چونکا دینے والی کہانیاں
ماہنامہ
ڈر
ڈائجسٹ
کراچی
مئی 2012
PDFBOOKSFREE.PK

16 — قاتل روح — عبدالحمید ساگر
ایک روح کی دہشت ناک اور بھیانک روداد جس نے گاؤں والوں کو خوف زدہ کردیا تھا

29 — جنات کا قبضہ — انور فرہاد
سطر سطر دل و دماغ کو جھنجھوڑتی ناقابل فراموش انجام کی ایک دلچسپ اور دل گرفتہ کہانی

39 — نہلے پہ دہلا — ناصر محمود فرہاد
حرص و لالچ کی ایک عجیب وغریب ذہن پر نقش ہونے والی پراثر اور سبق آموز کہانی

46 — رولوکا — اے وحید
وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا،اس کی جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

69 — انوکھا انجام — ایس حبیب خان
ایک جن کی در پردہ دیدہ دلیری اور پھر جب وہ کھلے عام سامنے آیا تو لوگ تھرا کر رہ گئے

79 — خونی بت — رضوان قیوم
ایک ساکت وجامد پتھر کے بت کی عجیب وغریب دل دہلا دینے والی لرزیدہ لرزیدہ خونی روداد

89 — راز — محمد عثمان علی
سوچ کے افق پر جھلمل کرتی ایک ناقابل یقین عجیب وغریب دل و دماغ کو مبہوت کرتی کہانی

96 — چندرا دیوی — ایم الیاس
پرتحیر کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے ذہن سے محو نہ ہونے والی ایک اچھوتی کہانی

127 — بدروح — شاہد سلیم
دل و دماغ پر خوف و دہشت طاری کرتی اپنی نوعیت کی ایک انوکھی اچھوتی اور خطرناک کہانی

131 — ہوائی مخلوق — نظارت نصر
اسماء الحسنٰی اور قرآنی آیات کو عقیدت سے پڑھتے ہی خونی بلائیں بھاگ جاتی ہیں

139 — خیر کی فتح — ع ک آفاقی
صدیوں سے موجود ایک خوفناک اور حیرتناک بلا کی دل پر دہشت طاری کرتی کہانی......

144 — شمیکا — ڈاکٹر اختر ہاشمی
اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کیلئے دل پر اثر کرنے والی ایک زبردست اور حیرت انگیز روداد

166 — خونی ڈاکٹر — شہاب شیخ
جسم میں گردش کرتے ہوئے لہو کو منجمد اور دماغ پر لرزہ طاری کرتی خوفناک کہانی

177 — انوکھی کہانی — عدنان علی
اللہ والوں کے قدردان آفات وبلیات سے محفوظ رہتے ہیں جس کا ثبوت کہانی میں ہے

187 — درندگی — ساجدہ راجا
رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی ذہن پر خوف کی چادر ڈالتی لرزہ براندام کہانی

195 — پراسرار حویلی — خلیل جبار
خونی لبادے میں لپٹی ہوئی ظلم وستم کی دردناک ناقابل فہم دل فگار خونچکاں تحریر

211 — شکست — شائستہ سحر
خودغرضی انسان کی زندگی کو تہہ وبالا کرکے رکھ دیتی ہے،کہانی پڑھ کر پتہ چلے گا "کیا یہ حقیقت ہے؟"

222 — خونخوار — ایس امتیاز احمد
دل و دماغ پر سکتہ طاری کرتی اور سطر سطر رونگٹے کھڑے کرتی دہشت ناک کہانی

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کتاب مارکیٹ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

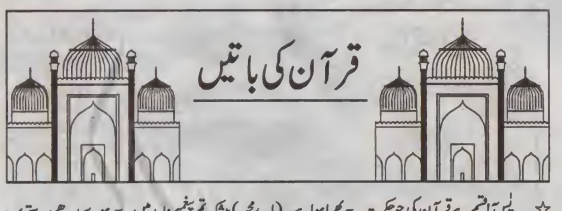

قرآن کی باتیں

- ☆ یٰسٓ! قسم ہے قرآن کی جو حکمت سے بھرا ہوا ہے۔ (اے محمد) بیشک تم پیغمبروں میں سے ہو۔ سیدھے رستے پر۔ (سورۃ یٰسٓ 36 آیت 1 سے 4)
- ☆ قسم ہے صف باندھنے والوں کی پرا جما کر پھر ڈانٹنے والوں کی جھڑک کر۔ پھر ذکر (یعنی قرآن) پڑھنے والوں کی کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ (سورۃ صافات 37 آیت 1 سے 4)
- ☆ صٓ۔ قسم ہے قرآن کی جو نصیحت دینے والا ہے کہ تم حق پر ہو، مگر جو لوگ کافر ہیں وہ غرور اور مخالفت میں ہیں۔ (سورۃ صٓ 38 آیت 1 سے 2)
- ☆ ق۔ قرآن مجید کی قسم کہ محمد پیغمبر ہیں لیکن ان لوگوں نے تعجب کیا کہ انہی میں سے ایک ہدایت کرنے والا ان کے پاس آیا تو کافر کہنے لگے کہ یہ بات تو بڑی عجیب ہے۔ (سورۃ قٓ 50 آیت 1 سے 2)
- ☆ بکھیرنے والوں کی قسم جو اڑا کر بکھیر دیتی ہیں۔ پھر پانی کا بوجھ اٹھاتی ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ چلتی ہیں۔ پھر چیزیں تقسیم کرتی ہیں۔ کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ سچا ہے اور انصاف کا دن ضرور واقع ہوگا۔ اور آسمان کی قسم جس میں رستے ہیں۔ کہ اے اہل مکہ تم ایک متناقض بات میں پڑے ہوئے ہو۔ (سورۃ ذاریات 51 آیت 1 سے 8)
- ☆ (کوہ) طور کی قسم، اور کتاب کی جو لکھی ہوئی ہے کشادہ اوراق میں۔ اور آباد گھر کی۔ اور اونچی چھت کی اور ابلتے ہوئے دریا کی۔ کہ تمہارے رب کا عذاب واقع ہو کر رہے گا۔ اور اس کو کوئی روک نہیں سکے گا۔ (سورۃ طور 52 آیت 1 سے 8)
- ☆ تارے کی قسم جب غائب ہونے لگے۔ کہ تمہارے رفیق (محمدؐ) نہ رستہ بھولے ہیں نہ بھٹکے ہیں۔ اور نہ خواہش نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں۔ یہ قرآن تو حکم اللہ ہے جو ان کی طرف بھیجا جاتا ہے۔ (سورۃ نجم 53 آیت 1 سے 4)
- ☆ ہمیں تاروں کی منزلوں کی قسم۔ اور اگر تم سمجھو تو یہ بڑی قسم ہے۔ کہ یہ بڑے رتبے کا قرآن ہے۔ (سورۃ واقعہ 56 آیت 75 سے 77)
- ☆ ن۔ قلم کی اور جو (اہل قلم) لکھتے ہیں اس کی قسم کہ (اے محمد) تم اپنے پروردگار کے فضل سے دیوانے نہیں ہو۔ اور تمہارے لئے بے انتہا اجر ہے۔ اور تمہارے اخلاق بڑی عالی ہیں۔ (سورۃ قلم 68 آیت 1 سے 4)
- ☆ ہمیں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی قسم کہ ہم طاقت رکھتے ہیں۔ یعنی اس بات پر قادر ہیں کہ ان سے بہتر لوگ بدل لائیں اور ہم عاجز نہیں ہیں۔ (سورۃ معارج 70 آیت 40 سے 41)
- ☆ ہاں ہاں ہمیں چاند کی قسم۔ اور رات کی جب پیٹھ پھیرنے لگے۔ اور صبح کی جب روشن ہو۔ کہ وہ (آگ) ایک بہت بڑی آفت ہے۔ اور بنی آدم کے لئے موجب خوف۔ (سورۃ مدثر 74 آیت 32 سے 36)
- ☆ ہم کو روز قیامت کی قسم۔ اور نفس لوامہ کی (کہ سب لوگ اٹھا کر کھڑے کئے جائیں گے) کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی بکھری ہوئی ہڈیاں اکٹھی نہیں کریں گے۔ ضرور کریں گے اور ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اس کی پور پور درست کردیں۔ (سورۃ قیامہ 75 آیت 1 سے 4)
- ☆ ہواؤں کی قسم جو نرم نرم چلتی ہیں۔ پھر زور پکڑ کر جھکڑ ہو جاتی ہیں۔ اور بادلوں کو پھاڑ کر پھیلا دیتی ہیں۔ پھر ان کو پھاڑ کر جدا جدا کر دیتی ہیں۔ پھر فرشتوں کی قسم جو وحی لاتے ہیں تاکہ عذر رفع کر دیا جائے۔ کہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ (سورۃ مرسلات 77 آیت 1 سے 7)
- ☆ ان فرشتوں کی قسم جو ڈوب کر کھینچ لیتے ہیں۔ اور ان کی جو آسانی سے کھول دیتے ہیں۔ اور ان کی جو تیرتے پھرتے ہیں۔ پھر لپک کر آگے بڑھتے ہیں۔ پھر دنیا کے کاموں کا انتظام کرتے ہیں۔ کہ وہ دن آ کر رہے گا۔ جس دن زمین کو زلزلہ آئے گا پھر اس کے پیچھے اور زلزلہ آئے گا۔ اس دن لوگوں کے دل خائف ہو رہے ہوں گے۔ آنکھیں جھکی ہوئی۔ (سورۃ نازعات 79 آیت 1 سے 9)
- ☆ ہم کو ان ستاروں کی قسم جو پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ اور جو سیر کرتے اور غائب ہو جاتے ہیں اور رات کی قسم جب ختم ہونے لگتی ہے۔ اور صبح کی قسم جب نمودار ہوتی ہے۔ (سورۃ تکویر 81 آیت 15 سے 18)
- ☆ ہمیں شام کی سرخی کی قسم۔ اور رات کی اور جن چیزوں کو وہ اکٹھا کر لیتی ہے ان کی۔ اور چاند کی جب کامل ہو جائے کہ تم درجہ درجہ رتبہ اعلیٰ پر پڑھو گے۔ (سورۃ انشقاق 84 آیت 16 سے 19)
- ☆ آسمان کی قسم جو مینہ برساتا ہے اور زمین کی قسم جو پھٹ جاتی ہے کہ یہ کلام (حق کو باطل سے) جدا کرنے والا ہی ہے۔ اور بے ہودہ بات نہیں۔ (سورۃ طارق 86 آیت 11 سے 14)
- ☆ فجر کی قسم۔ اور دس راتوں کی۔ اور جفت اور طاق کی اور رات کی جب جانے لگے اور بے شک یہ چیزیں عقل مندوں کے نزدیک قسم کھانے کے لائق ہیں کہ کافروں کو ضرور عذاب ہوگا۔ (سورۃ فجر 89 آیت 1 سے 5)
- ☆ ہمیں اس شہر (مکہ) کی قسم۔ اور تم اسی شہر میں تو رہتے ہو۔ اور باپ (یعنی آدم) اور اس کی اولاد کی قسم۔ کہ ہم نے انسان کو تکلیف کی حالت میں رہنے والا بنایا ہے۔ (سورۃ بلد 90 آیت 1 سے 4)
- ☆ سورج کی قسم اور اس کی روشنی کی۔ اور چاند کی جب اس کے پیچھے نکلے۔ اور دن کی جب اسے چمکا دے۔ اور رات کی جب اسے چھپالے۔ اور آسمان کی اور اس ذات کی جس نے اسے بنایا۔ اور زمین کی اور اس کی جس نے اسے پھیلایا۔ اور انسان کی اور اس کی جس نے اس کے اعضا کو برابر کیا۔ پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری کرنے کی سمجھ دی۔ کہ جس نے (اپنے) نفس یعنی روح کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا۔ اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا۔ (سورۃ شمس 91 آیت 1 سے 10)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

قارئین کرام السلام علیکم! شاعر نے ہم پاکستانیوں کے لئے کہا ہے۔ ”ہم زندہ قوم ہیں، پائندہ قوم ہیں۔“ یہ الفاظ ہم لوگ اکثر ریڈیو اور ٹی وی پر سنتے ہیں۔ زندہ کا مطلب ہے جیتا جاگتا اور پائندہ کا مطلب ہے۔ قائم رہنے والا، مضبوط اور مستحکم، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم واقعی زندہ اور پائندہ قوم ہیں؟ اگر ان الفاظ پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو کیا ہم پاکستانی اپنے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ واقعی ہم زندہ و پائندہ قوم ہیں! اور جب سارے حالات ہمارے سامنے آتے ہیں تو ہمارا ذہن تھرا کر رہ جاتا ہے کہ ہم تو ان الفاظ پر بالکل بھی پورے نہیں اترتے کیونکہ جو قومیں جاگتی رہتی ہیں، انہیں تو اپنے فرائض منصبی کے لئے اونگھ تک نہیں آتی، جاگتی قومیں اپنے ملک کی بھلائی اور خوشحالی کے لئے انتھک کوشش میں شب و روز لگی رہتی ہیں، اس کے بعد پائندہ قوم کا مطلب بھی واضح ہے، کیا ہماری سوچ، ہمارا عمل، اپنی قوم اور اپنے ملک کے لئے مثبت ہے؟ کیا ہمارے ذہن میں ملک و قوم کی بھلائی و خوشحالی کے لئے ذرہ برابر بھی کسک باقی ہے؟ آج کل جس سمت ہماری سوچ محو پرواز ہے تو کیا اس سے ہم دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہمارا ملک خوشیوں کا گہوارہ بن جائے گا، جو ہمارا طرز عمل ہے کیا اس سے ہم دنیا میں اپنے ملک و مذہب کا نام روشن کر سکتے ہیں؟ اب تو ہماری سوچ اپنی ذات تک سمٹ کر رہ گئی ہے۔ مطلب پرستی اور خود غرضی نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے کر جکڑ دیا ہے اور اس طرح سارے لوگ الگ الگ سوچ کے حامل ہو چکے ہیں۔ اب ہماری سوچ اجتماعی نہیں رہی کیونکہ اب ہم لوگ صرف اور صرف اپنی ذات اور اپنی بھلائی کے لئے کوشاں ہیں۔ ہمارا اپنا احساس اب غیروں کے لئے نہیں رہا۔ ہم اپنی ذات کے علاوہ دوسروں کے متعلق سوچتے تک نہیں ہیں۔

آج اگر ہم سوچنے لگیں کہ جس طرح میرے پیٹ، میرے سر اور میرے جسم میں کوئی تکلیف ہے جس سے میں متاثر ہو کر اذیت و کرب سے تڑپنے لگتا ہوں تو اسی طرح دوسرا بھی اس طرح اس تکلیف سے اذیت محسوس کرتا ہوگا۔ جس طرح میری ضروریات زندگی ہیں، میں جس طرز پر اپنی زندگی گزارنا چاہتا ہوں اس طرح دوسروں کی بھی سوچ ہوگی مگر افسوس صد افسوس کہ ہم دوسروں کا بالکل بھی احساس نہیں کرتے، نہ بڑے اپنے پن کا خیال کرتے ہوئے اپنے سے چھوٹوں پر دست شفقت رکھتے ہیں اور پھر اس طرح چھوٹے بھی اپنے بڑوں کی بات پر عمل نہیں کرتے۔ قارئین! دنیا میں جو بھی قومیں ترقی کرتی ہیں اور لوگ خوشحال ہوتے ہیں تو صرف اور صرف احساس ذمہ داروں کی وجہ سے، آج ہمارے ملک کی غیر ممالک میں جو عزت ہے، جو وقار ہے تو اس سے ہر کوئی واقف ہے۔ میڈیا کی وجہ سے ہر اچھائی اور برائی عیاں ہو کر رہ گئی ہے۔ ہم سے زیادہ دوسرے ممالک والے خوشحال ہیں کیوں کہ ان میں احساس ذمہ داری ہے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کا احساس کرتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ کل ہم بھی اس طرح دکھ و تکلیف میں مبتلا ہو سکتے ہیں، مگر اس بات کا ہمیں احساس نہیں ہوتا تو یہی وہ مین وجہ ہے کہ جس کی وجہ سے ہم سب کسی نہ کسی دکھ درد اور ٹینشن میں مبتلا ہیں۔ سب سے پہلے بڑوں کو اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کا احساس ہونا چاہئے پھر چھوٹے، بڑوں کو دیکھ کر راہ راست پر آ جاتے ہیں۔ ثبوت کے طور پر ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ ایک گھر میں والد نمازی تھے، والدہ نماز نہیں پڑھتی تھیں، ان کا ایک چھوٹا بیٹا تھا۔ ایک دن شوہر نے بیوی سے کہا۔ ”بیگم ببلو پر نماز کی پابندی کے لئے دباؤ ڈالو یہ سننا تھا کہ والدہ ببلو کے پیچھے پڑ گئیں۔ ”بیٹا نماز پڑھا کرو، نماز پڑھا کرو۔“ ببلو ایک دن دو دن تک تو سنتا رہا، تیسرے دن ببلو بولا۔ ”امی آپ تو نماز نہیں پڑھتی ہیں۔“ یہ سننا تھا کہ والدہ سٹپٹا کر رہ گئیں، تو شوہر نے کہا۔ ”بیگم یہ تو تمہیں پہلے سوچنا چاہئے تھا، اگر تم خود نماز پڑھتی ہوتیں تو آج ببلو یہ جواب نہ دیتا۔“ اس کے بعد اس دن سے بیگم نمازی بن گئیں اور پھر ان کی دیکھا دیکھی ببلو بھی نماز پڑھنے لگا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر بڑے اچھے ہوں تو چھوٹے خود بخود راہ راست پر آ جاتے ہیں۔

تو قارئین کرام! ان سطور کی روشنی میں ہم کیا یہ کہہ سکتے ہیں کہ ”ہم زندہ قوم ہیں۔ پائندہ قوم ہیں۔“

(ادارہ)

رضیہ عارف کراچی سے، اپریل کا ڈر ڈائجسٹ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، سب سے پہلے میں قرآن کی باتیں بڑے غور و خوض سے پڑھتی ہوں، اور یہ دو صفحات پڑھ کر چند منٹ کے لئے سوچ کی دنیا میں پہنچ جاتی ہوں۔ ”قرآن مجید کے روشن موتی“ کتاب سے لے

کر ہر ماہ جو آپ لوگ صفحات چھاپتے ہیں۔ یہ بہت احسن کام ہے۔ اور میرا مشورہ ہے کہ اس سلسلے کو ہمیشہ قائم رکھئے گا۔ اگر غور کیا جائے تو یہ سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان پر بہت ہی مہربان اور رحیم و کریم ہے۔ اس نے صرف اور صرف انسان کی بھلائی کے لئے ہر طرح سے سمجھایا ہے مگر ہم ہیں کہ صرف اور صرف اپنی دنیاوی ضرورتوں و خواہشوں کے شکنجے میں جکڑ کر رہ گئے ہیں۔ اپریل کے شمارے میں ہی دوسرے صفحہ پر سورہ بقرہ آیت 263 سے 264 کا حال بیان ہے۔ مومنو! اپنے صدقات خیرات اور احسان اس شخص کی طرح برباد نہ کر دینا جو لوگوں کو دکھاوے کے لئے مال خرچ کرتا ہے، اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کے مال کی مثال اس چٹان کی سی ہے، جس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہو اور اس پر زور کا مینہ برس کر اسے صاف کر ڈالے۔ اس طرح یہ ریاکار لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ حاصل نہیں کر سکیں گے اور اللہ ایسے ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔“...... یہ ایسی باتیں ہیں کہ اگر ان پر غور کیا جائے تو جسم و جان تھرا کر رہ جاتا ہے اور اکثر نظر آتا ہے کہ زیادہ تر لوگ صرف اور صرف دکھاوے کے لئے لاکھوں خرچ کر دیتے ہیں اور کسی مستحق کی مدد نہیں کرتے، مجبور لاچار بے کس اور بھوکوں کو روٹی کے لئے بھی نہیں پوچھتے۔ شادی بیاہ میں نام و نمود کے لئے دس بارہ قسم کے طرح طرح کے کھانے لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ ان کے ناموں کا چرچا زیادہ ہو۔ ہم غافلوں کو قرآن کی باتوں پر ضرور عمل کرنا چاہئے اس میں ہماری بھلائی، بخشش ہے، کہانیوں کے اعتبار سے اپریل کا شمارہ زبردست رہا۔ تمام کی تمام کہانیاں بہت خوب رہیں لیکن ”عبرت ناک“ سنز دماغ کو متاثر کر گئی کوئی بھی طاقتور اور ظلم کا پہاڑ توڑنے والا اپنے دردناک انجام سے فرار نہیں حاصل کر سکتا۔ ”نامراد“ بھی سبق آموز تحریر ہے۔ ”مندر کا پجاری“ بھی زور قلم کی شاہکار کہانی ہے۔ ساجدہ راجا اور نظارت نصر کی تحریروں میں اب پہلے سے زیادہ پختگی نظر آ رہی ہے اور ناصر محمود فرہاد صاحب کا تو جواب نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ لکھتے لکھتے آدمی لکھاری بنتا ہے۔ نئے رائٹروں کو اس پر غور کرنا چاہئے ڈر ڈائجسٹ کی کے لئے ترقی دعا گو ہوں۔

☆☆ رضیہ صاحبہ: آپ کی تمام باتیں قرآن کے متعلق دل میں اترنے والی ہیں کاش! ہم ان باتوں پر غور کریں اور پھر اپنی اصلاح، کیونکہ اسی میں ہماری بھلائی ہے، آئندہ ماہ بھی آپ کی اچھی باتوں کا انتظار رہے گا۔ Thanks۔

فرزانہ عابد لاہور سے، اپریل 2012ء کا ڈر ڈائجسٹ 23 مارچ کو سامنے آیا۔ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا، 23 مارچ قرارداد پاکستان کا اہم دن اور پھر ڈر ڈائجسٹ کی آمد نے خوشیوں میں نہ جانے کتنے چاند لگا دیئے۔ کام کی مصروفیات کچھ زیادہ تھیں مگر جھٹ سے شمارہ لے کر بیٹھ گئی۔ خطوط کی محفل میں فرسٹ نمبر پر اپنا خط دیکھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس کے بعد ”قرآن کی باتیں“ کا صفحہ کھول کر پڑھنے لگی۔ ادھر امی کی آوازیں برابر آتی رہیں مگر مجال ہے کہ میری نظریں ”قرآن کی باتیں“ سے ہٹی ہوں۔ جب دو صفحات مکمل پڑھ چکی تو پھر امی کے پاس پہنچ گئی اور بحکم امی کے مطابق کام میں جٹ گئی۔ خیر چار دنوں میں مکمل شمارہ پڑھ ڈالا۔ ردلو کا میں نئے نئے واقعات نے اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ اچھا ہوا شہرت وحشت پر جمود طاری ہو گیا۔ روگی، نامراد، مندر کا پجاری، دیوتا اور کایا پلٹ اچھی لگیں۔ دیگر کہانیاں بھی اچھی ہیں مگر یہ تو اپنی اپنی پسند ہوتی ہے۔ آج کل زیادہ تر یہ نظر آ رہا ہے کہ پرانے کہنہ مشق رائٹروں کے بہ نسبت نئے اور نو آموز لکھاری نئے نئے موضوع کو سامنے لا رہے ہیں۔ پرانے رائٹروں کی کہانیوں میں نیا پن نظر نہیں آتا، لیکن زمانے کی ریت ہے کہ نامی بنیا کا نام بکتا ہے۔ بہر حال ایسے رائٹروں کو اس طرف سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ میں تمام نئے رائٹروں کو ان کی اچھی اور بہتر کارکردگی پر مبارکباد پیش کرتی ہوں اور میری دعا ہے کہ ان کے قلم میں اور زور پیدا ہو، اللہ تعالیٰ انہیں کامیابی سے نوازیں اور یہ حقیقت ہے کہ محنت کا پھل ضرور ملتا ہے لیکن انسان اگر لگن سے اپنے کام میں جتا رہے تو۔ ڈر ڈائجسٹ اپنے پڑھنے والوں کے دل کی دھڑکن بن گیا ہے، جب تک پڑھ نہ لیا جائے سکون نہیں ملتا۔ اور وہ کہانیاں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ جو حقیقت سے قریب تر ہوں اور حقیقت سے جو قریب ہوتی ہیں ان میں رائٹر بہت مضبوط نظر آتا ہے اور اس کی سوچ کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی سامنے آتا ہے کہ وہ اپنے کام میں کس قدر مخلص ہے۔ میری دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ بہت زیادہ ترقی کرے۔ (آمین)

☆☆ فرزانہ صاحبہ: آپ نے جو کچھ بھی لکھا بہت خوب لکھا اور آئندہ ماہ بھی آپ کی خوب تر لکھائی کا انتظار رہے گا۔ شکریہ۔

ثاقب بشیر لاہور سے، امید ہے میرے پیارے ڈر ڈائجسٹ کے تمام قارئین اور عملہ خیریت سے ہو گا ڈر ڈائجسٹ اب ہماری زندگی کا ایک اہم جز بن گیا ہے۔ جب تک اسے پڑھ نہ لو اس وقت تک چین نہیں آتا۔ آپ کے خطوط کا جواب دینے کا انداز بھی بہت اپنا اپنا لگتا ہے۔ دو مہینے کے گیپ کے بعد خط لکھ رہا ہوں وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ تقریباً دو ماہ پہلے میں نے ”معصوم شیطان“ کے نام

سے ایک کہانی بھیجی تھی اور خط بھی۔ خط آپ نے شائع تو کر دیا تھا مگر کہانی شائع نہیں کی کیونکہ تب تک آپ نے پڑھی نہیں تھی۔ مگر دو ماہ گزر جانے کے بعد بھی میں اپنی تحریر کے انجام سے ناآشنا ہوں، مہربانی فرما کر اس کی اشاعت کے بارے میں بتا دیں۔ اپریل کا شمارہ تقریباً دو دن میں ختم کر دیا اور ہمیشہ کی طرح بہت مزہ آیا۔ میں ڈر ڈائجسٹ کا خاموش قاری ہوں، مگر پہلی تحریر بھیجی تھی مگر ابھی تک حوصلہ افزائی یا تنقید کا منتظر ہوں۔ شکریہ۔

☆☆ ثاقب صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، ڈر ڈائجسٹ سے چاہت کے لئے اور تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، آپ کی کہانی بنام ”شیطانی کھیل“ کمپوز ہو چکی ہے اور اگلے ماہ ضرور شامل اشاعت ہوگی۔ قوی امید ہے کہ آئندہ ماہ بھی اپنی خیریت سے ضرور آگاہ کریں گے۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! تمام عملہ اور تمام قارئین کی خیریت خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں، چند دن ہوئے شہر جانے کا اتفاق ہوا، وہاں ایک بک اسٹال پہ ماہ اپریل کے تازہ ڈر ڈائجسٹ سے ملاقات ہوگئی، سرورق بہت ہی خوبصورت تھا۔ ڈر ڈائجسٹ عوام میں بہت مقبول ہے خط اور غزل شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ آپ جس خلوص اور محبت سے ہمیں یاد کرتے ہیں اس کے لئے بہت بہت شکریہ۔ پرچے کے لئے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ وقت مقررہ پر مل جاتا ہے۔ پرچے میں ہمیں اچھی اچھی تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ پرچے کا اپنا الگ معیار ہے۔ اسلم راہی کی تحریروں کو آپ نے بند کر دیا ایسا ہی کوئی اور یادگار سلسلہ شروع کیا جائے جو کہ قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہو۔ خطوط میں ہر قاری اپنی اپنی رائے کا اچھے طریقے سے اظہار کرتا ہے۔ اس بار جن تحریروں سے میں متاثر ہوا وہ ہیں مندر کا پجاری، ہمزاد، دوسرا جنم، مسیحا، بھیانک چیخ، قوس قزح بھی اچھا سلسلہ ہے غزلیں بھی اپنی اپنی جگہ پہ بہتر ہیں۔ میری طرف سے تمام قلمکاروں کی خدمت میں آداب عرض، پرچہ پڑھ کر تبصرہ کرنا بھی ایک بہت مشکل فن ہے۔ اب اجازت چاہتا ہوں زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔ نیک تمناؤں کے ساتھ۔ خدا حافظ۔

☆☆ اسلم صاحب: خلوص نامہ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، ڈر ڈائجسٹ سے آپ کی والہانہ چاہت واقعی قابل دید ہے۔ اس کے لئے شکریہ، اگلے ماہ بھی خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

محمد علی کراچی سے، السلام علیکم، میں خیریت سے ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ڈر ڈائجسٹ کے تمام عملہ اور تمام قارئین کو خیر و عافیت سے رکھے۔ میرے نزدیک دعاؤں میں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔ پتہ نہیں کب کس کی دعا لگ جائے، دنیاوی عیش و عشرت کے لئے کیا دھرا سب کچھ یہیں رہ جائے گا، جب لاد چلے گا بنجارا، زیادہ تر لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ دوسروں کا نقصان کر کے اپنا گھر بھر لیں، مگر ایسا کرنے والے یہ نہیں سوچتے کہ میں جو زیادتیاں کر رہا ہوں اپنے آرام و سکون اور مال بٹورنے کے لئے تو یہ سب چند روزہ ہیں۔ میں کون سا اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ بلکہ میرے ساتھ صرف میرے اعمال جائیں گے۔ اسی لئے شاعر نے کہا ہے عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی، یہ خاک اپنی فطرت میں نہ نوری ہے اور نہ ناری۔ اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے سامنے گڑگڑاتے ہیں، تو یہ کیا صحیح ہے؟ میری نظر میں ایسا کرنا غلط ہے، اللہ تعالیٰ جو سب کا دینے والا ہے، سب کا پالنہار ہے، وہی مجھ کو بھی دیتا ہے اور وہی اسے بھی دیتا ہے جس کے آگے میں گڑگڑا رہا ہوں، تو کیوں نہ میں اس کے آگے دست سوال پھیلاؤں، جو سب کو دینے والا ہے۔ خیر یہ تو اپنی اپنی سوچ ہے، ہمیں آخرت اور قبر کے لئے ضرور سوچنا چاہئے۔ احکام خداوندی کے مطابق سب سے بڑی عبادت ہے حقوق العباد، جس نے اس کا خیال رکھا وہ کامیاب ہوا۔ باقی سب کچھ بے کار ہے۔ اب آتے ہیں، سوہنا ڈر ڈائجسٹ کی طرف، یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے اور میں قلبی لگاؤ سے تحریر کر رہا ہوں کہ ڈر ڈائجسٹ کا واقعی جواب نہیں، موضوع کے لحاظ سے یہ اس وقت پاکستان کا نمبرون پرچہ ہے۔ ہر ماہ اتنی ساری کہانیاں ایک ہی طرز کی شائع کرنا بہت ہمت و حوصلے کی بات ہے۔ یہ اچھا ہوا کہ شہر وحشت الوداع ہو گیا۔ اب چندرا دیوی کے متعلق بھی ضرور سوچیں اس کی جگہ کوئی اور سلسلہ آجائے تو ذائقہ چینج ہو جائے گا۔ جو مجھے زیادہ اچھی لگی وہ ہیں رولوکا، مندر کا پجاری، نامراد، عبرت ناک سفر، تاریک راہیں، ساگوان چکر، روگی اور دیوتا، میری دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ ترقی کی منازل طے کرتا ہے، آئندہ ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ اللہ حافظ۔

☆☆ محمد علی صاحب: قلبی لگاؤ سے خط لکھنے کے لئے V.V.Thanks کاش کہ لوگ اپنے اعمال کے مطابق غور کریں تو دین بھی اچھا اور دنیا بھی اور اس طرح خون خرابہ، دہشت گردی، لوٹ مار اور چھینا جھپٹی ختم ہو کر رہ جائے، خیر انسان کو اپنے اپنے کرتوتوں کے

متعلق ضرور غور کرنا چاہئے، نہیں تو ایسے لوگوں کے لئے نار جہنم دہک رہی ہے۔ اگلے ماہ بھی آپ کے خلوص کا انتظار رہے گا۔ شکریہ۔

عمر فاروق بلند تھل سے، السلام علیکم، چار پانچ سال سے ڈر ڈائجسٹ پڑھ رہا ہوں، لیکن اب تک خط نہیں لکھا، کیونکہ خط بھیجنے کے طریقے کا پتہ نہیں، تھا اب ہمت کر کے لکھ رہا ہوں، شاید پہنچ جائے مجھے ڈر ڈائجسٹ پڑھنے کا بہت شوق ہے، لیکن یہ رسالہ یہاں ملتا نہیں ہے فروری 2011ء تک تو کسی نہ کسی طریقے سے پڑھتا رہا کبھی ساتھ والے گاؤں رنگپور اور کبھی نور پور جاتا رہا لیکن اس کے بعد بہت کوشش کی نہ ملا۔ مجھے ڈر ڈائجسٹ سے بہت محبت ہے یہ میری زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔ کیا آپ اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکتے ہیں کہ میں کس طرح منگواؤں؟ کیا آپ ہمارے گاؤں۔ ”بلند تھل تحصیل نور پور تھل ضلع خوشاب، میں ہر ماہ باقاعدگی سے ڈر ڈائجسٹ بھجوا سکتے ہیں؟ میں اس کے لئے کس طرح پیسے بھجوا سکتا ہوں؟ ڈاک سے سال بھر کے رسالے منگوانے کا کیا طریقہ کار ہے؟ سالانہ قیمت کس طرح بھجوا سکتا ہوں پلیز! اس سلسلے میں میری کچھ مدد کریں میرے خط کا جواب خط میں ہی دیں اگر رسالے میں جواب دینا چاہیں تو صرف جواب ہی لکھ دیں آپ کی بہت مہربانی ہوگی میں دوسروں کو بھی یہ رسالہ پڑھنے کی ترغیب دیتا ہوں، آپ کے جواب کا شدت سے انتظار رہے گا۔

☆☆ عمر فاروق صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، ادارہ آپ کی چاہت و خلوص کی قدر کرتا ہے، آپ سالانہ خریدار بن جائیں، اس کا طریقہ ہے کہ -/850 روپے بذریعہ منی آڈر، ڈر ڈائجسٹ کے ایڈریس پر ارسال کر دیں۔ رقم ملتے ہی ہر ماہ آپ کے پاس ڈر ڈائجسٹ پہنچ جایا کرے گا۔ شکریہ۔

اسحاق انجم کنگن پور سے، السلام علیکم، امید ہے کہ ڈر کی پوری ٹیم بخیریت ہوگی۔ مارچ 2012ء ڈر کا شمارہ شہزاد بکسٹال سے کنگن پور سے خریدا۔ اپنا خط شامل اشاعت دیکھا تو خوشی ہوئی لیکن جب غزلوں میں جب اپنی غزل نہ شامل اشاعت دیکھی تو دکھ ہوا۔ سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں ایمان تازہ ہوا۔ ”میں منیر احمد ساغر صاحب کا بھی از حد مشکور ہوں جنہوں نے میری شاعری کو پسند کیا۔ کہانیوں میں رولوکا، آخری چوری، کیتلی، شہر دحشت، خونی مکڑی، روحانی لگاؤ، بری آتما، قاتل پیراہن، شمیکا اچھی لگیں پسند آئیں۔ شاعری محفل دوستاں میں شرف الدین جیلانی، صبا محمد اسلم گوجرانوالہ، محمد عثمان علی، محمد شفیق رضا، حبیب اللہ جٹ نول، سلمان خان نول، حکیم خان حکیم، منیر احمد ساغر، شائستہ سحر، انیلہ غزل، ایس امتیاز احمد، محمد اسلم جاوید، صبا محمد اسلم گوجرانوالہ، احسان سحر، محمد اسحاق انجم، آصف شہزاد فیصل آباد، پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی، ارشاد العصر جعفری کے کلام پسند آئے۔ شہر دحشت بہت اچھی جا رہی ہے۔ ایک عدد غزل آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اس کو بھی براہ کرم ردی کی ٹوکری سے بچا کر شائع کر دیں۔ مہربانی ہوگی۔

☆☆ اسحاق صاحب: اگر خط لیٹ موصول ہو تو اس کا علاج آپ خود بتائیں۔ خط ارسال کرنے میں ذرا جلدی کا خیال رکھا کریں۔ شکریہ۔

بشیر احمد بھٹی فوجی بستی غربی بہاولپور سے، اپریل 2012ء کا ڈر چوبیس مارچ کو خریدا، ٹائٹل دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، ایس امتیاز احمد کی پہلی کہانی مندر کا پجاری، سرورق کی کہانی ہے۔ عمر، ڈائنا، ارکلیس تین کہانی کے مرکزی کردار ہیں۔ کہانی بہت ہی پراسرار رہی۔ درخت کی شاخ کے حصول کے لئے عمر کو دن میں درخت پر چڑھ کے شاخوں میں چھپ کے بیٹھنا پڑا۔ مکار ارکلیس کے خاتمے کے لئے یہ ضروری تھا۔ دوسری کہانی دوسرا جنم، ایک لاجواب کہانی ہے۔ سزائے موت کے قیدی کا دماغ جیل وارڈن رچمنڈ میں ڈال کر ڈاکٹر نے خوب کارنامہ انجام دیا۔ کہانی سطر سطر سسپنس سے بھرپور تھی۔ تیسری کہانی نامراد تھی۔ خواجہ سراؤں کی دلچسپ اور معاشرتی عکس لئے ہوئے تھی۔ مندری کا پجاری کا اسکیچز جس میں ریوالور دکھایا گیا ہے۔ اس ریوالور کا کہانی میں ذکر ہی نہیں۔ سرورق کی کہانی کا اسکیچز ٹائٹل کی فوٹو کاپی کے ذریعے شائع کر دیا کریں۔ تاکہ پتہ چل جائے کہ یہ کہانی سرورق کی ہے۔ رولوکا کی قسط نمبر 83 خوب رہی۔ شمیکا بھی پرتجسس ہے۔ صفحہ 65 پر میرا بھیجا ہوا لطیفہ موجود ہے۔ شکریہ۔ مزید دو لطیفے حاضر خدمت ہیں۔ شائع کر کے مشکور فرمائیں۔

☆☆ بشیر صاحب: آج کل اسکیچز فری ہینڈ بن رہے ہیں۔ آپ کا مشورہ سر آنکھوں پر۔ خط لیٹ موصول ہوا۔ جس کی وجہ سے اس مرتبہ آپ کا ارسال کردہ لطیفہ اشاعت سے رہ گیا۔ پلیز! ٹائم کا خیال رکھا کریں۔ خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس۔

ایم مجاھد لیاقت ملتان سے، امید ہے ڈر ڈائجسٹ پڑھنے والے تمام لوگ خیریت سے ہوں گے۔ اپریل 2012ء کا شمارہ بہت زبردست تھا پڑھ کر دل کو خوشی ہوئی، تمام کہانیاں زبردست تھیں۔ مندر کا پجاری، دوسرا جنم، حفاظت، تاریک راہیں، عبرت ناک سفر، بھٹکتی روح، کہانیاں بہت زبردست تھیں، قرآن کی باتیں پڑھ کر ایمان تازہ ہوا، قوس قزح جس میں تمام دوستوں نے بہت اچھا لکھا۔ غزلوں میں واجد صاحب کی غزل اور عمار کی غزل بہت اچھی تھیں باقی تمام ڈائجسٹ بھی زبردست تھا میری غزل اور شعر شائع کرنے کے لئے بہت بہت Thanks، آخر میں ڈر ڈائجسٹ کے لئے دعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ ڈر ڈائجسٹ کو ترقی کی منازل کی طرف رواں دواں رکھے۔ (آمین)

☆☆ مجاہد صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، مگر امید ہے آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

رانا ظفر اقبال جنڈانوالہ سے، السلام علیکم! امید کرتا ہوں کہ ڈر ڈائجسٹ کا پورا اسٹاف اور تمام قارئین دوست خیریت سے ہوں گے۔ اپریل کا رسالہ 28 مارچ کو ملا، ٹائٹل ہمیشہ کی طرح اچھا رہا۔ قرآن کی باتیں پڑھ کر دلی سکون ملا اور ایمان بھی تازہ ہوا۔ اس کے بعد خطوط کا مطالعہ کیا سب دوستوں نے اچھے الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور خوشی بھی ہوئی کہ ہر ماہ کئی نئے دوست ڈر کی اس محفل میں شرکت کرتے ہیں جس سے پتا چلتا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ ترقی کی راہ پر کامیابی سے گامزن ہے۔ بہت سے دوستوں نے گلے شکوے کئے۔ خیر یہ تو ہوتا رہتا ہے۔ اس کے بعد "شمیکا" کے دوسرے حصے کا مطالعہ کیا جو کہ بہت خوب تھا۔ اب تیسرے حصے کا انتظار ہے اس کے بعد "چندرادیوی" اور "رولوکا" ہمیشہ کی طرح بہت اچھی تھی۔ "شہروحشت" کا اچھا اینڈ ہوا۔ اب ایم اے راحت صاحب سے درخواست ہے کہ جلدی سے کوئی نئی سلسلہ وار کہانی ڈر ڈائجسٹ کی نظر کریں۔ اس کے علاوہ "نامراد" "ساگوان چکر" "روگی" "دیوتا" "بھٹکتی روح" اور "مسیحا" بھی بہت اچھی تھی۔ قوس قزح میں "لاہوتی عمار" "منیر احمد ساغر" "راجہ خرم ساگر" اور مس فوزیہ کنول کے شعر پسند آئے۔ غزلیات میں "شرف الدین جیلانی" "منیر احمد ساغر" "سحرش اعظم" "ارشد ملک" اور "گلناز شہزادی" کی غزلیں اچھی تھیں۔ اس کے علاوہ دیگر مراسلہ جات بھی اچھے تھے۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے پیارے ملک پاکستان اور تمام مسلمانوں کو اپنی حفظ وامان میں رکھے اور ڈر ڈائجسٹ کو ترقی کی راہ پر گامزن رکھے۔ (آمین) خدا حافظ۔

☆☆ رانا ظفر صاحب: خلوص نامہ پڑھ کر خوشی ہوئی، کہانیوں کی تعریف اور اگلے ماہ بھی خیریت نامہ بھیجنے کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کریں۔

مبشر علی حیدر شمس آباد حضرو سے، السلام علیکم! اپریل کا ڈر ڈائجسٹ ہاتھوں میں آیا تو خوشی ہوئی اور پڑھ کر تو دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ تمام کی تمام کہانیاں بہت خوب اور اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ میں پہلی مرتبہ ڈر کی محفل میں شرکت کر رہا ہوں امید ہے حوصلہ افزائی ضرور کریں گے، نہیں تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ میں بہت آس وامید لے کر خط ارسال کر رہا ہوں اور ساتھ ہی ایک نظم بھی ارسال کر رہا ہوں۔ قوی امید ہے کہ اسے شائع کر کے شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔ میری دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ خوب ترقی کرے۔

☆☆ مبشر صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں ویلکم، چلئے آپ کی حوصلہ افزائی ہوگئی اب تو خوش ہیں ناں اور اسی خوشی میں اپنی خیریت کا خط فوراً ارسال کردیں۔

شعیب شیرازی جوہرآباد سے، ڈر ڈائجسٹ ماہ اپریل 2012ء میرے ہاتھوں میں ہے، پچھلے دو ماہ سے خط نہیں لکھ سکا، اس کے لئے معذرت، معروفیت کچھ زیادہ تھی، میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہر ماہ خط لکھا جائے۔ لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ میں خط نہیں لکھ پاؤں گا۔ اگر آدمی ایک ماہ میں دو تین کہانیاں لکھنے لگ جائے تو ٹائم ہی کہاں بچتا ہے کہ آدمی اپنا ماضی الضمیر بیان کر سکے۔ ویسے میں کوشش کروں گا کہ ہر ماہ شرکت کی جا سکے۔ کیونکہ ڈر ڈائجسٹ کے ساتھ الفت سی ہوگئی ہے۔ علاوہ ازیں میں مشکور ہوں ڈر ڈائجسٹ کی انتظامیہ کا جنہوں نے میری کہانی "آنکھیں" کو اس قابل سمجھا کہ وہ ڈر ڈائجسٹ کی زینت بن سکے۔ اور ساتھ ساتھ محمد شاکر کاشان، بشیر احمد بھٹی کا جنہوں نے میری کہانی کو پسند فرمایا۔ ان کے علاوہ باقی قارئین خاموش تھے۔ لگتا ہے انہیں پسند نہیں آئی۔ خیر میری پہلی کہانی تھی آئندہ ماہ مزید بہتر لکھنے کی کوشش کروں گا۔ کہانیاں ابھی پڑھی بھی نہیں۔ اس لئے کہانیوں پر ڈسکس نہیں کر سکتا۔

صرف ایک کہانی "ساگوان چکر" ساجدہ راجا صاحبہ کی پڑھی ہے، جو پسند آئی۔

☆☆ شعیب صاحب: آدمی لکھتے لکھتے لکھاری بنتا ہے۔ کہانی کا اچھا ہونا، یہ ثبوت ہے کہ کہانی ادارے کو پسند آگئی اور ہمیشہ اچھی کہانی شائع ہوتی ہے۔ ایک کہانی بھیج کر خاموش بیٹھ رہنا دانشمندی نہیں۔ آپ کی دوسری کہانی کا شدت سے انتظار رہے گا۔

محمد بشیر احمد پرواز جنڈانوالہ سے، امید ہے ڈر ڈائجسٹ کی پوری ٹیم اور تمام قارئین خیریت سے ہوں گے، اپریل کا ڈر ڈائجسٹ 26 مارچ کو بک اسٹال سے خریدا۔ سرورق لاجواب تھا۔ گھر آکر سکون کے ساتھ مطالعہ شروع کیا۔ سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں تو ایمان تازہ ہوگیا۔ اس کے بعد خطوط پڑھے تمام قارئین نے اچھا لکھا تھا۔ اس کے بعد سب سے پہلے شہروحشت کی آخری قسط پڑھی جو کہ لاجواب تھی۔ اس کی تعریف کے لئے الفاظ نہیں مل رہے۔ اس کے بعد "رولوکا" اور "شمیکا" کا مطالعہ کیا۔ "شمیکا" کا دوسرا حصہ بھی زبردست تھا۔ اس کے علاوہ "رولوکا" "حفاظت" "ہمزاد" چندرادیوی بہت اچھی تھی۔ ویسے تمام رسالہ اپنی مثال آپ تھا۔ شمیکا کے اگلے حصے کا شدت سے انتظار رہے گا۔ قوس قزح میں بھی سب دوستوں نے اچھا لکھا۔ غزل میں محمد آصف، محمد منیر احمد ساغر نے اچھا لکھا تھا۔ اگلے شمارے کا انتظار ہے۔ دعا ہے کہ ساتھ اللہ تعالیٰ ڈر ڈائجسٹ کو اسی طرح ترقی کی راہ پر گامزن رکھے۔ آمین!

☆☆ بشیر صاحب: آپ کو ڈر ڈائجسٹ کی کہانیاں اچھی لگیں، اس کے لئے بہت بہت شکریہ، نوازش نامہ پڑھ کر خوشی ہوئی اور آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ سے بھرا تجزیہ نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

عامر ملک راولپنڈی سے، آداب تسلیم، امن سکھ اور سلامتی کی سب دعائیں ادارہ ڈر ڈائجسٹ، قارئین اور اپنے وطن کے نام "کایا پلٹ" کی اشاعت کا شکریہ۔ "ڈر" کا سرورق نہایت ہی شاندار ہے۔ کہانیاں پڑھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ اس کے علاوہ تحریریں اور دیگر کالم بھی اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ اس میں ایس امتیاز احمد کی تحریر "مندر کا پجاری" بہترین رہی۔ اس کے علاوہ شائستہ سحر، خالد علی، عمران قریشی اور ڈاکٹر اختر ہاشمی کی کہانیاں پرچے کی جان لگیں۔ سب کو مبارکباد۔ خط کے ہمراہ ایک تحریر "صحابی جن" بھیج رہا ہوں۔ یہ واقعہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اس کے راوی وہ خود تھے۔ لیکن میں نے اپنے انداز میں لکھا ہے۔ اچھا لگے تو شائع کر کے ممنون فرمائیں۔

☆☆ عامر صاحب: کہانی لیٹ موصول ہوئی، لہٰذا اشاعت سے رہ گئی، آئندہ ماہ بھی قلبی خلوص نامہ کا انتظار رہے گا۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم، امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ماہ اپریل 2012ء کا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ اسٹوریز اور غزلوں کا انتخاب لاجواب رہا۔ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ آرٹیکلز لگانے کا شکریہ۔ مزید میٹر آپ کے پاس ہے...... پلیز دیکھئے گا...... مزید میٹر میں۔ خونی بدروح، نمک پارے، غزل ارسال خدمت ہیں۔ پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ آپ کو اور دیگر اسٹاف اور "ڈر ڈائجسٹ" کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے وویورز کو دعا سلام۔ پلیز اپنا خیال رکھئے گا۔

☆☆ امتیاز صاحب: آپ کی محبت کا منہ بولتا ثبوت "خونخوار" شامل اشاعت ہے۔ قوی امید ہے کہ ہر ماہ قلبی لگاؤ کا خلوص نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گے۔ Thanks۔

سعد پرویز کراچی سے، السلام علیکم، اپریل کا ڈر ڈائجسٹ اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ موصول ہوا۔ شروع سے آخیر تک کی تمام تحریریں بے مثال اور لاجواب ہیں۔ ان تمام تحریروں کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ میرے گھر والے بھی اس رسالے کو قلبی لگاؤ سے پڑھتے ہیں۔ جدید مزاج سے ہٹ کر یہ رسالہ ہے یعنی لغویات سے پاک۔

☆☆ سعد صاحب: ڈر ڈائجسٹ کی تعریف کے لئے شکریہ، آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا بہت زیادہ انتظار رہے گا۔

☆☆

نوٹ:۔ تمام رائٹر حضرات سے التماس ہے کہ اپنی ہر کہانی پر مکمل ایڈریس اور Cell,No ضرور لکھا کریں، دھیان سے کیونکہ اعزازی کاپی بھیجنے یا پھر رابطہ کرنے میں آسانی ہو۔ قوی امید ہے کہ رائٹر حضرات عملی قدم اٹھا کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

قاتل روح

عبدالحمید ساگر۔کندیاں

رات کے تاریک سناٹے کو چیرتی ہوئی گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور پھر اس علاقے میں دودھیا روشنی پھیل گئی تو دیکھنے والوں کا دل حلق میں آگیا۔ ایک گھڑ سوار تیزی سے آرہا تھا کہ اچانک اس کا سر دھڑ سے غائب ہوگیا۔

ایک روح کی دہشت ناک اور بھیانک روداد جس نے گاؤں والوں کو خوف زدہ کردیا تھا

چاروں طرف بھیانک اندھیرا تھا۔ اور اس اندھیرے میں اردگرد کے سفید پوش برفانی پہاڑ اور درخت عجیب پراسرار منظر پیش کررہے تھے۔ ایسے میں دو پہاڑوں کے درمیان ایک کچے راستے پر ایک بگھی جس میں کل چار لوگ سوار تھے اپنی مخصوص رفتار سے چلتی جارہی تھی۔ اس کچے راستے کے اردگرد گھنے درخت تھے جو کہ مکمل طور پر برف سے ڈھکے ہوئے تھے اور اسی وجہ سے سفید نظر آرہے تھے۔

بگھی میں جو چار دوست سوار تھے ان میں سے ایک جوزف تھا، اس کی عمر چالیس سال تھی۔ دوسرا چارلس ڈان تھا، اس کی عمر بھی چالیس کے قریب ہی تھی، تیسرا شخص ایڈی جان تھا جس کی عمر مشکل سے پچیس برس تھی۔ جبکہ چوتھی شخصیت مس ایڈرا تھی۔ جو کہ ایڈی جان کی گرل فرینڈ تھی۔

یہ چاروں دوست پاس والے گاؤں میں جو کہ ان کے گاؤں سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا، ایک تقریب میں شرکت کرنے گئے تھے۔ تمام دن اور رات تک تقریب میں شراب وشباب کے مزے لینے کے بعد اب یہ رات کے ایک بجے واپس آرہے تھے۔ ان سب کے میزبان مسٹر تھامسن نے انہیں روکا بھی تھا کہ راستے میں گھنا جنگل پڑتا ہے اور خطرناک جنگلی جانور ہیں۔ اور دوسرا یہ کہ رات کا سفر ہے لہٰذا انہیں صبح کا انتظار کرنا چاہئے لیکن ان لوگوں نے مسٹر تھامسن کی بات پر غور نہیں کیا بلکہ ان کی بات کی کوئی پرواہ نہ کی۔ خاص کر ایڈی جان نے کہا کہ ”اسے جنگلی جانوروں سے ڈر نہیں لگتا وہ تو چاہتا ہے کہ کوئی جانور اس کے سامنے آئے اور وہ اسے اپنی گولی کا نشانہ بنادے۔“

جب بگھی اچانک چلتے چلتے ایک جگہ رک گئی تو چارلس بگھی سے اترا اور بگھی کو کھینچنے والے گھوڑوں سے کہنے لگا ”کیا بات ہے کیوں رکے ہو؟“ یہ گھوڑے شاید انسانی زبان سمجھتے تھے جو چارلس کی بات سن کر ہنہنانے لگے۔ ”اچھا! تو تم لوگ تھک گئے ہو، چلو کچھ دیر آرام کرلو لیکن یاد رکھنا زیادہ دیر نہیں۔“ چارلس نے کہا اور پھر بگھی میں بیٹھ گیا۔

”چارلس کیوں رکے ہیں گھوڑے، یہاں تو چاروں طرف جنگل ہے، اور جنگلی جانوروں کا خطرہ بہت زیادہ ہے۔“ جوزف نے سوال کیا۔

”جوزف تم ٹھیک کہہ رہے ہو پر کیا کیا جائے گھوڑے تھک گئے ہیں۔ اور شکر کرو کہ بگھی چاروں طرف سے بند ہے ورنہ ہم لوگ سردی سے ہی مرجاتے،

باہر بہت سردی ہے اگر ہاتھ باہر نکالو تو خون جمتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔'' چارلس نے جواب دیا۔

''تم لوگ خواہ مخواہ ڈر رہے ہو مجھے جنگلی جانوروں سے کوئی خطرہ نہیں۔ میں انہیں ختم کرنا چاہتا ہوں۔'' ایڈی نے اپنی رائفل دکھاتے ہوئے کہا۔

''ایڈی تم ابھی بچے ہو، تم نے ابھی کچھ نہیں دیکھا، تم نے تو شیر کی دہاڑ تک نہیں سنی اگر کبھی سن لی تو خوف سے پینٹ گیلی ہوجائے گی۔'' چارلس نے کہا۔ اور ایڈرا سمیت سب لوگ ایڈی پر ہنسنے لگے۔

''چارلس اب اگر دوبارہ تم نے میرا مذاق اڑایا تو تمہیں شوٹ کردوں گا۔'' ایڈی نے چارلس پر بندوق تانتے ہوئے کہا۔

''او کے! او کے! نو فائٹنگ! ہم سب دوست ہیں، ایڈی ہمیں لڑنا نہیں چاہئے۔'' چارلس نے کہا۔

''مجھے لگتا ہے گھوڑوں نے اب تک کچھ نہ کچھ ریسٹ کرلیا ہوگا۔'' ایڈرا نے پہلی دفعہ بات کی۔

''ہاں میں دیکھتا ہوں انہیں'' ایڈی نے کہا اور بگھی سے باہر نکل آیا۔ ابھی ایڈی نے مشکل سے باہر نکلا ہی تھا کہ اچانک تیز ہوا چلنے لگی اور آہستہ آہستہ آندھی میں بدلنے لگی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہوا کافی تیز ہوگئی درخت بری طرح جھولنے لگے اور خشک پتے پتنگوں کی طرح اڑنے لگے، بگھی کی چھت اتنی زور سے ہل رہی تھی جیسے ابھی اڑ جائے گی اور پوری بگھی الٹ جائے گی۔

ایڈی ابھی حالات کو سمجھنے کی کوشش کررہا تھا کہ اچانک ہوا کا ایک جھونکا آیا اور ایڈی تین فٹ دور جا گرا، وہ برفانی زمین پر قلابازیاں کھا رہا تھا۔

جوزف اور چارلس بگھی کے اندر چلا رہے تھے۔ ''ایڈی بگھی میں آجاؤ..... بگھی میں آجاؤ، بہت بھیانک طوفان ہے باہر۔'' ایڈرا بھی چیخ رہی تھی لیکن ان کی آواز کا ایڈی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ہوا تھی کہ تیز ہوتی جارہی تھی۔ گھوڑے ہنہنا رہے تھے۔ اتنے میں ایڈی مشکل سے زمین پر رینگتا ہوا بگھی تک پہنچا اور ایڈرا کی مدد سے اندر داخل ہوگیا۔ ''یہ، یہ سب کیا ہے چارلس؟'' ایڈی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''ایڈی گھوڑوں کی لگامیں کھینچو یہ بہت بھیانک طوفان ہے اگر ہم اس کی زد میں آگئے تو بچ نہ سکیں گے۔'' چارلس نے کہا۔

ابھی وہ یہی باتیں کررہے تھے کہ اچانک انہیں دور سے کوئی آواز قریب آتی ہوئی سنائی دی۔ آواز لحمہ لحمہ قریب آرہی تھی۔ ''یہ..... یہ تو گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز ہے۔''

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز بالکل قریب آگئی تھی۔ ''جوزف تم نے یہ بات محسوس کی، اب ہوا بھی قدرے کم ہوگئی ہے۔'' چارلس نے کہا۔

''ہاں مجھے یہی بات پریشان کررہی ہے۔'' جوزف نے کہا۔

''آواز بہت قریب آگئی ہے ہم لوگ دیکھتے ہیں یہ ہے کون؟'' ایڈی نے کہا۔

''ہاں چلو'' چارلس نے کہا اور چاروں نے بگھی میں بنی ہوئی چھوٹی سی کھڑکی سے سر باہر نکال لئے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں دور سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی جو کافی صحت مند نظر آرہا تھا گھوڑے پر سوار ان کی طرف آرہا تھا۔ گھوڑا کافی تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اچانک اس آدمی کا سر دھڑ سے غائب ہوگیا لیکن گھوڑا اسی رفتار سے ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گھوڑے پر اس آدمی کا دھڑ موجود تھا جیسے ایک سر سمیت انسان بیٹھتا ہے۔

''ارے..... یہ..... یہ..... چارلس'' جوزف نے کہا۔

''یہ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔'' چارلس بولا۔

یہ منظر دیکھتے ہوئے ایڈرا کی چیخیں نکل گئیں۔ جبکہ ایڈی حیران کن آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔

جیسے ہی سر کٹا گھڑسوار ان کے قریب آیا، ان سب نے اپنے سر اندر کرلئے اور خوف سے کانپنے لگے۔ لیکن ایڈی نے اپنا سر بگھی کے اندر نہ کیا اور باہر نکال کر دیکھتا رہا۔ اتنے میں اچانک سر کٹے گھڑسوار نے ایک تلوار میان سے نکالی اور ایڈی کی گردن پر وار کردیا۔

خون کا فوارہ پھوٹ پڑا اور ایڈی کی گردن کٹ کر دور جا گری۔ لیکن سر کٹے قاتل نے پرواہ نہیں کی اس نے جلدی سے گھوڑے کو گھمایا اور تلوار کی نوک میں ایڈی کے سر کو پھنسا کر تیزی سے گھوڑا بھگاتا ہوا اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز دور تک جوزف اور چارلس کو سنائی دیتی رہی۔ ایڈرا خوف سے بے ہوش ہوچکی تھی۔ جبکہ جوزف اور چارلس بگھی کے اندر اس خونی منظر کو دیکھ کر خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔

اب ہوا تھم گئی تھی۔ پتے جو پہلے اڑ رہے تھے۔ اب اپنی جگہ پر ٹک گئے تھے۔ سب کچھ معمول پر آگیا تھا۔ اور ماحول بالکل پہلے کی طرح پرسکون ہوگیا تھا۔

☆☆☆☆

ایڈی جان کی آخری رسومات ادا ہورہی تھیں جب (C-B-I) انسپکٹر جارج کو لطے، گاؤں میں پہنچا۔ انسپکٹر جارج کو لطے کو اسپیشل برانچ سے خاص طور پر اس کیس کو حل کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ کیونکہ یہ پہلا قتل نہیں تھا جو اس طرح بے دردی سے ہوا تھا۔ بلکہ پانچواں قتل تھا جو ایک سر کٹا کررہا تھا۔ ایورسٹی نام کے اس گاؤں میں خوف وہراس پھیلا ہوا تھا۔

لوگ شام کے بعد اکثر گھروں سے نہیں نکلتے تھے۔ لیکن اگر کوئی بھول کر بھی نکل جاتا تو وہ واپس آئے گا یا نہیں اس بات کی گارنٹی نہیں ہوتی تھی۔ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اس سر کٹے کو دیکھا تھا جو معصوم اور بے گناہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا تھا۔ اور ان کی گردنیں کاٹ کر سر تلوار کی نوک میں پھنسا کر اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ اس معاملے کو حل کرنے کے لئے مقامی پولیس نے کئی کوششیں کیں لیکن ناکام رہی۔ اس لئے اب اسپیشل برانچ سے انسپکٹر جارج کو لطے کو بھیجا گیا تھا۔

انسپکٹر جارج نے مقتول ایڈی جان کی لاش پر سے کپڑا اٹھا کر دیکھا اور کافی دیر تک دیکھتا رہا پھر اس نے اپنے بیگ سے ایک کیمرہ نکال کر اس کی تصویر لی اور لاش پر کپڑا دوبارہ ڈال دیا۔

''تم میں سے کن لوگوں نے سر کٹے کو دیکھا ہے؟'' انسپکٹر نے ایڈی جان کی آخری رسومات میں آئے ہوئے چند لوگوں سے پوچھا۔

''انسپکٹر! گاؤں کے جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے ان میں سے زیادہ تر یہاں موجود ہیں۔ بس چند ایک ہیں جو یہاں نہیں آئے پر میں ان کو آپ سے ملوا دوں گا۔'' ایک بوڑھے شخص نے کہا۔ اس کا نام ٹام باطلے تھا۔ اور یہ ایورسٹی گاؤں کے بزرگ لوگوں میں سے تھا۔

''مسٹر ایڈی جان جن کا قتل ہوا ہے ان کے ساتھ جو اور لوگ بگھی میں تھے کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟'' انسپکٹر نے کہا۔

''جی ہاں! وہ تینوں یہاں موجود ہیں۔'' بوڑھے شخص نے چارلس، جوزف اور ایڈرا کی طرف اشارہ کیا جو ایک سائیڈ پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔

انسپکٹر جارج نے ان تینوں سے کچھ دیر سوالات کیے اور پھر بوڑھے سے کہا۔ ''اس گھڑسوار کا کھوج لگانے کے لئے مجھے یہیں رہنا ہوگا، آپ کے گاؤں میں، آپ اس طرح کریں کے میرے رہنے کا انتظام کردیں، اب میں یہیں رہوں گا۔''

''ٹھیک ہے میں شام تک انتظام کردوں گا، ابھی انسپکٹر صاحب آپ میرے ساتھ میرے گھر چل سکتے ہیں۔'' ٹام باطلے نے کہا۔

''انکل ٹام باطلے'' اچانک ایڈرا بول پڑی۔ ''میرے گھر میں دو تین کمرے فالتو ہیں۔ اور اب جان ایڈی تو رہا نہیں، مجھے بہت ڈر لگے گا، اگر انسپکٹر جارج میرے گھر میں رہنا پسند کریں تو مجھے خوشی ہوگی اور میرا ڈر بھی کم ہوجائے گا۔''

''انسپکٹر آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔؟'' بوڑھے ٹام باطلے نے کہا۔

''نہیں، مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ مجھے تو بس رہائش چاہئے، مجھے اور کوئی مطلب نہیں کسی سے؟'' انسپکٹر جارج نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''تو ٹھیک ہے آپ میرے ساتھ چلیں انسپکٹر۔'' ایڈرا نے انسپکٹر جارج سے کہا اور ایک طرف

چلنے لگی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے ڈیوٹ! یہ نیا انسپکٹر اس گھڑ سوار کا پتا لگا لے گا؟" ایڈرا اور انسپکٹر جان کے جانے کے بعد وہاں پر کھڑے ایک ادھیڑ عمر شخص نے ڈیوٹ سے کہا۔

"ہاں شاید کرے، لگتا تو کافی چالاک ہے۔"

"مجھے بالکل نہیں لگتا کہ یہ اس سر کٹے کا پتا چلا لے گا۔ آتے ہی لڑکی کے ساتھ چپک گیا ہے مجھے اس سے کوئی امید نہیں ہے؟" وہ ادھیڑ عمر شخص طنز کرتے ہوئے بولا۔

"چلو پتا لگ ہی جائے گا، فکر نہ کرو تم" ڈیوٹ نے جواب دیا اور پھر وہ دونوں وہاں سے ایک طرف کو چل نکلے۔

انسپکٹر جارج ایڈرا کے ساتھ چہل قدمی کر رہا تھا۔ وہ دونوں باتیں کرتے کرتے کافی دور جنگل کی طرف نکل آئے تھے۔ انسپکٹر کو ایورسٹی آئے ہوئے تقریباً ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ لیکن اس ایک ہفتے میں کوئی ایسا غیر معمولی واقعہ نہیں ہوا تھا جس سے اسے کوئی ایسا نقطہ ملتا جس سے اس سر کٹے کے بارے میں پتا لگایا جا سکتا تھا۔ انسپکٹر نے اس ایک ہفتے میں اپنے طور پر تمام کوششیں کیں اور آدھی، آدھی رات تک جنگل میں گھومتا رہا۔ شاید اسے وہ سر کٹا قاتل کہیں نظر آ جائے، لیکن اسے کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس نے گاؤں کے تمام لوگوں سے بھی معلومات حاصل کی تھیں۔

لوگوں کا کہنا تھا کہ "وہ سر کٹا قاتل جنگل کی طرف سے گھوڑا دوڑاتا ہوا آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار چمکیلی تلوار ہوتی ہے۔ وہ سر کاٹ کر دور پھینک دیتا ہے اس کے بعد تلوار کی نوک میں وہ کٹا ہوا سر پھنسا کر جنگل کی طرف گھوڑا دوڑاتے ہوئے غائب ہو جاتا ہے۔"

انسپکٹر اور ایڈرا کو ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ہفتہ ہو گیا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ دونوں ایک دوسرے سے کافی مانوس ہو گئے تھے۔ انسپکٹر تو بہت کم باتیں کرتا، لیکن ایڈرا بہت زیادہ بولتی اور انسپکٹر کو اپنے بارے میں بتاتی۔ اور اس کے بارے میں پوچھتی۔ اسے انسپکٹر اچھا لگنے لگا تھا۔ انسپکٹر بھی ایڈرا میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ لیکن اسے اپنے مشن کی فکر بھی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اس گھڑ سوار سر کٹے کو پکڑ کر اسے انجام تک پہنچا دے اور ایڈرا کو اپنے ساتھ لے جائے۔

"جارج، ہم کافی دور آ گئے ہیں۔ شام ہو رہی ہے، چلو واپس چلتے ہیں۔" ایڈرا نے کہا۔

"ارے تمہیں تو ڈر لگ رہا ہے۔ اور ابھی تو میرا دل کہہ رہا ہے کہ بہت آگے تک چلا جائے، جنگل کے بیچ تک۔" جارج نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں جارج! مجھے واقعی ڈر لگ رہا ہے آگے پھر کبھی چلیں گے۔" ایڈرا نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"فکر مت کرو، میں تمہارے ساتھ ہوں، تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے کیا۔"

"نہیں وہ بات نہیں......" ابھی ایڈرا نے جواب دیا ہی تھا کہ اچانک دور سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آنے لگی۔ آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھی۔

"جارج...... جارج بھاگو، یہاں سے...... وہی گھڑ سوار، وہی گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز۔" ایڈرا نے جیسے چیختے ہوئے کہا۔

"کیا...... کیا کہہ رہی ہو تم؟" جارج نے کہا۔

"جارج...... یہ وہی سر کٹا قاتل ہے مجھے بچاؤ ...... پلیز! چلو یہاں سے" ایڈرا نے شور مچایا۔

"ارے اگر وہ یہاں آ رہا ہے تو آنے دو، مجھے تو ویسے بھی اس کی تلاش تھی۔ آج میں اسے گرفتار کر لوں گا۔ یا پھر ختم کر دوں گا۔" جارج نے کہا۔

اتنے میں اچانک تیز ہوا چلنے لگی اور زمین پر پڑے ہوئے پتے اڑنے لگے درخت جھولنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے طوفان کا سماں بن گیا۔ گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز بالکل قریب آ گئی تھی۔

"جارج ...... وہ ...... وہ مار دے گا ہمیں، بھاگو...... بھاگو یہاں سے جلدی کرو۔" ایڈرا چلا چلا کر انسپکٹر جارج سے کہہ رہی تھی۔

"چپ کرو تم! مجھے اسے پکڑنا ہے۔ تم کو جانا ہے تو چلی جاؤ یہاں سے۔" انسپکٹر نے کہا۔ اتنے میں اچانک اسے درختوں کے جھنڈ میں سے ایک گھوڑا جس کا سفید رنگ تھا نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے اوپر ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا ہوا تھا۔ گھوڑا تیزی سے انسپکٹر کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک گھڑ سوار کا سر اپنے دھڑ سے جدا ہو گیا اور دور جا گرا۔ اس کے سر اور دھڑ دونوں سے خون فوارے کی طرح بہہ رہا تھا۔ لیکن حیرت کی بات تھی کہ دھڑ، سر کے بغیر گھوڑے پر موجود تھا۔

اچانک سر کٹے نے اپنی میان سے ایک تیز دار چمکیلی تلوار نکال لی۔ اور لہراتا ہوا انسپکٹر کی طرف بڑھا۔ اس دوران ایڈرا جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ سر کٹے نے جیسے ہی انسپکٹر کی گردن پر تلوار سے وار کیا۔ انسپکٹر جو پہلے سے ہوشیار تھا فوراً نیچے جھکا اور سر کٹے قاتل کا وار خالی چلا گیا۔ سر کٹے نے کچھ دور جا کر گھوڑے کو دوبارہ موڑا اور تیزی سے انسپکٹر کی طرف لپکا لیکن اس سے پہلے کہ وہ انسپکٹر جارج پر حملہ کرتا، انسپکٹر جارج نے اس پر گولی چلا دی اور یکے بعد دیگرے کئی فائر کر دیئے۔

سر کٹا دھڑام سے گھوڑے پر سے گر پڑا اور تڑپنے لگا جبکہ اس کا گھوڑا جنگل کی طرف بھاگ گیا۔

انسپکٹر سر کٹے کے قریب آیا اور اسے دیکھنے لگا۔ اس کا جسم سیاہ تھا۔ سر کے بال ایسے تھے جیسے کانٹے اگے ہوں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ صدیوں سے نہایا نہیں ہے اور جس کی وجہ سے اس کے جسم پر کالے دھبے اور دانے نکل آئے ہیں۔ اتنے میں ایڈرا بھی بھاگتی ہوئی انسپکٹر کے قریب آ گئی۔

"دیکھا، تم نے میں نے مار دیا اسے۔" انسپکٹر نے ایڈرا سے شوخی دکھاتے ہوئے کہا۔ ایڈرا گھور کر سر کٹے کے تڑپتے ہوئے جسم کو دیکھ رہی تھی کہ اچانک سر کٹے کے جسم میں پھرتی سی آ گئی اور وہ اٹھا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے انسپکٹر کا گلا دبانے لگا۔ انسپکٹر کو یہ توقع نہ تھی اس لئے وہ بے بسی سے ہاتھ پاؤں ہلا رہا تھا۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا اور سر کٹے کے بازو پکڑ کر خود کو چھڑانے لگا۔ لیکن سر کٹے میں بہت طاقت تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے اس کے بازو لوہے کے بنے ہوں۔ اپنی جگہ سے ہل ہی نہیں رہے تھے۔ پھر اچانک انسپکٹر جارج نے اپنی لات سر کٹے کے پیٹ میں ماری اور سر کٹے کے ہاتھوں سے انسپکٹر کا گلا چھوٹ گیا۔ اس دوران انسپکٹر نے اپنی پسٹل نکالی اور اس پر پے در پے فائر کر دیئے۔ ایک بار پھر سر کٹے کا جسم تڑپنے لگا اور آخر کار بالکل ساکت ہو گیا، لیکن اس سے پہلے کہ انسپکٹر کچھ سمجھتا۔

اچانک سر کٹے کے مردہ جسم کو آگ لگ گئی اور اتنی تیزی سے بھڑک اٹھی کہ انسپکٹر جارج کو چھلانگ لگا کر سات فٹ دور جانا پڑا ورنہ وہ بھی جل جاتا۔ کچھ دیر آگ یونہی جلنے کے بعد آہستہ آہستہ کم ہو گئی اور پھر بالکل ختم ہو گئی۔ اب وہاں صرف سر کٹے کی راکھ کے سوا کچھ نہ تھا۔

☆......☆......☆

برفانی پہاڑوں کے بیچ ایک بہت بڑا برگد کا درخت تھا۔ جو کہ مکمل طور پر برف سے ڈھکا ہوا تھا اور اس سے بڑی بڑی شاخیں زمین تک لٹکی ہوئی تھیں۔ درخت کا تنا اتنا موٹا تھا کہ ایک ہاتھی اس میں آسانی سے اندر داخل ہو سکتا تھا۔ اور رات گزارنے کے بعد باہر بھی نکل سکتا تھا۔

اچانک دور سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے قریب آ گئی۔ دوسرے ہی لمحے وہاں وہی سر کٹا گھڑ سوار موجود تھا۔ وہ اپنے گھوڑے سے اترا اور برگد کے موٹے تنے کے قریب آیا۔ کچھ دیر وہ یونہی موٹے تنے کی طرف دیکھتا رہا پھر میان سے اس نے اپنی تلوار نکالی اور برگد کے موٹے تنے پر آڑے ترچھے وار کرنے لگا۔ تلوار لگنے سے تنے کے اوپر کا کچھ حصہ کٹ گیا اور تنے سے انسانی خون بہنے لگا۔ خون اتنی تیزی سے بہہ رہا تھا جیسے اندر بہت سے انسان ہوں جن کو تلوار لگنے سے ان کا خون باہر آ رہا ہو۔ پھر اچانک تنا ایک گرجدار واز کے ساتھ پھٹ گیا اور خود بخود وسیع ہوتا گیا، اور ایک ہاتھی کے جتنا پھیل گیا۔ تنے کے اندر کا ماحول بہت بھیانک نظر آ رہا تھا۔ جگہ جگہ باہر کے جیسے

برگد کی شاخیں لٹکی ہوئی تھیں اور نیچے زمین پر کچھ انسانی کٹے ہوئے سر پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ سروں پر سے بال اور کھال ہٹ چکی تھی۔ جبکہ ایک دوسرا، ابھی تک بالوں سمیت تھے۔ شاید یہ وہی سر تھے جو سر کٹا حال ہی میں کاٹ کر لایا تھا۔ سر کٹا تنے کے اندر داخل ہوگیا اور پھر ایک طرف چلنے لگا۔

اچانک ایک جگہ پہنچ کر وہ جھک گیا اور پھر سجدے میں گر گیا وہاں ایک بہت بڑی پتھر کی مورتی تھی۔ جس کا رنگ سیاہ تھا اور اس نے منہ سے سرخ زبان باہر نکالی ہوئی تھی۔ سر کٹا اس کو ہی سجدہ کر رہا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد وہ اٹھا اور مورتی کے چرنوں کو چھو کر نڈھال قدموں سے باہر نکل آیا۔ وہ جیسے ہی باہر نکلا اچانک پہلے کے جیسے دھماکے کی آواز آئی اور برگد کا تنا آہستہ آہستہ پہلے کی طرح برابر ہوگیا۔

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس تنے کے اندر اتنی بڑی مورتی موجود ہے اور یہ سر کٹے کا مسکن ہے۔ اگلے ہی لمحے سر کٹا گھوڑے پر سوار ہوا اور جنگل میں غائب ہوگیا۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز کافی دیر تک وہاں سنائی دیتی رہی۔

رات گزر گئی اور دوسری صبح ایک جگہ گاؤں کے لوگ موجود تھے۔

"تم میں سے کم از کم دو آدمیوں کو میرے ساتھ رہنا ہوگا، میں نے اسے دیکھا ہے۔ اس کا زور عام انسانوں سے زیادہ ہے۔ میں اکیلا شاید اس کا مقابلہ نہ کر پاؤں، کوئی نہ کوئی میری مدد کرنے والا ہونا چاہئے۔" انسپکٹر جارج لوگوں سے کہہ رہا تھا۔ ایڈرا بھی اس کے ساتھ کھڑی تھی۔ انسپکٹر نے تمام واقعہ جو اس کے ساتھ رونما ہوا تھا، لوگوں کو سنا دیا۔ وہ سب پریشان تھے۔ اور اس آفت سے چھٹکارا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کا گاؤں بہت خوبصورت ہے۔ اور وہ اس کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں لیکن اس خونی مصیبت کی وجہ سے اب وہ گھروں سے باہر نکلتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔

انسپکٹر جارج کا کہنا تھا کہ "وہ سر کٹا گھڑ سوار کوئی انسان نہیں ہے، کیونکہ جب ایک انسان کا سر کٹ جائے پھر وہ زندہ رہے اور لوگوں کے سر کاٹتا پھرے" انسپکٹر نے پھر کہا "وہ کوئی بھٹکتی ہوئی روح ہے جسے چین نہیں مل رہا۔ اس کی اصل وجہ کیا ہے اسے نہیں معلوم لیکن یہ سچ ہے کہ وہ انسان نہیں ہے۔ اس لئے اس پر قابو پانے کے لئے اسے کم از کم دو آدمیوں کی ضرورت پڑے گی۔"

گاؤں کے تمام لوگ جو وہاں موجود تھے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ انسپکو کی مدد کے لئے کون کھڑا ہوتا ہے۔ لیکن کوئی بھی کھڑا نہ ہوا تو ایک بار پھر انسپکٹر بولا۔ "دیکھو تم لوگوں کو ہمت کرنی ہوگی ورنہ ہم اس سے جان نہیں چھڑا سکتے۔"

مشکل سے ایک آدمی اٹھا جس کا نام فرانک تھا۔ وہ کہنے لگا۔ "انسپکٹر میں ہر قسم کے خطرے کے لئے تیار ہوں آج سے میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

"لیکن مجھے ایک اور آدمی کی بھی ضرورت ہے مسٹر فرانک۔" انسپکٹر نے کہا۔

"وہ میرا دوست ٹونی ہے ناں وہ بھی میرے ساتھ ہوگا۔" فرانک نے ایک پتلے جسامت والے شخص کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں......نہیں......فف......فرانک میں نہیں ہوں تمہارے ساتھ۔" ٹونی نے ڈرتے ہوئے کہا۔

لیکن فرانک نے آگے بڑھ کر اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ "کم آن ٹونی کچھ نہیں ہوگا میں بھی تو تمہارے ساتھ ہوں، کم آن ہمت کرو۔"

بدلے میں ٹونی خاموش رہا لیکن وہ اندر سے بہت ڈرا ہوا تھا۔

"آپ لوگوں ! سے میری ایک گذارش ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"وہ سر کٹا گھڑ سوار اکثر شام یا رات کو ہی نمودار ہوتا ہے، یعنی کہ اندھیرے میں حملہ کرتا ہے دن کی روشنی میں نہیں، تو آپ لوگ دن کو جہاں بھی جائیں گھومتے پھرتے رہیں لیکن شام ہوتے ہی گھروں کو آجائیں اور پھر باہر نہ نکلیں تاکہ آپ سر کٹے سے محفوظ رہیں، باقی ہم

کوشش کریں گے کہ اس کو جلد سے جلد ختم کردیں، وہ ایک روح ہے، اسے پکڑا نہیں جاسکتا لیکن ختم کیا جاسکتا ہے، آپ لوگ ہم پر بھروسہ رکھیں اور گھبرائیں نہیں ہم اسے بہت جلد ختم کردیں گے۔"

انسپکٹر کی تقریر سن کر کچھ لوگ مطمئن ہوگئے تھے لیکن کچھ ابھی بھی خوفزدہ تھے۔ جب تمام لوگ چلے گئے اور صرف انسپکٹر، ایڈرا فرانک اور اس کا دوست ٹونی رہ گئے تو انسپکٹر نے فرانک سے کہا۔ "تم لوگ اپنا اپنا سامان ایڈرا کے گھر لے آؤ ہم وہیں رہیں گے، اور ہاں اپنے حفاظتی ہتھیار ساتھ لانا مت بھولنا ہمیں ان کی ضرورت پڑے گی۔"

"ٹھیک ہے" فرانک نے کہا۔ اور ٹونی کو لے کر ایک سمت چل پڑا۔

"کیا تمہیں یقین ہے جارج کے تم اس روح کو ختم کردو گے؟"

فرانک اور ٹونی کے جانے کے بعد ایڈرا نے انسپکٹر سے سوال کیا۔

"ہاں! میں کوشش کرکے دیکھوں گا کہ اسے ماردوں، لیکن اس کو مارنے کے لئے مجھے کوئی اور طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔" انسپکٹر نے جواب دیا۔

"کیا طریقہ؟" ایڈرا نے سوالیہ نظروں سے جارج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایڈرا ڈیئر وہ ایک روح ہے۔ اور روح کو اس طرح ایک انسان کی طرح ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے پاس انسان سے زیادہ طاقتیں ہوتی ہیں۔ اس لئے اس پر قابو پانے کے لئے بھی ایسی ہی طاقتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"تو تم کہاں سے لاؤ گے ایسی طاقت۔" ایڈرا نے پوچھا۔

"اس کا بندوبست بھی میں کرلونگا۔" انسپکٹر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

☆☆☆☆

"کل رات اس سر کٹے نے ایک اور بے گناہ آدمی کا سر کاٹ دیا، یہ ہمارے لئے بہت فکر کی بات ہے۔ اگر یہی حال رہا تو ایک ایک کرکے گاؤں کے تمام لوگوں کی گردنیں کاٹ دے گا وہ اور ہم کچھ نہیں کرسکیں گے۔" ٹام باقلے اونچی آواز میں گاؤں والوں کے سامنے کہہ رہا تھا۔ انسپکٹر بھی وہیں موجود تھا۔ اور خاصا پریشان نظر آرہا تھا۔ ایڈرا بھی اس کے ساتھ گم صم کھڑی تھی۔ جبکہ فرانک، اور ٹونی بھی موجود تھے۔

"آپ لوگوں سے میری ایک گزارش ہے۔" انسپکٹر نے کافی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ انسپکٹر کی بات سن کر لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ وہ ایک روح ہے۔ اگر وہ روح نہ ہوتی تو جب میں نے اس پر گولیاں چلا کر اسے مار دیا تھا تو وہ دوبارہ نہ اٹھتی اور نہ ہی اس کے جسم کو اچانک آگ لگتی۔ وہ ایک بد روح ہے۔ اور اس کے ان حملوں سے لگتا ہے کہ وہ آپ لوگوں سے کوئی بڑا انتقام لے رہی ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"کیسا انتقام انسپکٹر، ہم لوگوں نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟ ہم لوگ تو اسے جانتے بھی نہیں، نہ ہی ہمارا اس سے کوئی واسطہ پڑا ہے؟" بوڑھے ٹام نے انسپکٹر سے سوال کیا۔

"اوہ مسٹر ٹام" میں یہ نہیں جانتا کہ اس کی آپ لوگوں سے کیا دشمنی ہے۔ اور وہ آپ سب سے کس بات کا انتقام لینا چاہتا ہے۔ میں تو یہ بات اندازاً کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ جس طرح وہ آپ کے گاؤں کے لوگوں کے سر کاٹ رہا ہے۔ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ آپ سے کوئی انتقام لے رہا ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"لیکن انسپکٹر! ایک بات میری بلکہ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آرہی۔" ٹام باقلے نے کہا۔

"کونسی بات؟" انسپکٹر نے حیران لہجے میں کہا۔

"وہ جب بھی کسی کا سر کاٹتا ہے تو اپنے ساتھ وہ سر لے جاتا ہے۔ اور اب تک جتنی بھی لاشیں ملی ہیں۔ ان کے دھڑ تو موجود تھے لیکن سر غائب تھے۔' ٹام باقلے نے بتایا۔

''یہی بات تو مجھے پریشان کر رہی ہے ٹام، اس سے لگتا ہے جیسے یہ کوئی اہم راز ہے جس کو معلوم کرنا کافی مشکل ہے۔ لیکن ناممکن نہیں بہرحال آپ لوگ فکر مت کریں یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ وہ جنگل کی طرف سے آتا ہے۔ اور اسی طرف جا کر غائب ہو جاتا ہے۔ اس لئے اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم اس کے پیچھے جنگل میں جائیں گے۔ اسے تلاش کریں گے۔ اور اسے ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔ آپ لوگ ہم پر بھروسہ کریں، اور اپنے اپنے گھروں سے شام کے بعد نہ نکلا کریں۔'' انسپکٹر نے ٹام ہا فلے اور گاؤں والوں کو سمجھاتے ہوئے کہا اس کے بعد لوگوں نے چند اور باتیں کہیں اور پھر آہستہ آہستہ وہ وہاں سے جانے لگے۔ آخر کار کچھ دیر بعد انسپکٹر اور اس کے ساتھی بھی اپنی رہائش کی طرف چل پڑے۔

☆......☆......☆

ایورسٹی گاؤں کے اس گھنے اور برفانی جنگل میں ایک جگہ برف سے ڈھکے ہوئے نالے کے قریب دو خیمے نصب تھے۔ دونوں خیموں کے اردگرد خاردار تار سے باڑ لگی ہوئی تھی، یہ خیمے انسپکٹر جارج، ایڈرا، مسٹر فرانک، اور اس کے دوست ٹونی کے تھے۔ وہ پچھلے ایک ہفتے سے یہاں ڈیرا لگائے ہوئے تھے۔ کھانے پینے کے سامان، گرم لباس، اور حفاظتی ہتھیاروں سے لیس ہو کر وہ یہاں سر کٹے قاتل کی تلاش میں موجود تھے۔ انسپکٹر اور ایڈرا کا خیمہ الگ تھا جبکہ فرانک اور ٹونی ایک ہی خیمے میں تھے۔

ان کا یہ معمول تھا کہ صبح ہوتے ہی سر کٹے قاتل کی تلاش میں جنگل میں نکل پڑتے۔ اور پھر شام سے کچھ دیر بعد اپنے خیموں میں واپس آ جاتے۔ اس ایک ہفتے میں انہوں نے پوری کوشش کی کہ وہ سر کٹے کو ڈھونڈ نکالیں لیکن انہیں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

ایک صبح انسپکٹر، ایڈرا، فرانک جنگل کی طرف نکلنے لگے۔ تو ٹونی نے جانے سے انکار کر دیا، کیونکہ اس کی طبیعت خراب تھی۔ اور جب شام کے وقت انسپکٹر ایڈرا اور فرانک خیموں کے قریب پہنچے تو انہیں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ ''انسپکٹر لگتا ہے وہ آ رہا ہے، آواز سنو۔'' فرانک نے آواز کی سمت انسپکٹر کی توجہ دلاتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر آواز کی سمت غور کرنے کے بعد انسپکٹر بولا۔ ''وہ آ نہیں رہا بلکہ جا رہا ہے۔ آواز آہستہ آہستہ دور جا رہی ہے چلو جلدی کرو کہیں اس نے ٹونی کو......'' انسپکٹر نے خیموں کی طرف دوڑتے ہوئے کہا۔ وہ تینوں تقریباً بھاگتے ہوئے خیموں تک پہنچے۔ لیکن انہیں ایک زوردار جھٹکا لگا، بے اختیار ان کے چہرے پیلے پڑ گئے۔ کیونکہ وہی ہوا تھا جس کا ڈر تھا۔ ٹونی اپنے خیمے سے کچھ فاصلے پر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس کا سر غائب تھا۔ سر کٹے نے ٹونی کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اور اس کا سر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ٹونی کی گردن سے نکلتا ہوا خون برفانی زمین میں جذب ہو رہا تھا۔

''اوہ مائی فرینڈ۔'' فرانک نے کہا۔ فرانک بہت رویا اس واقعے پر لیکن انسپکٹر نے اسے خاموش کرا دیا۔

''اب اس منحوس روح کا ختم ہونا ضروری ہے۔ اب مجھے پتہ چل گیا ہے کہ اس کو عام آدمی کی طرح ختم نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے اس کے لئے فادر سے ملنا ہوگا، وہی کچھ بتائیں گے، تم لوگوں کو تین دن یہیں رکنا ہوگا، میں شہر جاؤں گا اور فادر سے اس بارے میں معلوم کروں گا۔''

''جارج مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو، مجھے یہاں بہت ڈر لگے گا، میں اس جگہ نہیں رہ سکتی وہ سر کٹا مجھے مار دے گا۔'' ایڈرا نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''ہاں انسپکٹر! اس طرح تو ہم لوگ اس کا شکار ہو جائیں گے، ہمیں واپس گاؤں چلنا چاہیے۔'' فرانک نے بھی ایڈرا کی سائیڈ لی۔

''اگر تم لوگ گاؤں واپس چلو گے تو گاؤں والے ہم سب کو بزدل سمجھیں گے جو کہ مجھے بالکل پسند نہیں، میں خود بھی گاؤں والوں سے چھپ کر شہر جاؤں گا۔ آگے تمہاری مرضی۔'' انسپکٹر نے کہا۔ اور تیزی سے ایک طرف چل پڑا۔ ایڈرا اور فرانک اسے دور تک جاتا دیکھتے رہے۔ جب انسپکٹر ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ

دونوں خیمے میں داخل ہو گئے۔ شاید انہوں نے انسپکٹر کی بات ماننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

تیسرے دن انسپکٹر جارج کی واپسی ہوئی۔ جب وہ شام کے وقت خیموں کے قریب پہنچا تو وہاں مکمل خاموشی تھی۔ ''ایڈرا، ڈیئر، میں آ گیا ہوں۔ تم کہاں ہو؟ فرانک تم کہاں ہو میں آ گیا ہوں؟'' انسپکٹر نے ان دونوں کو آوازیں دیں لیکن بدلے میں کوئی آواز یا جواب نہ آیا بلکہ مکمل خاموشی رہی۔ انسپکٹر فرانک کے خیمے میں داخل ہوا لیکن وہ خالی تھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ اسے فکر لاحق ہوئی تو وہ تیزی سے اپنے اور ایڈرا کے خیمے کی طرف دوڑا لیکن وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ وہ خیموں کے اردگرد ڈھونڈتا اور چلاتا رہا لیکن فرانک اور ایڈرا کہیں نہ تھے۔ آخر تھک ہار کر انسپکٹر ایک موٹی لکڑی پر بیٹھ گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ اس کے ذہن میں کئی خدشات وخیالات امنڈ رہے تھے کہ اچانک اسے اپنے پیچھے کھسر پھسر کی آوازیں آئیں۔ اس نے جیسے ہی مڑ کر دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔

وہ سر کٹا اب اپنے سر سمیت تھا۔ اپنے گھوڑے کے ساتھ کھڑا تھا۔ اور ایڈرا بھی اس کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ اس سے ایسی باتیں کر رہی تھی جیسے وہ اس کا محبوب ہو۔ ایک اور کالے رنگ کا گھوڑا بھی سر کٹے کے گھوڑے کے ساتھ موجود تھا۔ شاید وہ ایڈرا کا گھوڑا تھا۔

جب انسپکٹر جارج کے حواس کچھ درست ہوئے تو اس نے چیخ کر کہا۔ ''ایڈرا، تم کیا کر رہی ہو اس کے ساتھ، یہ مار دے گا تمہیں ادھر آؤ۔'' لیکن ایڈرا پر انسپکٹر کی باتوں کا کچھ اثر نہ ہوا کیونکہ وہ حیرانی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اور سر کٹے سے باتیں کر رہی تھی۔ البتہ سر کٹے نے گھور کر انسپکٹر کی جانب دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ ایڈرا کا نام مت لو۔ ''ایڈرا میری بات سنو۔'' انسپکٹر چیخا لیکن ایڈرا کو اس بات کا کچھ اثر نہ ہوا۔ انسپکٹر عجیب کشمکش و پیچ میں تھا۔ اور حالات کو سمجھنے کی کوششیں کر رہا تھا کہ اچانک سر کٹے کی رعب دار گونجتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''انسپکٹر میرا پیچھا چھوڑ دے...... تو مجھے نہیں ختم کر سکتا، اور ترے دوست فرانک کو بھی میں نے مار دیا۔ بہت مزاحمت کی تھی اس نے لیکن میں نے اس کا سر کاٹ دیا، اب تیری اس محبوبہ کو بھی میں...... تو گھبرا مت اسے میں نہیں ماروں گا، میں نے اس کا ذہن تبدیل کر دیا ہے، اب یہ مجھے اپنا عاشق سمجھتی ہے۔ اور واقعی میں اس خوبصورت پری پر عاشق ہو گیا ہوں۔ میں اسے اپنے ساتھ اپنی دنیا میں لے جاؤنگا۔ اور تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور اگر تو میرے راستے میں آیا تو مسل کر رکھ دونگا تجھے۔ تو نے مجھے زخم دیئے تھے۔ ان کا بدلہ میں نے تیری محبوبہ کو اپنا کر لے لیا ہے۔ جا، اب دفعہ ہو جا، یہاں سے، تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تجھے میری شکتیوں کا اندازہ نہیں ہے۔''

انسپکٹر تمام صورت حال سمجھ گیا تھا۔ سر کٹا ایک بد روح تھی۔ اس نے ایڈرا کا ذہن قابو میں کر کے اسے اپنا غلام بنا لیا تھا۔ اور اب انسپکٹر کی باتیں ایڈرا کو نہیں سنائی دے رہی تھیں۔ کیونکہ وہ ادھر ادھر حیرانگی سے دیکھ رہی تھی۔ یہ سب سر کٹے کی شکتیوں کی وجہ سے ہوا تھا۔

''میں نے بھی تیرا بندوبست کر لیا ہے۔ یہ دیکھ مرے گلے میں فادر کی دی ہوئی چین لٹک رہی ہے یہ کوئی عام چین نہیں ہے۔ اس میں یہ طاقت ہے کہ تیری کوئی بھی طاقت، تیرا کوئی بھی وار مجھ پر اثر نہیں کرے گا، اور تو زیادہ دیر مجھ سے بھاگ نہیں سکے گا، اور میں تجھے فنا کر کے رکھ دوں گا۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''نہیں...... یہ نہیں ہو سکتا۔'' سر کٹے نے خود سے کہا، اگلے ہی لمحے سر کٹا گھوڑے پر چھلانگ لگا کر سوار ہوا اور پھر وہی منظر رونما ہوا۔ اچانک سر کٹے کا سر کٹ گیا اور وہ گھوڑا دوڑاتے ہوئے انسپکٹر کی جانب بڑھا تو انسپکٹر نے اپنی پستول نکال کر ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لی اور سر کٹے کو گھورنے لگا، سر کٹے نے تلوار نکالی اور انسپکٹر کی گردن پر زوردار وار کیا، لیکن تلوار انسپکٹر کی گردن میں سے ایسے گزر گئی جیسے ہوا میں سے گزر گئی ہو۔ سر کٹے نے گھوڑے کا رخ موڑا اور انسپکٹر پر دوسرے حملے کے لئے تیار ہوا،

لیکن انسپکٹر نے اس پر پے در پے فائر کھول دیئے۔ سر کٹا دھڑام سے گھوڑے سے گر پڑا، اور تڑپنے لگا۔ اس دوران انسپکٹر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا، اس کا بڑبڑانا تھا کہ سر کٹے کا جسم تڑپنے لگا لیکن اچانک وہ پھرتی سے اٹھا اور گھوڑے پہ بیٹھ کر بھاگنے لگا۔

اس دوران ایڈرا جیسے ہوش میں آ گئی تھی۔ وہ حیرانی سے یہ سب منظر دیکھ رہی تھی۔ اور کافی خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔

انسپکٹر سر کٹے کے بھاگتے ہی تیزی سے ایڈرا کے ساتھ کھڑے دوسرے گھوڑے کی جانب بھاگا اور چھلانگ لگا کر گھوڑے پر سوار ہوا، دوسرے ہی لمحے اس کا گھوڑا ہواؤں سے باتیں کر رہا تھا اور سر کٹے کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے تھا۔

سر کٹا اپنے گھوڑے پر آگے اور انسپکٹر جارج کا گھوڑا اس کے پیچھے، اور آخر کار پھر ایک جگہ سر کٹے کا گھوڑا رک گیا، اس سے پہلے کہ سر کٹا کچھ کرتا انسپکٹر کا گھوڑا بھی اس کے پیچھے آ کر رک گیا۔ ”تو مجھ سے نہیں بچ سکتا سر کٹا، میں تجھے مار دونگا۔“ انسپکٹر نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے کہا۔

”تم مجھے کیوں مارنا چاہتے ہو؟“ سر کٹے نے کہا۔

”اس لئے کہ تم نے کئی بے گناہ لوگوں کا خون کیا ہے۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”ہاں...... ہاں میں مانتا ہوں کہ میں نے کئی لوگوں کو مارا ہے، ان کا خون کیا ہے لیکن تم یہ نہیں پوچھو گے کہ کیوں...... کیوں میں نے ایسا کیا؟“ سر کٹے نے کہا۔

انسپکٹر کچھ دیر خاموش رہا پھر گھوڑے سے اترا اور سر کٹے کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔ ”بتاؤ کیوں؟“

”اس کے لئے تمہیں میری کہانی سننی ہوگی، بولو سنو گے میری کہانی؟“ سر کٹے کی آواز آئی۔

”ہاں سنو گا، تمہاری آپ بیتی سناؤ۔“ انسپکٹر نے کہا۔ انسپکٹر کی بات سن کر سر کٹا گھوڑے سے اترا، اور زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ پھر وہ گویا ہوا۔

”کبھی میں بھی تمہاری طرح ایک انسان تھا۔ اور اسی گاؤں میں جہاں آج یہ لوگ آباد ہیں، میں اپنی بیٹی جولی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس وقت یہ لوگ تو موجود نہ تھے، لیکن ان کے آباؤ اجداد موجود تھے۔ انہی میں سے ایک گاؤں کا سردار مائیکل تھا۔ جس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس نے اولاد کی خاطر کئی شادیاں کیں، لیکن اسے اولاد نصیب نہ ہوئی۔ آخر کار کئی سال بعد ایک دن گاڈ نے اسے ایک بیٹی سے نوازا، لیکن سردار مائیکل کی بدقسمتی کہ اس کی بیٹی اندھی پیدا ہوئی، لیکن سردار پھر بھی بہت خوش ہوا، اس نے اپنی بیٹی کا بہت علاج کروایا، بڑے بڑے معالجوں سے رابطہ کیا، لیکن اس کی بیٹی کو افاقہ نہ ہوا، وقت گزرتا رہا، سردار کی بیٹی ”جین“ تھی اندھی لیکن دولت اور آسائش کی وجہ سے جلد نشو نما پاتی گئی اور کافی بڑی ہو گئی، اس وقت اس کی عمر سات سال تھی اور میری بیٹی ”جولی“ کی عمر آٹھ سال۔ جب شمالی افریقہ کے ایک سادھو نے مائیکل کو مشورہ دیا کہ ”تم جولی یعنی میری بیٹی کی آنکھیں نکال کر اپنی بیٹی یعنی جین کو دے دو، کیونکہ ایسا کرنے سے جین بالکل ٹھیک ہو جائے گی اور ہمیشہ کے لئے دیکھ سکے گی۔“ سادھو نے جین کا ہاتھ دیکھ کر بتایا تھا۔ سادھو کے مطابق ایسا جین کی قسمت میں لکھا تھا۔

”نہیں، میں ایسا نہیں ہونے دوں گا، یہ زیادتی ہے جین اندھی پیدا ہوئی اس میں میری بیٹی کا کیا قصور۔“ میں نے چیختے ہوئے مائیکل سے کہا وہ میری بیٹی کو ساتھ لے جانے آیا تھا، تاکہ اس کی آنکھیں نکال کر جین کو دے سکے، لیکن میری بات کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا، میں نے بہت منتیں کیں، گڑگڑایا، رویا لیکن وہ اپنی بیٹی کے پیار میں اندھا ہو گیا تھا۔ اور پھر میں اسے نہ روک سکا، کیونکہ وہ گاؤں کا سردار تھا۔

لوگوں نے بھی اس کی بات مانی اور مجھے میرے ہی گھر میں باندھ دیا، لیکن میں نے جوں توں کر کے خود کو چھڑایا اور مائیکل کے گھر پہنچا جہاں وہ میری بیٹی کی آنکھیں نکالنے والا تھا، لیکن اس کے پہرے داروں نے تلواروں سے میرا سر کاٹ کر دور پھینک دیا۔ اور میرے

دھڑ کو جنگل میں پھینک دیا، بعد میں گاؤں کے لوگوں نے عیسائی مذہب کے مطابق میری تدفین کی، لیکن انہوں نے صرف میرے دھڑ کو ہی دفنایا کیونکہ ظالم پہرے داروں نے میرا سر کاٹ کر کہیں دور پھینک دیا تھا جو گاؤں کے لوگوں کو نہ ملا اور انہوں نے زیادہ زحمت بھی نہیں کی ڈھونڈنے کی۔

سردار مائیکل کی بیٹی ٹھیک ہو گئی تھی، کیونکہ اسے میری بیٹی کی آنکھیں لگا دی گئی تھیں۔ میری بیٹی بعد میں ٹھوکریں کھاتے کھاتے مر گئی اور پورے چار دن اس کی لاش ویرانے میں سڑتی رہی، بعد میں گاؤں والوں نے رحم کھا کر اس کو بھی دفنا دیا۔

مجھے مرے ہوئے اسی سال سے زیادہ گزر گئے لیکن میری روح بھٹکتی رہی اسے کہیں بھی چین نہ ملا میری روح اپنا سر ڈھونڈتی رہی، تاکہ اسے اپنے دھڑ سے لگا کر رکھ لے اور چین ملے لیکن میرا سر مجھے کہیں نہیں ملا۔

آخر کار ایک رات میری ملاقات ایک ہندو سادھو سے ہوئی، میں نے اس کا ایک کام کیا، جس کے بدلے میں اس نے مجھے ایک عمل بتایا کہ میں اگر چالیس آدمیوں کے سر کاٹ کر کالی کی مورتی کے آگے جمع کروں تو کالی مجھ سے بہت خوش ہوگی، اور مجھے ایسی شکتیاں دے گی جن سے میں اپنا کٹا ہوا سر ڈھونڈ لونگا، تب سے میں نے کالی کی پوجا شروع کر دی اور اس گاؤں میں بسے ہوئے لوگوں کے سر کاٹ کاٹ کر یہاں لانے لگا، میں نے ان معصوم لوگوں کا خون اس لئے کیا کہ اگر اس وقت یہ گاؤں والے سردار کو میری بیٹی کی آنکھوں نکالنے سے روکتے اور اس کے خلاف ہو جاتے تو آج میری یہ حالت نہ ہوتی، بس یہی ہے میری کہانی، اسی بات کی وجہ سے میں ان لوگوں سے انتقام لے رہا ہوں کیونکہ انہی کی وجہ سے میں برباد ہوا ہوں۔“

”بہت دکھ ہوا مجھے تمہاری کہانی سن کر، واقعی تمہارے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔ لیکن، اب جو تم کر رہے ہو وہ بہت غلط ہے۔ یہ وہ لوگ تو نہیں ہیں جنہوں نے تمہارے ساتھ ظلم کیا تھا۔ یہ تو معصوم اور بے گناہ لوگ ہیں۔“ انسپکٹر نے کہا۔

سر کٹے نے کہا۔ ”میں بالکل ٹھیک کر رہا ہوں، انسپکٹر یہ وہ لوگ بے شک نہیں ہیں جنہوں نے میرا ساتھ نہیں دیا اور مجھ پر ظلم کیا لیکن ان ظالم لوگوں کی نسل تو ہیں اور میں ان سے بدلہ لے رہا ہوں، ان کے سر کاٹ کاٹ کر اپنا عمل پورا کرونگا، اب تک میں نے ستائیس سر جمع کر لئے ہیں۔“

”تو کیا تم نے ان کے علاوہ اور بھی قتل کیے ہیں؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”ہاں انسپکٹر! میں نے پہلے یہاں سے کچھ دور ایک قصبے میں جا کے لوگوں کو قتل کیا، اور اس کے علاوہ کوئی بھولا بھٹکا مسافر اگر اس جنگل سے گزرے اور میرے ہتھے چڑھ جائے تو وہ مجھ سے نہیں بچتا۔ میں تمہارا ابھی سر کاٹ کر لے جاتا، لیکن تم نے یہ چین پہنی ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے میرا کوئی بھی وار تم پر اثر نہیں کرتا، لیکن تم کب تک اسے پہن کر رکھو گے، کبھی تو اتارو گے، میں اس وقت تمہیں زیادہ موقع نہیں دونگا۔“ سر کٹے نے کہا۔

”تم کیا سمجھتے ہو میں تمہیں زیادہ دیر تک زندہ رہنے دونگا، میں تمہیں ختم کر دونگا، تم سمجھتے ہو کہ مجھے فادر نے صرف یہ چین دی ہے اپنی حفاظت کے لئے...... فادر نے تمہاری ساری کہانی جو تم نے مجھ سے بیان کی ہے پہلے ہی بتا دی تھی۔ اور تمہیں ختم کرنے کا طریقہ بھی، تم جس سر کو تلاش کرنے کے لئے اتنے بے گناہ لوگوں کو قتل کر رہے ہو۔ مجھے فادر نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ سر کہاں ہے؟ اور اسی سر کے ذریعے میں نے تمہارا خاتمہ کرنا ہے۔ میں تمہیں مزید بے گناہ لوگوں پر اور ظلم نہیں کرنے دونگا، میں تمہیں ختم کر دونگا۔“ انسپکٹر نے غصے سے کہا۔

”انسپکٹر۔“ سر کٹے نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ”کیا...... تم سچ کہہ رہے ہو کیا تمہیں معلوم ہے کے میرا سر کہاں ہے؟“

”مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟“ انسپکٹر نے کہا۔

"انسپکٹر اگر واقعی ایسا ہے تو تم مجھے وہ سر دے دو تا کہ میری روح کو سکون مل جائے، پھر میں کسی بے گناہ کا قتل نہیں کرونگا، میں ہمیشہ کے لئے چلا جاؤنگا۔" سر کٹے نے التجاء کی۔

"لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تم واقعی کسی بے گناہ کا قتل نہیں کرو گے، اور یہاں سے چلے جاؤ گے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں انسپکٹر، میں پھر کبھی کسی بے گناہ کا خون نہیں کرونگا، ہمیشہ کے لئے چلا جاؤنگا یہاں سے...... میرا یقین کرو، میں یہ سب کچھ اسی لئے تو کر رہا ہوں کہ میری روح کو سکون ملے۔" سر کٹے نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے، آؤ میرے ساتھ جلدی کرو۔" انسپکٹر نے اپنے گھوڑے پر چھلانگ مار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ سر کٹا بھی پھرتی سے اٹھا اور اپنے گھوڑے پر بیٹھ گیا، دوسرے ہی لمحے ان کے گھوڑے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ تقریباً نصف گھنٹے کے سفر کے بعد وہ ایک بڑے درخت کے قریب پہنچے یہ برگد کا پرانا درخت تھا، انسپکٹر گھوڑے سے تیزی سے اترا اور درخت کے تنے کے قریب جانے لگا۔

"ارے یہ تو وہی درخت ہے جہاں میں نے اپنے لائے ہوئے سر جمع کئے ہیں یہاں تو کالی کی مورتی ہے۔" سر کٹے نے خود سے کہا۔

انسپکٹر تنے کے قریب پہنچ کر عجیب زبان میں کچھ پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس نے تنے کی طرف پھونک ماری تو اچانک پورا درخت ہلنے لگا، دوسرے ہی لمحے درخت کا موٹا تنا پھٹ گیا اور اس میں سے بے شمار کھوپڑیاں باہر نکلنے لگیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اندر کوئی طوفان آ گیا ہو جس کی وجہ سے کھوپڑیاں باہر نکل رہی ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں کھوپڑیاں نکلنا بند ہو گئیں۔ اور درخت ہلنا بند ہو گیا۔

انسپکٹر نے پھر کچھ عجیب زبان میں پڑھا اور درخت کی طرف پھونک ماری، درخت ایک دفعہ پھر زور دار آواز کے ساتھ ہلنے لگا، جیسے کوئی زلزلہ اور طوفان آ گیا ہو۔ اگلے ہی لمحے برگد سے نیچے کی طرف لٹکی ہوئی شاخوں پر بے شمار کھوپڑیاں نمودار ہوئیں۔ یہ کھوپڑیاں انسانی تھیں اور شاخوں سے لٹکی ہوئی تھیں۔ درخت کے ہلنے کی وجہ سے تمام لٹکی ہوئی کھوپڑیاں عجیب پراسرار انداز میں ہل رہی تھیں۔

"جلدی کرو سر کٹے، پہچانو اپنے سر کو، ان کھوپڑیوں میں ایک تمہارا بھی سر ہے، جلدی کرو اور اپنے سر کو اپنے ہاتھوں میں لے لو۔" انسپکٹر نے چیختے ہوئے کہا۔

"ہاں...... ہاں......" سر کٹے نے کہا۔ اور دوسرے ہی لمحے وہ چھلانگ لگا کر بے شمار شاخوں میں سے ایک شاخ پر جھپٹ پڑا، اس نے اپنا سر شاید پہلے ہی سے پہچان لیا تھا۔ اس نے کھوپڑی کھینچ کر شاخ سے علیحدہ کی، ابھی وہ زمین پر اترا تھا کہ اچانک ایک گرجدار آواز آئی اور سر کٹا غائب ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہلکا ہلکا دھواں چھا گیا اور دھوئیں میں سر کٹا ایک بار پھر نمودار ہوا۔ لیکن اس بار وہ اپنے سر سمیت ایک ڈھانچے کی صورت میں تھا۔ "تمہارا بہت شکریہ انسپکٹر میری روح کو سکون مل گیا۔ تم نے میری بہت بڑی مشکل آسان کر دی، میں تمہارا احسان اگلے جنم تک یاد رکھوں گا، اب مجھے اجازت دو، میں پھر کبھی واپس نہیں آؤنگا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے ہلکے ہلکے دھوئیں میں انسپکٹر جارج کو ہاتھ سے الوداعیہ اشارہ کیا اور آہستہ آہستہ دھوئیں کے ساتھ غائب ہو گیا۔ اب وہاں جنگل اور جھاڑیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سر کٹا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا تھا۔ برگد کا درخت بالکل پہلے کی طرح ہو گیا تھا۔

"اوہ گاڈ! شکر ہے کہ میں کامیاب ہوا۔" انسپکٹر جارج نے خود سے کہا۔ دوسرے ہی لمحے وہ گھوڑے پر بیٹھا اور خیموں کی طرف چلنے لگا، وہ بہت خوش تھا، چہکتے ہوئے خیموں کی طرف گھوڑا بھگانے لگا، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ایڈرا اسے وہیں ملے گی۔

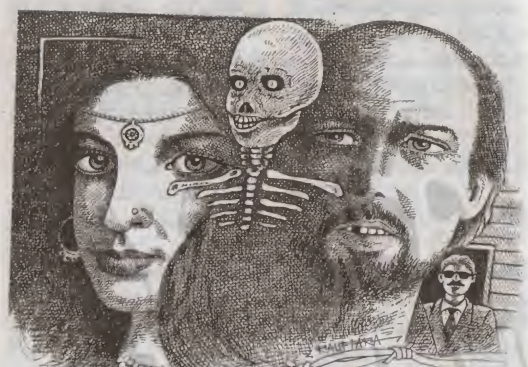

جنات کا قبضہ

انور فرہاد

گھپ اندھیرے کمرے میں آواز گونجی۔ ہم کسی بھی صورت یہ مکان نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ ہماری شرافت ہے کہ ہم نے تم لوگوں کو چند دن اس مکان میں ٹھہرنے دیا، فوراً یہ مکان چھوڑ دو نہیں تو تم سب کے سر اپنے دھڑوں سے الگ پڑے نظر آئیں گے اور یہ سنتے ہی......

سطر سطر دل و دماغ کو جھنجھوڑتی ناقابل فراموش انجام کی ایک دلچسپ اور دل گرفتہ کہانی

دروازے کے تالے میں چابی ڈال کر سنی نے گھمایا۔ ہلکی سی کھٹاک کی آواز آئی۔ جس کا مطلب تھا۔ بند تالا کھل گیا۔ جس کے بعد اس نے ہینڈل پکڑ کر کواڑ کو اندر دھکا دیا۔ حسا با دروازے کے پٹوں کو کھل جانا چاہئے تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ کواڑ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ اسے شک گزرا۔ "کہیں تالا اب تک بند تو نہیں؟" یہ سوچ کر اس نے چابی دوبارہ تالے میں ڈال کر گھمائی۔ جس طرف چابی گھمانے سے تالا کھلتا تھا، ادھر تو چابی گھومی ہی نہیں۔ جب اس نے مخالف سمت گھمائی تو چابی گھومی اور تالا بند ہو گیا۔ ہلکی سی آواز بھی آئی۔ "یعنی تالا کھلا ہوا تھا۔ اب بند ہو گیا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ اور ایک بار پھر تالا کھلنے والی سمت میں چابی گھمائی۔ تالا کھلنے کی آواز بھی سنائی دی۔ اس نے چابی نکال کر کواڑ کھولنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

"کیا ہوا سنی! تالا کھولنے میں کتنی دیر لگا رہے ہو۔؟"

اب اس نے پیچھے پلٹ کر امی کو مخاطب کیا، جسکے اردگرد اس کے بھائی بہن کھڑے تھے۔ "امی! تالا کھلنے کے باوجود کواڑ نہیں کھل رہے ہیں۔"

"کیا مطلب!!"

سنی نے انہیں مطلب سمجھایا مگر شاید ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ انہوں نے اس سے چابی لے کر خود کوشش کی تب ان کی سمجھ میں یہ آیا۔ "شاید دروازہ اندر سے بند ہے۔"

"مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" سنی سے چھوٹے فنی نے حیرانگی سے کہا۔ "جاتے وقت دروازہ جب میں نے بند کیا تھا تو۔"

"شاید ہمارے جانے کے بعد پاپا آئے ہوں اور انہوں نے دروازہ اندر سے بند کردیا ہو؟" گڑیا نے اپنی عقل کا مظاہرہ کیا۔

"بدھو کہیں کی...... چابی تو ہمارے پاس ہے۔ پاپا اندر کیسے داخل ہوں گے۔؟" ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بچوں کی والدہ نے دروازہ تھپتھپا کر کہا۔ "کون ہے......؟ اندر کون ہے......؟"

"میں ہوں۔"

کسی کو توقع نہیں تھی کہ ایسا کوئی جواب آئے گا۔ سب گھبرا گئے۔ گھبرانے کی شاید یہ وجہ بھی تھی کہ یہ آواز سنی کے پاپا کی نہیں تھی۔ بالکل اجنبی آواز تھی۔ عجیب طرح کی آواز...... جیسے بھرائی ہوئی...... جیسے گھبرائی ہوئی...... جیسے بیزار بیزار سی۔ یہ اندازہ لگانا بھی مشکل تھا کہ مردانہ آواز ہے یا زنانہ۔

"ارے بھئی! دروازہ کھولو...... ہم بچوں کے ساتھ آدھی رات کے وقت گھر کے باہر کھڑے ہیں۔"

اندر جو بھی تھا، اس سے بے نیاز ہو کر نجمہ بیگم نے اسے مخاطب کیا۔ مگر نہ کوئی جواب آیا۔ نہ دروازہ کھلا۔ نجمہ بیگم بچوں کے ساتھ ایک عزیز کی شادی کی تقریب سے واپس آئی تھیں ان کے میاں انکے ساتھ نہیں گئے تھے۔ وہ اپنی کاروباری مصروفیات کی وجہ سے ایسی تقریبات میں شرکت کو تضیع اوقات سمجھتے تھے۔

جب ذرا دیر تک اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تو نجمہ بیگم نے ایک بار پھر دروازہ پیٹنا شروع کردیا۔ وہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتی جاتی تھیں۔

"ارے بھئی! اندر کون ہے۔؟"

ذرا دیر بعد جھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "میں ہوں۔"

"تو دروازہ کھولنا...... دروازہ کیوں نہیں کھولتے۔؟"

جواب پھر ندارد۔ اور دروازہ بھی نہیں کھلا۔ "یا اللہ! ہم کس مصیبت میں پھنس گئے۔" نجمہ بیگم نے دل ہی دل میں کہا۔ "پتہ نہیں کون بھوت بلا گھر کے اندر گھس گیا ہے جو "میں ہوں" کے علاوہ اور کچھ بولنا نہیں جانتا۔ نہ ہی اسے دروازہ کھولنے کی توفیق ہوتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ایسے حالات میں میں کیا کروں۔؟"

"امی! میں موبائل فون پر علاقے کے تھانے فون کروں کہ ہمارے گھر میں کوئی گھس گیا ہے؟" نجمہ بیگم نے خیالات سے چونک کر سنی کی طرف دیکھا۔ کچھ سوچا...... پھر بولیں۔ "نہیں، ابھی نہیں۔"

سنی پوچھنا ہی چاہ رہا تھا کہ کیوں، ابھی کیوں نہیں؟ کہ اسی وقت اسے اس کے پاپا کی آواز سنائی دی۔ "یہ تم لوگ اپنے گھر کے قریب کیوں دھرنا دیئے کھڑے ہو؟ کس کے خلاف احتجاج کررہے ہو؟" ان کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ سب ان کی طرف متوجہ ہوگئے اور ان کی بیگم نے نہایت سنجیدگی سے جب موجودہ صورت حال سے انہیں آگاہ کیا تو انکے موڈ کی شگفتگی رفو چکر ہوگئی۔

"اچھا......!" کہہ کر وہ چند لمحوں تک گم سم کھڑے رہے پھر آگے بڑھ کر کواڑوں پر ہاتھ رکھا تو وہ بڑی آسانی سے اندر کھلتے چلے گئے۔ سب حیران تھے کہ یہ پل بھر میں کیا ماجرا ہوگیا؟ ایک ایک کرکے سب گھر میں داخل ہوئے مگر سب سہمے سہمے تھے۔ گھر کے

اندر ادھر ادھر متجسس نگاہیں ڈال رہے تھے۔ سب کی نگاہیں کسی کو تلاش کررہی تھیں یا کسی ایسی بات یا ایسے آثار کی متلاشی تھیں جس سے کسی کی موجودگی کا کچھ اتہ پتہ چلے۔ مگر اس کوشش میں کسی کو کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ لباس تبدیل کیا۔ ضروریات سے فارغ ہوئے اور بستر پر جاتے ہی بے خبر ہوگئے۔

کسی کو کچھ اندازہ نہیں کہ کتنی دیر بعد اچانک وہ جاگ پڑے تھے۔ جاگنے کی وجہ یقیناً کوئی تیز آواز تھی۔ آنکھیں کھل گئی تھیں مگر ذہن ابھی تک بیدار نہیں ہوا تھا۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کرپائے تھے کہ وہ کیسی آواز تھی جس کی وجہ سے ان کی آنکھ کھل گئی کہ اچانک ایک تیز آواز پھر سنائی دی تھی۔ جس نے ان کے اونگھتے ہوئے ذہن کو اچھی طرح بیدار کردیا۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے شیشے کے برتنوں کو کسی نے زمین پر زور سے دے مارا ہو...... چھناکے کی تیز آواز کے ساتھ برتنوں کے ایک ساتھ ٹوٹنے کی کیفیت بڑی نمایاں تھی۔

"یہ کیا ہے۔!" سلطان صاحب نے گھبرا کر بیوی سے پوچھا۔ "کیا کچن میں چوہے بلی تو نہیں گھس گئے۔؟"

نجمہ بیگم ابھی کوئی مناسب جواب دینے کا ارادہ کررہی تھیں کہ ایسے ہی چھناکے کے ساتھ ٹوٹ پھوٹ کی آواز ایک بار پھر آئی۔ مگر اس بار یوں لگا تھا کہ سنگھار میز اور الماریوں کی قسمت پھوٹی ہے۔ دونوں گھبرا کر بستر پر اٹھ بیٹھے تھے۔ اور اس نئی آواز پر خیال آرائی کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ سنی کے چلانے کی آواز سنائی دی۔

"پاپا! پاپا!"

دونوں میاں بیوی آواز کی سمت سرپٹ بھاگے۔ سنی اپنے کمرے کے باہر کھڑا تھا اور اس کے قریب فنی اور دیگر بچے ہونقوں کی طرح کھڑے تھے۔ چھوٹے بچے دوڑ کر ماں سے لپٹ گئے وہ بے حد خوفزدہ تھے۔

"کیا بات ہے ارسلان! عرفان! کیا ہوا......؟ تم لوگ کیوں چلا رہے ہو؟"

"یہ کیسی آوازیں ہیں؟ گھر میں کوئی چور ڈاکو گھس آیا ہے شاید۔"

"جس نے گھر میں توڑ پھوڑ مچا رکھی ہے۔" سنی کی بات کو فنی نے آگے بڑھایا۔

"آؤ دیکھتے ہیں کون ہے؟" ان کے پاپا نے ان سے کہا۔

"اس طرح نہ جایئے۔" نجمہ بیگم نے ہانک لگائی مگر باپ بیٹوں نے ان کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ آگے بڑھتے گئے۔ نجمہ بیگم اپنی جگہ چھوٹے بچوں کے ساتھ کھڑی رہیں۔ وہ کچن پہنچے تو وہاں ہر چیز اپنی جگہ صحیح سلامت نظر آئی۔ کمروں میں جاکر شیشے کی الماریوں اور سنگھار میزوں کو دیکھا تو ان پر کوئی خراش بھی موجود نہیں تھی۔ ڈرائنگ روم میں بھی ہر طرف سکون ہی سکون نظر آیا۔ تینوں واپس آئے۔ نجمہ بیگم کو بتایا۔

"ہر چیز صحیح سلامت ہے...... کہیں بھی کسی ٹوٹ پھوٹ کا کوئی نشان نہیں۔" نجمہ بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا تھا مگر دل ہی دل میں یہ ضرور کہہ رہی تھیں۔ "پھر وہ آوازیں کیسی تھیں۔!!"

☆......☆......☆

چند روز بعد کی بات ہے۔ دن کے وقت جب سلطان صاحب اپنے دھندے اور ان کے بیٹے اسکول کالج گئے ہوئے تھے۔ گھر میں صرف نجمہ بیگم اور چھوٹے بچے تھے۔ نجمہ بیگم کسی کام سے کچن سے ڈرائنگ روم گئیں۔ اور پھر ذرا دیر بعد ہی لوٹی تھیں لیکن چھت سے لٹکا ہوا فانوس اچانک ٹوٹ کر نیچے آگرا۔ فانوس ان سے چند قدم کے فاصلے پر گرا تھا۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے جان بوجھ کر فانوس ان کے اوپر گرایا تھا کہ وہ اس کی زد میں آجائیں۔ وہ اس قدر گھبرا گئی تھیں کہ وہاں سے بھاگیں اور جاتے وقت ڈرائنگ روم کے دروازہ دوسری طرف سے بند کردیا۔ غالباً اس خیال سے کہ کمرے میں اگر کوئی موجود ہے تو وہ

باہر نہ آسکے۔ کچن کی بجائے اپنے کمرے میں آکر وہ لمبی لمبی سانس لے رہی تھیں۔ ''یا اللہ! وہ کون تھا جس نے میرے اوپر وہ فانوس گرانے کی کوشش کی تھی؟'' انہوں نے سوچا۔ ''میں گھر میں چھوٹے بچوں کے ساتھ اکیلی ہوں۔ میں تن تنہا اس کا مقابلہ کیسے کرسکوں گی؟ وہ جو کوئی بھی ہے، مجھے نقصان پہنچانے کی پھر کوشش کرسکتا ہے۔ میں کیا کروں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔'' کچھ دیر تک وہ اس بارے میں غور و فکر کرتی رہیں، آخر ان کی سمجھ میں یہی بات آئی کہ سلطان کو فون کرکے گھر بلالیا جائے۔ اور انہوں نے اس سلسلے میں دیر نہیں لگائی فوراً موبائل فون سے اپنے میاں سے کہا۔

''آپ فوراً گھر واپس آئیں۔''

''مگر کیوں؟ کیا ہوا؟''

''میں سخت خطرے کی حالت میں ہوں۔'' کہہ کر انہوں نے رابطہ منقطع کردیا۔ اب سلطان صاحب بھی گھبرا گئے تھے اور سیدھے گھر کی طرف بھاگے تھے۔ انہیں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ ''کیا ہے بھئی!'' انہوں نے نجمہ بیگم کو حواس باختہ دیکھ کر کہا۔ ''کیسا خطرہ؟ کس سے خطرہ؟

نجمہ بیگم نے خوفزدہ لہجے میں انہیں صورت حال سے آگاہ کیا اور بولیں۔ ''یوں سمجھیں اللہ نے مجھے بچالیا ورنہ اس نے تو میرے اوپر ہی فانوس گرایا تھا۔''

''کس نے۔؟''

''میں کیا جانوں وہ کون ہے۔ مجھے تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔''

سلطان صاحب چند لمحوں تک گم صم کھڑے سوچتے رہے پھر بولے۔ ''چلو تو دیکھتے ہیں، کون ہے ڈرائنگ روم میں۔''

''آپ جائیے!'' نجمہ بیگم نے لرزیدہ آواز میں کہا۔ ''میں نہیں جاؤں گی۔''

سلطان صاحب کچھ بولے نہیں، یہ سوچتے ہوئے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئے کہ بہت زیادہ خوفزدہ معلوم ہوتی ہے۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تھے اور پھر اگلے ہی لمحہ ان کی چیخ سنائی دی تھی۔ ''نجمہ!''

نجمہ بیگم یوں اچھلی تھیں جیسے انہیں بچھو نے ڈنک ماردیا ہو۔ ''اللہ خیر کر'' کہتے ہوئے آندھی طوفان کی طرح ڈرائنگ روم کی طرف بھاگی تھیں۔ ''کیا ہوا؟ کیا ہوا؟'' انہوں نے ڈرائنگ روم کے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ مگر سلطان صاحب پر نظر پڑی تو ان پر خوف کے آثار کی بجائے انکا چہرہ غصے سے تمتمایا ہوا نظر آیا۔

''مجھے تمہارا یہ مذاق بالکل پسند نہیں آیا۔'' انہوں نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔

''کیسا مذاق؟'' نجمہ بیگم نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

سلطان صاحب نے جواب دینے کی بجائے چھت کی طرف انگلی سے اشارہ کیا جہاں فانوس حسب سابق اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ انہوں نے گھبرا کر نیچے فرش کی طرف دیکھا جہاں وہ فانوس کو کرچی کرچی چھوڑ کر گئی تھیں۔ وہاں ایک کرچی بھی موجود نہیں تھی۔

''تمہیں معلوم ہے میں کتنا ضروری کام چھوڑ کر آیا ہوں۔ اب تم بچی نہیں ہو۔ سیانے بچوں کی ماں ہو۔ اس عمر میں تمہیں ایسی حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔''

نجمہ بیگم اگرچہ اس صورت حال سے بہت شرمندہ تھیں۔ اس کے باوجود انہوں نے کچھ جواب دینے کی بجائے سلطان صاحب کا ہاتھ پکڑ کر انہیں ڈرائنگ روم سے باہر لے گئیں۔

''میں نے کوئی مذاق نہیں کیا سلطان! ذرا سوچو، اس سے پہلے بھی تو ہمارے ہاں اس سے ملتے جلتے واقعات ہوچکے ہیں۔ چیزوں کے ٹوٹنے کی آوازوں کے باوجود کسی بھی چیز کا نقصان نظر نہیں آیا۔'' وہ ذرا رکیں پھر بولیں۔ ''یہاں...... اس گھر میں یقیناً کسی آسیب کا سایہ ہے۔ جو ہمیں اپنے ساتھ رکھنے پر تیار نہیں۔ ہمیں خوفزدہ کرکے یہاں سے بھگانا چاہتا ہے۔''

نجمہ بیگم کے سمجھانے بجھانے پر سلطان صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور وہ واپس اپنے کام پر چلے گئے۔

☆......☆......☆

یہ گھر انہوں نے نیا نیا خریدا تھا۔ اور حال ہی میں یہاں شفٹ ہوئے تھے۔ یہ گھر بہت خوبصورت کشادہ اور آرام دہ تھا۔ کسی بات کی شکایت نہیں تھی اور پھر علاقہ بھی بہت اچھا تھا۔ خوش حال اور صاحب حیثیت لوگوں کی بستی تھی۔ سلطان صاحب کو بس اتفاق ہی سے اس گھر کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ قیمت لوکیشن کے حساب سے زیادہ نہیں تھی۔ انہوں نے فوراً خرید لیا۔ شفٹنگ کے بعد ایک دو بار رات کے وقت انہیں ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کوئی چل پھر رہا ہے۔ جس کو انہوں نے یہ معنی پہنایا کہ شاید چوہے ہیں۔ خالی گھر میں جنہوں نے بسیرا کر رکھا تھا۔ اور اب تک یہاں سے بھاگے نہیں ہیں۔ انہوں نے سوچا اس کا واحد علاج یہی ہے کہ ایک دو بلی لاکر گھر میں چھوڑ دی جائے جو آہستہ آہستہ ان کا صفایا کردیں گی۔ بلیاں آئیں تو بظاہر چوہوں کی گڑبڑ ختم ہوگئی مگر ایک نیا فتنہ کھڑا ہوگیا۔ بلیاں رات کو رونا شروع کردیتیں۔ اور ایسا لگتا جیسے روتے روتے جھلا کر کسی پر حملہ آور ہورہی ہیں۔ میاں بیوی اٹھ کر بلیوں کے پاس جاکر انہیں مخاطب کرتے۔

''کیا بات ہے۔؟ تم سب اس طرح چیخ چلا کر کیوں ہماری نیند خراب کررہی ہو۔؟''

بلیاں انہیں ٹینشن کی حالت میں نظر آتیں۔ ان کے بال کھڑے ہوتے اور وہ دھیرے دھیرے غرا رہی ہوتیں۔ کئی دنوں کے بعد بلیوں کے چیخنے چلانے کا سلسلہ بند ہوگیا۔ بلیاں اچانک غائب ہوگئیں خود ہی کہیں چلی گئیں۔ اس بات کو بھی انہوں نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ یہی سمجھا پالتو بلیاں نہیں تھیں اس لئے گھر میں ٹک کر نہ رہ سکیں۔

ایک دن فنی گھر آیا تو اسکے ہاتھ میں رسی کا ایک سرا تھا جبکہ دوسرا سرا ایک کتے کے پٹے سے بندھا ہوا تھا۔ ''فنی! یہ تم کیا لے آئے۔؟'' سنی نے اس سے کہا۔

''اسے قومی زبان میں کتا اور انگریزی زبان میں DOG کہتے ہیں۔''

''ارے ہاں! مجھے معلوم ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ بلیوں کی مصیبت گئی تو تم کتے کی نئی مصیبت لے آئے۔؟''

مگر کتا بڑا پیارا تھا۔ جلد ہی گھر بھر کی توجہ اس نے حاصل کرلی۔ عرفان اسے اپنے ہی کمرے میں رکھتا تھا۔ دن کے وقت جب وہ گھر پر نہیں ہوتا تو پورے گھر میں گھومتا رہتا۔ بچوں کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ ایک دن وہ بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ نجمہ بیگم کچن میں مصروف تھیں کہ اچانک کتے کے زور سے بھونکنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی بچے چیخے۔ ''امی!''

نجمہ بیگم بچوں کی طرف سرپٹ بھاگیں۔ بچوں کے پاس پہنچ کر بولیں۔ ''کیا ہوا؟'' بچے جو خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے ان سے لپٹ گئے اور انہوں نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا بچوں سے خاصے فاصلے پر کتا فرش پر پڑا لمبی لمبی آخری سانسیں لے رہا تھا۔

''کیا ہوا اسے......؟ کس نے اسے مارا......؟''

بچوں سے فوری طور پر جواب نہیں دیا گیا۔ ذرا دیر بعد جب ماں کے دم دلاسہ دینے پر ان کے حواس قدرے بحال ہوئے تو ان میں جو بڑا تھا۔ ''رک رک کر اور اٹک اٹک کر بولا۔'' وہ...... ہمارے ساتھ...... کھیل رہا تھا۔ پھر جانے کیا ہوا ......وہ ادھر دیکھ کر ......بھونکا...... اور اچھل کر...... کسی پر حملہ کردیا۔''

''کس پر حملہ کیا؟''

''پتہ نہیں۔''

''پھر کیا ہوا۔؟''

''پھر وہ اس طرح نیچے...... پڑ گیا۔''

نجمہ بیگم بچوں کو چھوڑ کر کتے کے پاس گئیں، اس پر ایک نظر ڈالی۔ پھر بھاگ کر پانی لائیں اور اس کے منہ پر ٹپکایا...... پانی نے غالباً اس کی مشکل آسان کردی اور اس کا تڑپتا ہوا جسم بے حس و حرکت ہوگیا۔ ''یا اللہ! وہ کون تھا......؟ جسے دیکھ کر اس نے حملہ کیا تھا۔ اور اس نے اسے موت کے منہ میں پہنچادیا۔؟''

نجمہ بیگم کو ان کے اس سوال کا جواب نہیں ملا۔ وہ بچوں کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ اچانک انہیں خیال آیا کہ وہ کچن میں چولہے پر ہانڈی چھوڑ کر گئی تھیں۔ لہٰذا بچوں کو وہیں رکنے کا کہہ کر کچن کی طرف دوڑیں۔

"خدا کا شکر ہے، ہانڈی جلی نہیں۔" کہہ کر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔ "امی!"

انہوں نے پلٹ کر دیکھا عرفان سراپا غم و یاس بنا کھڑا تھا۔ "میرے ٹائیگر نے کیا قصور کیا تھا کہ آپ نے اسے......" مارے صدمے کے اس سے پورا جملہ ادا نہیں کیا گیا۔

"فی بیٹے! اسے میں نے نہیں......" اس کے پاس جا کر اسے تسلی دیتے ہوئے انہوں نے ساری روداد سنا دی۔ عرفان نے دوبارہ مردے کتے کے پاس جا کر نئے سرے سے اس کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ کسی نے اس کی گردن مروڑ کر توڑ دی ہے۔ مگر کس نے؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

☆......☆......☆

"نجمہ بیگم! تمہارا خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ اس گھر میں آسیب کا سایہ ہے۔" سلطان صاحب نے بیوی کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"اور اس بات سے بھی آپ کو اتفاق کرنا پڑے گا کہ جو کوئی بھی ہے ہمیں اس گھر سے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔"

"ہاں عندیہ تو یہی ملتا ہے کہ وہ ہمیں خوفزدہ کر کے یہاں سے جانے پر مجبور کر رہے ہیں۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے۔ کیا ہمیں یہ گھر چھوڑ دینا چاہئے؟"

نجمہ بیگم جواب دیتے وقت ذرا ہچکچائیں لیکن آخر انہوں نے کہہ ہی دیا۔ "میں اس مکان کو چھوڑنے کے حق میں نہیں۔ اتنا اچھا اور پیارا مکان ہم کسی ان دیکھے۔"

"ایسا ہے......" سلطان صاحب نے تلخ کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ہم بچوں سے بھی ان کی رائے لے لیں۔ اس کے بعد کوئی فیصلہ کریں۔"

اور اگلے روز کھانے کی ٹیبل پر سلطان صاحب دونوں بڑے بیٹوں ارسلان اور عرفان کو مخاطب کرتے ہوئے یہ مسئلہ چھیڑ دیا۔ اور پوچھا۔ "تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟"

"آپ لوگوں نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" انہوں نے الٹا سوال کر دیا۔

"تمہاری امی تو اس گھر کو چھوڑنے کے حق میں نہیں۔"

"ہم بھی ان کے ہم خیال ہیں۔"

"گھر انسانوں کے رہنے کے لئے ہوتے ہیں، بھوت پریتوں کے لئے نہیں۔" فی نے سنی کی بات آگے بڑھائی۔

"تم لوگوں کو ہر حال میں یہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔" اچانک کمرے میں یہ آواز گونجی تھی اور ایسا لگا تھا جیسے ہر طرف سے اس کی بازگشت سنائی دی ہو۔ "تم لوگوں کو ہر حال میں یہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔......یہ گھر چھوڑنا پڑے گا......چھوڑنا پڑے گا......"

سب ذرا دیر کے لئے سناٹے میں آ گئے تھے۔ پھر فی ایک دم بول پڑا۔ "یہ گھر ہمارا ہے۔ ہم نے اسے خریدا ہے۔ اس لئے تم اس پر حق جتانے والے کون ہو۔؟"

"اس پر ہمارا حق یوں ہے کہ ہم ایک مدت سے اس میں مقیم ہیں۔ جب یہ گھر بنا تھا، اس سے بھی پہلے ہم یہاں رہتے تھے۔ مکان بننے کے بعد بھی ہم یہاں رہ رہے ہیں اور آئندہ بھی ہم یہاں رہیں گے۔"

"یہ اچھی زبردستی ہے۔"

"اور اگر ہم یہاں سے نہیں گئے تو تم کیا کر لو گے۔؟" ابھی سنی کا یہ جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ کمرے میں ایک دھند سی چھا گئی اور جب دھند چھٹی تو کھانے کی میز، اس پر رکھی ڈشوں، پلیٹوں اور ان کے ہاتھوں میں گرد و غبار کی ایک موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ سلطان

صاحب نے اشاروں سے بچوں کو خاموش رہنے اور صبر و تحمل سے کام لینے کو کہا۔

اس وقت تو یہ معاملہ یہیں تک رہا لیکن انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ان ان دیکھی طاقت سے شکست نہیں کھائیں گے۔

سلطان صاحب نے ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے کسی ایسی شخصیت کی تلاش شروع کر دی جو بھوت پریت اور آسیب کو قابو کرنے پر قادر ہو۔ کہتے ہیں کہ اگر جستجو سچی ہو تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ سلطان صاحب کو بھی ان کی مطلوبہ شخصیت مل گئی۔ انہوں نے انہیں ساری روداد سنا کر کہا۔ "یا حضرت! کوئی ایسی تدبیر ہو سکتی ہے کہ ان نادیدہ قابضین سے نجات حاصل ہو سکے۔ وہ قبضہ مافیا ہمارے گھر سے بھاگنے پر مجبور ہو جائے۔؟"

"پہلے یہ معلوم کرنا ہوگا کے آخر وہ ہیں کون؟ اس کے بعد فیصلہ کیا جا سکے گا کہ ان کو وہاں سے بے دخل کیسے کیا جائے۔"

سلطان صاحب ان سے پوچھنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ اس سلسلے میں آپ کیا کریں گے؟ کہ وہ بول پڑے۔ "ان کے گرد و غبار سے جو برتن آلودہ ہوئے تھے، ان میں سے کوئی ایک آپ لا کر مجھے دیں۔ اس سے مجھے انکے بارے میں اندازہ لگانے میں مدد ملے گی۔"

"مگر جناب! وہ سارے برتن تو ہم نے اسی وقت دھو ڈالے تھے۔"

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔" پھر وہ ہلکے سے مسکرائے۔ "آپ کی جدید سائنس جب برسوں پرانے مردے کی ہڈی سے مرنے والے کے بارے میں بہت سی باتوں کا پتہ چلا لیتی ہے تو "ہماری روحانی سائنس" کیا ان برتنوں سے اندازہ نہیں لگا سکتی جن پر کبھی کسی نے گرد و غبار کی بارش کی تھی کہ وہ تھے کون؟"

سلطان صاحب نے اس ضمن میں کوئی بحث نہیں کی اگلی ملاقات میں ایک رکابی لا کر ان کی خدمت میں پیش کر دی۔

"شکریہ!" بزرگوار نے پلیٹ کو گھورتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ "اب "ہماری لیبارٹری" میں اس پلیٹ کی "ڈی این اے ٹیسٹ" ہوگی اور آپ کو بتا دیا جائے گا کہ "قبضہ مافیا" کون ہے۔" وہ ذرا رک کے پھر اپنی بات بڑھاتے ہوئے بولے۔ "اچھا! یہ تو بتایئے کہ اس رکابی کو لاتے وقت بیگم یا کسی کو بتایا تو نہیں تھا کہ کس مقصد کے لئے اسے کہاں لے جا رہے ہیں؟"

"جی نہیں......میں نے اس بارے میں نہ کسی سے کوئی بات کی نہ ہی کسی کی موجودگی میں یہ کام کیا، بہت ہی خاموشی کے ساتھ اس پلیٹ کو چھپا کر لایا ہوں۔"

"ٹھیک! آپ خاصے سمجھدار ہیں۔ ان حاضر غائب کو ذرا بھی بھنک لگ جانے سے وہ ہمارے کام میں رکاوٹیں پیدا کر سکتے ہیں۔"

"اب کیا حکم ہے میرے لئے؟"

"آپ پرسوں تشریف لائیں۔ اس وقت تک انشاء اللہ تعالیٰ اس رکابی کا روحانی ڈی این اے ٹیسٹ ہو چکا ہوگا۔ اور ہاں، فی الحال اس بارے میں بیگم صاحبہ کو بھی کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔"

گھر پر ایک بار نجمہ بیگم نے ان سے اشارتاً کنایتاً پوچھا بھی کہ موجودہ حالات کے تدارک کے لئے آپ کچھ کر کیوں نہیں رہے ہیں۔؟ جس پر انہوں نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ "میں اپنے کاروبار کی طرف توجہ دوں یا کسی اور طرف؟ تمہیں کیا پتہ آجکل کاروباری حالت کتنی خراب ہے۔"

تیسرے دن وہ بزرگوار کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا۔ "ہماری" روحانی ڈی این اے ٹیسٹ نے "قبضہ مافیا" کی ہسٹری شیٹ سے ہمیں آگاہ کر دیا ہے۔"

"کون ہیں وہ۔؟" سلطان صاحب نے بے تابی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ جن ہیں۔ مگر ذرا بگڑے ہوئے۔ اپنے گروہ سے کٹے چھٹے رہتے ہیں۔ انسانوں کے درمیان

رہنے والے جنوں کو، جنوں کی اکثریت اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتی۔"

"اب آپ کا اگلا مرحلہ کیا ہوگا؟ کیا آپ ان سے دوبدو ملاقات کرکے......"

"ابھی نہیں۔ پہلے کچھ احتیاطی تدبیریں کرنی ہوں گی، اس کے بعد۔"

اور احتیاطی تدبیروں کے لئے انہوں نے سلطان صاحب کو سفید دھاگے کی ایک ریل دی۔ جس میں لپٹے دھاگے میں تھوڑے تھوڑے فاصل پر گرہیں لگی ہوئی تھیں۔

"آپ کو پھر ایک بار بے حد احتیاط کا مظاہرہ کرنا پڑے گا۔ اس دھاگے کو مختلف کمروں کے مختلف حصوں میں اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکرے کرکے اس طرح باندھنا پڑے گا کہ آپ کو کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔ اگر دیکھے بھی تو یہی سمجھے آپ کوئی اور کام کرر ہے ہیں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا۔؟"

"جی ہاں...... یہ احتیاط ان ان دیکھی مافیا کے لئے ہے۔"

"بالکل! آپ سمجھ دار آدمی ہیں۔ یہ کام ضروری نہیں کہ ایک ہی وقت میں مکمل کیا جائے۔ جب بھی مناسب موقع ملے کرتے رہیں۔ مگر دو تین دنوں میں مکمل کرلیں اس کے بعد مجھے آکر صورت حال سے آگاہ کریں۔"

یہ کام واقعی بڑے احتیاط سے کرنے کا تھا۔ گھر والوں کی نگاہوں سے بھی بچنا تھا۔ بہر حال انہوں نے مقررہ وقت میں محتاط طریقے پر کرلیا اور آکر اس کی اطلاع دی۔

"دیکھئے......" بزرگوار نے سوچتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ "آج جمعرات ہے...... اگلے بدھ تک آپ لوگوں کو جنوں کی متوقع ری ایکشن کا بغور اندازہ لگانا ہوگا۔"

"کیا ان پر کوئی ناخوشگوار اثر پڑے گا۔؟"

"پڑ بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ بہر حال آپ لوگوں کو ڈرنے اور خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی آپ لوگ اس پر اپنا کوئی ری ایکشن ظاہر کریں گے۔"

اگلے بدھ کو سلطان صاحب نے جاکر بتایا۔ "یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قبضہ مافیا بہت بے چینی اور بے کلی کی حالت میں مبتلا ہے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں، ذرا صاف طور سے بتایئے۔"

سلطان صاحب نے ذرا سوچ کر جواب دیا۔ "یوں سمجھئے، ہم لوگ جس طرح لوڈ شیڈنگ کے دوران مضطرب اور بے چین رہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح کی کیفیت ان کی طرف محسوس ہوتی ہے خاص طور پر رات کے وقت ان کی بے قرار بڑھ جاتی ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ان کی اف آہ کی صدائیں سنائی دیتی ہیں۔ ایسے میں اکثر پھڑ پھڑاہٹ کی آواز بھی سنائی دیتی ہے جیسے کوئی پرندہ اڑ کر کہیں چلا گیا ہو۔"

"جیسے......" بزرگوار نے سلطان صاحب کی بات آگے بڑھائی۔ "ہم لوگ لوڈ شیڈنگ کے دوران حبس اور گرمی سے بے چین ہو کر گھر سے باہر نکل جاتے ہیں......"

"جی ہاں...... جی ہاں...... شاید ان کی یہی کیفیت ہوتی ہے اور وہ گھر سے باہر جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔" سلطان صاحب نے تائید کی۔

"میں یہی تو چاہتا تھا۔ یوں سمجھئے ہمارا تیر نشانے پر لگا ہے۔ اب اگلا مرحلہ ان سے دو دو ہاتھ کرنے کا ہے۔" وہ ذرا رکے...... پھر گویا ہوئے۔ "کل ظہر کی نماز کے بعد آکر مجھے اپنے ساتھ لے چلیں۔ کل آخری راؤنڈ کا کھیل ہوگا۔ مگر......" مگر کہہ کر وہ رک گئے۔ پھر ذرا توقف کے بعد بولے۔ "یہ کھیل کسی قدر ڈراؤنا اور خوفناک بھی ہوسکتا ہے۔ لہٰذا بہتر ہوگا کہ اگر آپ کے چھوٹے بچے ہیں تو میرے پہنچنے سے پہلے انہیں کسی عزیز کے گھر پہنچا دیں۔ بیگم صاحبہ اور سیانے بچے یہ دلچسپ کھیل دیکھنے کے لئے موجود رہ سکتے ہیں۔"

گھر پہنچ کر سلطان نے بیگم کو کسی بہانے گھر سے باہر لے جا کر ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ ڈریں بھی اور خوش بھی ہوئیں کہ اس فائنل راؤنڈ کے

بعد اللہ نے چاہا تو قبضہ مافیا سے ہمارا گھر آزاد ہو جائے گا۔ اگلے روز صبح انہوں نے چھوٹے بچوں کو اپنی والدہ کے گھر چھوڑا کہ شام کو آکر انہیں لے جاؤں گی۔

سلطان صاحب بزرگ محترم کو ظہر کے بعد گھر لائے تو دونوں بڑے بیٹے ارسلان اور عرفان بھی گھر میں موجود تھے۔ انہوں نے ڈرائنگ روم میں ٹھنڈی بوتل لیتے ہوئے کہا۔

"آپ تمام لوگ کسی ایسے کمرے میں کسی ایسی جگہ بیٹھ کر تماشہ دیکھیں گے جہاں سے ہماری طرف سے آپ لوگوں پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔ جبکہ آپ لوگ ہماری طرف دیکھ سکیں گے۔"

پھر ایک ایسی جگہ کا انتخاب ہوگیا۔ جو تھا وسیع و عریض...... جہاں کا تماشہ سامنے والے کمرے سے بخوبی دیکھا جاسکتا تھا۔ بزرگوار نے وارانڈے میں کالے کوئلے سے ایک وسیع دائرہ کھینچا۔ اور اس کے اندر اپنے ساتھ لائی ہوئی مختلف چیزوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک آنکھیں بند کئے قرآنی آیتوں کی بہ آہستگی تلاوت کرتے رہے۔ پھر خاموش ہو کر گلاس کے پانی میں پھونک ماری، اپنے بدن پر پھونک ماری۔ اپنے چاروں طرف پھونک ماری۔ پھر ذرا توقف کے بعد ذرا بلند آواز سے کہا۔

"اس گھر کے دعوے دارو! ذرا سامنے تو آؤ۔ اور مجھے بتاؤ تمہارا کیا مسئلہ ہے۔"

ذرا دیر کی خاموشی کے بعد ایک بڑی ڈراؤنی سی آواز آئی۔ "ہمیں بلانے والے! اپنے بڑھاپے پر ترس کھاؤ...... کیوں ہمیں بلا کر دہشت کی موت مرنا چاہتے ہو۔؟"

"میری فکر نہ کرو جوانو! میری تو مرنے کی عمر ہی ہے۔ تم لوگ جس طرح جی چاہے چلے آؤ۔"

ذرا دیر بعد ایک دم اندھیرا سا چھا گیا۔ پھر آہستہ آہستہ دھند چھٹی تو بزرگوار کے کھینچے ہوئے دائرے کے باہر کچھ فاصلے پر ایک عجیب دہشت ناک کوئی چیز موجود تھی۔ جس پر سلطان صاحب اور ان کی دو بچوں کی نظر پڑی تو ان پر سراسیمگی سی طاری ہوگئی۔ جبکہ بزرگوار زیر لب مسکرا رہے تھے۔ سامنے جو چیز نمودار ہوئی تھی اس کا وہ بغور جائزہ لے رہے تھے۔ اور دل ہی دل میں کہہ رہے تھے بہت خوب۔ شیر کے اوپر ایک بڑا سا بچھو بیٹھا ہے۔ اور شیر کے چاروں پیروں کی جگہ منہ کھولے ہوئے چار اژدھے ہیں۔ گویا شیر چار اژدھوں کے سہارے کھڑا ہے۔ بچھو وقفے وقفے سے شیر کے سر پر ڈنک مار رہا ہے۔ ڈنک مارنے سے شعلہ سا ابھرتا ہے۔ اور شیر کی بے چینی بڑھ جاتی ہے۔ دوسری طرف اژدھے شیر کو ڈستے ہیں تو شیر کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلتی ہیں۔

یہ خوفناک تماشہ دیکھنے کے باوجود بزرگ ہستی پر جب کسی خوف کا شائبہ بھی نظر نہیں آیا تو شیر نے اپنا بھاڑ سا منہ کھولا...... آواز آئی۔

"لو...... ہم سامنے آگئے...... بتاؤ ہمیں کیوں بلایا ہے؟"

ادھر شیر کے منہ سے آواز نکل رہی تھی...... ادھر اس کے منہ سے بڑے بڑے انگارے نیچے گر رہے تھے۔ بزرگ محترم کوئی دلچسپ تماشہ دیکھنے والے بچے کی طرف بے حد خوش دکھائی دے رہے تھے۔

"ارے بھئی! تم لوگ اتنے اچھے بازی گر ہو تو...... اس گھر میں رہنے والوں کے ساتھ مل جل کر کیوں نہیں رہتے۔؟ ان کو اپنا کھیل تماشہ دکھاؤ اور گھر کے ایک طرف پڑے رہو۔ اور وہ لوگ ایک طرف رہیں۔ شانتی اور امن وامان کا مظاہرہ کرو۔ ایک دوسرے سے مل کر میل محبت کا مظاہرہ کرو۔"

"نہیں......!!" عجب الخلقت شیر دھاڑا۔ اور اس کے منہ سے ڈھیر سارے انگارے نیچے گرے۔ "یہ گھر ہمارا ہے...... بلا شرکت غیرے...... ہمارا اور صرف...... اس میں ہم کسی کی شرکت برداشت نہیں کرسکتے۔ ان لوگوں سے کہئے اپنا بوریا بستر اٹھا کر یہاں سے چلے جائیں۔ اب تک ہم نے بہت صبر وضبط سے کام لیا ہے کہ ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ مگر تم ہمارے دہشت انگیزی کا خود اندازہ لگالو کہ ہم ان کے لئے کس

قدر خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں۔؟"

بزرگ نے چند لمحوں تک خاموش رہ کر کچھ سوچا۔ پھر بولے۔ "اچھا...... ٹھیک ہے یہ لوگ اس گھر سے بے دخل ہوجائیں گے...... مگر......"

"ارے ارے......" سلطان صاحب کے دونوں بیٹوں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "پیرومرشد یہ کیا کررہے ہیں۔ ہماری بےدخلی کا معاہدہ کررہے ہیں۔!!"

سلطان صاحب نے انہیں خاموش رہنے کی تلقین کرتے ہوئے سرگوشی ہی کے انداز میں کہا۔ "خاموشی سے تماشہ دیکھو...... پیرومرشد کی پوری بات سنو۔"

وہ کہہ رہے تھے۔ "مگر ایک کاغذ پر آپ لوگوں کو ایک معاہدہ لکھ کردینا پڑے گا۔"

"کیسا معاہدہ؟"

"اس بات کا وعدہ کرنا پڑے گا کہ ان لوگوں کے جانے کے بعد اس گھر میں جب بھی جو کوئی بھی آئے، تم لوگ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔ بغیر نقصان پہنچائے یہاں سے جانے پر مجبور کروگے۔"

شیر نے زور سے قہقہہ لگایا۔ یوں لگا جیسے گھر کے در و دیوار لرز کر رہ گئے ہوں۔ "لاؤ لاؤ...... کاغذ قلم...... اس معاہدے پر دستخط کرنے پر مجھے کیا تامل ہوسکتا ہے۔ مجھے معلوم تھا میری دہشت ناک شکل و صورت دیکھ کر تم لوگوں کے لئے دم دبا کر بھاگنا ہی واحد آپشن ہوگا۔"

سلطان صاحب بھی اندر ہی اندر کسمسا کر رہ گئے۔ "کیا باباجی سچ مچ ہمیں یہاں سے نکلوانے کے ارادہ کررہے ہیں۔؟"

دوسری طرف باباجی بڑے طمینان سے ایک کاغذ پر کچھ لکھ رہے تھے۔ پھر اس کاغذ کو انہوں نے قلم میں لپیٹا۔ اور اس کو دھاگے سے باندھ کر شیر کی طرف اچھال دیا۔ یوں لگا جیسے ایک ہاتھ نے آگے بڑھ کر قلم تھام لیا۔ پتہ نہیں یہ ہاتھ شیر کے بدن سے کیسے اور کہاں سے نکلا تھا۔ اس ہاتھ نے دھاگہ کھول کر کاغذ کی تحریر پڑھی۔

"واہ...... یہ بھی کوئی وعدہ ہے؟ ایسے تو ایک ہزار ایک وعدے پر میں دستخط کرسکتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے کاغذ پر دستخط کرنے کی کوشش کی مگر قلم چل کر نہیں دیا۔ ایک دوبار کوشش کرنے کے بعد اس نے بچوں کی طرح قلم کی نوک منہ میں رکھ کر اسے تر کرنے کی کوشش کی۔ پتہ نہیں قلم تر ہوا یا نہیں...... لیکن خوفناک شیر تر بتر ہوگیا۔ ایسا لگا کہ شیر پسینے میں شرابور ہوگیا ہو...... اس کے بدن سے پانی کے قطرے ٹپ ٹپ ٹپکنے لگے...... وہ اتنا مضطرب اور بےچین لگ رہا تھا جیسے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی ہو۔ مگر عجیب بات تھی کہ اس کے منہ سے بےچینی کی کیفیت میں جب بھی غراہٹ کی آواز نکلتی...... اس کے جسم سے بڑے بڑے انگارے نیچے گرتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سر پر بیٹھا بچھو بھی انگاروں کی شکل میں ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرگیا۔ جن چار اژدھوں کے سہارے شیر کھڑا تھا...... ان کے بھی آہستہ آہستہ کس بل ڈھیلے ہونے لگے۔ وہ چاروں ستون بھی تھوڑی دیر بعد پگھلی ہوئی آگ کی صورت بہہ گئے۔ بچا کھچا شیر بھی دھپ سے نیچے گرگیا اور انگاروں کی صورت میں بکھر گیا...... کچھ دیر تک تو انگارے جلتے بجھتے رہے۔ پھر ایک دم بجھ کر راکھ کی ایک مختصر سی ڈھیر بن کر رہ گئے۔

"خس کم...... جہاں پاک۔" یہ بزرگ محترم کی اطمینان بھری آواز تھی۔

ذرا دیر بعد سلطان صاحب اور ان کی فیملی کے ساتھ بزرگوار ڈرائنگ روم میں بیٹھے کہہ رہے تھے۔ "گھر...... گھر...... گھر...... انسان ہو یا جن...... گھر کے لئے کیا کیا تگڑم بازی نہیں کرتا۔ اگرچہ یہ گھر اس کا مستقل ٹھکانا نہیں۔ ایک دن اسے بہرحال یہاں سے جانا ہے۔ پھر اس گھر کے لئے اتنا اودھم مچانا کہاں کی دانشمندی ہے؟ جو مستقل گھر ہے...... جہاں ہمیشہ رہنا ہے اس کی فکر کوئی نہیں کرتا۔"

نہلے پہ دہلا

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

لڑکی اپنا چھوٹا سا پستول پکڑے کھڑی تھی کہ اچانک اس کے محبوب نے اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان فائر کیا تو زمین پر گرنے سے پہلے وہ مرچکی تھی، بھلا وہ ایک پیشہ ور قاتل کی گولی کا کیسے مقابلہ کرسکتی تھی لیکن......

حرص و لالچ کی ایک عجیب و غریب ذہن پر نقش ہونے والی پراثر اور سبق آموز کہانی

ٹریوس اور تارا دونوں ایک متمول علاقے میں رہائش پذیر تھے لیکن ہر وقت مزید لالچ میں رہتے تھے۔ ٹریوس کا زیادہ وقت گھر سے باہر گزرتا تھا اور جب بھی وہ گھر واپس آتا اس کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوتیں۔ تارا اس کی محبوبہ تھی اور اس کے ساتھ ہی اس گھر میں رہتی تھی لیکن ان کو ابھی تک شادی کے متعلق سوچنے کا وقت نہیں ملا تھا۔ تارا کو دولت کی خوشبو بہت اچھی لگتی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے ٹریوس سے بھی محبت تھی۔

بعض اوقات وہ سوچتی اور حیران ہوتی کہ آخر ٹریوس ایسا کون سا کام کرتا ہے جس کے بدلے اسے اتنی زیادہ رقم حاصل ہوتی ہے لیکن اس کے پاس اس قسم کے موضوعات پر سوچ بچار کے لئے زیادہ وقت نہیں تھا کیونکہ اس کا زیادہ تر وقت اس رقم کو خرچ کرتے،

شاپنگ کرتے اور دوستوں کے ساتھ سیر وتفریح میں صرف ہوجاتا۔

آج بھی تارا بھاگتی ہوئی صدر دروازے پر اس کے استقبال کو پہنچی ''آج تم ایک ہفتے بعد گھر آئے ہو......'' وہ مصنوعی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

''ہاں...... ایک کنٹریکٹ مکمل کرنا تھا......'' ٹریوس کے لہجے میں تھکن تھی۔

''ہنی...... آج ہم ڈنر کرنے کہاں جارہے ہیں......؟'' تارا نے پوچھا۔

''سویٹی...... میں کافی تھک چکا ہوں۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم گھر پر ہی رہیں اور پیزا آرڈر کریں۔''

''ٹھیک ہے...... جیسا مناسب سمجھو......'' تارا نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

''مجھے کچھ بزنس کال بھی کرنی ہیں۔''

''ٹھیک ہے......'' تارا چپ ہوگئی۔

''شکریہ سویٹی......'' اس نے تارا کے ماتھے پر بوسہ دیا اور خود اسٹڈی روم کی طرف بڑھ گیا۔

پیزا آرڈر کرنے کے بعد تارا اسٹڈی کی طرف گئی۔ دروازہ حسب معمول بند تھا۔ کچھ عرصہ پہلے ٹریوس نے اس کمرے کو ساؤنڈ پروف بنوا دیا تھا۔ بظاہر اس لئے کہ باہر سے ٹی وی کا شور اسٹڈی میں سنائی نہ دے۔ تارا کو یہ سب بہت برا لگا تھا، آخر ٹریوس اندر کیا کرتا تھا؟ وہ کیا چھپا رہا تھا۔ کیا اس کا کسی اور کے ساتھ بھی تعلق ہے؟ یہ ممکن تھا کہ ہر اس شہر میں جہاں وہ کاروبار کے سلسلے میں جاتا ہو اس کی کوئی نہ کوئی محبوبہ ہو لیکن وہ اس کے متعلق کیسے جان سکتی تھی۔ مسئلہ وفا یا بے وفائی کا نہ تھا یہ بھی نہیں کہ وہ ٹریوس کی زندگی میں کوئی اور عورت برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ مسئلہ صرف یہ تھا کہ کوئی اور عورت اس کے حق کی اس رقم پر قبضہ کرسکتی تھی جو اسے ٹریوس سے حاصل ہوتی تھی اور جس کی آج کل وہ بلا شرکت غیرے مالک تھی۔ دوسری عورت آنے کا مطلب ہوتا...... نہ کلب کی زندگی، نہ مزید شاپنگ، نہ کچھ اور، بلکہ ہوسکتا ہے کہ وہ اس پر تعیش اپارٹمنٹ سے سڑک پر آجاتی۔ اپنی تعلیم مکمل کیے تارا کو دس سال گزر چکے تھے مگر آج تک اپنی بزنس کی ڈگری استعمال کرنے کا اسے موقع نہیں ملا تھا اور اسے امید بھی نہیں تھی کہ وہ کوئی ایسی جاب حاصل کرپاتی جو اس کے موجودہ معیار زندگی کو برقرار رکھ سکے کیونکہ وہ دفتر سے زیادہ بیڈروم کے معاملات میں ماہر تھی۔

تارا بھاگتی ہوئی بیڈروم میں گئی وارڈ روب کو کھولا اور ایک دراز کھینچ کر باہر نکالا، عقبی خانے میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی مشین نما کوئی چیز نکال لی جو اس نے حال ہی میں ایک ویب سائٹ سے دیکھ کر خریدی تھی یہ ڈاکٹروں کے اسٹیتھو اسکوپ سے ملتی جلتی چیز تھی جس کے متعلق کمپنی کا دعویٰ تھا کہ اس کی مدد سے دیواروں اور بند دروازوں کے پیچھے ہونے والی گفتگو بھی سنی جاسکتی ہے۔

اس آلے کو اپنی پشت پر چھپا کر وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی اسٹڈی کے دروازے پر پہنچی جس کا دروازہ بدستور بند تھا۔ جب اس نے اس آلے کا ہیڈ فون اپنے کانوں پر لگایا اور اس کا دوسرا سرا دروازے پر رکھا تو اس کا دل یوں دھک دھک کررہا تھا جیسے ابھی سینہ پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔ والیوم والے بٹن کو گھما کر اس نے اس کو ایڈجسٹ کیا اب اس کے کانوں میں کمرے کے اندر سے آنے والی آوازیں پڑ رہی تھیں۔

''...... وہ اپنے کپڑے بدلنے کے بعد اب کمرے میں ادھر ادھر گھوم رہی ہے، اس کا جسم بہت دلکش ہے، اگرچہ اس کو اس بات کا علم نہیں کہ میں اس کو دیکھ رہا ہوں لیکن یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنی حرکتوں سے مجھے غصہ دلا رہی ہے۔ اب وہ جاکر اپنے بستر پر لیٹ گئی ہے اور اس نے روشنیاں بجھا دی ہیں، میں چند منٹ تک اس کے اونگھنے کا انتظار کروں گا اور پھر میں اپنا کام شروع کردوں گا اب وہ مجھ سے نہیں بچ سکتی۔''

تارا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ٹریوس کس کو رپورٹ دے رہا تھا اور کس کے متعلق بات کررہا تھا کیا وہ کسی کو دیکھ رہا تھا اور

وہ کیا کرنا چاہ رہا تھا...... کیا اب وہ باہر جائے گا......

بات جوں جوں تارا کی سمجھ میں آرہی تھی اس کے کان کی لوئیں بھی گرم ہوتی جارہی تھیں۔ اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی اس نے اپنا ایک ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیا۔ وہ پنجوں کے بل بھاگتی ہوئی بیڈروم میں گئی اور اس آلہ سماعت کو فوراً اس کی خفیہ جگہ پر چھپا دیا، دراز بند کرکے وہ جونہی مڑی اپنی جگہ پر ٹھٹک کر رہ گئی۔ ٹریوس دروازے میں کھڑا تھا...... ''تم......؟'' تارا نے اپنے لہجے کو حتی الامکان پرسکون رکھنے کی کوشش کی۔

''پیزا آگیا کیا......؟ مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے...... تم نے یقیناً لارج پیزا کا آرڈر کیا ہوگا۔'' ٹریوس نے پوچھا۔

''ہاں...... تارا اس کے قریب ہوتی ہوئی بولی، ٹریوس نے اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا اور اپنی آغوش کا حلقہ تنگ کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ایک کام یاد آگیا ہے...... جب تک پیزا آتا ہے میں بھی واپس آجاتا ہوں......'' اور پھر تارا کے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس نے اپنا کوٹ اٹھایا اور ایک ہوائی بوسہ اچھالتے ہوئے باہر نکل گیا...... تارا دم بخود کھڑی اسے دیکھتی رہ گئی...... ''آخر وہ کہاں گیا ہے......؟'' تارا کے ذہن میں ٹریوس کی کسی عورت کے متعلق ہونے والی گفتگو ابھرنے لگی۔ اس کا دل ودماغ غصے سے بھر گیا۔

اگلی صبح جونہی ٹریوس ایئر پورٹ کے لئے روانہ ہوا، تارا نے ایک ہیجان انگیز لباس پہنا اور ٹریوس کے وکیل جان سے ملنے نکل کھڑی ہوئی۔ جیسے ہی تارا وکیل کے دفتر میں داخل ہوئی جان کی نگاہ اس پر جم گئی۔ لباس کا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ تارا نے سوچا کہ اس کی ادائیں کسی کو بھی دیوانہ کردینے کے لئے کافی ہیں۔

''میں تمہارے لئے کیا کرسکتا ہوں تارا......؟'' جان کی بے باک آواز نگاہیں تارا کے جسم سے الجھ رہی تھیں۔

''میں صرف اپنے تجسس اور تسلی کے لئے پوچھ رہی ہوں جان...... کیا ٹریوس نے اپنی وصیت میں کوئی تبدیلی کی ہے......؟''

''نہیں...... کیوں......؟'' جان نے حیرت سے جواب دیا۔

''تم تو جانتے ہو مجھے ہر چیز کی فکر رہتی ہے......'' وہ انداز دلربائی سے مسکرائی۔

''...... لیکن تمہیں کیا فکر ہے تارا...... تمہیں تو ٹریوس اپنی جان سے بھی زیادہ چاہتا ہے۔''

''یہ تو میں جانتی ہوں......'' وہ زہر خند لہجے میں بولی اور پھر کہنے لگی۔ ''آج تو میں یہاں اپنی ایک دوست کے مسئلے کی وجہ سے آئی ہوں......''

''بولو......'' جان پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''اصل میں یہ میری ایک دوست کا مسئلہ ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس کا شوہر اسے دھوکہ دے رہا ہے۔ اس لڑکی نے کئی دفعہ پولیس میں شکایت درج کرائی مگر اس کے خاوند کے پولیس میں کئی دوست موجود ہیں جو اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہونے دیتے، لہٰذا اب وہ کسی بھی طرح اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہے۔''

''اوہ...... ٹھیک ہے۔ لیکن تم جانتی ہو میں طلاق کے کیس نہیں لیتا۔''

''میں جانتی ہوں لیکن وہ لڑکی بھی طلاق نہیں چاہتی، اس کے شوہر نے اسے دھمکی دی ہے کہ اگر اس نے اسے چھوڑنے یا طلاق لینے کی کوشش کی تو وہ اسے مروادے گا۔''

''یہ تو کھلی غنڈہ گردی ہے......'' جان نے کہا۔

''ہاں بالکل...... اور میرا خیال ہے کہ تم کسی ایسے شخص کو جانتے ہوگے جو......'' تارا کی بات ادھوری رہی گئی اور جان بول اٹھا۔

''کیا...... کیا مطلب ہے تمہارا......؟''

''...... کوئی ایسا شخص جو اس آدمی کا ساتھ دے رہا ہو یا دے سکتا ہو......'' تارا نے اپنی بات مکمل کی۔

جان کی تیوری پر بل پڑگئے۔ ''رکو...... تم نے یہ

کیسے سمجھ لیا کہ اس قسم کے لوگوں سے میرا تعلق ہے......؟'' وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور میز کے پیچھے سے نکل کر اس کے قریب آیا اور دوبارہ بولا۔ ''بہتر ہے کہ اب آپ تشریف لے جائیں اور مجھے اپنا کام کرنے دیں۔''

تارا اٹھی اور ایک قدم اس کے نزدیک ہوگئی۔ اس کا جسم جان کے جسم سے چھو رہا تھا، تارا نے اس کا بازو تھاما اور آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''پلیز جان...... میں نے تم سے مدد چاہی اس کے لئے معذرت خواہ ہوں...... لیکن اس کے بغیر گزارا بھی نہیں تھا کیونکہ میں نہیں جانتی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ وہ لڑکی بہت پریشان، مایوس اور خوف زدہ ہے۔ اس مرد کے قدموں کی چاپ سے ہی اس کا خون خشک ہو جاتا ہے۔ مجھے امید تھی کہ تم میری اتنی مدد ضرور کرو گے اور میری رہنمائی کرو گے کہ مجھے مدد حاصل کرنے کے لئے کہاں جانا چاہیے......

جان نے ایک لمحہ کے لئے اس کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔ ''میں ایک وکیل کو جانتا ہوں، میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، بس صرف جانتا ہوں کیونکہ اس نے ایک کانفرنس کے دوران میں مجھے اپنا وزٹنگ کارڈ دیا تھا، اس کا کوئی دفتر نہیں ہے وہ چل پھر کر اپنا کام کرتا ہے، اس کی کار ہی اس کا دفتر ہے۔'' وہ چند لمحے رکا پھر بولا۔ ''ٹھہرو مجھے دیکھنے دو۔'' پھر وہ اپنی میز کے گرد چکر لگا کر اپنے کمپیوٹر تک پہنچا اور چند ایک بار ماؤس کو کلک کرنے کے بعد وہ بولا۔ ''ہاں یہ رہا اس کا ایڈریس......

'' پھر اس نے اس شخص کا نام اور فون نمبر باآواز بلند پڑھا جسے تارا نے اپنی نوٹ بک میں لکھ لیا۔

''معلوم نہیں یہ شخص تمہیں کوئی مفید مشورہ دے بھی سکے گا یا نہیں...... لیکن تم اسے ایک بار آزما لو......'' جان نے مشورہ دیا۔

''شکریہ جان......'' تارا نے ایک جان لیوا مسکراہٹ جان کی طرف اچھالی۔

جان نے دروازے تک اس کی رہنمائی کی اور کہنے لگا۔ ''کسی سے ذکر مت کرنا کہ اس شخص کا نام میں نے تمہیں بتایا ہے۔ میں اس گندے کام میں شریک نہیں بننا چاہتا۔''

بیس منٹ تک ڈرائیو کرنے کے بعد تارا ایک پی سی او کے سامنے رک گئی وہ اپنے مطلوبہ شخص سے سیل فون کے نمبر سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''ہیلو!...... کیا میں مسٹر جانسن سے بات کر سکتی ہوں......؟'' نمبر ملتے ہی اس نے پوچھا۔

''یس میڈم...... اٹارنی ایٹ لاء آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہے۔'' دوسری طرف سے شائستہ آواز آئی۔

''مجھے کسی دوست سے آپ کا نمبر ملا ہے'' اس کے بعد تارا نے اپنے مسئلے کے متعلق تمہید باندھنا شروع کی۔ جانسن نے پہلے پہل تو اس کو ٹالنا چاہا مگر پھر کچھ بحث اور ردوقدح کے بعد نرم پڑ گیا اور اس کو کسی اور شخص کا فون دے دیا کہ وہ تارا کا مسئلہ حل کر سکتا ہے۔

''جس کا فون نمبر مجھے آپ نے دیا ہے اس کا کیا نام ہے......؟'' تارا نے دریافت کیا مگر کوئی جواب ملنے کے بجائے لائن ڈیڈ ہوگئی۔ تارا نے پھر دوسرا نمبر ڈائل کیا۔

''معافی چاہتی ہوں...... میں آپ کا نام نہیں جانتی مگر مجھے کسی نے آپ کا نمبر دیا ہے......''

''کام بتاؤ......'' اس سے پہلے کہ تارا تمہید باندھتی دوسری طرف سے کسی مرد نے سرد لہجے میں اس کو ٹوک دیا۔

آواز یوں تھی جیسے کوئی گہرے کنوئیں میں سے بول رہا ہو۔ تارا نے خیال کیا کہ ممکن ہے کہ وہ کسی میکانکی آلے کی مدد سے اپنی آواز بدل کر بول رہا ہو۔ مگر اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی اسے تو بس اپنے مسئلے کی فکر تھی۔

''یہ میرا شوہر ہے اور جمعہ کی رات کو گھر پر ملے گا......'' تارا نے فون پر اپنا مسئلہ بیان کرنے کے بعد

اپنا ایڈریس لکھوایا۔

جب ٹریوس جمعہ کی رات کو گھر پہنچا، تارا لذیذ کھانوں کے ساتھ ڈنر پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ اس کے ساتھ لپٹ گئی اور اپنے پیار کا بے تحاشہ اظہار کرنے لگی، کھانے کے بعد وہ آئس کریم لینے کچن میں چلی گئی۔ جب وہ لوٹی تو ٹریوس صوفے پر نیم دراز اونگھ رہا تھا۔

''آئس کریم تو ختم ہو چکی......'' تارا نے اسے اطلاع دی مگر ٹریوس نے کوئی جواب نہ دیا۔

''ہنی...... اٹھو...... آئس کریم ختم ہو چکی ہے۔'' تارا نے اس کا شانہ دھیرے سے ہلایا۔

''میں کافی تھک چکا ہوں مجھے تھوڑی دیر سو لینے دو......'' ٹریوس نے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

''پلیز...... اٹھو نا...... مجھے آئس کریم چاہیے......'' اب تارا نے ذرا سختی سے اس کا شانہ ہلایا۔ اس کا سارا پلان چوپٹ ہو رہا تھا۔ ٹریوس اب خراٹے لینا شروع ہو گیا تھا۔

''ہنی...... اگر تم آئس کریم لا دو تو میں تمہارے پسندیدہ سگریٹ کا ایک کارٹن لا کر تمہیں دے سکتی ہوں...... تارا نے لالچ دیا۔

''او کے...... وہ مجبوراً اٹھا اور اپنا لباس درست کرنے لگا۔ جیسے ہی وہ دروازے سے باہر نکلا تارا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگنے لگی۔ ''شکریہ پیارے!...... تم بہت اچھے ہو اب کام بن جائے گا......'' تارا نے سوچا اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا، وہ بیڈ روم میں گئی اور بیڈ پر لیٹ گئی۔ اب وہ امیر ہو جائے گی، ساری رقم اس کی اپنی ہوگی، اس کے تصور میں وہ تمام چیزیں گھومنے لگیں جو وہ خریدنا چاہتی تھی۔

اب تارا کو کسی بھی وقت پولیس کی فون کال کا انتظار تھا لیکن اس کے بجائے اس کو مرکزی دروازے پر چابی گھومنے کی آہٹ سنائی دی، اس کی نگاہ فوراً گھڑی پر گئی ٹریوس کو گئے آدھ گھنٹہ ہو چکا تھا اس سے پہلے کہ وہ بیڈ سے اٹھتی دروازے پر ٹریوس نمودار ہوا۔

خوشخبری

طلسماتی انگوٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورۂ یاسین کے نقش پر فیروزہ، یمنی، عقیق، پکھراج، لاجورد، نیلم، زمرد، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاءاللہ جو بھی یہ طلسماتی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو تکیے کے نیچے رکھنے سے لاٹری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہو جائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مائل، نافرمان اولاد، نیک، میاں کی عدم توجہ، جج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مرد و عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہوگا۔ یاد رکھو سورۂ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد

0333-3092826-021-2446647

M-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر

بالمقابل سندھ مدرسہ کراچی

اسے دیکھتے ہی تارا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''مجھے دیکھ کر حیران ہو گئی ہو......؟'' ٹریوس مسکرایا۔

''نہیں...... بلکہ پریشان ہوں کہ تم نے اتنی دیر کہاں لگا دی......؟'' تارا نے بات بناتے ہوئے کہا۔

''تم غلط کہہ رہی ہو...... تمہیں مجھ سے دیر کی توقع نہیں تھی بلکہ تمہارے خیال میں تو میں ہمیشہ کے لئے چلا گیا تھا......''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو...... میں تو تمہارے متعلق فکر مند تھی......''

''اچھا...... پھر تم نے میرے سیل فون پر مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کیا......؟''

''مم...... میں تو...... وہ......'' تارا گڑبڑا گئی۔

''تم نہیں بتا سکتیں لیکن مجھے معلوم ہے کیوں......'' ٹریوس نے کہا۔

تارا کو محسوس ہوا کہ وہ گہری دلدل میں پھنس رہی ہے، ڈوب رہی ہے۔ اسے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔

''......اس لئے کہ تمہارے خیال اور پلان کے مطابق میں مر چکا تھا......'' ٹریوس نے کوئی جواب نہ پا کر اپنی بات مکمل کی۔

''...... میں نہیں جانتی تم کیا کہہ رہے ہو......'' تارا بولی۔

''تم کیا سمجھتی تھی کہ جان مجھے کچھ نہیں بتائے گا......؟ ٹریوس کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔ اب اس بات کے بعد تارا کے لئے تردید کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

''......آئی ایم سوری...... میں نہیں جانتی کہ میرے ذہن میں کیا آ گیا تھا، میرا دماغ خراب ہو گیا تھا، مجھے تمہاری مدد چاہیے، لگتا ہے مجھے کسی ماہر نفسیات کی ضرورت ہے۔'' تارا نرم پڑ گئی۔

''کیوں نہیں...... تمہارے لئے سب کچھ مجھے ہی تو کرنا پڑتا ہے......'' ٹریوس نے طنز کیا۔

''اس طرح بات مت کرو تم بھی کوئی پارسا نہیں ہو...... میں نے تمہیں خود اس عورت کے متعلق بات کرتے سنا جس کے ساتھ تم تھے......'' تارا نے پھر جوابی حملہ کیا۔

''کیا......'' ٹریوس نے حیرت ظاہر کی۔

''گزشتہ جمعہ کی رات...... جب تم اپنے اسٹڈی روم میں تھے میں نے تمہیں کہتے سنا کہ جب وہ سو جائے گی تو تم اپنا مقصد پورا کر لو گے......'' تارا نے اسے یاد دلایا۔

''......اور تم نے سوچا کہ میرا اس عورت سے کوئی غلط تعلق ہے۔''

''اب تم کہو گے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے...... مجھے غلط فہمی ہوئی ہے......'' تارا کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''نہیں ایسا کچھ نہیں کہوں گا...... تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے......'' ٹریوس اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کے عقب میں چلا گیا۔

''......اور جو کچھ میں نے سنا وہ بھی غلط تھا......'' تارا چلائی۔

''نہیں وہ بھی درست تھا...... لیکن میرا اور اس کا جسمانی تعلق نہیں بلکہ یہ تعلق تھا......'' ٹریوس کے ہاتھ میں ایک پستول تھا۔ اس نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور سائلنسر نکال کر پستول کی نالی کے آگے فٹ کر دیا۔ ''مجھے اس عورت کو اس کی زندگی سے آزاد کرنا تھا......''

''یہ تم کیا کر رہے ہو......؟'' تارا نے چیختے ہوئے اپنے بچاؤ کے لئے دونوں ہاتھ آگے کر دیئے۔

''میں وہ کر رہا ہوں جو مجھے زندہ رہنے کے لئے کرنا چاہیے۔''

''تم نے تو مجھے بتایا تھا کہ تم چیزیں بیچنے کا کاروبار کرتے ہو......''

''لیکن جب میں گھر میں بڑی بڑی رقمیں لاتا تھا تب تو تم نے ایسا کوئی سوال نہیں کیا تھا۔'' وہ پستول

سے اس کا نشانہ لیتے ہوئے بولا۔

''رکو...... وہ شخص کون تھا جس کا فون نمبر مجھے وکیل جانسن نے دیا تھا...... کیا وہ تم تھے جو آواز بدل کر بول رہا تھا......'' تارا کے چہرے پر حیرت تھی۔

ٹریوس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اور وہ بولا۔ ''تمہارا لہجہ اور انداز فون پر بہت ہی پیارا اور عمدہ تھا...... سوچو ذرا...... شکار بھی میں اور شکاری بھی میں ہی...... اور ویسے میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ جان ہی وہ شخص ہے جو میرے لئے کام تلاش کرتا ہے۔ اور اسی نے تمہیں آگاہ کیا ہو گا......''

تارا نے کہا۔ ''ہاں...... وکالت تو صرف ایک پردہ ہے...... وہ اس طرح کے کیس لے کر مجھے اور مجھ جیسے کئی اور لوگوں کو دیتا ہے۔''

''بہت خوب ہنی!......'' تارا دلنشین انداز میں مسکرائی۔ ''تمہارے متعلق میرا یقین غلط نہیں تھا تم جو بھی کام کرتے ہو مکمل اور بے داغ کرتے ہو۔ تم پرفیکٹ ہو......''

''شکریہ......'' ٹریوس نے پستول جھکا لیا، کیا وہ اس عورت کو قتل کر سکتا تھا جس سے اس نے ٹوٹ کر محبت کی تھی اس کو یہ جان کر بہت بڑا جھٹکا لگا تھا کہ یہ عورت اس کو قتل کروانا چاہتی ہے لیکن اب اس کو علم ہو گیا تھا کہ اس عورت کی یہ حرکت حسد اور جلن کا نتیجہ تھی وہ اس کو کسی اور کے پہلو میں نہیں دیکھ سکتی تھی وہ اس کو گنوانا نہیں چاہتی تھی یا دوسرے لفظوں میں اس کی دولت کو گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن جو بھی ہوا، اسے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ اس نے تارا کے متعلق جو سمجھا وہ غلط تھا اس سارے معاملے میں کوئی دوسرا مرد ملوث نہیں تھا۔

''پلیز ہنی!......'' تارا منمنائی۔

ٹریوس نے پستول واپس رکھ لیا اور بولا۔ ''تم نے یہ سب دولت کے لئے کیا ہے نا...... اس لئے میں تمہیں چند روز دیتا ہوں...... یہاں سے دفع ہو جاؤ لیکن جو کچھ اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہو لے جاؤ......''

فرمانبردار

جن: کیا حکم ہے میرے آقا؟

آدمی: میرے گھر سے امریکہ تک سڑک بنا دو۔

جن: بہت مشکل، کوئی اور کام بتایئے۔

آدمی: میری بیوی کو میری فرماں بردار کر دو۔

جن: سڑک سنگل بنانی ہے یا ڈبل۔

(انتخاب: شمس الحق۔کراچی)

''شکریہ......'' تارا نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔

تارا کو وہیں کمرے میں چھوڑ کر ٹریوس باہر چلا گیا۔ جب وہ دروازے تک پہنچا تو اسے اپنے پیچھے پستول کا دھماکہ سنائی دیا، انگارے اس کی ٹانگ میں جل اٹھے تھے، گولی اس کی ٹانگ میں گھس گئی تھی وہ گھوم گیا اور پھر اس سے پہلے کہ اپنی پستول نکال پاتا دو مزید گولیاں اس کے سینے میں اتر گئیں۔

گرتے گرتے بھی ٹریوس نے تارا کی آنکھوں میں لالچ بھری مسکراہٹ دیکھ لی تھی، وہ اپنا چھوٹا سا پستول پکڑے کھڑی تھی۔ ٹریوس نے اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان فائر کیا اور تارا زمین پر گرنے سے پہلے ہی مر چکی تھی۔ ایک پیشہ ور قاتل کی گولی کا وہ بھلا کیسے مقابلہ کر سکتی تھی لیکن اس کی چلائی ہوئی دونوں گولیاں بھی ٹریوس کے لئے مہلک ثابت ہوئی تھیں۔

ٹریوس فرش پر خون میں لت پت گرا پڑا تھا، وہ حرکت کرنے سے بھی معذور تھا، زندہ رہنے کی بے تحاشہ جدوجہد کر رہا تھا۔ بہتے خون کے درمیان اس کے ذہن پر تاریکی چھاتی جا رہی تھی۔

رولوکا

تحریر: اے وحید

قسط نمبر: 84

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

شانتی پور بہت ہی سرسبز وشاداب گاؤں تھا، ہر طرف ہریالی اور خوشحالی نظر آتی تھی، اس گاؤں میں ہندو مسلم دونوں ہی شیر وشکر کی طرح رہتے تھے، ایک دن سندری نام کی ایک دوشیزہ کی ایک فلک شگاف چیخ سنائی دی۔ بعد میں پتہ چلا کہ سندر کسی ہوائی مخلوق کے جھپیٹے میں آ گئی ہے، اس کے گھر والے گاؤں میں موجود مسجد کے پیش امام صاحب کو بلالائے، پیش امام صاحب نے سختی کی اور پھر سندری پر موجود جن کو جلا کر خاکستر کردیا اور اس طرح سندری کی جان اس جن سے چھوٹ گئی، اس واقعہ کے چند ماہ بعد ہی پیش امام صاحب کا انتقال ہوگیا۔ کچھ عرصہ بعد پھر نہ جانے شانتی پور کو کسی کی نظر لگ گئی۔ ہونے یہ لگا تھا کہ ہر رات ایک آدمی کی موت واقع ہونے لگی، کمال کی بات یہ تھی کہ جو بھی مرتا وہ مرد ہوتا، کسی بھی عورت کی موت واقع نہیں ہوتی تھی۔ گاؤں والوں نے لاکھ جتن اور بچاؤ کے تدبیر کر ڈالے مگر کوئی بھی رات ایسی نہیں ہوتی کہ اس رات کوئی فرد نہیں مرتا تھا۔ گاؤں والے جب تھک گئے تو اس گاؤں کا ایک فرد سلیم الدین دلی حکیم وقار کے مطب میں پہنچا اور آنسو بہاتے ہوئے گاؤں کی ساری بپتا رولوکا کے گوش گزار کردی۔ ایک دن صبح ہی صبح رولوکا شانتی پور آ گیا۔ اس روز بھی ایک موت رامو نام کے شخص کی ہوئی تھی۔ اسے سانپ نے کاٹا تھا۔ رولوکا ایک جگہ بیٹھ کر ایک چوکور دائرہ بنایا اور چاروں کونوں پر ایک ایک کوڑی رکھ دی۔ رولوکا نے کچھ پڑھتے ہوئے اپنی انگلی ان کوڑیوں کی طرف اٹھائی تو چاروں کوڑیاں فضا میں معلق ہوئیں اور چاروں سمت میں پرواز کرگئیں۔ چند منٹ بعد تین کوڑیاں واپس آ گئیں اور ایک کوڑی واپس نہیں آئی اس کے بعد رولوکا نے ان تینوں کوڑیوں کو بھی اس سمت بھیج دیا۔ جس سمت میں ایک کوڑی رک گئی تھی دس پندرہ منٹ بعد اس سمت سے ایک زبردست سانپ آتا نظر آیا۔ دو کوڑیاں اس سانپ کی دونوں کنپٹیوں میں چپکی تھیں ایک کوڑی نیچے ٹھوڑی میں جبکہ ایک کوڑی سر پر ضرب لگا رہی تھی۔ سانپ رولوکا کے سامنے آیا اور رولوکا کے اشارے پر اس طرف بڑھا جدھر رامو بے سدھ پڑا تھا۔ سانپ اس کے قریب گیا اور اپنا منہ رامو کے انگوٹھے پر رکھ کر زہر چوسنے لگا۔ چند منٹ بعد وہ نڈھال ہوکر زمین پر گر گیا تو رولوکا نے اسے اٹھا کر دودھ سے بھرے ایک ناند میں ڈال دیا۔ دوبارہ بھی ایسا ہی ہوا جب سانپ زہر چوسنے کے بعد نیچے زمین پر لڑھک گیا تو رولوکا اپنی جگہ سے اٹھا اور سانپ کو پکڑ کر دودھ سے بھرے دوسرے ناند میں ڈال دیا۔ (اب آگے پڑھیں)

چند لمحے میں دودھ کا رنگ ہلکا نیلا ہوگیا۔

سانپ دودھ میں کلبلاتا رہا پھر وہ آہستہ آہستہ دودھ سے باہر آ کر ناند سے نیچے اترنے لگا۔ نیچے آ کر سیدھا وہ رولوکا کی جانب اس جگہ آ گیا جہاں کہ حصار تھا۔

حصار میں آ کر سانپ خاموشی سے پھن اٹھا کر بیٹھ گیا۔ اس کی قہر آلود آنکھیں رولوکا پر مرکوز تھیں۔ وہ کسی نادیدہ قوت کے زیر اثر مجبور تھا، ورنہ اس کا بس چلتا تو ابھی تک وہ حملہ آور ہو کر رولوکا کا تیا پانچاں کرچکا ہوتا، وہ ٹکٹکی باندھے رولوکا کو دیکھتا رہا۔ مگر رولوکا بھی غافل نہیں تھا رولوکا کی بھرپور نظریں سانپ پر ٹکی ہوئی تھیں اور پھر رولوکا منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ بھی رہا تھا۔

چھ سات منٹ اسی طرح گزر گئے دونوں ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے کہ پھر رولوکا کا ہاتھ اوپر کو اٹھا اور اس نے اپنی انگلی سے سانپ کی طرف اشارہ کیا، کئی اشارے کرنے کے بعد آخر کار طوعاً و کرہاً سانپ اپنی جگہ سے ہلا اور اس طرف بڑھا جدھر چارپائی پر رامو ابھی تک بے سدھ پڑا تھا۔

سانپ چارپائی کے قریب آیا اور زور زبردستی اپنا

منہ رامو کے انگوٹھے پر اس جگہ رکھ دیا جس جگہ اس نے ڈسا تھا۔ چند منٹ تک وہ رامو کے انگوٹھے پر اپنا منہ رکھے زہر چوستا رہا، پھر وہ نڈھال ہو کر ایک طرف کو ہٹ گیا۔

رولوکا اپنی جگہ سے اٹھا اور سانپ کو پکڑ کر دودھ سے بھرے تیسرے ناند میں ڈال دیا۔ دودھ میں سانپ ڈبکیاں کھانے لگا۔ چند منٹ تک وہ دودھ میں رہا مگر اس مرتبہ دودھ کا رنگ نیلا نہیں ہوا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ناند سے نکلا اور آ کر حصار میں اپنی مطلوبہ جگہ پھر پھن کاڑھ کر بیٹھ گیا۔ اور قہر برساتی نظروں سے رولوکا کو دیکھنے لگا۔

رولوکا کے اشارے کے بغیر کسی صورت بھی وہ سانپ حصار سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اب جو دو کوڑیاں جو کہ اس کی کنپٹی میں چپکی ہوئی تھیں۔ وہ علیحدہ ہو کر ہوا میں اڑتی ہوئی اپنی جگہ جا کر ٹک گئیں۔ دونوں کوڑیوں کو علیحدہ ہوتے ہی سانپ اپنی گردن دائیں بائیں گھمانے لگا۔ اس کا معنی یہ تھا کہ اس کی تکلیف میں کمی آ گئی تھی۔ وہ اپنا پھن اٹھاتے ہوئے کچھ مزید اوپر کو اٹھا۔ لیکن اب بھی اس کی نظریں رولوکا پر بدستور جمی ہوئی تھیں۔

رولوکا اپنی شہادت کی انگلی گول دائرے کی شکل میں گھمانے لگا۔ پھر اس نے اپنی انگلی کا رخ سانپ کی طرف کر دیا۔ انگلی کا سانپ کی طرف ہونا تھا کہ اچانک رولوکا کی انگلی سے شعلہ کی ایک تیز لکیر نکلی اور حصار کی طرف بڑھی اور جیسے ہی وہ لکیر حصار سے ٹکرائی تو پورے حصار میں آگ بھڑک اٹھی۔ آگ کو دیکھ کر سانپ بے چین ہو گیا اور ساتھ ہی ساتھ زور دار طریقے سے پھنکارنے بھی لگا تھا۔ اب اس کا پھنکارنا بے سود تھا کیونکہ آگ نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔

آگ آہستہ آہستہ اپنا گھیرا سانپ کے گرد تنگ کرتی جا رہی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے شعلے مزید بلند ہو گئے اور سانپ کے جسم سے لپٹ گئے۔

حصار کے اندر ہی سانپ تڑپنے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے جل کر کوئلہ ہو گیا۔ چند منٹ میں ساری آگ اور شعلے غائب ہو گئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ کوئلہ بنا سانپ اس جگہ موجود تھا۔

رولوکا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اشارے سے سلیم الدین کو پاس بلایا۔ سلیم الدین فوراً لپک کر رولوکا کے قریب آ گئے تو رولوکا نے سلیم الدین سے ایک گلاس پانی منگایا۔ فوراً ایک گلاس پانی آ گیا تو رولوکا نے اس پانی پر کچھ پڑھ کر پھونکا۔ پھر اس پانی کو چلو میں لے کر رامو کے چہرے پر چھینٹا مارا۔ ایک مرتبہ، دو مرتبہ اور پھر تیسری مرتبہ پانی کا چھینٹا مارا تو رامو کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے رامو نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے بعد وہ اپنے سر کو ادھر ادھر گھمانے لگا۔

رولوکا نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور رامو اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد رولوکا نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی۔ اس شیشی میں شاید کوئی دوا تھی۔ ایک گلاس دودھ منگا کر اس دوا کو رولوکا نے دودھ میں ملا دیا اور سارا دودھ رامو کو پلا دیا۔

چند منٹ تک رامو چارپائی پر بیٹھا رہا پھر رولوکا نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اٹھنے کے لئے کہا تو رامو اٹھ کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ ”اب تم بالکل ٹھیک ہو، جاؤ اپنے گھر جا کر آرام کرو۔“ رولوکا بولا۔ رامو اچنبھے میں تھا، اچنبھے کی حالت میں سارے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ بہر حال سلیم الدین کے کہنے پر تین چار لوگ اس کے ساتھ چلنے لگے۔ اب رامو اپنے گھر کی جانب جا رہا تھا۔

رولوکا نے سلیم الدین سے کہا۔ ”تینوں ناند کے دودھ بہتے پانی میں ڈلوا دیں اور جلا ہوا سانپ کا جسم بھی اس پانی میں ڈلوا دیں۔“ رولوکا کے حکم کی فوراً تعمیل ہوئی۔

رولوکا کو چوہدری کے بیٹھک میں بیٹھایا گیا۔ ابھی تک کسی نے بھی رولوکا سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

”حکیم صاحب اگر اجازت ہو تو آپ کے لئے چائے پانی کا انتظام کروں۔“ سلیم الدین نے پہلی مرتبہ اپنا منہ کھولا۔

”بس آپ ایک گلاس پانی پلا دیں، فی الحال کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔“ رولوکا بولا۔

”فوراً گھڑے کا ٹھنڈا پانی آ گیا تو رولوکا گلاس کا سارا پانی پی کر گویا ہوا۔“ سلیم الدین صاحب اب آپ کا گاؤں اس موذی موت سے آزاد ہے۔ گاؤں میں جتنے بھی لوگ مرے ہیں۔ دراصل اس سانپ نے موت سے ہمکنار کیا تھا۔“

یہ سن کر اس جگہ موجود سارے کے سارے لوگ حیران تھے اور سب پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ سارے لوگوں کی آنکھوں میں سوال تھا؟“ کہ سانپ نے کس طرح اتنے لوگوں کو ڈس کر مارا تھا اور پھر طریقہ کار بھی ایک جیسا تھا، اس کے علاوہ سانپ کے ڈسنے کا کوئی بھی نشان مرنے والوں کے جسم پر نظر نہیں آتا تھا؟“

رولوکا بولا۔ ”یہ سانپوں کا جوڑا تھا۔ ایک دن یہ دونوں اپنی موج مستی میں تھے کہ مرنے والوں میں سے کسی نے بروقت ایک کو مار دیا۔ جس سانپ کو اس نے مارا تھا دراصل وہ نر سانپ تھا۔ یہ مادہ بچ گئی تھی اور اس جگہ سے بھاگ کر اپنی جان بچائی تھی۔

لیکن انتقام کا شعلہ اس کے دل دماغ میں بھڑک اٹھا تھا۔ یہ جس فرد کو بھی ڈستی تھی تو رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر، مرنے والوں کے سر میں اپنا ڈنک مارتی تھی۔ اس کا زہر اس قدر تیز تھا کہ مرنے والا تھوڑے ہی وقفے میں موت سے ہمکنار ہو جاتا تھا۔ زہر کی وجہ سے اس کا جسم پھٹنے لگتا تھا۔

یہ ناگن تھی، انتقام کے معاملے میں یہ اندھی ہو چکی تھی، اس کا بس نہیں چلا ورنہ یہ ابھی تک گاؤں کے تمام لوگوں کو ختم کر چکی ہوتی۔ دن میں یہ نکلتی نہیں تھی کہ اس پر کسی کی نظر نہ پڑ جائے اور اگر کسی کی نظر پڑ گئی تو لوگ چوکنے ہو جاتے اور پھر اس سے بچاؤ کی تدبیر ڈھونڈنے لگتے اور پھر کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچ کر اسے ختم کر دیا جاتا۔“

”حکیم صاحب سانپ تو عموماً پاؤں یا پنڈلی پر ڈستے ہیں، یہ طریقہ اس کے دماغ میں آیا کیوں کر؟“ سلیم الدین نے پوچھا۔

رولوکا بولا۔ ”سلیم صاحب صرف انسان ہی عقل نہیں لڑاتا بلکہ جانور بھی بہت عقلمند ہوتے ہیں، اکثر جاندار خطرے کے وقت اپنی عقل استعمال کر کے اپنا بچاؤ کر لیتے ہیں، بس اس کے دماغ میں بھی یہ طریقہ آ گیا کہ سر ایسی جگہ ہے جہاں کہ ڈسنے کا پتہ نہیں چلے گا اور اس نے مرنے والوں کے سر میں ڈسا۔“

”حکیم صاحب! لیکن اس نے رامو کو تو انگوٹھے پر ڈسا، ایسا کیوں ہوا؟“ سلیم الدین نے پوچھا۔

”دراصل یہ صرف مردوں کو ہی مارنا چاہتی تھی، اس نے اب تک کسی عورت کو اپنا نشانہ نہیں بنایا چونکہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے مخالف سمت میں اپنا سر کر کے سوئے تھے اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ دو راتوں سے میں اس کے پیچھے غائبانہ طور سے لگا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ پرسوں رات میں کوئی بھی نہیں مرا تھا، یہ جس طرف بھی جاتی تھی میں اس کے راستے میں رکاوٹ ڈال دیتا تھا۔ پہلی رات تو یہ ناکام واپس چلی گئی۔ آج رات یہ اور غضبناک حالت میں آئی، میں تو اس کے پیچھے لگا ہی پڑا تھا۔ بس مجھے رامو کے گھر میں آتے ہوئے چند منٹ کی دیر ہو گئی۔

یہ بدحواسی کی حالت میں دھوکہ کھا گئی کہ ان دونوں میں مرد کون سا ہے؟ اور اس بدحواسی و گھبراہٹ میں یہ سر کی طرف نہ جا سکی اور اس نے رامو کے انگوٹھے پر اپنا ڈنک مار دیا۔ اگر میں موجود نہ ہوتا تو کسی بھی صورت رامو بچ نہیں سکتا تھا۔ یہ بہت زہریلی ناگن تھی۔

میں کیا بتاؤں بلکہ میرے پاس الفاظ نہیں کہ یہ کس قدر ظالم، ضدی اور زہر والی تھی۔ آپ لوگوں نے دیکھا تھا کہ شروع میں، میں نے چار کوڑیوں کو اس کی تلاش میں بھیجا۔ تین تو واپس آ گئیں مگر ایک کوڑی واپس نہیں آئی، وہ کوڑی اس کے اردگرد منڈلاتی رہی۔ یہ ناگن طاقت میں بہت زیادہ تھی۔

پھر میں نے یکے بعد دیگرے مزید تین کوڑیوں کو اس کی طرف بھیجا تو ان چاروں کوڑیوں نے اسے زبردستی اذیت دیتے ہوئے پکڑ لائیں۔ عام سپیرے جنتر منتر کی پڑھائی یا پھر بین کی آواز سے سانپ پر قابو پاتے ہیں مگر اس پر کسی پڑھائی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے دیوتا کے قدموں میں پڑ کر گڑگڑائی تھی اور دیوتا سے اپنی شکتی و طاقت میں اضافہ

کے لئے روئی تھی، لہٰذا دیوتا نے اس پر رحم کھاتے ہوئے اس کی طاقت میں اضافہ کردیا تھا۔ چند سال بعد ان دونوں میں اتنی طاقت آجاتی کہ یہ انسانی روپ بھی دھار سکتے تھے۔ ان دونوں کی عمر ستانوے سال کی ہوچکی تھی اور اکثر کوئی کوئی سانپ سو سال کی عمر تک پہنچ کر بے پناہ غائبانہ طاقت کا مالک ہوجاتا ہے اس میں یہ صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ جو بھی روپ چاہے دھار سکتا ہے۔

لیکن ہر عروج کو زوال ہے جب کوئی بھی انسان یا پھر جاندار اپنے حدود سے تجاوز کرتا ہے تو قدرت کی طرف سے اس کی پکڑائی شروع ہوجاتی ہے۔ دوسروں پر زیادتی کرنے والا، مخلوق خدا کو نقصان پہنچانے والا بہت جلد اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے، اگر یہ ناگن اپنے حدود سے تجاوز نہ کرتی تو آج یہ اپنے آخری انجام کو نہ پہنچتی۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ دیوی دیوتا اپنے سیوک پر نظر خاص کردیتے ہیں جس سے اس کی غائبانہ طاقت میں کئی گنا اضافہ ہوجاتا ہے اور پھر وہ سیوک اپنی طاقت کے زُعم میں آکر مخلوق خدا کو فائدہ کے بجائے نقصان پہنچانا شروع کردیتا ہے اور جب اس کا ظلم بڑھتا ہے تو ان نادیدہ شکتیوں میں کھلبلی مچ جاتی ہے کہ میں نے خود ہی منش کی بھلائی کے لئے شکتی تھی لیکن یہ تو راون بن بیٹھا، پھر اس ظالم کے گرد ایک دائرہ کھینچ دیا جاتا ہے اور پھر وہ دائرہ آہستہ آہستہ اس ظالم کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرنا شروع کردیتا ہے اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ ظالم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے مٹ جاتا ہے۔

سانپ موذی ہوتا ہے اسے دیکھتے ہی لوگ مارنے کی سوچتے ہیں اور یہی کچھ ان ناگ اور ناگن کے ساتھ بھی ہوا، اس نے بے گناہ اور معصوم لوگوں پر ظلم کیا اور آخر کار یہ خود بھی موت سے ہمکنار ہوگئی۔ اسے قابو کرنے کے لئے بہت زیادہ طاقت کا استعمال کرنا پڑا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ کسی صورت بھی قابو میں نہیں آتی اور پھر لوگوں کو موت کے منہ میں پہنچاتی رہتی۔

اب آپ لوگ بے فکر ہوجائیں، کسی قسم کا ڈر یا خوف نہیں کہ آئندہ پھر کبھی ایسا ہوگا، دین و دنیا کا جو مالک ہے اس کا شکر ادا کریں اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں۔ وقتاً فوقتاً اپنے بندوں کو شہرت دولت اور حکمرانی سے نوازتا ہے تو اس کا اصل مقصد ہوتا ہے کہ "اے انسان میں نے جو تجھے طاقت سے نوازا ہے، تجھے شہرت دی ہے، لوگوں کو تیرے لئے طابع کردیا ہے تو تجھ پر فرض ہے کہ دوسروں کے ساتھ بھلائی کر، لوگوں کے دکھ درد کو دور کرنے میں مددگار بن جا، اپنی ذات سے کسی کو ناحق تکلیف نہ دے۔" مگر انسان اپنی طاقت کے زور پر ظالم بن جاتا ہے کمزوروں اور مظلوموں کو روندنا شروع کردیتا ہے، اپنے پیدا کرنے والے کو بھول جاتا ہے، اس کا ہر حکم پس پشت ڈال دیتا ہے تو پھر پیدا کرنے والا، انسان کی زندگی کی رسی کو کسنا شروع کردیتا ہے اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ اس ظالم کا نام ونشان مٹ جاتا ہے۔

اچھا اب میں چلتا ہوں، ہوسکتا ہے مطب میں کوئی اور بھی میرے انتظار میں بیٹھا ہوگا۔" رولوکا بولا۔

"حکیم صاحب آپ کا یہ احسان ہم گاؤں والے نسل در نسل یاد رکھیں گے، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنا فضل وکرم رکھے آپ کو مزید حوصلہ و ہمت دے کہ آپ مصیبت زدوں کی مصیبت کو دور کرتے رہیں۔ ہم تو کسی لائق نہیں کہ اس نیک کام کا اجر دے سکیں، آپ کو اجر تو اللہ تعالیٰ ہی دے گا۔ اگر آپ کچھ کھا پی لیں تو......" سلیم الدین نے کہا۔

"نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں، اب میں اجازت چاہوں گا، آپ لوگ مجھے اجازت دیں۔ آپ لوگ کسی بھی بیماری کے لئے مطب آسکتے ہیں۔ حکیم وقار مجھ سے بھی بڑھ کر اچھے ہیں، وہ مریضوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔" یہ بول کر رولوکا اٹھ کھڑا ہوا۔

"حکیم صاحب میری خواہش ہے کہ آپ گھوڑا گاڑی پر تشریف لے جائیں۔ میں نے کوچوان کو بلوالیا ہے۔" سلیم الدین نے کہا۔

"چلیں آپ کی یہ خواہش میں پوری کردیتا ہوں، ویسے اس کی ضرورت تو نہیں میں خود اکیلا چلا جاتا۔" یہ بول کر رولوکا نے اس جگہ موجود تمام لوگوں سے مصافحہ کیا

اور بیٹھک سے نکل کر باہر آگیا، باہر گھوڑا گاڑی کھڑی تھی، رولوکا نے ہاتھ اٹھا کر سب کو سلام کیا اور گھوڑا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ لوگ بڑی محبت اور لگاؤ سے اپنے ہاتھ ہلاتے رہے، چند لمحوں میں ہی گھوڑا گاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ تو سارے لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور تھوڑی دیر میں ہی رولوکا حکیم وقار کے مطب میں پہنچ گیا۔

☆......☆......☆

"باباجی مجھے رامپور جانا ہے، کیا آپ چلنا پسند کریں گے؟" مالنی نے مہذب لہجے میں بوڑھے کوچوان سے کہا۔

"پتر کیوں نہیں چلوں گا، میرا تو کام ہی سواریوں کو ان کی منزل تک پہنچانا ہے۔" کوچوان بولا۔

باباجی آپ پیسوں کی فکر نہ کریں، میں کرایہ سے بڑھ کر دوں گی، دراصل شام بھی ہورہی ہے، اگر گاڑی لیٹ نہ ہوتی تو دو گھنٹے پہلے پہنچ جاتی۔" مالنی بولی۔

"پتر میں رامپور سے آگے نکل جاؤں گا، اگلے گاؤں میں میرا گھر ہے، تمہیں میں رامپور اتار دوں گا۔"

بوڑھے کوچوان نے کہا تو مالنی خوشی خوشی گھوڑا گاڑی میں بیٹھ گئی۔ مالنی کے بیٹھتے ہی کوچوان نے گھوڑے کو چابک سے اشارہ دیا تو گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد کوچوان بولا۔ "پتر رامپور میں کیا کوئی عزیز رہتا ہے، جس کے گھر تو جارہی ہے؟"

"بابا! میرا ایک متر رہتا ہے، کوئی بیس دن پہلے لندن سے آیا ہے، ہم دونوں لندن میں اکٹھے ہی پڑھتے ہیں اور ہم دونوں ایک ساتھ بیس دن پہلے آئے ہیں، میں اپنے گھر امر پور چلی گئی تھی اور وہ رامپور چلا آیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میں چند دن میں ہی تمہارے گاؤں آؤں گا اور پتا نہیں کیوں نہیں آیا، میں انتظار کرتی رہی، پھر سوچا کیوں نہ میں خود ہی اس کے پاس چلی جاؤں، اور میں آگئی۔" مالنی تفصیل بتاتے ہوئے بولی۔

"پتر تو دل والی لگتی ہے، بہادر بھی لگتی ہے، مرد ہوکر اس نے وعدہ کیا اور تیرے پاس پہنچا نہیں اور تو لڑکی ہوکر چلی آئی، ہے ناں ہمت اور حوصلے کی بات۔ کوچوان بولا۔

"باباجی دراصل یہ اپنے من کی بات ہے، ویسے وہ ایسا ہے تو نہیں، لگتا ہے کسی کام میں مصروف ہوگیا اور پھر میں نے سوچا اس طرح میں اسے سرپرائز دوں گی۔"

"پتر میری بھی بوڑھی آنکھیں دھوکہ نہیں کھاسکتیں، میں نے اندازہ کرلیا ہے کہ تیرے دل میں اس کی چاہت زیادہ ہے اور اسی چاہت کے زور پر تو دندناتی ہوئی آگئی۔ رامپور راستے میں آتا ہے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو، پتر میں تجھے اپنے گھر لے چلتا اور کل صبح کے وقت تجھے تیری منزل پر پہنچا دیتا۔ اگر گھر ڈھونڈنے میں کوئی دقت ہو تو میرے گھر چلی چل، صبح کے وقت میں تجھے رامپور لے آؤں گا۔" کوچوان پیار بھرے لہجے میں بولا۔

"باباجی! گھر ڈھونڈنے میں پریشانی نہیں ہوگی، پتہ میرے پاس ہے اور ویسے بھی اس کے پتا گاؤں کے مشہور ہستی ہیں۔ آپ مجھے گنیش پارک کے قریب اتار دینا۔ قریب میں ہی کالی ماتا کا مندر ہے اور مندر سے تھوڑا ہٹ کران کا گھر ہے، چلیں یہ بھی اچھا ہوا کہ آپ مجھے اتار کر آگے کو نکل جائیں گے، اگر ایسا نہیں ہوتا تو آپ کو خالی واپس آنا پڑتا۔" مالنی بولنی۔

"ارے پتر میں کبھی ایسا نہیں سوچتا، کہ خالی خالی واپس آنا پڑے گا۔ جسے جہاں جانا ہوتا ہے میں تو خوشی خوشی اسے اس کے گھر تک پہنچا دیتا ہوں۔ بھگوان کی کرپا سے، بھگوان نے جتنا مجھے دینا ہے، وہ سواریوں سے دلوا دیتا ہے۔ کچھ سواریاں اپنی خوشی سے کچھ زیادہ دے دیتی ہیں تو یہ ان کی مہربانی ہے، ورنہ میں خود سے کسی کو پریشان نہیں کرتا۔ لوگ دل سے دعا دیتے ہیں۔ یہ میرے لئے کیا اچھا نہیں۔ چند ٹکے کے لئے میں کسی کا دل دکھاؤں یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں بھی آل اولاد والا ہوں، میرے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں، بیٹے شادی والے ہیں، بڑی بیٹی کا دو مہینہ بعد لگن ہے، وہ بھی اپنے گھر چلی جائے گی۔ بیٹے بولتے ہیں۔ پتا جی! اب آپ گاڑی نہ چلایا کریں، آپ آرام کریں۔"

مگر میں بیٹھنا نہیں چاہتا کیونکہ آگر منش بیٹھ جائے تو زیادہ تھک جاتا ہے، چلتا پھرتا ہے تو بدن میں شکتی رہتی ہے اور ویسے بھی چلنے پھرنے سے دو پیسے آ ہی جاتے ہیں۔ منش کو آرام طلبی ست اور ناکارہ بنادیتی ہے۔ پتر! جب تک شکتی ہے میں تو کام کرتا رہوں گا، مجھے لوگوں کو ان کے گھروں تک پہنچا کر بڑی شانتی ملتی ہے۔" کوچوان نے کہا۔

"بابا جی! آپ کی سوچ بہت اچھی ہے، اگر اس طرح ہر آدمی سوچنے لگے تو کیا ہی اچھا ہو، جب تک جسم میں شکتی ہے آدمی کو کام کرتے رہنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ باہر والے ملک کے لوگ زیادہ چاک و چوبند ہیں۔ آدمی کا حوصلہ ہی ہے جو کہ آدمی کے جسم میں شکتی پیدا کرتا ہے۔ حوصلہ اگر آدمی کا جوان ہو تو آدمی ترقی کرتا ہے اور جو لوگ کام سے جی چراتے ہیں وہ بہت جلد تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں اور اس طرح دن بدن کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں۔" مالتی بھی کوچوان کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کر رہی تھی۔

"لے پتر! تیرا گنیش پارک آ گیا۔" کوچوان نے یہ بولتے ہوئے گھوڑا گاڑی روک دی۔

مالتی نے اپنا بیگ اٹھا کر اپنے کندھے پر لٹکایا اور جھٹ گھوڑا گاڑی سے نیچے اتر گئی۔ اس نے اپنے پرس سے دو سو روپے نکالے اور کوچوان کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

کوچوان بولا۔ "پتر یہ پیسے دو بہت زیادہ ہیں۔ اتنے تو نہیں بنتے! اور ویسے بھی میں نے تو اپنے گاؤں جانا ہی تھا۔"

"بابا جی! بس آپ رکھ لیں۔ میں اپنی خوشی سے دے رہی ہوں۔" مالتی بولی۔

"ٹھیک ہے پتر تیری خوشی ہے تو کوئی بات نہیں۔ بھگوان تجھے خوش رکھے۔" یہ بول کر کوچوان نے گھوڑا گاڑی آگے کو بڑھا دی۔

مالتی پارک کے قریب کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی کہ اچانک اس کی نظر پارک کے بنچ پر بیٹھے ہوئے چند لوگوں پر پڑی تو وہ ان کی طرف جانے کے لئے اپنے قدم اس طرف بڑھا دیئے۔

اندھیرا پورے علاقے پر مسلط ہو چکا تھا، پارک میں لگا ہوا مٹی کے تیل کا لیمپ کھمبے پر ٹمٹما رہا تھا۔ مالتی اس جگہ پہنچ گئی جہاں پر کئی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے غور سے دیکھا تو وہ چار تھے۔

"بھائی صاحب آپ بتا سکتے ہیں کہ اس جگہ رمیش بابو کا گھر کس طرف ہے؟" مالتی نے پوچھا۔

"لگتا ہے آپ کہیں دور سے آرہی ہیں اس سے۔" ان میں سے ایک بولا۔

"جی! میں امر پور سے آئی ہوں۔ گاڑی لیٹ تھی اس لئے رات ہو گئی آپ ذرا رمیش بابو کا گھر بتا دیں، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔" مالتی نے کہا۔

"ہاں ہاں! کیوں نہیں۔ آپ چلیں، آپ کو ان کے گھر چھوڑ کر ہم اپنے گھر چلے جائیں گے، ویسے بھی رات ہو چکی ہے، ہم بھی اب اٹھنے ہی والے تھے، یار چلتے ہیں۔ دیوی جی کو رمیش بابو کے گھر چھوڑ دیں گے۔" ان میں سے ایک آگے بڑھ کر بولا۔

"آپ اپنا بیگ مجھے دے دیں۔ میں اٹھا لیتا ہوں، آپ اپنے کندھے پر لٹکائے ہوئے ہیں۔ آپ تھک گئی ہوں گی۔" ایک بولا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں، آپ کا دھنے واد۔" مالتی بولی۔

لیکن بیگ اٹھانے والے نے بیگ مالتی کے کندھے سے اتار لیا اور بولا۔ "آپ مہمان ہیں اور رمیش بابو کیا بولیں گے۔"

مالتی بہت خوش تھی کہ یہ لوگ بہت اچھے ہیں اور رمیش کی دل سے عزت کرتے ہیں۔

وہ چاروں مالتی کو لے کر پارک سے باہر نکلے اور ایک طرف کو چلنے لگے۔ وہ لوگ آگے کو چلتے ہوئے تھوڑی دور جا کر ایک سنسان اور کچھ زیادہ ہی اندھیرے راستے پر مڑ گئے۔

اس راستے پر اندھیرا اتنا تھا کہ مالتی کا دل ہولنے لگا۔ مگر وہ اس وقت مجبور تھی۔ وہ دل میں سوچ رہی تھی کہ

"آج میں رمیش سے ناراض ہو جاؤں گی کیونکہ وہ حسب وعدہ میرے پاس گھر آیا کیوں نہیں؟"

جب وہ چاروں کچھ اور دور گئے تو ان میں سے دو مالتی کے دائیں بائیں اس کے جسم سے لگ کر چلنے لگے۔

مالتی کا تو دل ہول اٹھا کہ اتنے میں ایک بولا۔ "دیوی جی! ایک مشورہ ہے اگر آپ مان لیں تو اس میں آپ کا بھلا ہے۔"

مالتی بولی۔ "جی! بولیں، آپ کیا مشورہ دے رہے ہیں۔"

"دیوی جی! ہماری اچھا ہے کہ آپ ہمیں خوش کردیں۔ نہیں تو......" وہ بولا۔ جو مالتی کے دائیں ہاتھ کی طرف تھا۔

یہ سنتا تھا کہ مالتی سٹپٹا گئی اور اندرونی طور پر کانپنے لگی۔

"میں اس کی شکایت رمیش سے کروں گی، آپ بدتمیزی نہ کریں...... نہیں تو میں چیخ مار کر لوگوں کو جمع کر لوں گی۔" مالتی کی آواز تھرتھرانے لگی۔

اتنے میں ایک نے جھٹ اس کے بال پکڑ لئے اور دوسرے نے اپنا بڑا سا رومال مالتی کے منہ پر ڈال کر زوردار طریقے سے اس کا منہ باندھ دیا۔ "سالی چیخ مارے گی۔" وہ بولا۔

اب تو مالتی کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا۔ منہ کس کر باندھنے کے بعد انہوں نے اسے دبوچ کر نیچے بیٹھا دیا۔ وہ بے بس ہو چکی تھی۔

کہاں ایک نازک سی لڑکی اور کہاں گاؤں دیہات کے چار اوباش مسٹنڈے۔ اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے مالتی کو بے بس کر دیا تھا۔ پھر انہوں نے بے دردی سے اس کے کپڑے پھاڑ دیئے، وہ اپنے بچاؤ کے لئے چیخ بھی نہیں سکتی تھی۔ ناک سے پورا زور لگا کر وہ صرف "اوں...... آں...... آں......" کے علاوہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

جب وہ زیادہ زور لگانے لگی تو ایک نے اس کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی، ایسا کرتے ہوئے وہ یہ نہیں دیکھ رہا تھا کہ اس کے تھپڑ مالتی کے گال پر پڑ رہے ہیں یا پھر وہ تھپڑ اس کی آنکھوں پر بھی پڑ رہے ہیں، کیونکہ ہر طرف ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہ دینے والا اندھیرا مسلط تھا۔

انہوں نے پوری طاقت سے مالتی کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اور پھر وہ باری باری اپنی من مانی کرنے لگے۔ مالتی درد اذیت اور کرب کی وجہ سے بن پانی مچھلی کی طرح تڑپنے لگی تھی۔ اس کے جسم کی ساری جان سمٹ کر اس کے سینے میں سما گئی تھی۔ رات کے اندھیرے میں چار وحشیوں کی اذیت ناک سلوک نے مالتی کو بے سدھ کر کے رکھ دیا۔

اس زور ازوری میں اس کے منہ سے کپڑا ہٹ گیا تو مالتی کرب سے بولی۔ "میں تم لوگوں کو چھوڑوں گی نہیں، تمہیں تھانے میں لے جاؤں گی، تم حرامیوں کی زندگی اجیرن کر دوں گی۔" درد، کرب اور اذیت کی وجہ سے اس کے منہ سے بڑی مشکل سے آواز نکل رہی تھی۔ پھر اس کی فلک شگاف چیخ بلند ہوئی۔ "کالی ماتا میری رکھشا کر۔"

"بند کر بکواس! سالی تھانے میں لے جائے گی، میں ابھی تیرا انتظام کئے دیتا ہوں...... نہ تو رہے گی اور نہ تھانے میں جائے گی۔" یہ بول کر مالتی کا وہ بے دردی سے گلا دبانے لگا۔ اس پر جیسے جنون سوار ہو گیا تھا۔ مالتی تو پہلے ہی نڈھال اور بے سدھ تھی۔ وہ مالتی کا گلا اس وقت تک دباتا رہا جب تک مالتی میں جان تھی۔ مالتی کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی تو ایک بولا۔ "ارے یہ تو مر گئی۔"

"اب کیا ہوگا؟" ایک بولا۔

"اس کو ٹھکانے لگانا ہوگا نہیں تو ہماری خیر نہیں۔" دوسرا بولا۔

"چندر تو ایسا کر بھاگ کر جا اور جلدی سے کدال لے آ، مندر کے پیچھے جو جھاڑیاں ہیں، وہاں پر گڑھا کھود کر گاڑ دیتے ہیں۔" یہ سن کر وہ ایک طرف کو جانے لگا جس کا نام چندر تھا۔

"اس کے کپڑے اور بیگ، کو بھی اس کے ساتھ ہی گڑھے میں دبا دیں گے تاکہ کسی کو کچھ پتہ نہ چلے۔" تیسرا بولا۔

"دبانے سے پہلے اس کے بیگ کی ضرور تلاشی لے لینا، مجھے لگتا ہے بیگ میں کافی رقم موجود ہوگی۔" ایک بولا۔

تھوڑی دیر میں ہی چندر کدال لے آیا۔ تو مالنی کو گھسیٹ کر وہ مندر کے پیچھے جھاڑیوں میں لے جانے لگے۔ مندر کے قریب ہی ایک بہت پرانا اور کافی دور تک پھیلا ہوا برگد کا درخت تھا۔ برگد کے درخت اور مندر کے درمیان سے راستہ گاؤں کے لئے جاتا تھا۔ راستے کے دونوں طرف بہت لمبے لمبے درخت تھے اور بہت زیادہ گہری کھائیاں بھی تھیں۔

گاؤں والوں نے بہت کوشش کی تھی کہ کوئی اور راستہ گاؤں میں داخل ہونے کے لئے بنایا جائے مگر زیادہ گہری کھائی کی وجہ سے یہ ممکن نہ تھا۔ مالنی کے مردہ جسم کو گھسیٹ کر مندر کے پیچھے لے گئے، اس جگہ اتنی جھاڑیاں تھیں کہ کوئی غلطی سے کبھی اس طرف نہیں جاتا تھا۔ ویسے بھی وہ مندر اب ویران ہو چکا تھا۔ جب سے گاؤں کے بیچوں بیچ نیا مندر بنایا گیا تھا، لوگوں نے اس مندر میں آنا چھوڑ دیا تھا۔

ان چاروں میں چندر ہی بہت زیادہ مضبوط اور گٹھیلے جسم کا مالک تھا۔ اس نے جلدی جلدی گڑھا کھودنا شروع کردیا۔ ایک گھنٹہ کی جدوجہد کے بعد انہوں نے اپنا سارا کام مکمل کرلیا۔ مالنی کو گڑھے میں ڈال کر اور ساتھ ہی اس کے سارے کپڑے اور بیگ کو بھی گڑھے میں ڈال کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔ گڑھے میں مٹی ڈال کر ہاتھ سے چھو کر وہ مطمئن ہوگئے کہ مٹی ٹھیک طرح سے گڑھے میں ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے قریب سے سوکھی ہوئی جھاڑیاں اٹھا کر اس جگہ ڈال دیں۔ ابھی وہ جھاڑیاں ڈالنے کا کام کر ہی رہے تھے کہ اچانک انہوں نے دیکھا کہ گڑھے میں سے ایک دودھیا رنگ کا ہیولہ نکل کر ایک طرف گڑھے سے تھوڑا ہٹ کر کھڑا ہوگیا اور بغور اس گڑھے اور ان چاروں کو دیکھنے لگا۔

اتنے میں ان چاروں نے ایک اور دل دہلا دینے والا منظر دیکھا۔ کالی ماتا کے ویران مندر سے سبز رنگ کی روشنی کی ایک لمبی لکیر نکلی اور ہیولہ کے قریب پہنچ کر پورے ہیولہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چند سیکنڈ تک وہ ہیولہ اس جگہ کھڑا رہا۔ پھر وہ اس طرف پلٹا جدھر سے سبز روشنی نکلی تھی۔ وہ ہیولہ سبز روشنی کے حصار میں مندر کے اندر چلا گیا۔

اس کے بعد اچانک مالنی کی آواز گونجی۔ "ماتا! تو دیکھ رہی ہے، میرے ساتھ ان حرامیوں نے کتنا انیائے کیا ہے، ماتا مجھے شکتی چاہئے تاکہ میں اس انیائے کا بدلہ ان سے لے سکوں۔" اور پھر اس گڑھے کی جگہ جہاں کہ انہوں نے مالنی کو دبایا تھا ایک زبردست آگ کا شعلہ بھڑکا۔

رات ختم ہوگئی۔ دن کا سورج طلوع ہوا، مالنی کے بیگ سے پانچ ہزار روپے نکلے تھے۔ ان چاروں نے پوری رقم آپس میں بانٹ لی۔ "یار رات والا منظر تو بہت ہی دل دہلا دینے والا تھا۔ میں تو بالکل اندر سے ہول گیا تھا، ایسا لگا کہ اس جگہ اس کی آتما تھی جو کہ گڑھے سے نکلی تھی۔"

"ابے کیا تو گھاس کھا گیا ہے، کچھ بھی نہیں تھا، وہ سب ہم لوگوں کا وہم اور خوف تھا۔ چونکہ ہم زیادہ ڈر گئے تھے اس لئے ہمیں ویسا نظر آرہا تھا۔" ایک بولا۔

"لیکن مندر سے سبز روشنی کا نکلنا وہ کیا چکر تھا؟" دوسرا بولا۔

"ابے تم لوگ یہ کیا چکر لے کر بیٹھ گئے، جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ کچھ بھی ہو، مگر لونڈیا تھی بہت کراری، جیون کا سواد آگیا، اور پھر جاتے ہوئے ہمارے عیش کے لئے اچھی خاصی رقم بھی دے گئی، اب اس رقم سے عیش کرو، موج کرو دبا کر، دارو پیو اور مست ہو جاؤ۔" چندر بولا۔ ان چاروں میں ایک کا نام چندر، دوسرے کا سنیل، تیسرے کا رامو اور چوتھے کا نام گنیش تھا۔

ادھر چھ سات دن بیت گئے امرپور میں مالنی کے گھر والے مالنی کی وجہ سے بہت بے چین تھے کیونکہ مالنی کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ مالنی اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے پتا رامانند گاؤں کے مکھیا تھے۔ دس دن جب بیت گئے تو گھر والوں کو تشویش ہونے لگی۔

انہیں یہ بھی پتہ تھا کہ مالنی اس قدر لاپرواہ نہیں ہوسکتی۔ ان کے دل مطمئن تھے کہ مالنی گاؤں دیہات جیسی کم ہمت یا ڈرپوک نہیں، وہ تو لندن ریٹرن ہے۔

گیارہویں دن اس کے گھر سے ان کا منشی گوپال رامپور آگیا۔ وہ رمیش کے گھر آیا اور مالنی کی خیر خیریت معلوم کی، اس نے بتایا کہ "آج سے ٹھیک دس دن پہلے مالنی آپ کے گاؤں آپ کے گھر آئی تھی۔"

یہ سن کر رمیش اور اس کے گھر والوں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ مالنی سے بے خبر تھے۔ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو منشی گوپال جیسے سکتے میں آگیا۔ اب تو پورے گاؤں میں جیسے بھونچال آگیا۔ گاؤں کے نزدیکی تھانے میں رپورٹ درج کرائی گئی۔

رمیش کے پتا بھی گاؤں کے مکھیا تھے ان کی بھی بہت چلتی تھی، ان کا رعب دبدبہ بہت زیادہ تھا۔ پورے رامپور میں ہلچل مچ گئی تھی۔

ریلوے اسٹیشن پر جتنے بھی گھوڑا گاڑی والے کھڑے رہتے تھے ان سب سے جانکاری کی گئی تو پتہ چلا کہ آج سے دس دن پہلے ایک لڑکی آئی تو تھی۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ بہرحال یہ پتہ لگ گیا کہ لڑکی گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر رام پور گئی تھی۔ بوڑھا کوچوان جس کا نام جگدیش تھا اس نے لڑکی کو پارک کے پاس اتار کر آگے اپنے گاؤں چلا گیا تھا۔ پولیس نے کوچوان پر بہت سختی کی مگر کوچوان بہت ہی اچھا ہمدرد، ایماندار آدمی تھا اس کی گواہی سارے کوچوانوں نے دی اور ساتھ ہی اس کے گاؤں کے ہر فرد نے کہا کہ جگدیش بابا بہت اچھے آدمی ہیں اور ساتھ ہی تھانے کے پولیس والے بھی انہیں اچھی طرح جانتے تھے کیونکہ کبھی بھی ان کے نام یا ان کے گھرانے والوں کی کوئی شکایت نہ تھانے پہنچی تھی اور نہ ہی اس گھرانے سے گاؤں کے کسی فرد کو کوئی شکایت تھی۔

ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کوچوان کو پولیس نے چھوڑ دیا۔ گاؤں کے تمام افراد سے پولیس نے پوچھ گچھ کی مگر حاصل کچھ بھی نہ ہوا۔ آخر تھک ہار کر کیس کو فائل میں بند کردیا گیا۔ گھر والے روپیٹ کر خاموش ہوگئے۔

لیکن رمیش وہ واحد شخص تھا جس نے مالنی کا سب سے زیادہ غم کیا۔ وہ بالکل بجھ کر رہ گیا۔ ہر وقت خلاؤں میں گھورتا رہتا تھا۔ اکیلا خاموش رہنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ دراصل مالنی اور اس نے ایک دوسرے کو زندگی کا ہمسفر بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس کی زندگی سے روشنی ختم ہو کر اندھیرے نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ کسی بھی کام میں اس کا دل نہیں لگتا، ہر وقت اپنے کمرے میں اکیلا پڑا چھت کو گھورتا رہتا تھا۔ خوراک کم ہو کر برائے نام رہ گئی تھی۔

خیر وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ تھوڑا بہت نارمل ضرور ہوا، مگر دوبارہ لندن جانے کا پروگرام اس نے بالکل ملتوی کردیا۔ اس نے گھر والوں کو صاف انکار کردیا کہ اب لندن میں میرے لئے کچھ بھی نہیں رہا، میں کسی صورت بھی لندن نہیں جاؤں گا اور نہ ہی اب میری زندگی میں کوئی اور لڑکی آسکتی ہے۔

بہرحال اس کا فیصلہ سن کر اس کے گھر والے بہت دکھی ہوئے مگر کر بھی کیا سکتے تھے جوان اور سب سے بڑی اولاد، گھر والوں نے اس معاملے میں چپ سادھ لی، اور یہ بول کر اپنے آپ کو مطمئن کرلیا کہ "جو بھگوان کی اچھا...... اگر بھگوان نے چاہا تو ہمارا رمیش وقت کے ساتھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

تین ماہ بخیر و خوبی سے گزر گئے، چوتھا مہینہ آیا۔ اماوس کی رات تھی۔ چندر اپنے کمرے میں سویا پڑا تھا۔ کمرے میں مکمل اندھیرا تھا کہ اچانک ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ "چندر میں آگئی ہوں، تم آرام سے سو رہے ہو، اور میں تمہارے بنا بیاکل ہوں، اٹھو چلو میرے ساتھ۔"

یہ سننا تھا کہ چندر فوراً اٹھ کر اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ پسینے میں شرابور ہو چکا تھا، وہ آناً فاناً فوراً چارپائی سے نیچے اترا اور سرہانے رکھی ماچس کو اٹھا لیا۔ پھر دیر کئے بغیر کمرے میں موجود لالٹین جلادی۔ روشنی ہوتے ہی اس نے سارے کمرے کو چھان مارا، مگر کمرے میں کسی بھی انسانی وجود کا پتہ نہیں تھا۔ اس کا گلا خشک ہو رہا تھا، اس نے

گلاس میں پانی ڈالا اور پھر ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا۔

اس نے ایک لمبا سانس کھینچا۔ اپنی آنکھیں بند کرلیں اور پھر فوراً آنکھیں کھول دیں۔ اس کی نیند اس سے کوسوں دور جا چکی تھی۔ کبھی وہ چارپائی پر بیٹھ جاتا، اور پھر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ کسی پل اسے چین نہیں آرہا تھا۔ بار بار اس کے دماغ میں یہی آواز گونج رہی تھی۔ ''چندر میں تمہارے بنا بیاکل ہوں، اٹھو چلو میرے ساتھ۔''

اور اس طرح پوری رات گزر گئی۔ صبح سورج طلوع ہوتے ہی وہ اپنے تینوں دوستوں کے پاس بھاگا، وہ بالکل بدحواس ہو چکا تھا۔ حیرانی اور پریشانی اس کے چہرے پر رقصاں تھی۔ ''ارے بھائی کیا بات ہے تو صبح ہی صبح دوڑا چلا آیا۔ خیریت تو ہے ناں۔ رامو بولا۔

''رامو خیریت نہیں ہے۔ میں بہت ڈر گیا ہوں، رات بھر میں سویا نہیں۔'' چندر نے کہا۔

''ہوا کیا؟ اور تو رات بھر سویا کیوں نہیں، کیا کوئی بلا نظر آگئی تھی تجھے رات میں۔ ابے مرد ہو کر تو بدحواس ہورہا ہے، تو تو بڑے دل گردے والا ہے، آج تو یہ بزدل اور ڈرپوکوں جیسی باتیں کیوں کررہا ہے؟'' رامو بولا۔

''رامو لگتا ہے رات میں اس لونڈیا کی آتما آگئی تھی۔ جسے ہم نے مارا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''چندر تم آرام سے سو رہے ہو، میں تمہارے بنا بیاکل ہوں۔ اٹھو چلو میرے ساتھ۔'' چندرا گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

یہ سن کر رامو زور سے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا اور بولا۔ ''تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے، لگتا ہے تو بہت جلد پاگل ہونے والا ہے۔ ابے کیسی بے تکی باتیں کررہا ہے، اسے مرے ہوئے چوتھا مہینہ ہے اور بھلا کوئی آتما بھی ایسا کرسکتی ہے۔ تو اندھیرے میں ڈر گیا ہوگا، لگتا ہے تو اس کے متعلق سوچنے لگا ہے اس وجہ سے تیرے دماغ میں فتور آگیا ہے، چل میرے ساتھ میں تجھے سنیل اور گنیش کے پاس لے چلتا ہوں۔'' اور رامو نے چندرا کا ہاتھ پکڑ کر باہر اپنے گھر سے نکلتا چلا گیا۔

تھوڑی دیر میں وہ دونوں ایک باڑے میں پہنچ گئے۔ اس جگہ سنیل اور گنیش دونوں موجود تھے۔ چندر اور رامو کو دیکھ کر گنیش بولا۔ یارو! خیریت تو ہے آج صبح ہی صبح درشن کیسے نظر آرہے ہیں۔ ابے چندر آج تیری آنکھ کیسے اتنی صبح کھل گئی، ویسے تو تو دن کے دو بجے اٹھنے والا ہے۔''

''دن کے دو بجے! ارے یہ اگر سوتا تو پھر دن کے دو بجے اٹھتا، یہ تو پوری رات سویا ہی نہیں۔ یہ تو ایک بہت ہی نیا راگ الاپ رہا ہے۔ رات میں اس کے پاس اس لڑکی کی آتما آگئی تھی، جسے ہم نے آگے پہنچا دیا تھا۔'' اور یہ بات اس نے ذرا آہستہ کی کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔'' رامو بولا۔

''لگتا ہے اس نے اس کے متعلق کچھ زیادہ ہی سوچنے لگا ہے۔ آج سے تو ایسا کر سوتے وقت ایک گلاس دارو پی لیا کر، تاکہ رات بھر تو مست ہو کر سوتا رہے۔ ابے یہ آتما واتما کچھ نہیں ہوتی، جو اس دنیا سے گیا وہ بس چلا گیا اور رات میں کمرے میں اندھیرا نہ کیا کر، جب آدمی کسی مسئلے پر زیادہ سوچنے لگتا ہے تو وہ مسئلہ اس کی بدھی میں سما جاتا ہے۔ تو فکر نہ کر ابھی میں تجھے لے کر دارو خانہ میں چلتا ہوں۔ دو تین پیگ چڑھ جائے گا تو سارا غم اور ڈر خوف تجھ سے دور ہو جائے گا۔'' سنیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ارے کیا ہم دوستوں کی جگ ہنسائی کرائے گا، لوگ کیا بولیں گے کہ گاؤں کے جالو برزا جوان رات میں اندھیرے سے ڈرنے لگے ہیں!'' گنیش بولا۔

''میں تم لوگوں کو کیسے سمجھاؤں، میں اپنے ہوش و حواس میں تھا جب میں نے اس کی باتیں سنی تھیں۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں کسی سے ڈرا ہوں، مجھے تو یقین ہوگیا ہے کہ بالکل اسی کی آتما تھی، میرا دل کہہ رہا ہے کہ اب ضرور ہمارے ساتھ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔'' چندر گھبراتے ہوئے بولا۔

''اوئے تو خاموشی سے بیٹھ جا...... نہیں تو میرا امیٹر شاٹ ہو جائے گا۔ میں نے ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا۔ میں ناشتہ منگواتا ہوں۔ خوب ڈٹ کر ناشتہ کرتے ہیں۔ پھر

چل کر موج مستی کریں گے۔'' سنیل نے کہا اور ساتھ ہی آواز لگائی۔ ''او سندر ادھر آ۔''

آواز سن کر ایک لڑکا بھاگا ہوا آیا اور بولا۔ ''جی سنیل بھائی۔''

''ایسا کر گھر میں جا اور ماتا سے بول کہ بھیا نے ناشتہ منگایا ہے۔ آج بارہ میں ہی ناشتہ کریں گے، اور یہ بھی بولنا کہ گنیش، رامو اور چندر بھی آگئے ہیں وہ بھی ناشتہ کریں گے۔'' سنیل نے تفصیل بتائی۔ جسے سن کر سندر جلدی سے چلا گیا۔

تھوڑی دیر میں سندر آیا تو ایک بڑی ٹرے اس کے ہاتھ میں تھی۔ ٹرے میں مکئی کی گرم گرم گئی روٹیاں اور کٹورے میں ساگ پڑا تھا۔ ''بھیا ناشتہ حاضر ہے، آپ لوگ ناشتہ کریں، اور میں لسی لے کر آتا ہوں۔'' یہ بول کر سندر پھر الٹے پاؤں چلا گیا۔ اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں مٹی کی ایک مٹکی تھی اور ساتھ ہی دو گلاس بھی تھے۔ وہ لسی کی مٹکی اور گلاس رکھ کر چلا گیا۔

''یارو! چلو ناشتہ کرو۔'' سنل نے کہا۔ ''چندر تو پیٹ بھر کر ناشتہ کرنا کیونکہ تجھے زیادہ کھانے پینے کی ضرورت ہے۔ اگر پیٹ بھرا ہو تو من میں مستی زیادہ آتی ہے۔''

چاروں بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگے، روٹی ختم ہوگئی تو انہوں نے ٹھنڈی ٹھنڈی لسی پی اور تھوڑی دیر اور بیٹھ کر باڑہ سے نکلتے چلے گئے۔ چاروں ایک دارو خانہ میں پہنچے۔

رامو بولا۔ ''اوئے چھوٹے آج کوئی زیادہ اسٹرانگ چیز پلا، کیونکہ ہمارا چندر آج بہت زیادہ الجھا ہوا ہے، چیز ایسی ہو کہ بس سواد آجائے۔''

چند منٹ میں ان کے سامنے دارو کی بوتل اور چار گلاس پڑے تھے۔ تینوں آج چندر پر کچھ زیادہ ہی مہربان تھے۔ تینوں اپنے اپنے ہاتھ سے اسے پلاتے رہے۔ بہت زیادہ پینے کے بعد جب نڈھال ہو کر چندر نے اپنا سر ٹیبل پر رکھ دیا تو سنیل بولا۔ ''چلو یہ تو گیا کام سے۔ اسے آرام کرنے دو، جب یہ خود ہی اٹھے گا تو اس وقت اس کا دماغ اپنی جگہ آچکا ہوگا۔''

''اوئے چھوٹے اسے کونے میں پڑی چارپائی پر ڈال دے، اسے اٹھانا نہیں، ہم دو تین گھنٹے میں ذرا گھوم پھر کر آتے ہیں، ہم خود ہی اسے اٹھالیں گے۔ تو ذرا خیال رکھنا کوئی اسے اٹھائے نہیں، نہیں تو تیری خیر نہیں۔'' گنیش بولا۔

تینوں نے خود ہی چندر کو اٹھا کر کونے میں پڑی چارپائی پر ڈال دیا اور پھر وہ تینوں دارو خانے سے باہر کو نکلتے چلے گئے۔

شام کو پانچ بجے وہ تینوں واپس آئے تو دیکھا کہ چندر ابھی تک بے سدھ چارپائی پر پڑا تھا۔ اسے کوئی ہوش نہیں تھا۔ انہوں نے اسے ہلایا جلایا مگر وہ تو ہوش سے بیگانہ پڑا تھا۔ ''یار! اس پر تو آج کچھ زیادہ ہی چڑھ گئی ہے۔ یہ تو اٹھنے سے رہا، اب اس کے لئے کچھ کرنا ہی پڑے گا۔'' سنیل بولا۔

''رامو جلدی سے ایک لیموں لا، اس کا بس یہی علاج ہے، ورنہ یہ رات تک نہیں اٹھے گا اور مجھے بھی ذرا جلدی گھر پہنچنا ہے۔ بابو جی کسی کام سے جائیں گے اور انہوں نے کہا ہے کہ آج گائے کا دودھ میں نکالوں۔''

رامو جلدی سے دو عدد لیموں لے آیا تو انہوں نے لیموں کا رس ایک گلاس میں نچوڑا، پھر اس میں پانی ملا کر چندر کو ذرا جھنجھوڑ کر اٹھایا، جب چندر اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا تو سنیل نے لیموں کا شربت چندر کے ہونٹوں سے لگا دیا، چندر غٹا غٹ پورا گلاس خالی کر گیا۔

چند منٹ ہی گزرے تھے کہ چندر نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ خیر آدھا گھنٹہ میں اس کے حواس بحال ہو چکے تھے۔ تینوں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور اسے لے کر گھر کی طرف چلنے لگے۔ دارو خانہ سے گھر کا فاصلہ تقریباً ایک گھنٹہ کا تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے چندر کی طبیعت بحال ہو چکی تھی۔ گنیش بولا۔ ''چندر اب تو گھر میں جا کر آرام کر، کل صبح پھر ہماری ملاقات ہوگی، آج رات تیری طبیعت بحال رہے گی اور تجھے نیند بھی زیادہ آئے گی، مگر رات میں لالٹین ضرور جلا کر سونا۔'' یہ بول کر وہ تینوں اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

رات میں چندر کی طبیعت کچھ زیادہ ہی بوجھل

جادوئی کمالات سیکھیے

آپ پاکستان میں ہوں یا دنیا کے کسی بھی کونے میں ٹی وی اسٹار ایم مجاہد سے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک جادوئی کمالات کا کورس منگوائیں اور آسانی سے سیکھیں دلچسپ اور حیران کردینے والے جادوئی کمالات سیکھ کر شہرت اور پیسہ بھی حاصل کریں

ایم مجاہد کے ہزاروں کمالات میں سے چند کمالات

نظروں سے گلاس توڑنا، کاغذ جلا کر نوٹ بنانا، لڑکی کے بیگ سے رومال نکالنا، دور سے دودھ کا گلاس پینا، کاغذ جلا کر کبوتر بنانا، ڈبہ سے خرگوش نکالنا، رومال سے کبوتر بنانا، زبان سے تار گزارنا، انڈے سے چوزہ بنانا، جسم کی حرارت سے بلب جلانا، پھول سے شعلہ پیدا کرنا، لکھی ہوئی کتاب سادہ کرنا، لکھی ہوئی کتاب سادہ کرنا، تاش کے تمام پتے بادشاہ بنانا، ہاتھ سے نوٹ غائب کرنا، کوئی بھی چیز غائب کرنا، ان کے علاوہ بے شمار کمالات سیکھنے کے لئے آج رابطہ کریں۔

عملیات کے شوقین بھی رابطہ کریں

پیکج نمبر 1	1,500/-
پیکج نمبر 2	2,000/-
پیکج نمبر 3	3,000/-
پیکج نمبر 4	4,000/-
کل قیمت	~~10,500/-~~

تمام کورسز ایک ساتھ منگوانے پر خصوصی رعایتی قیمت پر 5,000/-

آرڈر کیلئے ابھی ان نمبر پر کال کریں
0300-9214642
0333-3254309

اسپیشل کورس
دل و دماغ قابو کرنا، ہپناٹزم و نظر بندی وغیرہ
قیمت 30,000 روپے

ایم جے میجک گروپ
روم نمبر 11 فرسٹ فلور نعمان اسکوائر بالمقابل ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی
021-5214012, 5215482
0300-9214642, 0333-3254309

تھی۔ کھانے کے لئے اس نے گھر والوں کو منع کردیا اور اپنے کمرے میں آ کر لمبی تان کر سوگیا۔ رات کے دو ڈھائی کا وقت ہوگا کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ کوئی کمرے میں زور زور سے سانس لے رہا ہے۔ اچانک خود بخود لالٹین بجھ گئی۔

"چندر! میں برگد کے درخت کے نیچے تمہارا انتظار کررہی ہوں، دیکھو میں تمہارے بنا بیاکل ہوں، جلدی سے آجاؤ میرے پاس، اب میں زیادہ انتظار نہیں کرسکتی۔"

اور پھر کسی نادیدہ قوت نے اسے چارپائی پر سے اٹھادیا، وہ چارپائی پر سے نیچے اتر کر کھڑا ہوگیا، اس کا دماغ اپنے قابو میں نہیں تھا۔ اس نے آہستہ سے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر نکل کر رات کے اندھیرے میں برگد کے درخت اور مندر کی طرف چلنے لگا۔ تھوڑی دیر میں وہ مندر کے پاس سے ہوتا ہوا برگد کے درخت کے نیچے پہنچ گیا۔

دودھیا رنگ کا ایک ہیولہ اس جگہ سے نمودار ہوا۔ جہاں ان چاروں نے گڑھا کھود کر مالنی کو دبایا تھا۔ اس کے بعد مندر سے سبز رنگ کی روشنی نکل کر باہر آئی اور اس ہیولہ کو اپنے حصار میں لے لیا۔ اس کے بعد وہ ہیولہ مندر کے اندر چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد وہ ہولہ مندر سے نکلا اور برگد کے درخت کے نیچے آ کر اس جگہ کھڑا ہوگیا۔ جہاں چندر ہوش سے بیگانہ کھڑا تھا۔

ہیولہ نے برگد کے درخت کے اوپر دیکھا تو فوراً برگد کے درخت کی داڑھی آناً فاناً نیچے کو آنے لگی اور پھر برگد کی داڑھی چندر کے دونوں پاؤں میں لپٹ گئی۔ اس کے بعد ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ وہ داڑھی اوپر کو اٹھتی چلی گئی۔ الٹا ہو کر چندر اوپر کو کھنچتا چلا گیا۔ اب چندر کا سر نیچے اور دونوں پاؤں برگد کی داڑھی میں الجھے ہوئے اوپر کو تھے۔

چندر کی دل دہلا دینے والی فلک شگاف چیخ قرب و جوار کو دہلا گئی اور پھر چاروں اور گھپ اندھیرے کا راج ہوگیا۔ چندر کی آتما اس کا شریر چھوڑ چکی تھی۔ وہ ہیولہ برگد کے درخت کے نیچے سے فضا میں معلق ہوا اور پھر مندر کے اندر چلا گیا۔ اس کے بعد ایک عجیب و غریب ڈراؤنی اور پرہیبت آواز پورے رامپور میں گونج اٹھی۔ آواز ایسی تھی کہ جیسے کوئی بہت بڑا الو چیخا ہو۔ اس آواز سے کئی لوگوں کی اچانک آنکھیں کھل گئی تھیں۔

جو لوگ اس وقت رات میں جاگ پڑے تھے وہ سب کے سب حیران تھے کہ "یہ عجیب و غریب پرہیبت اور اذیت ناک آواز کیسی تھی؟"

صبح کا سورج طلوع ہوا۔ اس ویران مندر اور برگد کے درخت کے پاس سے لوگوں کا گزر ہوا تو دیکھنے والوں نے اپنے دانتوں تلے انگلیاں داب لیں، اور یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح چند منٹ میں ہی سارے رامپور میں پھیل گئی۔ "چندر برگد کے درخت پر مردہ لٹکا ہوا ہے۔"

دیکھتے ہی دیکھتے سارا رامپور برگد کے درخت کے نیچے امڈ آیا۔ سب کی نگاہیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ لوگوں کی نظریں جیسے پتھرا گئی تھیں، سارے لوگ سکتے کی حالت میں تھے۔ کسی کی عقل کام نہیں کررہی تھی کہ "آخر چندر رات سے یہاں تک پہنچا کیسے؟ اور پھر الٹا ہو کر برگد کی داڑھی میں بندھ کر اوپر کو کیسے پہنچا؟"

اور یہ بات دماغ میں آنے والی تھی بھی نہیں۔ اکثر مرنے والے جب آتما ہتھیا کرتے ہیں تو رسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈال کر جھول جاتے ہیں۔ مگر یہ اچنبھے میں ڈالتا مرنے والے کا انوکھا طریقہ تھا۔ برگد کی داڑھی چندر کے پاؤں میں الجھی ہوئی تھی۔ برگد کی داڑھی کا نیچے زمین پر آنا، اس کے پاؤں میں الجھنا اور پھر چندر مجسم اوپر کو کھنچتا چلا گیا۔ بھلا یہ بات کیسے ممکن ہوسکتی تھی۔

چندر کے تینوں دوست گنیش، رامو اور سنیل بھی اس جگہ آئے، ان کی حالت تو ایسی تھی کہ انہیں کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ وہ تینوں بے حس و حرکت کھڑے تھے ان کی آنکھیں چندر پر ٹنگ گئی تھیں۔ وہ ایسے کھڑے تھے کہ جیسے پتھر کے بت ہوں۔ ان تینوں کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہوکر رہ گئی تھی۔ اب چندر کی باتیں انہیں ٹھیک لگ رہی تھیں۔ اندرونی طور پر وہ تھر تھر کانپ رہے تھے۔

خیر جتنے منہ اتنی باتیں۔ اب مرحلہ چندر کے مردہ وجود کو برگد کے درخت پر سے نیچے اتارنا تھا۔ مندر کے بڑے پجاری، مکھیا اور دیگر عمر رسیدہ لوگوں کے مشورے سے چند مضبوط قسم کے جوان برگد کے درخت پر چڑھ گئے۔

طے یہ پایا تھا کہ وہ لوگ اوپر جاکر برگد کی داڑھی پکڑ کر چندر کو اوپر کو کھینچیں گے پھر اس کے دھڑ میں رسی باندھ کر برگد کی داڑھی سے اسے علیحدہ کر کے آہستہ آہستہ اس کو نیچے کی طرف ڈھیل دیں گے تو نیچے کھڑے ہوئے لوگ چندر کے مردہ دھڑ کو پکڑ لیں گے۔

برگد کی داڑھی بہت مضبوط اور موٹی تھی۔ اوپر چڑھنے والوں نے آہستہ آہستہ داڑھی کو اوپر کو کھینچنے لگے تاکہ تھوڑا نزدیک آنے پر وہ ایک مضبوط رسی چندر کے گرد باندھ دیں اور پھر داڑھی کو کاٹ دیں اس طرح چندر آہستہ آہستہ رسی کو ڈھیل دینے سے نیچے کو آجائے گا۔

مگر لوگوں کے مشورے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اچانک اوپر کو کھینچتے ہوئے برگد کی داڑھی درمیان سے ٹوٹ گئی تو دھڑام سے چندر سر کے بل زمین پر گر پڑا۔

اچانک پورے مجمع میں ”رام......رام......رام“ کی آواز گونجنے لگی۔ لوگ خوف زدہ ہو کر رام رام کی آوازیں نکالنے لگے تھے۔

نیچے زمین پر گرنے کی وجہ سے چندر کی گردن کی ہڈی اچانک ٹوٹ گئی تو اس حالت میں اس کی گردن بے قابو ہو کر چاروں طرف ڈھلنے لگی تھی۔ خیر اسے چارپائی پر ڈال کر لے جایا گیا۔ لوگوں کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ ہر کوئی عجیب کشمکش و پیچ میں تھا، کسی کے بھی دماغ میں یہ بات نہیں بیٹھ رہی تھی کہ یہ سب کچھ ہوا کیسے؟

چندر کے گھر والوں کا غم سے سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ اس کی ماں بہنیں بن جلی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ خیر انسان کی یہ فطرت ہے کہ مرنے والے کے لئے وہ بہت روتا ہے اور پھر مذہب کے ریت کے مطابق اسے آخری منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ سو دوپہر ہوتے ہوتے چندر کو ”رام رام ست ہے......رام نام ست ہے“ کی گونج میں دیکھتے ہی دیکھتے چیتا کے حوالے کر دیا گیا اور اس طرح وہ جل کر راکھ ہو گیا۔

چندر کے تینوں دوست رامو، گنیش اور سنیل اپنی اپنی جگہ بہت زیادہ خوفزدہ اور سہمے ہوئے تھے۔ ان کے دماغ میں یہ بات گردش کر رہی تھی کہ ”بھگوان نہ کرے کہ ہمارے ساتھ کچھ ہو۔“ وہ تینوں جو کہ مندر میں جانے کے لئے کبھی سوچا بھی نہ تھا اب وہ ہر روز مندر میں جانے لگے تھے اور کافی دیر تک بیٹھ کر مندر کے پجاری سے آشیرواد لینے لگے تھے۔ ان تینوں کو دیکھ کر گاؤں والے دنگ تھے کہ نہ جانے انہیں کیا ہو گیا ہے کہ روزانہ مندر میں آنے لگے ہیں۔

کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ بھگوان نے ان پر کرپا کی ہے اور یہ سیدھی راہ پر چلنے لگے ہیں اور یہ اس طرح روزانہ مندر آتے رہے تو یہ اپنی ساری برائیاں چھوڑ کر اچھا آدمی بن جائیں گے۔

لیکن وہ تو چندر کا انجام دیکھ کر اندرونی طور پر دہل کر رہ گئے تھے، انہیں ڈر تھا کہ کہیں اس لڑکی کی آتما جسے انہوں نے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لئے گلا گھونٹ کر مار دیا تھا کہیں وہ اپنا انتقام لینے ان تک نہ پہنچ جائے۔ اس خوف اور ڈر کی وجہ سے وہ روزانہ مندر آنے لگے تھے اور اگر مندر کے بڑے پجاری کی آشیرواد ان کے ساتھ ہو گی تو وہ آتما ان کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی۔ انہوں نے دن میں آوارہ گھومنا ختم کر دیا تھا۔ وہ اکیلے میں کہیں بھی نہیں جاتے تھے اور پھر سر شام ہی اپنی مصروفیات سے فارغ ہو کر اپنے گھروں کو آجاتے تھے۔

چندر کی موت کو ایک ہفتہ ہی گزر تھا کہ ایک رات اس کی اذیت ناک اور ناقابل برداشت فلک شگاف چیخ رامپور والوں کو سنائی دی۔ چیخ اتنی زوردار اور بھیانک تھی کہ سوتے میں بہت سارے لوگوں کی نیند اچاٹ ہو گئی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں اٹھ کر بیٹھ گئے۔ آواز بڑی واضح اور صاف تھی، اس میں کوئی شک کی بات نہیں تھی، لوگوں نے واضح طور پر چندر کی اذیت میں ڈوبی آواز سنی تھی۔

لوگوں کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ جتنے لوگوں نے چندر کی اذیت ناک آواز سنی تھی وہ سب کے سب بہت زیادہ اچنبھے میں تھے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ ”ہم نے چندر کو چیتا پر لٹا دیا تھا۔ وہ جل کر راکھ ہو گیا اس کے بعد اس کی ارتھی گنگا میں بہا دی گئی تھی۔ اب اس کی آتما اس قدر کشٹ میں کیوں ہے؟ ایک دن، دو دن اور پھر تیسری رات بھی ایسا ہوا تو لوگوں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔

صبح ہوتے ہی لوگ گاؤں کے بیچ جو کالی ماتا کا مندر تھا۔ اس مندر کے بڑے پجاری کے پاس گئے اور ساری کتھا پنڈت کے آگے رکھ دی۔ پنڈت جنتر منتر میں بہت پہنچا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”یہ مسئلہ تو میرے پلے بھی نہیں آ رہا ہے، لیکن دماغ میں یہ بات آ رہی ہے کہ چندر کی آتما بہت زیادہ کشٹ میں ہے، اس کی آتما پرلوک سدھاری نہیں ہے، اس گاؤں میں بیاکل ہو کر بھٹک رہی ہے، آپ لوگ جائیں میں رات سمے ماتا سے معلوم کروں گا کہ یہ معاملہ کیا ہے؟“

پنڈت کی بات سن کر گاؤں والے اپنے اپنے گھر آ گئے، لیکن چندر کے گھر والے بہت زیادہ حیران و پریشان تھے، اس کی ماں بہنیں رو رو کر ہلکا ہو رہی تھیں۔

مندر کا بڑا پجاری اکثر مندر میں ہی رات گزارتا تھا۔ رات کے جب بارہ بج گئے تو وہ کالی ماتا کے چرنوں میں بیٹھ کر کالی ماتا کے لئے عمل پڑھنے لگا۔ آدھا گھنٹہ گزرا تھا کہ اچانک کالی ماتا غضبناک شکل میں اس کے سامنے حاضر ہو گئی۔ کالی ماتا کی سرخ آنکھیں اور غضب کو دیکھ کر پنڈت تھر تھر کانپنے لگا۔ ”ماتا مجھ پر کرپا کر دے، میری غلطی کو معاف کر دے، میں نے تیرے آرام میں خلل ڈالا، ماتا مجھے معاف کر دے۔“ پنڈت گڑگڑانے لگا۔

کالی ماتا کی گرجدار آواز گونجی۔ ”پنڈت! تو نہیں جانتا! وہ پاپی تھا اس نے ناریوں کی عزت کو عزت نہیں سمجھا، اس کے پاپ کا گھڑا بھر گیا تھا، اب تو ہی بتا اس حالت میں اگر کوئی مجھے پکارتا ہے تو کیا میں اس کی مدد نہ کروں۔ اس کی آتما کشٹ اٹھاتی رہے گی، اسے چین ملنا مشکل ہے۔ تو میرا بہت بڑا سیوک ہے اس کارن میں تیرا جیون دان کر رہی ہوں، ورنہ آج تیری موت ہو جاتی۔ لیکن تیری سزا ہے کہ ایک مہینہ کے لئے تو گونگا ہو جائے گا، تیرا بولنا ختم ہو جائے گا، یہ بھی میری کرپا ہے اور آئندہ تو کسی پاپی کے لئے مجھے بلانا نہیں، ورنہ وہ دن یا رات تیری زندگی کا آخری سمے ہو گا۔“ اور یہ بول کر کالی ماتا غائب ہو گئی۔

پنڈت تھر تھر کانپتا رہ گیا۔ پنڈت کی بولنے کی طاقت ختم ہو چکی تھی۔ صبح ہوتے ہی لوگ مندر آنا شروع ہو گئے۔ لوگ بولتے رہے۔ پوجاپاٹ کے لئے مگر پنڈت خاموش ہی رہا۔ وہ بار بار کالی ماتا کے بت کی طرف اشارہ کرتا اور پھر ان لوگوں کو بھی اشارے سے جانے کو کہتا۔ وہ لوگ بھی مندر میں آئے جنہوں نے چندر کی آتما کے لئے پنڈت سے رابطہ کیا تھا۔ پنڈت نے اس مرتبہ بھی کالی ماتا کی طرف اشارہ کیا تو لوگ یہ سمجھے کہ کالی ماتا ضرور سہائتا کرے گی۔ (کالی ماتا چندر پر رحم کرے گی)

پنڈت کی روتے روتے آنکھیں سوج گئی تھیں۔ وہ رات بھر کالی ماتا کے چرنوں میں گڑگڑاتا رہتا تھا۔ اسے کسی پل چین نہیں تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ”کالی ماتا مجھے معاف کر دے اور مجھ سے خوش ہو جائے۔“

بہرحال مہینہ گزرنے کی آخری رات تھی۔ پنڈت کالی ماتا کے چرنوں میں گڑگڑا رہا تھا کہ اچانک کالی ماتا کی شفقت بھری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”پنڈت اٹھ جا، میں نے تجھے معاف کر دیا، اب آئندہ کسی پاپی کی سہائتا کے لئے مجھے کشٹ نہ دینا۔ بولنے کی تیری طاقت اب ٹھیک ہو جائے گی۔ تیری خوشی کی خاطر میں ایسا کروں گی کہ کل رات سے چندر کی آتما کی آواز کوئی نہیں سنے گا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے مکتی مل جائے گی۔ اس کی آتما کشٹ میں ہی رہے گی۔ اگر لوگ پوچھیں تو بتا دینا کہ اب چندر کی آتما کی آواز نہیں سنائی دے گی۔ اب میں چلتی ہوں۔“ اور پھر کالی ماتا پنڈت کی نظروں سے غائب ہو گئی۔

صبح جب پنڈت سو کر اٹھا تو اس کی آواز بحال

تھی۔ اب وہ بول سکتا تھا۔ لوگوں کے پوچھنے پر اس نے بتادیا کہ آج رات سے چندر کی آتما کی آواز سنائی نہیں دے گی۔ یہ سن کر لوگ خوش ہوگئے کہ اب چندر کی آتما کشٹ میں نہیں ہوگی۔ اور پھر پوری رات گزر گئی کسی نے بھی چندر کی آتما کی کشٹ میں ڈوبی آواز نہیں سنی۔

ادھر چندر کے تینوں دوست گنیش، رامو اور سنیل کی حالت بہت پتلی تھی۔ وہ تینوں جب ایک جگہ ہوتے تو چندر کی اذیت ناک موت کی بات لے بیٹھتے تھے۔ ”یار کہیں ایسا نہ ہو کہ چندر کی طرح ہماری مرتیو بھی ہوجائے۔ مجھے تو نہ رات میں چین ہے اور نہ دن میں سکون مل رہا ہے۔“ رامو بولا۔

”ابے ایسا ممکن نہیں، تو خواہ مخواہ پریشان ہورہا ہے۔ چندر وہم میں مارا گیا، مجھے تو لگتا ہے کہ اس نے اس لونڈیا کی بات اپنے دماغ میں بیٹھالی تھی اور جب کوئی بات دماغ میں بیٹھ جاتی ہے تو اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہوجاتا ہے۔ میرا تو دماغ کہتا ہے کہ چندر برگد کے درخت پر چڑھا ہوگا اور پھر اس کے بعد اس نے اس طریقے سے آتما ہتھیا کرلی ہوگی۔“ گنیش روانی میں بولتا چلا گیا۔

”گنیش مجھے تیری بات سے اتفاق ہے، تیری بات بالکل سو فیصد درست لگتی ہے۔ چندر نے ضرور آتما ہتھیا کی ہے۔“ سنیل گنیش کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے بولا۔

”کچھ بھی ہو، مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے، میں نے تو اپنے گھر والوں کو راضی کرلیا ہے کہ میں یہاں سے اپنی چاچی کے گھر چلا جاؤں۔ ماتا نے کہہ دیا ہے کہ تو آنے والے سوموار کو اپنی چاچی کے گھر چلے جانا۔“

مجھے تو یہاں رہ کر چین نہیں ملے گا اور میں گھٹ گھٹ کر مرجاؤں گا۔“ رامو بولا۔

”ابے تو تو بہت ہی ڈرپوک نکلا، ہمارا ساتھی ہوکر اتنا ڈر رہا ہے۔ اب یہ کہنے کی ساری باتیں ہیں مرنے کے بعد کسی کی بھی آتما پلٹ کر نہیں آتی اور نہ ہی کسی کو کشٹ دیتی ہے، چل میرے ساتھ دو پیگ دارو کا پئے گا تو تیرا بھیجا ٹھیک ہوجائے گا۔“ سنیل نے رامو سے کہا۔

اس کے بعد وہ تینوں اٹھے اور دارو خانہ میں جاکر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں دارو ان کے سامنے آگئی تو وہ دارو کا گلاس بھر کر اپنے پیٹ میں اتارنے لگے۔

شام ہونے والی تھی وہ تینوں اٹھے اور اکٹھے ہی اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگے۔

وہ خراماں خراماں جھومتے ہوئے اسی راستہ پر چلنے لگے جو راستہ برگد کے درخت کے نیچے سے ہوکر گزرتا تھا۔ وہ اپنی باتوں میں مگن ہر طرف سے لاپروا ہوکر گھر کی جانب جارہے تھے جب وہ تینوں برگد کے درخت کے نیچے پہنچے۔

تو اچانک برگد کے درخت کی ایک پتلی شاخ خود بخود ٹوٹ کر رامو پر آن گری۔ ٹوٹنے کی طرف سے شاخ نوکیلی ہوگئی تھی، اوپر سے شاخ گری اور سیدھی رامو کے سر میں اندر کو گھستی چلی گئی۔ یہ دیکھ کر گنیش اور سنیل کا نشہ ہرن ہوگیا۔

برگد کی شاخ سر سے ہوتی ہوئی ٹھوڑی کی طرف سے باہر کو نکل گئی۔ رامو کو چیخنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ رامو کو دیکھ کر وہ دونوں سکتے میں آگئے تھے۔ وہ دونوں ٹکٹکی باندھے رامو کو دیکھ رہے تھے۔ کہ اتنے میں ایک شخص اس جگہ سے گزرنے لگا۔ وہ جب قریب پہنچا تو اس نے دیکھا رامو کے سر میں برگد کی شاخ گھس کر ٹھوڑی کے نیچے سے باہر نکل گئی تھی۔ ”ارے یہ کیا ہوگیا؟“

وہ شخص بولا تو ان دونوں کو جیسے ہوش آگیا۔

”راجندر! اوپر سے اچانک ڈال گری اور اس کے سر میں گھستی چلی گئی۔“ گنیش بولا۔

”یہ کیسے ہوسکتا ہے؟! شاخ خود بخود کیسے ٹوٹ کر گر پڑی؟“ راجندر نے کہا۔

”راجندر بھائی ایسا ہی ہوا ہے۔ ہم تینوں گھر جارہے تھے کہ یہ ہوگیا۔“ اس مرتبہ سنیل بولا۔

رامو زمین پر گر پڑا تھا۔ اس کے جسم سے نکلنے والے خون نے اس جگہ کی زمین کو سرخ کردیا تھا۔ رامو کی جان بڑی آسانی سے اس کا شریر چھوڑ چکی تھی، اسے ہلنے اور مچلنے تک کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ایک

سوچی سمجھی اسکیم کے تحت وہ شاخ رامو پر گری تھی۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اتنی موٹی شاخ خود بخود کیسے ٹوٹ کر رامو کے سر پر گر پڑی۔

اب رات کا اندھیرا ہر سو پھیل چکا تھا۔ ”تم دونوں یہیں رکو! میں جاکر جلدی سے گاؤں والوں کو بلاکر لاتا ہوں۔ تم دونوں اس جگہ سے ہلنا نہیں۔“ راجندر نے کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گاؤں کی طرف چلنے لگا۔ چند منٹ میں ہی بہت سارے لوگ اپنے اپنے ہاتھوں میں لالٹین اٹھائے اس جگہ آگئے۔

رامو کے سر میں جس طرح شاخ گھسی تھی اسے دیکھ کر ہر شخص حیران ہورہا تھا۔ گنیش اور سنیل رامو کے لئے دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ”ہم تینوں اکٹھے گھر جارہے تھے کہ اچانک ایسا ہوگیا، ارے ہمیں کیا پتہ تھا، ورنہ ہم اس راستے سے نہیں آتے۔“ گنیش بولا۔

رامو کا پتا تو جیسے اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ لوگ اسے ہوش میں لاتے اور پھر وہ ”رامو...... رامو......“ بول کر بے ہوش ہوجاتا۔ رامو کے گھر والوں کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ سارے گھر والے پانی کے بغیر مچھلی کی طرح تڑپ رہے تھے۔

چند لوگوں نے رامو کو پیر کی جانب سے پکڑا پھر چند لوگوں نے ٹوٹی ہوئی شاخ کو رامو کے سر سے باہر کو کھینچ لیا۔ اتنی دیر میں رامو کا پورا چہرہ سوج کر کپا ہو چکا تھا۔ اس کا مسخ شدہ چہرہ دیکھ کر اسے پہچاننا مشکل ہورہا تھا۔

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا پورے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ ویسے بھی اب اماوس کی راتیں شروع ہوچکی تھیں۔ آسمان سے چاند غائب تھا۔ لوگوں نے رامو کو چارپائی پر ڈالا اور اشکبار آنکھوں سے اسے لے کر گاؤں کی طرف بڑھے۔

گنیش اور سنیل تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ان سے زمین پر اپنے قدم جما کر چلنا دوبھر ہورہا تھا۔ دو دو لوگ ان دونوں کو دونوں طرف سے پکڑ کر لے جارہے تھے۔ ”بے چاروں کی حالت بہت ابتر ہورہی ہے، ان کے سامنے ہی ان کا دوست انہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ بے چاروں پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے رامو کو مرتا دیکھا ہے تو بھلا انہیں ہوش اور جسم میں طاقت کیسے ہوگی۔ بھگوان ان پر بھی اپنی کرپا کرے۔“ ان تمام لوگوں میں سے ایک شخص بولا۔

”ہاں بھائی! تمہاری بات ٹھیک ہے، بے چاروں سے چلنا بھی مشکل ہورہا ہے۔“ ایک اور شخص بولا۔

جتنے لوگ اتنی باتیں تھیں۔ کچھ لوگ تو بالکل سکتے کے عالم میں تھے ان سے بولا بھی نہیں جارہا تھا۔

تھوڑی دیر میں وہ لوگ رامو کے گھر کے پاس پہنچ گئے۔ چارپائی نیچے رکھ دی گئی جس پر رامو کا مردہ وجود پڑا تھا۔ جلدی جلدی اس جگہ دری بچھادی گئی۔ دری پر تمام لوگ بیٹھ گئے۔

”لگتا ہے برگد کا درخت اب خونی ہوگیا ہے اس نے بھینٹ لینا شروع کردیا ہے۔“ ایک شخص بولا۔

”ارے بھائی! تم کیسی باتیں کررہے ہو، اس گاؤں میں ہماری زندگی بیت رہی ہے، اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اچانک برگد کا درخت خونی کیسے ہوگیا؟“ ایک دوسرے نے جواب دیا۔

”بھائیو! تم لوگ مانو یا نہ مانو میرے دماغ میں تو آرہا ہے کہ برگد کے پیڑ پر کوئی بھٹکی ہوئی آتما نے بسیرا کرلیا ہے۔ پہلے چندر اس پیڑ پر مرا، اور اب رامو کی موت ہمارے سامنے ہے۔“ ایک نے کہا۔

”ابے تو کیا پاگل ہوگیا ہے، برگد پر بھٹکی آتما کیسے آسکتی ہے، تجھے معلوم نہیں کہ اس جگہ تو کالی ماتا کا پرانا مندر ہے اور مندر کے پاس کوئی بھٹکی آتما کیسے آسکتی ہے۔“

”یہ بس اتفاق ہے۔“ ایک نے کہا۔

”ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم لوگ کچھ عرصہ کے لئے وہ راستہ ہی چھوڑ دیں۔ پھر دیکھتے ہیں کہ برگد کا درخت بھینٹ کیسے لیتا ہے۔“

”ارے بھائی۔ یہ ممکن نہیں کیونکہ وہ واحد راستہ ہے جس پر سے ہم گزرتے ہیں۔ کوئی دوسرا راستہ ہم کیسے بناسکتے ہیں اور یہ بات دماغ میں آنے والی نہیں۔“

پورے گاؤں میں رامو کی موت پر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ لوگوں کے چولہے ٹھنڈے پڑے تھے۔ کسی کو بھی کھانا پینا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لوگ رامو کے گھر کے باہر بیٹھے تھے اور عورتیں اپنے اپنے گھروں میں بے چین و بے سکون تھیں۔ بچے تو تھک ہار کر نیند کی وادی میں پہنچ گئے تھے۔

رامو کے گھر کے پاس جہاں لوگ بیٹھے تھے اس جگہ پیپل کا ایک بہت بڑا گھنا درخت تھا۔ رات کے جب ساڑھے بارہ بجے تو اس درخت پر کئی الو کریہہ آواز میں اچانک چیختے ہوئے درخت پر اڑنے لگے۔ الوؤں کی وحشت ناک آواز سن کر اس جگہ بیٹھے ہوئے سارے لوگ سہم کر رہ گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب گاؤں دیہات میں بجلی نہیں ہوتی تھی۔ چارپائی پر رامو کی لاش پڑی تھی اور اس پر ایک چادر ڈال دی گئی تھی۔ چارپائی سے ہٹ کر گیس کی بتی جل رہی تھی۔

اچانک پیپل کے درخت پر سے یا پھر نہ جانے کس طرف سے کئی بڑی بڑی دیوہیکل سیاہ چمگادڑیں خوفناک آواز نکالتی ہوئی رامو کے چہرے پر جھپٹ پڑیں اور پھر وہ چاروں رامو کے چہرے پر چمٹ گئیں۔ وہ خونی منظر لوگوں کے دلوں پر دہشت طاری کرنے لگا، لوگ بدحواس ہو کر اپنی جگہ بیٹھے ہوئے دہل کر رہ گئے۔ پھر چند سیکنڈ بعد وہی چمگادڑیں اڑتی ہوئی رات کے اندھیرے میں نہ جانے کس طرف غائب ہو گئیں۔

کافی دیر تک لوگ اپنی اپنی جگہ سہمے ہوئے بیٹھے رہے۔ اتنے میں رامو کا باپ اپنی جگہ سے بدحواس ہو کر ”رامو بیٹا“ کہتے ہوئے اٹھا اور چارپائی کے پاس جا کر رامو کے چہرے پر جھک گیا۔ پھر اس کی دلخراش آواز لوگوں نے سنی۔ ”ارے میرے رامو کے ساتھ کیا ہو گیا، اے بھگوان یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں، بھگوان میرے رامو کی رکھشا کر، رامو تو چلا گیا اور مجھے زندہ درگور کر گیا، میں کتنا بدنصیب ہوں کہ تیری حفاظت بھی نہیں کر سکتا، ارے تو نے ایسا کیا انیائے کر دیا تھا کہ تجھے یہ کشٹ برداشت کرنا پڑا، تو نے ضرور کچھ نہ کچھ انیائے کیا ہوگا...... ورنہ تیرے ساتھ ایسا نہ ہوتا...... لوگو! دیکھو یہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا؟“

جھٹ سے کئی لوگ اپنی جگہ سے اٹھے اور گیس بتی کو قریب لا کر دیکھا تو سارے کے سارے دہل کر رہ گئے۔ سب سہمی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تھے۔ ”ارے بھائیو! میرے رامو کو دیکھو......“ اور یہ بول کر باپ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ وہ زمین پر اس جگہ بیٹھتے چلا گیا اور پھر وہ ایک طرف کو گر گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

جلدی سے لوگوں نے اسے اٹھا کر اس جگہ سے تھوڑی دور لا کر دری پر لٹا دیا۔ ”ارے ذرا پانی لاؤ...... یہ تو بے ہوش ہو گئے۔“ ایک نے کہا تو ایک نوعمر لڑکا جلدی سے بھاگا ہوا ان کے گھر میں گیا اور فوراً کٹورے میں پانی لے آیا۔ لوگوں نے بے ہوش رامو کے باپ کے منہ پر چلو میں پانی لے کر چھڑکنا شروع کیا تو انہوں نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔ لوگوں نے سہارا دے کر انہیں بٹھا دیا۔ ایک آدمی بولا۔ ”کاکا حوصلہ کرو، اگر تم ہی حوصلہ ہار جاؤ گے تو گھر والوں کا کیا بنے گا؟ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا...... اب تو صرف بھگوان سے پرارتھنا کرنے کی ضرورت ہے۔ بھگوان اس کی رکھشا کرے اور اس کی غلطیوں کو معاف کر دے...... کسے پتہ کہ اس نے کیا غلطی کر دی تھی کہ اس کے ساتھ ایسا ہوا۔“

چند سیکنڈ میں ہی چاروں چمگادڑوں نے رامو کے چہرے کا سارا گوشت ادھیڑ کر کھا گئی تھیں۔ اس کا پورا چہرہ بھیانک ہو گیا تھا۔ چہرے کی ہڈیاں نظر آنے لگی تھیں۔ اس کا چہرہ دیکھ کر لوگ دہشت زدہ ہو گئے تھے۔ چہرے کے گوشت کے ساتھ ساتھ اس کی دونوں آنکھیں بھی غائب ہو چکی تھیں۔ اب آنکھوں کی جگہ دو چھوٹے چھوٹے گڑھے نظر آ رہے تھے۔ اس قدر ہولناک منظر تھا کہ لوگ اندرونی طور سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔

گاؤں دیہات میں یہ بات بہت اچھی ہے کہ سارے لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد میں برابر کے

شریک ہوتے ہیں۔ جسمانی طور پر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور جب تک خوشی یا غم کا مرحلہ ختم نہیں ہو جاتا اس وقت تک ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ سارے گاؤں والے اس جگہ بیٹھے تھے۔

تھوڑی دیر میں صبح کا سپیدہ پھیلنے لگا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے صبح کا سورج طلوع ہوا۔ سارے لوگ بھاگ دوڑ کرنے لگے اور پھر دو گھنٹہ کے اندر اندر رامو کو چتا پر لٹا دیا گیا۔ چتا کو آگ لگائی گئی اور دھڑ ادھڑ چتا سے شعلے بلند ہونے لگے۔ سارے لوگوں کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ لوگوں کے دل دہل رہے تھے اور جیسے سب پر سکتہ طاری تھا۔ رامو کے مرنے کے منظر اور چمگادڑوں کے خونی عمل نے لوگوں کو خوفزدہ کر کے رکھ دیا تھا۔ ایسا منظر لوگوں نے اپنی زندگی میں کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔ بڑے بڑے حادثے اور بھیانک موتیں لوگوں نے دیکھی تھیں مگر اس جیسا وحشت ناک خوفناک دہشت ناک اور ڈراؤنا منظر تصور میں بھی نہیں آیا تھا۔

گنیش اور سنیل کی حالت دیدنی تھی ان کی تو جیسے زبان بند ہو کر رہ گئی تھی۔ ان کا ایک اور ساتھی ہنستا کھیلتا ان کے ساتھ موج مستی کرتے ہوئے اچانک بھیانک موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔ ان دونوں کی سوچنے کی صلاحیت بھی مفقود ہو کر رہ گئی تھی۔ دونوں، لوگوں کی طرح طرح کی دل دہلاتی باتیں سن رہے تھے مگر ان کی اپنی زبان گنگ تھی۔ ان دونوں کی نیندیں اچاٹ ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ لاکھ کوشش کرتے کہ تھوڑی دیر کے لئے ہی نیند آ جائے مگر نیند ان سے کوسوں دور چلی گئی تھی۔ کھانا پینا ان کا چھوٹ گیا تھا۔ بس ہر وقت خیالوں میں گم بت بنے بیٹھے رہتے تھے۔ اگر بیٹھے ہوتے تو ان کی گردنیں نیچے کو جھکی رہتیں اور اگر چارپائی پر لیٹتے تو ان کی نظر اوپر چھت کو گھورتی رہتی تھیں۔ ان کی اپنی ساری مرضی غائب ہو گئی تھی، صرف رفع حاجت وغیرہ سے فارغ ہونے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھ جاتے اور پھر اس کے بعد مردار حالت میں بیٹھ جاتے۔

گاؤں کے سارے افراد وقت کے ساتھ ساتھ نارمل ہوتے چلے گئے اور اپنے کام کاج کی طرف دھیان دینے لگے تھے مگر وہ دونوں تو جیسے زندہ لاش بن کر رہ گئے تھے۔ لوگ ان دونوں کی غیر حالت دیکھ کر اچنبھے میں تھے کہ گاؤں کے یہ کھلنڈرے اور آوارہ دل و دماغ کے مالک، انہیں کس بات سے سکتہ ہو گیا ہے۔ لوگ معلوم بھی کرتے تو وہ دونوں ہوں...... ہاں...... اور یہ...... وہ بول کر لوگوں کو ٹال دیتے تھے۔

اصل خوف ان کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ ان دونوں نے رامو اور چندر کی دہشت ناک موت کو دیکھ کر دہل گئے تھے اور وہ ہر وقت اسی سوچ میں گھل رہے تھے کہ کہیں اب ہم دونوں کی باری نہ ہو۔ انہیں یکا یقین ہو گیا تھا کہ کسی بھی وقت ہمارا حشر بھی ان لوگوں کے سامنے ہوگا۔ اور اگر ہم دونوں یہاں سے کہیں اور بھاگ جائیں مگر ایسی حالت میں جائیں تو جائیں کہاں۔ کیونکہ موت سے پیچھا چھڑانا بالکل بھی ممکن نہیں۔

”ابے سنیل کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے ساتھ بھی کچھ ہو جائے۔ لگتا ہے یہ سارا چکر اس لونڈیا کی آتما کا ہے، اب تو میں بہت پچھتا رہا ہوں، کاش! میں چندر کی باتوں میں نہیں آتا، چندر کی باتوں نے میرا دماغ گھما کر رکھ دیا تھا۔ میرے دل میں قطعی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ بلادکار کیا جائے۔ مسافر لڑکی...... نہ جانے دل میں کیا کیا لے کر آئی ہوگی...... ہم نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا...... اگر میں اکیلا ہوتا تو ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر میں تو تم لوگوں کی وجہ سے...... خیر اب تو......“ اور گنیش کی بات ادھوری رہ گئی۔ کیونکہ سنیل نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

”تو بہت ڈرپوک ہے...... بلاوجہ میرے دل کو بھی دہلا رہا ہے۔ سانپ تو گزر گیا، اب لکیر پیٹنے سے کیا فائدہ۔ حوصلہ رکھ...... ہمت سے کام لے۔ کچھ بھی نہیں ہوگا...... جو بھی ہوا چندر اور رامو کے ساتھ وہ بس اتفاق ہے۔ مرد بن مرد...... یہ کیا عورتوں کی طرح بیٹا کا رونا، رونے لگا۔ تو ہماری وجہ سے مجبور ہوا، ارے اگر تیرے دل میں نہیں تھا تو تو وہاں سے فوراً بھاگ جاتا، اب ایسی باتیں

کرنے سے کیا ملے گا...... چل اٹھ اور حوصلہ پکڑ۔ تو میرے دل کو ہولایا نہیں کر...... تیری باتیں سن کر میں بھی نفسیاتی طور پر ایسی ویسی سوچنے لگتا ہوں۔" سنیل گنیش کے کندھے کو تھپکاتے ہوئے بولا۔

"آج دارو کی چھٹی...... شام کے بعد مندر میں پنڈت جی کے پاس چلنا، ان سے کہیں گے۔ "پنڈت جی...... ہمارا دل بہت گھبرا رہا ہے، رامو اور چندر کی موت نے ہم پر بہت زیادہ اثر کیا ہے۔ ہر وقت ان دونوں کی بھیانک موت ہمارے دل و دماغ میں سماگئی ہے۔ رات ہو یا دن بلکہ کسی پل بھی چین نہیں مل رہا ہے۔ آپ کوئی اپائے کریں کہ ہمارے دل و دماغ سے ہر طرح کا ڈر و خوف نکل جائے۔"

شام کے بعد دونوں مندر میں پنڈت کے پاس پہنچ گئے، اور پنڈت کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے تمام اپنی رام کتھا سنا ڈالی۔ "پنڈت جی آپ ہمارے لئے بھگوان سے پرارتھنا کریں کہ بھگوان ہم پر رکھشا کرے، پنڈت جی آپ کی کرپا سے ہم ضرور ٹھیک ہو جائیں گے۔ نہ جانے کیوں رامو اور چندر کی موت کی دہشت ہم پر سوار ہے، پنڈت جی اگر پوجا پاٹ کے لئے کچھ خرچہ چاہئے ہو تو وہ ہم دینے کے لئے تیار ہیں۔ آپ ہم پر دیا کریں۔" اور یہ بولتے ہوئے دونوں نے پنڈت کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

خرچ کا سن کر پنڈت کی نیت ڈگمگا گئی۔ اس نے سوچا۔ "موقع اچھا ہے، لوہا گرم ہے بس چوٹ لگانے کی دیر ہے۔" اور ویسے بھی اگر کوئی انسان بہت زیادہ پریشان ہو تو اپنی پریشانی کے لئے وہ سب کچھ کرنے پر تیار ہو جاتا ہے تاکہ اسے پریشانی سے نجات مل جائے۔

"بالکو! گھبراؤ مت، میں ہر وہ اپائے کروں گا جس سے تمہاری پریشانی دور ہو جائے، آج رات میں، میں ماتا کے چرنوں میں بیٹھ کر تمہاری رکھشا کی بات کروں گا، اور مجھے امید ہے کہ تم دونوں پر ماتا دیا کرے گی۔ رہا خرچہ تو تم دونوں ایک ایک ہزار کر کے دو ہزار دے دو، مہنگائی بھی ہو گئی ہے، کیونکہ بڑی پوجا کے لئے بہت زیادہ خرچ ہو جاتا ہے اور بڑی پوجا کرنے سے ماتا زیادہ خوش ہوتی ہے۔ تم دونوں کے دان سے دو کالے بکرے ضرور لانے پڑیں گے، اور بغیر بھینٹ دیئے ماتا زیادہ متوجہ نہیں ہوتی، بھینٹ دینے سے ماتا خوش ہو کر وہ بھینٹ قبول کر لیتی ہے، اور پھر بھینٹ دینے والوں پر ماتا خاص کر نظر کرم کرتی ہے۔ ماتا بہت دیالو ہے اور اپنے سیوکوں پر بہت زیادہ دیا کرتی ہے۔"

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کرتے ہوئے جیب سے ہزار، ہزار روپے نکال کر پنڈت کے ہاتھ پر رکھ دیئے کہ چلو ہزار روپے کی قربانی سے جیون تو بچ جائے گا، پیسہ تو آنی جانی چیز ہے۔ جیون رہا تو پیسوں کی کون فکر کرتا ہے۔

دو ہزار کی رقم لے کر پنڈت کی آنکھیں چمکنے لگیں وہ فوراً دونوں کے سر پر شفقت کے ہاتھ پھیرنے لگا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "بالکو! اب چنتا کی کوئی بات نہیں، آرام سکون سے گھر چلے جاؤ، اب باقی کام میرا ہے لیکن ایک بات کا خاص خیال رکھنا کہ یہ جو تم نے دو ہزار روپے دان کئے ہیں اس کا ذکر اوروں سے نہیں کرنا کیونکہ بھینٹ اور دان کا ڈھنڈورا پیٹنے سے ماتا ناراض ہوتی ہے۔ چلو اب تم دونوں جاؤ۔" پنڈت نے کہا تو دونوں اٹھے اور مندر سے نکلتے چلے گئے۔

دو ہزار روپے پا کر خوشی سے پنڈت کے قدم زمین پر ٹک نہیں رہے تھے۔ اس نے مندر کا دروازہ بند کیا اور پھر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ "ارے نہ بابا، میں اب خود کو کشٹ میں نہیں ڈال سکتا، میں کسی صورت بھی ان دونوں کے لئے ماتا سے پرارتھنا نہیں کروں گا، چال چلن سے یہ دونوں تو ٹھیک نہیں ہیں، انہیں کون نہیں جانتا کہ یہ کس قدر بگڑے ہوئے ہیں اور بگڑے لوگوں کو تو ماتا ویسے بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھتی، ایسا نہ ہو کہ الٹا ماتا میری درگت بنا دے، چلو اس بہانے دو ہزار تو آئے۔ ان کے آنے پر انہیں "آئیں بائیں شائیں" کر دوں گا اور بول دوں گا ماتا کے چرنوں میں بیٹھ کر میں نے تمہارے لئے بہت پرارتھنا کیا ہے، ماتا ضرور تم دونوں پر کرپا کرے گی۔ گھبراؤ نہیں ماتا اپنے چاہنے والوں کو نراش نہیں کرتی، ماتا ویسے بھی بہت دیالو ہے۔" اور یہ تمام باتیں سوچ کر پنڈت مسکراتے ہوئے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

ادھر مالنی کے بغیر رمیش کی دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ دن بدن وہ سوکھ کر کانٹا بنتا جا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں بار بار یہی خیال آتا کہ "مالنی یہاں پارک تک آئی تھی اور پھر اچانک غائب ہو گئی؟" سب کو پتہ ہے کہ اگر انسان کسی حادثے کا شکار ہو جاتا ہے یا پھر موت کے منہ میں چلا جاتا ہے اور جب جانکاری ہو جاتی ہے تو آدمی کو صبر آ جاتا ہے لیکن جب کسی کی کوئی خبر ہی نہیں ملتی کہ اس کے ساتھ ہوا کیا، وہ آخر غائب ہوا تو کیسے اور کہاں غائب ہوا؟ اس صورت میں اس کے چاہنے والے دن رات بیاکل رہتے ہیں اور چونکہ رمیش تو مالنی کو اپنی زندگی کا ہمسفر بنانے والا تھا اور مالنی بھی اس کے لئے راضی تھی تو اس صورت میں رمیش کو چین کیوں کر ملتا۔ ایک طویل عرصہ تک دونوں نے لندن میں ایک ساتھ اپنا وقت گزارا تھا، سہانی زندگی کے سپنے دیکھے تھے، دل میں خوشیاں بھری طرح طرح کی امنگیں ہوں گی، ہر لمحہ ہر پل دونوں ایک دوسرے کے خیالوں میں گم رہتے تھے اور بہت جلد اس وقت کے انتظار میں تھے کہ جب وہ منڈپ میں اگنی کے چکر لگا کر زندگی کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جیون ساتھی بن جائیں گے۔ لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ ظالم، بدکار، بدچلن، خوشیوں کے دشمن، سماج کے ناسور ان کی خوشیوں کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیں گے اور ان کے دل کے ارمان آنسوؤں میں ڈھل جائیں گے۔

رمیش اب بھی مالنی کے غم میں گھلتا جا رہا تھا۔ پل پل کا اس کا چین اس سے بہت دور جا چکا تھا۔ اس کی زندگی میں خزاں کا دور دوراں تھا، اس کے ہونٹوں سے ہنسی اور مسکراہٹیں دم توڑ چکی تھیں۔ وہ غم اور آہوں کا مجسمہ بن کے رہ گیا تھا۔

اور مرنے کے بعد مالنی کی آتما رمیش کے لئے بے قرار ہو گئی تھی۔ وہ ہر وقت رمیش کے ارد گرد منڈلاتی رہتی تھی۔ رمیش کی ابتر حالت کو دیکھ کر وہ بہت دکھی ہو گئی تھی۔ وہ پورے گاؤں میں بیاکل پھرتی رہتی تھی، رمیش سے زیادہ وہ کہیں بے سکون تھی، اس کی آتما ایک بھٹکتی ہوئی آتما بن گئی تھی۔ وہ چاہ کر بھی رمیش پر ظاہر نہیں کر سکتی تھی کہ "ظالموں نے مجھ پر ظلم کے پہاڑ توڑے، اور زندگی سے میرا ناطہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ میری خوشیوں کا گلا گھونٹ دیا۔ بہار کی امید میں خزاں ہم پر دھاوا بول دیا۔ رمیش، ہم دونوں اب کبھی نہیں مل سکتے۔ میری بیاکل آتما تمہاری یاد میں شاید ہمیشہ ہمیشہ رامپور کی فضاؤں میں در و دیوار سے اپنا سر ٹکراتی رہے گی۔

لیکن اگر بھگوان نے چاہا تو ہمارا ملن ضرور ہو گا۔

"دوسرے جنم میں۔"

کالی ماتا کی طرف سے مالنی کی آتما کو ابھی بھرپور آزادی نہیں ملی تھی کیونکہ ابھی وہ سمے نہیں آیا تھا۔ کالی ماتا اسے دلاسہ ضرور دیتی تھی کہ "مالنی تو گھبرا نہیں، میرا آشیرواد تیرے ساتھ ہے، جو مظلوم مجھے پکارتا ہے میں اس کی مدد ضرور کرتی ہوں، میری نظریں اپنے پکارنے والوں پر ہر وقت لگی رہتی ہیں۔ میں اپنے سیوکوں کو نظر انداز نہیں کرتی۔ تیری آتما کے لئے بھی اچھا سمے ضرور آئے گا، تیری آتما کو شانتی ضرور ملے گی اور تو دوسرے جنم میں اپنے چاہنے والے کو ضرور پا لے گی۔

تو گھبرا نہیں! تجھ پر ظلم کرنے والے نرک میں جائیں گے، ان کی آتما کو کبھی بھی شانتی نہیں ملے گی، ان کی آتما سدا بیاکل رہے گی۔ کیونکہ ایشور کا یہ وعدہ ہے کہ ظلم کرنے والوں کو مر کر بھی شانتی نہیں ملے گی اور ظلم کرنے والے ضرور نرک میں جائیں گے۔"

ایک دن مالنی کی آتما اپنی بے چینی کو برداشت نہ کر سکی اور پھر وہ کالی ماتا کے سامنے گڑگڑانے لگی۔ "ماتا اب مجھ سے رمیش کا درد دیکھا نہیں جا رہا۔ ماتا مجھے اتنی آزادی دے کہ میں رمیش کی بے چینی ختم کر سکوں اور اس کے دل کو ڈھارس بندھاؤں تاکہ وہ تھوڑا بہت تو شانت ہو جائے۔"

اور پھر مالنی کی آتما کو کالی ماتا کی طرف سے

ایک حدود میں رہتے ہوئے رمیش کے لئے آزادی مل گئی کہ وہ رمیش کے قریب ہو سکتی ہے، جس سے رمیش کو کچھ شانتی ملے۔

ایک رات سے آخر کار رمیش کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور وہ آنسوؤں کے سمندر میں غوطے لگانے لگا۔ ایک طویل عرصہ سے اس نے مالنی کی یادوں کو سینے میں دبائے بیاکل رہا تھا مگر آج کی رات وہ قابو سے بے قابو ہو گیا، اس کے جسم کا خون آنسوؤں کی صورت میں باہر نکلنے لگا۔ وہ اپنا منہ تکیہ میں چھپا کر سسک پڑا۔ آنسوؤں سے اس کا چہرہ تر ہو گیا، دل تو چاہ رہا تھا کہ وہ گھر سے باہر نکل کر پورے رامپور کو اپنے آنسوؤں کے سیلاب میں بہادے مگر وہ مجبور تھا۔ ''مالنی تم کہاں ہو! مالنی تم کہاں چلی گئیں؟ مجھے اس سنسار میں بے یار و مددگار اکیلا چھوڑ کر، میں تمہیں کس طرح اور کہاں کہاں ڈھونڈوں، میں کہاں اور جاؤں، کس سے تمہارا پتہ پوچھوں؟ مالنی اب تمہارا بچھڑنا مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا، مالنی تمہارے بنا میرا جیون کٹی پتنگ کی طرح ہوا کے دوش پر ڈول رہا ہے، میں تو تمہارے لئے بھگوان سے پرارتھنا کرتے کرتے تھک گیا ہوں، اب تو تم ہی بھگوان سے پرارتھنا کرو کہ بہت جلد ہمارا تمہارا ملن ہو جائے، میں تو بھگوان سے یہ بھی کہہ چکا ہوں کہ بھگوان تو میرا جیون ختم کر دے، اب مجھ میں شکتی نہیں کہ میں اپنا وجود سنبھال سکوں، اب تو میرا وجود خود مجھے بھاری لگنے لگا ہے۔ مالنی تم مجھے بھی اپنے پاس بلالو، مالنی اب میں کیا کروں، اب تو صرف ایک ہی خواہش رہ گئی ہے کہ میں اپنا جیون تیاگ دوں، اور ہو سکتا ہے کہ میں کسی دن اس سنسار کو چھوڑ دوں گا، اس سنسار سے اپنا ناطہ توڑ لوں گا، مالنی میں تمہیں ہر جیون میں تلاش کروں گا، اور ہر جیون میں تمہاری تلاش میں آنسو بہاتا رہوں گا، اور پھر اپنا جیون تیاگتا رہوں گا۔''

روتے روتے رمیش کی آنکھیں سوج گئی تھیں، اس کی ہچکیاں اس کے گلے میں گھٹ گئی تھیں، اس کا دم گھٹنے لگا تھا، اس کی سانسیں اپنی رفتار کم کرنے لگی تھیں کہ اچانک اس کی ایک زوردار آہ نکلی اور اس پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ دماغ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مدھم پڑ گئی، وہ بالکل نڈھال ہو گیا اور پھر اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔ وہ سو گیا تھا لیکن اس کا حواس جاگ رہا تھا۔

اس نے اچانک محسوس کیا کہ ''کسی نے اپنا نرم و نازک ہاتھ اس کے چہرے پر پھیرا ہو، اس نادیدہ وجود کی نرم و نازک مخروطی انگلیاں اس کے بالوں میں پھرنے لگیں، تو رمیش کو ہلکا ہلکا سکون محسوس ہونے لگا۔ اس نے سوچا کہ اس نرم و نازک اور شفیق ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے مگر ایسا کرنے سے وہ مجبور تھا، اس کے ہاتھوں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ ایسا کر سکتا تھا اس نے یہ بھی چاہا کہ آنکھیں کھول کر وہ دیکھ لے کہ وہ کون مہربان ہے جو اس کے بالوں میں اپنی نرم و نازک گداز انگلیاں پھیر رہا ہے، اس کی بوجھل آنکھیں بہت وزنی ہو چکی تھیں، کئی بار اس نے کوشش کی کہ اپنی آنکھوں کو صرف وا کر سکے مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔

نرم و نازک انگلیاں تواتر سے اس کے بالوں میں سرگرداں تھیں اور اس وجہ سے اسے آج مہینوں بعد سکون محسوس ہو رہا تھا۔ ایسا سکون اس نے آج سے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کے دل میں خواہش جاگی کہ وہ اس مہربان کا شکریہ تو ادا کر دے جو اسے سکون پہنچا رہا تھا۔

رات کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جبکہ سب کو اپنی نیند پیاری ہوتی ہے لیکن وہ وجود تو خود جاگ کر اپنا سکون ختم کر کے اسے سکون پہنچا رہا تھا۔ وہ اب اپنے پورے جسم میں فرحت ہی فرحت محسوس کر رہا تھا، اب اس کے جسم کے کسی بھی حصے میں کوئی کسک باقی نہیں رہی تھی۔ اس کے سینے میں مقید سارا غم جیسے باہر کو نکلتا محسوس ہوا، اس نے ایک بہت لمبا سانس کھینچا اور سکون اس کے سارے جسم میں سرایت کرتا چلا گیا کہ پھر اچانک آنسو کا ایک بڑا سا گرم قطرہ اس کے چہرے پر گر پڑا......''

(جاری ہے)

انوکھا انجام

ایس حبیب خان۔ کراچی

جن نے اپنا ہاتھ آگے کو بڑھایا تو اس کا ہاتھ لمبا ہوتا ہوا سامنے کھڑی عورت کے سینہ تک پہنچ گیا اور پھر اس عورت کا اپنا دل بھنچتا ہوا محسوس ہوا، اس کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں اور اس کی بھیانک چیخ در و دیوار کو دہلا گئی۔

ایک جن کی در پردہ دیدہ دلیری اور پھر جب وہ کھلے عام سامنے آیا تو لوگ تھرا کر رہ گئے

''**مہندی** کی رات آئی مہندی کی رات، دیکھے کوئی کسی دلہن کے ہاتھ......'' گانے کی آواز کان پھاڑ رہی تھی، کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر اچانک صفت بی کے چلانے کی آواز سنائی دی۔ ''ارے باؤلے ہو گئے ہو سب کے سب؟ کسی بات کا ہوش ہی نہیں ہے، بس گانے میں مگن ہو......'' تو سب ایک دوسرے کو دیکھ کر کھی کھی کرنے لگے۔ ''سوری صفت بی!'' مہوش نے صفت بی کے گلے میں پیچھے سے بانہیں ڈال کر کہا تو ان کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

وہ سب بس میں بیٹھے باراتی تھے اور بارات پرویز صاحب کے بیٹے فہد کی تھی جو کہ لاہور جا رہی تھی۔ سفر جاری تھا اور سب کی شرارتیں بھی۔ مہوش سب سے آخری سیٹ پر آئی اس کے ہاتھ میں سینڈوچ کی پلیٹ تھی۔

''حیا!'' اس نے حیا کو ہلایا تو اس نے کسمسا کر

آنکھیں کھول دیں۔ ”لو بھئی کھالو اسے ورنہ صفت بی مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گی کہ حیا بھوکی رہ گئی۔......“ اس نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

”اب کیا کروں آنکھ تو لگنی ہی تھی۔ سفر بھی تو اتنا لمبا ہے......!“ حیا نے سینڈوچ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”بھئی یہ تو قسمت کا کھیل ہے، کوئی لاہور بارات لے کر جاتا ہے، اور کسی کی رخصتی سیدھی انگلینڈ ہوگی“ مہوش نے حیا کے کان میں کہا تو حیا کے گال حیا سے سرخ ہوگئے۔

حیا فہد کی خالہ زاد تھی اور اس کا نکاح ماموں کے بیٹے عاطف سے ہوچکا تھا جو کہ انگلینڈ میں سیٹل تھے۔ ماموں کا انتقال ہوگیا تھا اور ممانی کی ضد تھی کہ حیاء اور عاطف کی شادی جلدی سے ہوجائے۔ حیا ماسٹرز کررہی تھی اس لئے انہوں نے نکاح کرلیا اور رخصتی حیا کی پڑھائی پوری ہونے کے بعد ہونی تھی۔

بارات لاہور پہنچ گئی۔ لڑکی والوں نے اپنے برابر والے گھر میں مہمانوں کے ٹھہرنے کا انتظام کیا تھا۔ سب بڑے تو نیچے رک گئے مگر نوجوانوں نے اوپر کے کمرے پسند کیے تاکہ ”مستیاں کرتے وقت وہ بڑوں کی پہنچ سے دور رہیں......“ وہاں پہنچ کر سب سفر کی تھکان اتارنے کے لئے سوگئے۔

جب ایک ایک کرکے سب اٹھے تو نہا دھو کر محفل جمنا شروع ہوگئی، دونوں طرف کے نوجوان ایک دوسرے کو چیلنج کررہے تھے...... ساتھ مزے دار چیزوں سے تواضع بھی ہورہی تھی۔

حیا نہا کر باہر آئی تو اسے چھت کی طرف جاتی سیڑھیاں نظر آئیں...... ”چھت پر دھوپ ہوگی وہاں بال سکھاتی ہوں......“ اس نے سوچا اور چھت پر آگئی۔ چھت بہت بڑی تھی اور دھوپ سے بھری ہوئی تھی ایک طرف پانی کی ٹنکی بنی ہوئی تھی۔ دھوپ میں حیا الگ ہی چمک رہی تھی۔ گہرے نیلے سوٹ میں اس کی دودھیا رنگت اٹڈ پڑ رہی تھی۔ اس کے سنہرے بھیگے ہوئے بال دھوپ میں سونے کے تاروں کی طرح چمک رہے تھے گال سیب کی طرح، اور سرخ ہونٹ گلاب کی پتیاں لگ رہے تھے اور دھوپ سے مچلتی ہوئی نیلی آنکھیں جن کے آگے گھنیری پلکوں کی جھالر سی پڑی ہوئی تھی اس کے کپڑوں کے رنگ میں مل رہی تھیں۔ سورج اس کے سامنے تھا اس نے اپنا ہاتھ بے اختیار آنکھوں کے آگے کرلیا۔ وہ آگے ہوئی تو کوئی چیز اس کے پیر سے ٹکرائی، اس کی آواز پر اس نے نیچے دیکھا تو وہ ٹین کا کین تھا۔ آنکھیں تھوڑی عادی ہوئیں تو وہ آس پاس کا علاقہ دیکھنے لگی۔

ایک دم حیا کو اپنے پورے وجود میں بے پناہ تپش کا احساس ہوا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔ اس کا حلق خشک ہونے لگا تو اس نے اپنی زبان اپنے ہونٹوں پر پھیری اسے بہت گھبراہٹ ہورہی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ نیچے آئی اور کمرے میں آکر بستر پر لیٹ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

”وہ!“ سائے کی تلاش میں ادھر آیا تھا اور ٹنکی کے نیچے سائے میں بیٹھا، آنکھیں بند کئے اونگھ رہا تھا۔ کھڑکھڑانے کی آواز نے اس کی نیند میں خلل ڈال دیا تھا، اس نے آہستہ سے اپنی گہری سبز آنکھوں کو وا کیا اور پھر اس پر ایک سحر سا طاری ہوگیا اور وہ ٹکٹکی باندھے اسی جانب دیکھتا رہا۔ اور دیکھتے دیکھتے اس کی نظر سامنے نیچے جاتی سیڑھیوں پر ٹھہر گئی۔ وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے نیچے آیا اور کمرے کے دروازے پر آگے کے دونوں پیر جمائے دیکھتا ہی رہا......

شام ہوتے ہی مہندی کی تقریب شروع ہوگئی۔ حیا پوری تقریب میں ہر ایک کی نگاہوں کا مرکز بنی رہی۔ کئی خواتین نے اس کے رشتے کی خواہش ظاہر کی مگر حیا تو پہلے ہی کسی اور کی ہوچکی تھی۔ ہلکے سبز رنگ کے کپڑوں میں حیا پری لگ رہی تھی۔ نوجوانوں نے مہندی کی تقریب کو خوب انجوائے کیا۔ گانوں کا مقابلہ کافی دیر جاری رہا مگر آخر میں جیت حیا والوں کی ہوئی۔ حیا بچوں کی طرح خوش ہورہی تھی۔

”وہ!“ خاموشی سے آکر ایک کونے میں بیٹھ گیا

اور ٹکٹکی باندھے اسی جانب دیکھنے لگا۔

تقریب ختم ہونے کے بعد بھی کسی کا جوش ٹھنڈا نہیں ہوا اور سب نے رت جگا کرکے گھر سر پر اٹھائے رکھا۔ بڑی خواتین کی محفل ایک جگہ، مرد حضرات کی گفتگو اپنی جگہ جاری تھی اور نوجوانوں کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ صبح ہونے سے کچھ پہلے بڑوں نے زبردستی شور شرابہ بند کروایا کیوں کہ اگلے دن شادی تھی۔

شادی میں حیا نے چوڑی دار پاجامہ کے ساتھ لیموں کا گھیر دار فراک پہنا تھا۔ لباس پہن کر وہ اپنے بالوں کی چوٹی بنانے آئی تھی جیسے ہی اس نے کنگھا اٹھایا ایک زوردار ہوا کا جھونکا اندر آیا اور اس کے سارے بال بکھر کر رہ گئے۔ اس نے مڑ کر دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے بال سمیٹ کر دوبارہ باندھنے چاہے۔ تو سارے بال پھر خود بخود بکھر گئے۔

حیا کی بڑی بڑی نیلی آنکھوں میں خوف جھلکنے لگا۔ اس نے کنگھا پھینکا اور کھلے بالوں سے نیچے چلی گئی، کھلے بالوں میں کہ وہ زیادہ حسین لگ رہی تھی۔

شادی ہوگئی، دلہن کو رخصت کرکے اسے گھر لے جایا گیا جہاں لڑکے والے ٹھہرے تھے۔ بڑے تو آرام کرنے چلے گئے مگر لڑکیاں پھر جاگنے کا شور کرنے لگیں۔ ”ارے لڑکیوں! کتنے گانے گاؤ گی؟ دل نہیں بھرا تم لوگوں کا؟“ حیا کی امی بولیں۔

مہوش بولی۔ ”خالہ جان! بس آج رات ہے ہمارے پاس کل تو روانگی ہے۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔ ”ٹھیک ہے مگر زیادہ شور نہیں کرنا، آرام کرنے دو بڑوں کو اتنا لمبا سفر طے کرنا ہے کل۔“

لڑکیاں ڈھول لے کر چھت پر چلی گئیں۔ ”چل بھئی حیا شروع ہوجا!“ حیا تو تیار تھی، جھٹ سے ڈھول لے کر چہکنے لگی۔

”وہ!“ ایک کونے میں بیٹھا اپنی سبز آنکھوں سے حیا کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا......

حیا کے گورے ہاتھوں میں گہری سرخ مہندی رچی ہوئی تھی اور ان ہاتھوں کی تھاپ مسلسل ڈھولک پر پڑ رہی تھی، مسلسل گانے اور ہنسنے سے حیا کے گال دمک رہے تھے، اس کا چہرہ گلاب کی طرح سرخ ہورہا تھا۔ سارے جہاں کا حسن حیا میں سمٹ آیا تھا حیا کو ایک دم ایک انجانی سی بے چینی ہونی شروع ہوگئی۔ پھر ڈھول بجاتے بجاتے اس کو شدت سے نامعلوم تپش کا احساس ہونے لگا اور وہ بڑھتے بڑھتے دہکنے کے حد تک تیز ہوگئی اور وہ ایک طرف ڈھلک کر بے ہوش ہوگئی ساری محفل میں شور مچ گیا...... ”حیا کو کیا ہوا؟“

صفت بی، خالہ اور حیا کی امی دوسری خواتین کے ساتھ دوڑ کر اوپر آئیں، صفت بی نے حیا کو چھوا تو انگارے کی طرح دہک رہی تھی اور رنگت تپی تپی سی لگ رہی تھی۔ ”یااللہ! میری بچی“ حیا کی امی گھبرا کر بولیں۔

حیا کو کمرے میں لے گئے، ڈاکٹر آیا اور اس نے چیک کرکے کہا کہ نیند پوری نہ ہونے اور تھکن سے ایسی کیفیت ہوسکتی ہے۔ انہیں آرام کرنے دیں اور دیگر ہدایت دے کر رخصت ہوگیا۔ سب لائٹ آف کرکے چلے گئے۔

”وہ!“ اندھیرے میں چلتا ہوا حیا کے پاس آیا اور اس کے قدموں میں آنکھیں موند کر بیٹھ گیا......“

صبح حیا اٹھ گئی مگر اس کا پورا وجود انجانے اور بوجھ سے بھاری ہورہا تھا، گاڑی میں آخری سیٹ پر حیا کے لئے بستر سا بنا کر لگا دیا۔ لیٹ کر حیا نے آنکھیں بند کرلیں۔ سب بیٹھ گئے مگر گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ ایک دفعہ، دوسری دفعہ، چار پانچ دفعہ مگر وہ اسٹارٹ نہ ہوئی۔ سب لوگ نیچے اتر آئے۔ اور آپس میں بات کرنے لگے۔ ”لگتا ہے آج روانگی ممکن نہیں ہے۔ چلیں ملکہ عالیہ! گاڑی اسٹارٹ نہیں ہورہی، آج شاید نہ جاسکیں ہم لوگ۔“ مہوش نے حیا سے کہا......

”وہ!“ ایک ایک سیٹ کے نیچے سے چلتا ہوا حیا کی سیٹ کے نیچے آکر بیٹھ گیا اور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا......“

”نہیں! مجھے نہیں اترنا، مجھے تو آج ہی گھر جانا

ہے......'' حیا نے ضد کرتے ہوئے مہوش کو جواب دیا۔
حیا کا یہ کہنا تھا کہ گاڑی ایک دم اسٹارٹ ہوگئی۔ سب جلدی جلدی گاڑی میں سوار ہوگئے اور گاڑی روانہ ہوگئی۔

حیا نے آنکھیں بند کرلیں تو ''وہ! بھی'' اپنی آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔

گانے کی تیز آواز سے حیا کی آنکھ ایک جھٹکے سے کھل گئی۔ آواز ہتھوڑے کی طرح اس کے سر پر لگ رہی تھی۔ اس نے مہوش سے کہلوایا کہ آواز ہلکی کرلو مگر لڑکے کہاں سننے والے تھے۔

''وہ!'' سیٹ کے نیچے سے حیا کی آواز پر نکلا، حیا اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ حیا نے گانوں کی آواز سے بچنے کے لئے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھے ہوئے تھے، اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔

''اسے!'' بھی خود تکلیف کا احساس ہونے لگا اور ایک دم گانے بند ہوگئے......!

لڑکوں نے بار بار پلیئر کو چیک کیا مگر گانے دوبارہ چلے نہ ہوسکے......

مہوش نے جھٹ سے کہا...... ''لگ گئی بھئی، حیا کی بددعا لگ گئی، تم لوگوں کو!'' اور سب زور سے ہنسنے لگے۔ حیا کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تو اس کے گال سرخ ہوگئے......

''اس کی!'' سبز آنکھوں میں ٹھنڈک کا احساس اتر آیا، حیا کے مسکراتے چہرے کو دیکھ کر......

کافی دیر گزرنے کے بعد حیا نے اپنی امی سے کہا...... ''امی کچھ میٹھا ہے کھانے کو؟''

''ہاں بیٹا مٹھائی رکھی تھی چلتے وقت، دوں؟'' امی جلدی سے بولیں......

''رہنے دیں امی، میرا دل تو رس ملائی کا چاہ رہا ہے......''

''اچھا بیٹا! آگے اگر ملی تو میں گاڑی رکوا کر لے لوں گی......''

تھوڑی دیر بعد حیا کو کسی نے ہلایا۔ ''حیا!''

''ہوں'' حیا نے آنکھ کھولی...... ''یہ لو! رس ملائی''

یہ مہوش کی آواز تھی حیا نے رس ملائی لی اور مزے سے کھانے لگی اور کھا کر ڈبہ نیچے رکھ دیا۔ ''ڈبہ پل بھر میں غائب ہوگیا......''

اگر حیا اٹھ کر دیکھ لیتی کہ مہوش تو گہری نیند میں ہے تو اس کے ہوش اڑ جاتے......

پھر سب گھر پہنچ گئے۔ بس سے اترتے ہوئے حیا نے فہد سے پوچھا کہ ''رس ملائی کس جگہ کی تھی؟'' تو اس نے سر پیٹ لیا...... ''کیسی رس ملائی؟ خواب میں کھالی رہی تھیں؟......''

حیا اس کو مذاق سمجھی اور ہنسنے لگی......

دو روز بعد ولیمہ تھا۔ حیا اب بالکل ٹھیک لگ رہی تھی۔ ولیمے کے لئے اس نے بلیک کلر کا نیٹ کا سوٹ پہنا جس پر شیڈڈ موتیوں کا میچنگ کا کام بنا ہوا تھا۔ کالے لباس میں وہ الگ ہی چمک رہی تھی......

اچانک اسے اپنی آنکھیں دھندلی سی لگنے لگی اس نے آنکھیں ملیں مگر کچھ صاف نہیں ہوا وہ پلٹی تو زور سے کسی سے ٹکرا گئی پھر دو ہاتھوں نے اسے سنبھال لیا اس نے منہ اٹھایا تو وہاں گہرے سبز رنگ کی آنکھیں تھیں جو اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر حیا خود بخود ہوش سے بے گانی ہوتی ہوتی دھڑام سے گر گئی۔ اسے پھر بھی پتہ نہیں چلا کہ اسے کسی نے تھام لیا اور وہ فضا میں تیرتی ہوئی آئی اور بستر پر لیٹ گئی......''

صفت بی حیا کو بلانے آئیں تو وہ بے ہوش تھی انہوں نے پانی کے چھینٹے مار کر اس کو جگایا۔ حیا نے خوف سے ادھر ادھر دیکھا اور بے اختیار صفت بی سے لپٹ گئی...... ''یہاں کوئی تھا صفت بی!''

''کون بیٹا؟'' انہوں نے پیار سے اسے سنبھالا...... ''اس کی آنکھیں سبز تھیں!'' حیا نے بتایا۔

''بیٹا خواب ہوگا تمہارا۔'' انہوں نے اس کو کہا......

حیا تقریب میں بس تھوڑی دیر کے لئے گئی۔ تقریب ختم ہوگئی تو حیا کے گھر والے اپنے گھر چلے

گے......

دن گزرتے رہے۔ حیا کو اکثر عجیب سا محسوس ہوتا جیسے وہ کسی کی نظروں کا مسلسل محور میں ہے۔ مگر وہاں کوئی نہ ہوتا، کبھی آدھی رات کو اسے ایک سایہ سا اپنے اوپر محسوس ہوتا مگر لائٹ جلانے پر کچھ نہیں ہوتا......

ایک روز اسے اپنے تکیے کے نیچے موتیا کی کلیاں ملیں، اس نے سب سے معلوم کیا مگر کسی کو وہ کلیاں نظر نہیں آئیں، کبھی کبھی جب وہ اپنے کمرے میں آتی تو اس کی پسند کی مٹھائی موجود ہوتی، وہ اسے گھر والوں کا سرپرائز سمجھتی۔ کسی سے وہ اس لئے نہیں کہتی کہ گھر والے اس کا مذاق نہ اڑائیں۔

حیا نے کلاسز جوائن کرلیں، ویسے ہی شادی کی وجہ سے اس کے کافی لیکچرز مس ہوگئے تھے۔ حیا گاڑی سے اتر کر سہیلیوں کے پاس آئی تو اس کی سہیلی بولی...... ''کیوں بھئی! اب تمہارے ''پالتو'' بھی تمہارے ساتھ کلاسز لیں گے کیا؟''

''کیا مطلب؟'' حیا نے حیرانی سے پوچھا۔

''ابھی تو گاڑی سے تمہارے ساتھ ایک سیاہ بلا اترا ہے۔ تمہارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔'' سہیلی نے کہا اور نیچے ادھر ادھر دیکھنے لگی......

میرا تو کوئی پالتو بلا نہیں ہے!'' حیا نے سادگی سے کہا تو وہ لڑکی حیران رہ گئی......

''وہ!'' درخت کی اونچی شاخ پر بیٹھا حیا کو دیکھ رہا تھا۔ حیا باتیں ختم کر کے کلاس لینے جانے لگی تو ''وہ!'' بھی نیچے اترا اور کلاس میں داخل ہو کر حیا کے قدموں میں بینچ کے نیچے بیٹھ گیا......

حیا اپنی دوست سے مس ہوجانے والے لیکچرز کے بارے میں بات کر رہی تھی، دونوں کو پتہ ہی نہیں چلا کہ کب پروفیسر صاحب ان کے سر پر آکر کھڑے ہوگئے...... ''آپ لوگ ایسا کریں کسی اور جگہ آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں جہاں پڑھائی آپ لوگوں کو ڈسٹرب نہ کرے، اور حیا اتنے دن بعد آنے کے بعد بھی آپ کا دھیان پڑھائی کی طرف نہیں ہے؟''

وہ کنگلا تھا۔ چھوٹی سی نیکی کر کے بنگلے کا مالک بن گیا
کسی نے اس بنگلے کی دیوار پر کوئلے سے 'کنگلے کا بنگلا'
لکھ دیا، وہ بنگلا اسی نام سے مشہور ہوگیا
دوسرے کنگلے نے بیس روپے سے بزنس کا آغاز کیا
اور 'کنگلے کا بنگلا' کرائے پر لے کر کارخانہ قائم کردیا،
اس بنگلے کا اصل مالک بھی کنگلا ہی تھا
آنکھ میں آنسو لب پہ ہنسی
ایسی تعمیری عملی کہانی صدیوں میں لکھی جاتی ہے
مار دھاڑ، عشق و محبت، مکر و فریب، جائیداد کے
چکروں سے پاک منفرد پلاٹ پر بنا انوکھا ناول
ایمن کی چوتھی کتاب صرف 330 روپے میں

مالکانہ حقوق پر حاصل کرنے کے لیئے قریبی کتب فروش
سے رابطہ کریں نہ ملنے کی صورت میں ہمیں لکھیں
ایمن لائبریری پارسی گیٹ چنیسر گوٹھ کراچی
پوسٹ کوڈ نمبر 75460۔ (ڈاک خرچ بذمہ خریدار)
فون نمبر 02137655706، 03462211986

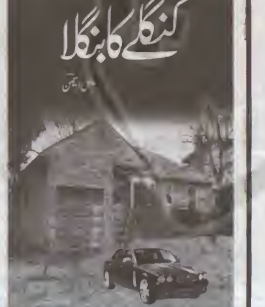

"سردہ!"

"شٹ اپ! اینڈ بوتھ آف یو، آؤٹ آف مائی کلاس!" پروفیسر نے غصے سے کہا......

حیا اور اس کی دوست کلاس سے باہر نکل گئیں۔ حیا کا چہرہ شرمندگی سے جھکا ہوا تھا......

"اسکی!" نظر حیا کے چہرے پر جمی ہوئی تھی، وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کلاس سے باہر نکل گیا......

لیکچر ختم ہوا تو پروفیسر صاحب کلاس سے نکل کر نیچے جانے کے لئے بڑھنے لگے۔ ایک کتاب ان کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے گری وہ اسے اٹھا کر سیدھے ہوئے تو انہیں ایک دم زور سے دھکا لگا تو وہ لڑھکتے ہوئے نیچے جاتے چلے گئے اور آخری سیڑھی ختم ہونے پر فرش پر رک گئے۔ اسٹوڈنٹس دوڑ کر ان کے پاس آئے، وہ بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ سارے میں شور مچ گیا۔

"وہ!" ایک طرف کھڑا اپنی سرخ زبان ہونٹوں پر پھیرنے لگا......

حیا لائبریری میں بیٹھی نوٹس لکھ رہی تھی، اسے آج یہ سارے نوٹس کاپی کرنے تھے۔ پرسوں انہوں نے چیک ہونا تھا......

"حیا نے گھر میں داخل ہو کر اپنی امی کو آواز دی......"امی! جلدی سے مجھے کھانا دے دیں، پھر مجھے بہت سارے نوٹس بنانے ہیں......"

"ارے بھئی کیا ٹرین چھوٹی جارہی ہے؟ آرام سے کھانا کھاؤ، جب فریش ہو جاؤ تو کام کرنا......" امی نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر بعد حیا نہانے چلی گئی اور باہر آ کر بال خشک کرے بغیر تولیہ لپیٹے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گئی اس کا بیگ اس کے برابر میں رکھا ہوا تھا......"آج تو بس کام ہی کام کرنا ہے......" اس نے خود سے کہا اور نوٹس لکھنے لگی۔ لکھتے لکھتے جانے کب اسے ایک جھونکا آیا اور اسے یوں محسوس ہوا کہ "جیسے کوئی اس کے بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیاں پھیر رہا ہو، اس کے پپوٹے بوجھ سے جھکے جارہے تھے، اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں، سب دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا بس جو چیز واضح تھی وہ سبز آنکھیں جن کو نمایاں کر رہی تھیں۔ گہری سیاہ بھنویں۔ ان آنکھوں میں عجیب سی کشش تھی......"

حیا کی آنکھ ایک جھٹکے سے کھل گئی۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی، اس کا دل اس کے حلق میں دھڑک رہا تھا اور سنہری بال کھلے ہوئے تھے اور وہ حیرت انگیز طور پر سلجھے ہوئے تھے۔ کمرے میں اندھیرا ہو رہا تھا۔ اس نے ٹیبل پر رکھی گھڑی دیکھی تو مغرب کا وقت ہونے والا تھا۔ "اوہ! میرے اللہ! میں سو گئی تھی، سارا وقت سونے میں ضائع ہو گیا، مجھے تو نوٹس!" حیا نے سامنے پڑے نوٹس اٹھائے تو وہ سن کی سن رہ گئی کیونکہ سارے نوٹس مکمل تھے......"یہ سب کیسے ہوا؟ کیا میں نوٹس پورے لکھ چکی تھی، اور میں سو گئی؟" اسے یاد نہیں آ رہا تھا......

"حیا! اٹھ جاؤ مغرب ہونے والی ہے"۔

یہ صفت بی کی آواز تھی۔ صفت بی حیا کی پھپھو تھیں ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ حیا اٹھی مگر اس کا دھیان اب بھی نوٹس کی طرف تھا۔

دوسرے دن حیا کلاس لے کر جا رہی تھی کہ ایک اور لڑکی اس کے برابر سے گزری......"سی سی......آہ!" حیا کے بال اس لڑکی کے بیگ سے اٹک گئے۔ حیا کے منہ سے تکلیف سے آواز نکلی ساتھ ہی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیر گئی......

"آئی ایم ریلی سوری!" لڑکی نے جلدی سے بال بیگ سے نکالتے ہوئے کہا، وہ بہت شرمندہ ہو رہی تھی اور حیا سے معافی مانگ رہی تھی......"کوئی بات نہیں......" حیا نے مسکرا کر کہا......

اگلے روز اس بھیانک خبر کا ہر جگہ چرچا تھا کہ "نورین! کچن میں چائے بنا رہی تھی جانے کب اس کے بالوں نے آگ پکڑ لی اور اس کے سارے بال جل گئے۔" جو لوگ نورین سے مل کر آئے تھے انہوں نے بتایا کہ اس کے بال اس بری طرح جلے ہیں کہ سر کی کھال بھی ادھڑ گئی ہے اور پلکیں بھنویں بھی متاثر ہوئی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے اس کی جان بچ گئی۔ یہ وہی لڑکی تھی جس کے بیگ سے حیا کے بال اٹلے تھے......

رات کو جب حیا سونے کے لئے بستر پر لیٹ گئی تو تھوڑی دیر بعد اس نے جیسے ہی پیر پھیلائے وہ اچھل کر بستر سے نیچے کود گئی اسے لگا کہ بستر میں کوئی نرم نرم سی چیز تھی جو کہ اس کے پیر سے ٹکرائی تھی! اس نے پورا کمرہ دیکھ لیا مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا، وہ دوبارہ سونے کے لئے لیٹ گئی اور نیند کی وادیوں میں کھو گئی......

"وہ!" آہستہ سے دبے پاؤں بیڈ کے نیچے سے نکلا اور بستر پر چڑھ کر حیا کے سرہانے کھڑا ہو کر اسے اپنی سبز آنکھوں سے گھورنے لگا اور چلتا چلتا اس کے پیروں کے پاس آیا اور اپنا منہ اس کے پیروں سے رگڑنے لگا پھر بیٹھ کر حیا کے گورے پیروں کے تلوے اپنی سرخ زبان سے چاٹنے لگا، وہ حیا کے پیر چاٹتا رہا اور حیا سوتی رہی۔ حیا اگر اٹھ جاتی تو خوف سے اس کا دم نکل جاتا۔

صبح حیا کو گھر سے نکلتے نکلتے کافی دیر ہو گئی تھی اس نے صرف جوس لیا اور ڈرائیور سے تیز چلانے کے لئے کہا......آج اس کا بہت اہم لیکچر تھا۔ وہ پہلے ہی لیٹ ہو گئی تھی۔ یونیورسٹی کے گیٹ کے قریب آتے ہی دو گاڑیاں زور سے آپس میں ٹکرائیں۔ کار ٹکرانے سے حیا کا سر زور سے سامنے ٹکرایا اور "اوہ!" کی آواز کے ساتھ ہی اس کا پورا سر چکرا کر رہ گیا......

"اس!" نے حیا کی آواز سنی تو بے چینی سے پہلو بدلا "وہ!" سیٹ کے نیچے تھا......

حیا کے ماتھے پر سوجن آ گئی تھی دوسری گاڑی نبیل کی تھی جو کہ حیا کا کلاس فیلو تھا، اس نے باہر آ کر حیا سے بار بار معذرت کی! حیا نے مسکرا کر کہا "کوئی بات نہیں، بس کلاس میں پہنچ جائیں......"

سارا دن حیا کے سر میں درد رہا۔ جب وہ گھر آئی تو سب پریشان ہو گئے۔

دوپہر میں نبیل بیکری سے نکل کر روڈ کراس کر رہا تھا اس نے دونوں طرف دیکھا ایک طرف سے بس آ رہی تھی جو کہ بہت دور تھی اتنی دیر میں نبیل کب کا روڈ کراس کر چکا ہوتا۔ نبیل جیسے ہی روڈ کے بیچ پہنچا، کسی نے نبیل! کہہ کر اسے آواز دی۔ جب اس نے مڑ کر دیکھا تو وہاں صرف "دو سبز آنکھیں تھیں......"

نبیل نے سر جھٹکا تو دور دور تک کسی کا نام و نشان نہ تھا، نبیل پلٹا اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، بس اس کے اوپر سے گزرتی چلی گئی۔ نبیل کا سر بری طرح سے کچل گیا تھا اور اس کی لاش روڈ پر پڑی ہوئی تھی۔

حیا بستر پر سو رہی تھی......

"وہ!" چلتا ہوا آیا اور چھلانگ لگا کر اوپر چڑھ گیا اور گھوم کر حیا کے تکیہ پر آ گیا، اس نے اپنی سرخ زبان سے حیا کا سوجا ہوا ماتھا چاٹنے لگا۔ حیا کو سوتے میں بھی محسوس ہوا کہ جیسے اس کے ماتھے پر انگارے دہک رہے ہوں۔ مگر دوا کے اثر سے وہ سوتی رہی۔ اور جب صبح اٹھی تو اس کی حیرت کی انتہا نے آسمان کو چھو لیا کیونکہ نہ تو اس کے ماتھے میں درد تھا اور نہ ہی سوجن یا چوٹ۔ وہ حیران پریشان سی یونیورسٹی پہنچی تو وہاں نبیل کی موت کی اطلاع ملی۔ اسے نہ جانے کیوں سب مصنوعی سا لگ رہا تھا مگر ایسا کیا تھا جو اسے چاہ کر بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا......

شام میں چائے پینے وہ امی کے پاس آئی گرم گرم سموسوں کی خوشبو نے اس کا موڈ بدل دیا۔ "واہ! صفت بی آج تو مزہ آئے گا......" اس نے گرم گرم سموسہ توڑتے ہوئے کہا۔ حیا کا چہرہ دمکنے لگا۔ صفت بی کچن سے آ رہی تھیں تو ان کی نظر "اس" پر پڑ گئی وہ ٹکٹکی باندھے حیا کی جانب ہی دیکھ رہا تھا......

صفت بی اس کی سبز آنکھیں دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئیں۔ انہیں حیا کے الفاظ یاد آ گئے! "یہاں کوئی تھا صفت بی! اس کی آنکھیں سبز تھیں......" انہوں نے سر کو جھٹکا اور شبنم کو آواز دی۔ شبنم ان کی ملازمہ تھی جو کیتلی سے چائے نکال کر حیا کو دے رہی تھی......

"شبنم! چائے دے کر اس بلے کو بھگا دینا اور کپڑے سکھا دینا" حیا نے پہلے اس بلے کو دیکھا اور پھر کپ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ملازمہ سے بے دھیانی میں چائے حیا کے ہاتھ پر گر گئی۔ گرم کھولتی ہوئی چائے

گرنے سے حیا کی چیخ نکل گئی......

"کم بخت! دیکھ کر کام نہیں کرسکتی" امی نے حیا کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

شبنم نے پہلے شی شی کرکے "اسے" بھگانا چاہا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ شبنم کو پہلے ہی ڈانٹ پڑ چکی تھی اس نے ایک لکڑی لی اور اس کی کمر پر ماری وہ تلملا کر کھڑا ہوگیا، مگر گیا نہیں......

"شبنم مت مارو! ایسے ہی بھگا دو" صفت بی بولیں......

"بڑا ڈھیٹ ہے! ایسے نہیں جائے گا یہ......" شبنم نے اس سے بھی زور دار ایک ضرب اس بلے کے لگائی، تو بلے نے غرا کے شبنم کو گھورا اور چھلانگ لگا کر چھت پر چلا گیا......

شبنم دھلے ہوئے کپڑوں کی بالٹی لے کہ نکلنے والی تھی کہ اچانک صابن خود بخود کھسک کر اس کے پیر کے نیچے آگیا اور وہ ایک دھماکے سے فرش پر کمر کے بل گرگئی۔ سب لوگ بھاگ کر آئے اور اسے ہسپتال لے جایا گیا۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ وہ زندگی بھر کے لئے معذور ہوگئی ہے......

گھر آکر صفت بی خاموش خاموش سی تھیں اور چاروں طرف نظریں دوڑا کر کچھ دیکھنے لگیں۔ ان کے ماتھے پر فکر کی گہری لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔

حیا کے پیپرز شروع ہوگئے تھے اور ممانی کا فون بھی آگیا تھا کہ "پیپرز ختم ہوتے ہی وہ رخصتی کرلیں گیں۔ رزلٹ بعد میں آتا رہے گا......"

ممانی پیپرز ختم ہونے سے پہلے ہی آگئیں جب کہ عاطف تاریخ طے ہونے پر آتا۔ ممانی، خالہ کے گھر ٹھہریں اور تیاریاں شروع کردیں۔ آخری پیپر دے کر حیا نے سکون کا سانس لیا اور بستر پر لیٹ کر سوگئی......

دوپہر کا وقت تھا صفت بی بھی ظہر کی نماز پڑھ کر لیٹ گئیں۔ انہوں نے خواب دیکھا کہ "حیا ایک سیاہ چادر میں بری طرح جکڑی ہوئی ہے اور نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ مگر نکل نہیں پا رہی اور اوپر دو سبز آنکھیں چمک رہی ہیں...... حیا چیخیں مارتی ہوئی دور ہوتی جارہی ہے اور اندھیرے میں غائب ہوجاتی ہے......" یکدم جھٹکے سے ان کی آنکھ کھل جاتی ہے وہ پسینے میں شرابور ہورہی تھیں اور سانس انجن کی طرح چل رہا تھا...... "اللہ! اتنا بھیانک خواب" انہوں نے پانی کا گلاس اٹھایا اور ایک سانس میں خالی کردیا۔ پھر تکیہ پر گر کر گہرے گہرے سانس لینے لگیں۔ "یہ آنکھیں میں نے کہاں دیکھی ہیں؟" انہوں نے یاد کیا۔

ممانی، خالہ کے گھر والوں کو وہ انگوٹھی دکھارہی تھیں جس پر انہوں نے خوب صورتی سے "حیا اور عاطف" کا نام لکھوایا تھا جو کہ ڈائمنڈ سے جڑا ہوا تھا۔

"بھابھی یہ تو بہت ہی خوب صورت ہے......" خالہ جان نے کھلے دل سے تعریف کرتے ہوئے کہا......

"ہاں ہے تو، مگر میری حیا سے زیادہ نہیں!" ممانی نے پیار بھرے لہجے میں کہا تو سب مسکرا دیئے۔

پھر کچھ دیر میں وہ لوگ حیا کی والدہ اور صفت بی سے ملنے چلے گئے اور سب نے مل کر اپریل کی پچیس تاریخ رخصتی کے لئے طے کردی۔ ممانی نے حیا کو انگوٹھی پہنانے کا ارادہ ظاہر کردیا۔ مگر اس وقت سب کی حیرت کی انتہا نہیں رہی جب ممانی کا پرس غائب ہوگیا۔ خالہ سمیت سب گواہ تھے کہ ممانی پرس لے کر آئیں تھیں گھر جا کر فہد بھی دیکھ آیا مگر پرس کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔

صفت بی کسی کام سے حیا کے کمرے کے آگے سے گزریں تو انہیں لمحہ بھر کے لئے بیڈ کے نیچے "دو سبز چمکتی آنکھیں" نظر آئیں۔ جو یکدم اندھیرے میں غائب ہوگئیں ان کے قدم وہیں جم کر رہ گئے۔

شادی میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا مگر عاطف کو لاکھ کوششوں کے باوجود فلائٹ نہیں مل رہی تھی۔

صفت بی کی سوچ کا رخ کہیں اور جارہا تھا۔ انہوں نے اپنے پڑوسی اختر صاحب سے کسی اچھے عامل کا پتہ معلوم کروایا اور دوسرے روز اختر صاحب کے ساتھ عامل صاحب کے پاس پہنچ گئیں۔ وہاں انہوں نے جا کر اپنے شک کی تصدیق کرنی چاہی تو عامل

صاحب نے حیا کی پہنی ہوئی قمیض منگوائی اور تین روز بعد آنے کا کہا...... یہ تین روز صفت بی کو تین صدیوں کے برابر محسوس ہورہے تھے۔ چوتھے روز وہ گئیں تو عامل صاحب انہی کا انتظار کررہے تھے۔ "بی بی! تمہارا شک بالکل درست ہے، ایک جن ہے جو تمہاری بچی پر بری طرح عاشق ہوگیا ہے، وہ سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتا ہے، اگر کسی نے بھولے سے بھی تمہاری بچی کو تکلیف پہنچائی تو اس کا انجام اچھا نہ ہوگا اور یہ بھی سن لو! اس نے اس بچی کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کررکھا ہے......" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئے۔

صفت بی کو ملازمہ شبنم یاد آگئی۔ جس سے بھولے سے حیا کے ہاتھ پر گرم چائے گرگئی تھی اس کے علاوہ اور لوگوں کے ساتھ کیا کیا ہوچکا ہے یہ تو صفت بی کو معلوم ہی نہیں تھا۔ صفت بی بولیں...... "آپ کچھ کریں! میری بچی کا تو نکاح ہوچکا ہے اس کی رخصتی......"

"ناممکن!" عامل صاحب نے ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی زوردار آواز سے کہا...... "ناممکن ہے کہ ایسا ہوجائے، شادی تو کیا وہ لڑکا اس بچی کے قریب بھی نہ آپائے گا......"

صفت بی کو سمجھ آگیا کہ عاطف کو فلائٹ کیوں نہیں مل پارہی...... "آپ کچھ کریں، میری بچی کی زندگی خراب ہوجائے گی......" انہوں نے عامل صاحب سے کہا......

"ہم پوری کوشش کریں گے!" انہوں نے کہا تو صفت بی کو کسی حد تک سکون ہوگیا۔

عاطف کو شادی سے ایک روز پہلے کی فلائٹ مل گئی! سب کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ صفت بی خوش ہوگئیں کہ عامل صاحب کامیاب ہوگئے۔

حیا مہندی لگا کر اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی کہ ایک طرف سے کمرے میں دھواں اٹھنے لگا۔ وہ گھبرا کر اٹھ گئی۔ سامنے آئینے میں سے کوئی دھندلا دھندلا سا ہیولہ باہر آگیا اور اس سے ذرا فاصلے پر رک گیا وہ ایک سیاہ بلا تھا جو اپنی سبز آنکھوں سے حیا کو دیکھ رہا تھا......" حیا کی روح فنا ہونے لگی۔ اس نے پلٹ کر بھاگنا چاہا مگر اس کے پیر زمین پر جم گئے...... اس بلے نے ایک قدم آگے بڑھایا تو وہ ایک نوجوان میں تبدیل ہوگیا، وہ اور آگے بڑھا اور بے حد بھاری آواز میں بولا "جو چیز میری پسند ہو، وہ کسی اور کی ہرگز نہیں ہوسکتی، چاہے کچھ بھی ہوجائے! میں نے تو بس خاموشی اختیار کی ہوئی تھی صرف آپ کی وجہ سے......"

وہ اور آگے آیا تو حیا کو بے حد تپش کا احساس ہونے لگا...... "وہ!" پھر بولا! "پہل میری طرف سے نہیں ہوئی، مگر جو لوگ آپ کو مجھ سے چھین لینے کی کوشش کررہے ہیں وہ نادان ہیں۔ انہیں بالکل اندازہ نہیں ہے میری طاقت کا، ان کی اس حرکت کی سزا تو انہیں لازمی ملے گی!" اس کا چہرہ غصے کی شدت سے انگارے کی طرح سرخ ہورہا تھا۔

ک ک......!!! کون ہیں آپ؟" حیا کے منہ سے الفاظ نکل نہیں رہے تھے......

"میں!" اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر زور سے ہنسا پھر بولا! میرا نام "شمشیر" ہے اور میرا تعلق قوم جنات سے ہے۔"

حیا کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہوگئے اور حیا کی پلک جھپکتے ہی "وہ" غائب ہوگیا۔ حیا غش کھا کر وہیں ڈھیر ہوگئی۔

عامل صاحب اپنے آستانے میں بیٹھے عمل کررہے تھے ایک چراغ روشن تھا صرف، باقی صرف اندھیرا۔ اچانک وہ چراغ خود بخود بجھ گیا۔ عامل صاحب نے کچھ پڑھا تو چراغ پھر جل اٹھا...... "سامنے آ اگر ہمت ہے تو!" وہ زور سے بولے......

لمحہ بھر میں وہ کمرے کے بیچ آن موجود ہوا، اس کا سر چھت سے لگ رہا تھا "لے! دیکھ میری ہمت، آگیا میں تیرے سامنے" اس نے لاپروائی سے کہا......

"چھوڑ دے اسے، وہ کسی کی امانت ہے......" عامل صاحب نے اسے مخاطب کیا۔

"وہ صرف میری ہے!" جن نے مضبوط لہجے

میں کہا......

''زندگی چاہتا ہے تو چلا جا!''

عامل صاحب نے اسے للکارا......

''وہ زور سے ہنسا'' تو مارے گا مجھے، تجھے شاید میری طاقت کا اندازہ نہیں ہے......''

''میری چھوڑ د، اپنی خیر منا......'' عامل صاحب بولے......

اس کے قہقہوں سے پورا آستانہ لرزنے لگا۔ عامل صاحب نے کچھ پڑھنے کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔ تو اس جن نے منہ سے پھونک ماری وہ پھونک کیا تھی ہوا کا طوفان تھا، عامل صاحب اس طوفان میں لپٹے گول گول گھومنے لگے، پھر ان دیکھے تماچے ان کے منہ پر پڑنے لگے۔ عامل صاحب کے منہ سے خون جاری ہوگیا، پھر وہ فٹ بال کی طرح فضا میں کئی کئی فٹ اچھلتے رہے اور جب وہ زمین پر آگرے تو روح عامل صاحب کے جسم سے پرواز کر چکی تھی......''

ادھر حیا کسی کام سے کمرے میں داخل ہوئی تو اندر آکر اس کی نگاہ بیڈ پر پڑی تو ''وہ'' سامنے موجود تھا، حیا پلٹ کر بھاگی تو دروازہ دھڑام سے خود بخود بند ہوگیا۔ اس نے پوری طاقت لگا ڈالی مگر دروازہ نہیں کھلا، اسے تو صفت بی نے کہا تھا کہ اب تمہیں کوئی نظر نہیں آئے گا! یہ کہاں سے آگیا۔ اور ایک تعویز بھی دیا تھا گلے میں ڈالنے کے لئے، اس نے ٹٹول کر اسے پکڑنا چاہا مگر اس کا گلا خالی تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا......

حیا نے ہمت جمع کی اور زور سے بولی! ''چھوڑ دو میرا پیچھا، میرا نکاح ہو چکا ہے، چلے جاؤ یہاں سے!''

وہ لمحہ بھر خاموش رہا پھر بولا...... ''ایسا ممکن نہیں ہے!''

حیا کو اس کی آنکھوں سے خوف آرہا تھا، جانے ایسی کیا چیز تھی ان آنکھوں میں کہ حیا نے سختی سے اپنی آنکھوں کو موند لیا......

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ باہر سے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ ''یہ تو امی کی آواز ہے......'' حیا نے دروازہ کھولا تو دروازہ آسانی سے کھل گیا۔ وہ دوڑ کر امی کے پاس آئی۔ ''امی کیا ہوا؟''

صفت بی نے بڑی مشکل سے اسے بتایا کہ ''عاطف جس جہاز میں سوار تھا، وہ کریش ہوگیا ہے......'' حیا کو سکتہ سا ہوگیا تھا۔ اس خبر سے یا آنے والے وقت سے!

حیا رو رہی تھی اور آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے...... ''وہ بولا'' مت روئیں آپ، کوئی آپ کو مجھ سے نہیں چھین سکتا......''

کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا وہاں صفت بی تھیں، ''مردود!'' دفع ہو جا یہاں سے اور چھوڑ دے میری بچی کو، یہ تیری کبھی نہ ہوگی۔''

''اس کی'' سبز آنکھیں شعلہ اگلنے لگیں۔ پھر ''اس نے اپنی جگہ سے ہاتھ بڑھایا، ہاتھ لمبا ہوتے ہوتے صفت بی تک چلا گیا اور ان کے سینے پر جا کر ٹک گیا'' صفت بی کو اپنا دل بھنچتا ہوا محسوس ہوا، بے انتہا کرب ان کے چہرے پر آگیا۔ حیا دوڑ کر اس کے سامنے آگئی۔ ''چھوڑ دیں صفت بی کو! معاف کردیں۔ جو آپ چاہیں گے وہی ہوگا!''

''اس کی!'' آنکھوں میں جلتے انگارے یکدم سرد ہوگئے اور صفت بی خود بخود اپنے کمرے میں پہنچ گئیں......

''میں انہی الفاظ کے انتظار میں تھا، ورنہ آپ کو یہاں سے لے جانا میرے لئے کوئی بڑی بات نہیں ہے......'' اس نے حیا سے کہا......

مگر حیا تو پتھر کی بنی ہوئی تھی۔

حیا نے اتنی بڑی قربانی دی، اپنے انجام سے بے پروا ہو کر اس کا کیا ہوا؟ یہ کسی کو نہیں معلوم۔ حیا کی ماں اور صفت بی اس کے غم میں اس دنیا سے جا چکی ہیں۔ اور حیا کا گھر ویران پڑا ہے۔ وہ ضدی جن جو حیا پر عاشق ہو گیا تھا، اس نے اپنی ضد پوری کر کے چھوڑی یا پھر حیا کی روح......

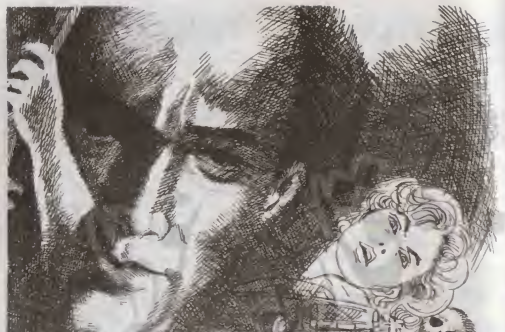

خونی بت

محمد رضوان قیوم۔راولپنڈی

تھانے دار نے کہا "سچی بات ہے۔ میں نے جب مردہ رمیش اور تجھے دیکھا تو میں اس وقت سمجھ گیا تھا کہ تو قاتل نہیں اور جب میں اوپر مندر میں الٹے بت کی جانب گیا تو وہاں پشت والے بت کی زبان باقاعدہ ایک عام انسان کی طرح نکلی تھی۔

ایک ساکت وجامد پتھر کے بت کی عجیب وغریب دل دہلا دینے والی لرزیدہ خونی روداد

اس کہانی کے بزرگ راوی گلزار عباسی ہیں، ان کا تعلق کوہ مری کے ایک مضافاتی گاؤں سے ہے۔ ان سے میری ملاقات ایک دوست نے کرائی تھی۔ گلزار عباسی جب مجھے ملے تو اس وقت بقول ان کی عمر 88 سال تھی۔ دیکھنے میں موصوف کی پیرانہ عمری کی وجہ سے صحت انتہائی نہ گفتہ تھی۔ انہیں بیک وقت کئی بیماریوں نے دبوچا ہوا تھا۔ یعنی، شوگر، ضعف نظری اور دمہ وغیرہ۔ لیکن اس عمر میں لاحق معتدد بیماریوں کے باوجود ان کی یادداشت انتہائی اچھی تھی، انہوں نے مجھے اپنی ذات سے لپٹی ماضی کی یہ دل خراش داستان سنانا شروع کی۔

''جولائی 1942ء میں روزگار کے لئے میں دہلی گیا تھا۔ اس زمانہ میں ہمارے علاقہ میں مسلمانوں کے لئے روزگار کے حالات انتہائی درجہ تک بد حال تھے۔ میں جب جوان ہوا تو میرے والد صاحب نے

مجھ سے کہا۔ ’’اپنے ماموں کے پاس دہلی چلے جاؤ، وہاں تمہیں کسی مناسب روزگار سے لگا دیں گے۔‘‘ میں نے اسکول کا منہ تک نہ دیکھا۔ ایک تو میں کوراان پڑھ تھا۔ اور دوسرا مجھے کوئی ہنر بھی نہیں آتا تھا۔ میں اللہ کے آسرے پر راولپنڈی ریلوے اسٹیشن سے چلنے والی ایک ٹرین فرنٹیر میل میں سوار ہو کر اگلی صبح دہلی شہر پہنچ گیا۔ میرے ماموں کلیم عباس دہلی شہر کے محلہ فراش خانہ میں ایک چھوٹی سی کوٹھری میں اپنے ایک دوست کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ وہ دہلی میں راج مستری کا کام کیا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ مزدوری کے کام میں لگا لیا تھا۔ ماموں ایک ہندو ٹھیکے دار ملوت رائے کے پاس ملازم تھے۔ انہوں نے سفارش کر کے مجھے بھی ملوت رائے کے پاس رکھوا دیا تھا۔ میری تنخواہ اس زمانہ میں 80 روپے طے ہوئی تھی۔ جو کہ اس زمانے کے لحاظ سے بہت اچھی تھی۔ ایک دن ملوت رائے نے ماموں کو کہا ’’اگر تم چاہو تو میں گلزار کو اپنے ساتھ علی گڑھ لے جاؤں۔ وہاں میں نے ایک جین مندر کی صفائی اور مرمت کا کام پکڑا ہے۔ اسے 120 روپے تنخواہ دے دوں گا۔‘‘

ماموں مان گئے، اس کی کئی وجوہات تھیں۔ پہلی تو یہ ہے کہ میری تنخواہ میں یکدم 40 روپے کا اضافہ تھا اور دوسرا یہ کہ میں ماموں کے ساتھ جس چھوٹی کوٹھری میں رہ رہا تھا۔ اس میں میرے لائق سونے کے لئے مناسب جگہ نہ تھی۔ ماموں کے دوست جن کے ساتھ رہ رہے تھے وہ اکثر میری آمد پر چڑ چڑ کیا کرتے تھے، ماموں نے مجھے کہا ’’اب میں نے تمہاری معقول نوکری لگوا دی ہے، اس سے آگے کے معاملات تم خود سنبھالو۔ لیکن میں یہاں تمہیں بتلانا چاہتا ہوں کہ ان حالات میں تمہیں ملوت رائے کی یہ بات مان لینی چاہیے اور تمہیں 120 روپے کی نوکری کو ٹھکرانا نہیں چاہیے میری مانو تو تم مصلحتاً اس بات کو مان لو۔‘‘

ماموں کی بات اس لحاظ سے بہتر تھی کہ میرے اس طرح جانے سے ان کا دوست جہاں انہوں نے رہائش اختیار کی تھی۔ اس کی چڑ چڑاہٹ سے جان چھوٹ رہی تھی۔ اور دوسری سچی بات ہے کہ اس زمانہ میں 120 روپے تنخواہ کی نوکری کس مسلمان کو ملتی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں دوبارہ مری بھی کیسے جاتا، وہاں مجھے ان حالات میں کیا روزگار ملتا۔ بالآخر بڑی سوچ بچار کے بعد میں نے ملوت رائے کی اس نئی طرز کی نوکری کی پیش کش کو قبول کر لیا تھا۔

ملوت رائے نے میرے ساتھ ایک اور مزدور لڑکا دے دیا تھا۔ اس کا نام رمیش تھا۔ وہ کچی عمر کا لڑکا تھا۔ ملوت رائے نے مجھے کہا۔ ’’تم عمر میں اس سے بڑے ہو لہٰذا تم بڑے بھائی کی طرح اس کا خیال رکھنا اور اس کے ساتھ ساتھ رہنا۔ تم دونوں علی گڑھ جا رہے ہو، وہاں مندر میں ایک چوکیدار ملے گا۔ وہ بیک وقت چوکیدار بھی ہے اور باورچی بھی اسے میں نے تمہارے بارے میں بتلا دیا ہے اور تمہارے کھانے، پینے کا خرچ اس کے پاس بھیج دیا ہے۔ وہاں رہائش کا بندوبست بھی ہے۔‘‘

ریل گاڑی کے سفر میں رمیش نے مجھے نے اپنے بارے میں بتایا ’’اس کا تعلق راجن پور سے ہے، اور وہ بھی اپنے خاندانی غربت کی وجہ سے محنت مزدوری کے لئے آیا ہے۔ وہ تین بہنوں اور ماں کا واحد سہارا ہے۔ جب کہ اس کا بوڑھا باپ معذوری کی زندگی گزار رہا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے علی الصبح علی گڑھ اسٹیشن پر ہماری ریل گاڑی پہنچی تھی۔ اسٹیشن سے باہر ہم نے تانگے، سائیکل رکشہ والے سے کہا۔ ’’ہمیں شام نگر گاؤں میں جین مندر جانا ہے۔‘‘ تو انہوں نے وہاں جانے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ یہاں سے 10 میل دور انسانوں سے عاری ویرانے میں ہے اور وہاں کوئی سواری نہیں جاتی۔ یہ ہمارے لئے ایک نئی ناحق پریشانی کھڑی ہو گئی تھی۔ ہم دونوں نے اسٹیشن پر کھڑے لاتعداد سائیکل رکشہ اور تانگے والوں کے آگے ہاتھ جوڑے، بھگوان اور خدا کے واسطے ہمیں شام نگر کسی طرح پہنچا دو، مگر سب نے انکار کر دیا۔ وہاں موجود ایک تانگے والے کی ہم دونوں نے جب بہت منتیں کیں تو اس نے کہا ’’میں شام نگر سے 3 میل دور

تمہیں اتار دوں گا۔ اور اس کے 2 روپے لوں گا۔ 2 روپے کا سن کر ہمارے سر چکرا گئے۔ اس زمانہ میں 1 روپے کا 9 کلو آٹا مل جاتا تھا۔ میں نے رمیش سے کہا ’’مجبوری ہے اسے بڑی مشکل سے منایا ہے۔ اگر یہ نہ گیا تو کوئی بھی نہیں جائے گا۔ لہٰذا 2 روپے دے کر ہمیں شام نگر چلنا چاہیے۔‘‘ وہ مان گیا۔ ہم دونوں تانگے کے پیچھے بیٹھ گئے۔ کوچوان نے خود ہی خاموشی کا سکوت توڑتے ہوئے کہا۔ ’’آپ بڑی عجیب پراسرار جگہ جا رہے ہیں۔ خیریت تو ہے؟‘‘

’’پراسرار، عجیب!‘‘ میں نے اس سے پوچھا تو جواباً اس نے کہا......

’’ہاں......جی! شام نگر درحقیقت ایک قدیم کھنڈرات پر مشتمل ایسا علاقہ ہے، جو کہ صدیوں پہلے جین مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا عبادت خانہ تھا۔ لیکن وقت کے مدوجزر نے اسے ویران کر دیا ہے، اب تو وہاں صرف ماضی کی چند نشانیاں ہی رہ گئی ہیں۔ جن میں قدیم ٹوٹا پھوٹا مندر ہی ہے جس کا تم ذکر کر رہے ہو، اسے تو یہاں کے لوگ جین مندر نہیں بلکہ جن مندر کہتے ہیں۔‘‘ یہ سن کر رمیش بولا! ’’چاچا جی! آپ تو خوامخواہ ہمیں ڈرا رہے ہیں۔‘‘ اس پر اس نے تانگے سے پیچھے مڑ کر ایک لمحے کے لئے دیکھا اور طنزیہ ہنسی کے بعد اپنا منہ آگے کی طرف کر لیا لیکن بولا کچھ نہیں۔

کافی دیر تانگہ چلتا رہا۔ کوچوان نے ہماری مطلوبہ منزل سے 3 میل دور اتار دیا اور بولا ’’بالکل سیدھے چلے جاؤ، جین مندر تک پہنچ جاؤ گے۔‘‘

سڑک بالکل ٹوٹی پھوٹی کھنڈوں سے بھری اس کے اردگرد اگے خودرو سوکھے، نیم سوکھے لمبی لمبی جھاڑیاں اور درختوں کے جھنڈ موجود تھے۔ وہاں عجیب سی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ ہم نے ان درختوں میں بڑی عجیب چیز محسوس کی کہ قرب وجوار میں کسی قسم کا کوئی پرندہ موجود نہ تھا۔ گویا سارا منظر خاموشی سے سہا پڑا تھا۔ ہم اس ویران دہشت انگیز ماحول میں تیز تیز چلتے جا رہے تھے۔ شکر ہے کہ ہم دو تھے۔ ہم میں سے کوئی اکیلا ہوتا تو یقیناً اس کا اس وحشت ناک ماحول میں چلنا محال ہوتا۔

’’میرا تو دل کر رہا ہے کہ میں یہیں سے دہلی بھاگ جاؤں۔‘‘ میں نے رمیش سے کہا۔

رمیش نے بڑے حوصلہ اور اعتماد سے جواب دیا۔ ’’بھائی گلزار، ہم مرد ہیں۔ یہ ماحول ہمیں ڈرا دھمکا نہیں سکتا۔ حوصلہ رکھو، دیکھو سامنے کھنڈر کے اثرات نظر آ رہے ہیں۔ تیز تیز قدم بڑھاؤ۔‘‘

ہم چلتے چلتے تھک گئے تھے۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ہم جتنا اس سڑک پر آگے بڑھ رہے تھے وہ عمارت اتنی ہی دور ہوتی جا رہی تھی۔ یہ بڑا کرب ناک مرحلہ تھا۔ ہم دونوں چلتے چلتے حال سے بدحال ہو گئے تھے۔ ’’لگتا ہے، یہ عمارت ہم سے اٹکھیلیاں کر رہی ہے۔‘‘

تھوڑی دیر بعد ہم اس ٹوٹے کھنڈر نما مندر کے پاس پہنچ گئے۔ وہاں پہلے منظر میں ہمارے سامنے یہ منظر تھا، ایک کمرا۔ دوسرے کمرا کے اوپر چڑھا ہوا تھا۔ باقی اردگرد ٹوٹے پھوٹے چھوٹے چھوٹے بڑے، کالے، پہاڑی پتھر اس کے علاوہ بے شمار چھوٹی بڑی لکڑیاں بکھری پڑی تھیں۔ اوپری منزل نچلی کی نسبت زیادہ کم زور نظر آ رہی تھی۔ جب کہ اس کے اردگرد اس کی حدود کی نشان دہی کے لئے ایک نئی تعمیر شدہ دیوار بنائی گئی تھی۔

میں اور رمیش ابھی اپنی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس بوسیدہ عمارت کا سراپا دیکھ رہے تھے کہ......اچانک ہم نے دیکھا کہ مندر کی عمارت کے پیچھے سے ایک کالا سا شخص تیزی سے ہماری جانب دوڑتا ہوا آیا اسے دیکھ کر میں دہل گیا تھا۔ ’’ڈرو۔ نہیں میں بھوت نہیں ہوں۔ میرا نام گل بادشاہ ہے۔ میں یہاں کا چوکیدار ہوں‘‘ گل بادشاہ نے انتہائی خوشی کے عالم میں ہمارا والہانہ استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ’’شکر ہے تم دونوں آ گئے، میں تو یہاں اکیلا......اس جین مندر میں کئی روز سے اذیت بھری قید کی زندگی گزار رہا ہوں۔‘‘

’’قید کی زندگی!‘‘ رمیش نے تجسس سے پوچھا۔

گل بادشاہ نے کہا کہا۔ ’’مجھے محکمہ آثار قدیمہ نے لاہور جیسے بارونق شہر سے ٹرانسفر کر کے اس ویرانے، اجاڑ

مندر کے کھنڈرات میں ناحق پٹخ دیا ہے، شکر ہے تم دونوں اب آگئے، کم از کم اس ویرانے میں انسانوں کی نہ صرف شکلیں نظر آئیں بلکہ ان سے باتیں کرنے کا موقع بھی ملے گا۔"

"اس سے پہلے یہاں کون چوکیدار تھا؟" رمیش نے اس سے پوچھا۔

اس نے جواباً دل دہلانے والا جواب دیا کہ "مجھ سے پہلے یہاں ایک بڑھا چوکیدار بڑے پراسرار طریقہ سے مردہ پایا گیا تھا۔"

"وہ کیسے؟"

گل بادشاہ نے کہا۔ "اس کے بارے میں زیادہ کوئی تفصیل نہیں معلوم، وہ مرا تو اس کی جگہ مجھے یہاں ٹرانسفر کیا گیا ہے۔"

"ملوت رائے نے تمہیں کس کام کے لئے بھیجا ہے؟"

گل بادشاہ نے جواب دیا۔ "چند دن پہلے یہاں محکمہ آثار قدیمہ کا ایک آفیسر اور ملوت رائے دونوں اکھٹے آئے تھے۔ انہوں نے مجھے کھانے پینے یعنی چائے، سوکھے دودھ، بسکٹ، دالیں، چاول، سوکھا گوشت مصالحے جات کی بھاری مقدار دی ہے۔ اور اس کے علاوہ 200 روپے علیحدہ خرچ کے لئے دیئے تھے۔ انہوں نے مجھے ہدایات دی ہیں کہ میں دو مزدور بھیج رہا ہوں۔ تم نے ان دونوں سے اس مندر کے صحن میں پڑے پہاڑی پتھروں۔ لکڑی اور دیگر گندگی کو پہلے صحن سے اٹھوانا ہے اور پھر اوپری کمرے کو کھول کر اس کی صفائی کروانی ہے۔" اور ساتھ یہ بھی کہا کہ "وہ کل معائنہ کے لئے دوبارہ آئیں گے۔"

گل بادشاہ وہ یہ باتیں کرتے کرتے ہم دونوں کو پہلے سے چوکیداری کی غرض سے بنائے گئے ایک عارضی کمرے میں لے گیا۔ وہاں ایک طرف کھانے پینے کا وافر مقدار میں سامان انتہائی ترتیب سے رکھا ہوا تھا۔ جب کہ درمیان میں ایک چھوٹا سا باورچی خانہ بنا ہوا تھا اور ایک جانب دو بڑے گول میلے کچیلے تکیے موجود تھے۔

"رفع حاجت اور نہانے دھونے کا کیا اہتمام ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے کہا۔ "رفع حاجت کے لئے جہاں مرضی بیٹھ جاؤ۔ جب کہ نہانے دھونے کے لئے بھی کوئی ایسا خاص انتظام نہیں ہے۔ رہا پانی تو وہ میں اس سڑک کے پار پانی کے ایک چھوٹے سے جوہڑ سے پانی لاتا ہوں جہاں غالباً بارش کا پانی کھڑا رہتا ہے، وہ گدلا ضرور ہے۔ لیکن اس سے صرف نہایا جاسکتا ہے۔"

"پینے کے پانی کا کیا بندوبست ہے؟"

"اس کا بھی کوئی خاص انتظام نہیں ہے۔ اس کا حل میں نے یہ کیا ہے کہ میں اس جوہڑ سے پانی لاتا ہوں۔ اسے پہلے ایک باریک کپڑے میں چھان کر پھر اسے ابالتا ہوں۔ پھر ٹھنڈا کر کے اسے حسب ضرورت پیتا رہتا ہوں۔

یہ تو ملوت رائے نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا۔ اس نے تو ہمیں اس کے بارے میں کھل کر نہیں بتایا تھا۔ اور نہ ان مسائل کا مجھے بعد میں محکمہ آثار قدیمہ والوں نے بھی صحیح طریقہ سے نہیں بتایا تھا۔ کل ملوت رائے کے آنے کا وعدہ ہے وہ آئیں گے تو میں ان سے کہوں گا کہ میں ان حالات میں ہرگز کام نہیں کروں گا۔ چاہے میری نوکری چلی جائے۔" گل بادشاہ نے انتہائی غصے سے کہا۔

"ہم بھی کل ان سے مل کر اس پراسرار، ویران آدم بیزار مندر سے چلے جائیں گے۔" میں نے اور رمیش نے مشترکہ طور پر کہا۔

ہم پہلے دن رات گئے تک چوکیدار کے کمرے میں رہ کر دل کھول کر آپس میں اپنا دکھڑا سنتے سناتے رہے۔ یہاں اس بات کا اقرار کرنا ضروری ہے کہ ملوت رائے نے ہم مزدوروں اور چوکیدار کے کھانے پینے کے لئے وافر مقدار میں قیمتی، تازہ اشیاء بھیجی تھیں جو کہ ہماری نسلوں نے بھی نہ کھائی تھی۔ وہ خدمت تو کر رہا تھا۔ حالانکہ اس زمانہ میں غریب مستری، مزدوروں کو کون کھانا پانی دیتا تھا، وہ ہماری اوقات سے زیادہ کھانا پینا دے رہا تھا۔ رات کو ہم نے خوب اچھا کھانا کھایا اور گدے پر لیٹ

کر باتیں کرتے رہے۔ اور پھر سو گئے۔

ایک پرانی موٹر گاڑی کی آواز ہم سوتے ہوؤں کے کانوں سے ٹکرائی۔ "لگتا ہے ملوت رائے صاحب آگئے ہیں۔" چوکیدار نے چونک کر کہا۔

ہم دونوں چوکیدار کے پیچھے ملوت رائے کی جانب گئے۔ وہ گاڑی سے اتر چکے تھے۔ ان کے ساتھ دو محکمہ آثار قدیمہ کے بڑے افسران بالا بھی تھے ان میں سے ایک گورا تھا۔ چوکیدار نے مجھے کہنی مارتے ہوئے کہا۔ "یہ ڈائریکٹر جنرل صاحب ہیں۔ ان کا نام مسٹر پالنے ہے۔ ان کے سامنے ذرا ادب سے رہنا۔"

"یہ تیرا آفیسر ہے ہمارا نہیں۔"

"ہاں بھئی گل بادشاہ کام شروع ہوا کہ نہیں؟"

رمیش جو پہلے ہی تپا ہوا تھا وہ جھٹ بولا۔ "ٹھیکے دار صاحب آپ نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔

"کیا دھوکہ؟" وہ کھسیانا ہو کر بولا۔

"دھوکہ یہ کہ آپ نے ہمیں دہلی میں یہ نہیں بتایا تھا کہ شام نگر میں اس جین مندر میں پانی، بجلی یا دیگر ضروریات کی سہولت موجود نہیں ہے۔ اور یہ علاقہ علی گڑھ سے دور دراز بالکل الگ تھلگ ویرانے میں ہے۔"

ملوت رائے نے رمیش کے سخت لہجے کا جواب انتہائی ملائم انداز میں یہ دیا۔ "میں نے تمہارے ساتھ کیا دھوکہ کیا ہے؟ ایک تو میں نے تمہیں ڈبل تنخواہ پر ملازم رکھا ہے۔ اور دوسرا میں تمہیں یہاں ویرانے میں ہر سہولت فراہم کر رہا ہوں جو شاید اس دور میں کوئی مالک اپنے نوکروں کو نہیں دیتا ہے۔" اس نے پھر اسے کہا۔ "میں کیا تمہارا پابند ہوں جو تمہیں ہر بات بتاؤں۔"

گورے بڑے آفیسر۔ مسٹر پالنے نے گل بادشاہ کو کہا۔ "تمہاری کچی نوکری پکی کر دے گا اور تمہاری تنخواہ اب اچھی ہو جائے گی۔ تم بس دل لگا کر اپنی نگرانی میں اس مندر کی صفائی کروا دو۔"

گل بادشاہ نے اپنا انداز بدل کر اپنے رویئے میں نرمی پیدا کر لی جسے میں نے اور رمیش نے حیرت سے دیکھا۔ "تم میرے بھائیوں کی طرح ہو، میں تمہاری سہولیات، مراعات میں مزید اضافہ کر دیتا ہوں بلکہ اس وقت تمہاری تنخواہ میں مزید 20 روپے کا اضافہ کر دیتا ہوں۔" ٹھیکے دار ملوت رائے نے ہمارے غصہ پر لالچ کا مرہم رکھ دیا تھا۔

"اور مزید کیا کیا سہولتیں دیں گے؟" رمیش نے لالچی انداز میں پوچھا۔

"مجھے احساس ہے کہ تم لوگ یہاں اس ویرانے میں اکیلے ہو۔ اس لئے میں تمہارے سیر سپاٹے کے لئے دو نئی سائیکلیں بھیج دیتا ہوں۔ تاکہ تم لوگ فارغ وقت میں اس ویرانے سے نکل کر تفریح وغیرہ کر سکو۔ اور ایک بڑا ریڈیو بھی بھیج دوں گا۔ جو اس تنہائی میں تمہارا دل بہلائے گا۔" ملوت رائے نے رمیش کو اپنے پاس پیار سے بلا کر کہا۔ "میں تمہیں 5-4 دن بعد واپس دہلی بلا لوں گا، تم ذرا جذباتی انسان ہو۔"

مسٹر پالنے نے اپنی جیب سے 60 روپے نکالے اور 20، 20 روپے ہم تینوں کو دیتے ہوئے بولا۔ "گھبراؤ نہیں۔ میں یہاں تمہاری دل جوئی کے لئے ہر دوسرے روز آتا رہوں گا۔"

ملوت رائے اور پالنے نے ہم تینوں کا غصہ اور زبانیں بند کرنے کے لئے چکنی چپڑی تسلیوں، نوٹوں اور مراعات کے اعلانات سے کر دی تھیں۔

ملوت رائے نے بڑی صفائی سے ہمارا ذہن دوبارہ کام کرنے کی طرف مائل کر دیا تھا۔ گورے آفیسر نے جین مندر کی اوپری منزل کی چابی چوکیدار گل بادشاہ کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ساتھ اس مندر کی اوپری منزل پر چلو، ذرا وہاں دیکھیں صفائی کا کتنا کام ہے؟ وہ کمرا چار سال سے کھلا نہیں۔"

جین مندر کی اوپری منزل پر جانے کے لئے لکڑی کی سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ ان سیڑھیوں کی چوڑائی بہت کم تھی ان پر بڑے قدم جما کر رکھنے پڑ رہے تھے۔ مسٹر پالنے جو بذات خود ماہر آثار قدیمہ تھا۔ اس نے بتایا کہ "اکی تحقیق کے مطابق یہ مندر 11 صدیاں پرانا ہے۔ اور جب یہ بنایا گیا تھا تو یہ بڑی شاندار وسیع عمارت پر مشتمل

تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کی عمارت گر گئی۔ یہ صرف اوپر نیچے شکستہ دومنزلہ بچ گیا ہے۔" سیڑھیوں کے ساتھ دیوار میں بڑی موٹی رسی باندھی ہوئی تھی تا کہ کوئی گرے نا۔ چوکیدار گل بادشاہ آگے تھا جب کہ اس کے پیچھے ہم سارے تھے۔ ہم بڑی مشکل سے ان سیڑھیوں کو عبور کر کے اوپری منزل کے آہنی دروازے پر پہنچے۔

گل بادشاہ نے چابی کو دو چار دفعہ اس آہنی دروازہ پر لگے بڑے قدیمی تالے میں پیوست کی وہ شاید زنگ آلود تھا۔ وہ بہرحال کھل گیا۔ اس کے بعد ملوت رائے نے ہمیں کہا کہ "تم تینوں اس دروازے کے نیچے جمی مٹی کو کھرچو۔" ہم نے مٹی کو کھرچا اس کے بعد مزید قوی زور لگانے کے بعد دروازے کو پیچھے کی جانب دھکا دیا۔ وہ چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ کھلنا شروع ہوا۔ دروازے کے کھلتے ہی ہماری نظروں کے سامنے ایک قدیم شکستہ ہال تھا۔ جس میں جابجا دبیز مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے لکڑیوں کے تختے اور بے شمار کباڑ والی چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ ہال کافی بڑا تھا اور فی الحال اندر گھسنے کے حالات نہیں تھے۔"

ہال کے اندر 6-7 فٹ لمبے بت نظر آرہے تھے دل چسپ بات یہ ہے کہ چھوٹے بت کی پشت نظر آرہی تھی اس کا منہ دیوار کی جانب تھا۔ جب کہ بڑا بت کا منہ ترچھا لیکن آگے کی جانب تھا۔ مسٹر پالنے نے ملوت رائے سے ہم سے ذرا ہٹ کر کچھ مشورہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد ملوت رائے نے ہم تینوں کو کہا کہ "تم دونوں یعنی میں اور رمیش گل بادشاہ کے کہنے کے مطابق کام کریں گے۔ اور گل بادشاہ بھی چوکیداری کے ساتھ ساتھ ہماری مدد کرے گا۔ نیز اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ "تم دونوں اس ہال کی صفائی کرو، جب کہ گل بادشاہ نیچے صحن کی صفائی کرے گا۔"

مسٹر پالنے نے ملوت رائے سے پوچھا۔ "یہ تم کام کب تک کراؤ گے۔"

اس نے جواب دیا۔ "مندر کے صحن اور ہال میں پڑے مکمل ملبے کی صفائی تقریباً 15 دن میں ہو جائے گی۔"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "سر! ہم دن رات لگا کر اس مندر کو چمکا دیں گے۔" دراصل میں دلی طور پر اس عذاب سے جلد از جلد جان چھڑانا چاہتا تھا، یقیناً رمیش اور گل بادشاہ بھی یہی چاہتے ہوں گے جو میں چاہتا ہوں۔

ماحول خوشگوار اور اچھا سا ہو گیا تھا۔ "یار خوف کا تعلق انسانی نفسیات سے ہے۔ یہ جن بھوت وغیرہ صرف کتابی تصور ہے۔" اس نے ہمارے ذہنوں پر طاری خوف کے سحر کو نکالنے کے لئے وہاں لاتعداد باتیں کی تھیں۔ دوران گفتگو اس نے بتایا کہ "یار اس جین مندر کو دراصل دہلی محکمے کے حوالے کرنا ہے۔ اس لئے اس کی صفائی کروائی جا رہی ہے۔ اور ویسے بھی میں اس مندر کی صفائی کا ٹھیکہ لے کر پچھتا رہا ہوں۔"

کام شروع ہو گیا، میں اور رمیش اس ہال کے دروازے کے سامنے پڑی مٹی کو اور دیگر چیزوں کو ہٹانا شروع کر دیا تھا۔ مٹی آسانی سے اٹھائی جا رہی تھی۔ لیکن تختے انتہائی وزنی تھے۔ انہیں اٹھانے کے لئے نیچے صحن میں کام کرتے گل بادشاہ کو آواز دے کر بلا لیا گیا تھا۔ ہم تینوں نے آدھا گھنٹہ اپنا بھرپور زور لگا کر انہیں گھسیٹ گھسیٹ کر نچلی منزل پر بمشکل اتارا۔ ہمارے اندازے کے مطابق ہر ایک ٹکڑے کا وزن، تقریباً 2 من ضرور ہو گا۔ سمجھ نہیں آتا تھا کہ اتنے موٹے لکڑی کے تختوں کو اس مندر میں لانے کا کیا مقصد رہا ہو گا۔

اوپری کمرے سے نیچے آتی سیڑھیاں بذات خود انتہائی کمزور تھیں اور ہمارے لئے جو موٹی رسی پکڑنے کے لئے تھی وہ بھی بہت خستہ حالی کا شکار تھی۔ اگر دوران پکڑائی وہ ٹوٹ جاتی تو یقیناً پکڑنے والا منہ کے بل گر کر مر بھی سکتا تھا۔ ملوت رائے نے جب یہ صورت حال دیکھی تو خود ہی اس نے احساس کرتے ہوئے کہا "یہ تین بندوں کا کام نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لئے مزید بندے اور درکار ہیں۔ کل صبح 2 بندے اور بھیجوں گا۔ اس سے نہ صرف تمہارا مزید دل بہل جائے گا اور کام بھی جلدی ہو جائے گا۔

" جب کہ ملوت رائے وہاں ہمارے ساتھ کھڑا رہا۔

گل بادشاہ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد یہ کہہ کر چلا گیا کہ "دوپہر کا وقت ہوتے ہی ملوت رائے افسران کے ساتھ چلا گیا اور یہ بول گیا کہ کل 2 مزدور اور ضروری سامان مل جائے گا۔ اور میں پرسوں آؤں گا۔ تم دل لگا کر اپنا کام کرو، میں پھر تمہاری بہت شاندار دعوت کروں گا۔"

میں اور رمیش بلا خوف اوپری منزل کی صفائی کرنے لگے تھے۔ وہاں کوئی غیر معمولی بات نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ سب کچھ نارمل تھا۔

دوسری صبح ایک چھوٹے ٹرک میں بیٹھ کر 2 مزدور آئے۔ ان کے ساتھ دو سائیکلیں کھانے پینے کا سامان دو بانس کی لمبی لمبی سیڑھیاں اور نئی لمبی لمبی رسیاں تھیں۔ ٹرک والے نے یہ سارا سامان اور دونوں مزدوروں کو اتارا اور چلا گیا۔ ان دونوں مزدوروں میں سے ایک بڈھا تھا جب کہ دوسرا ادھیڑ عمر تھا۔ بعد میں بڈھے نے اپنا نام راجندر اور ادھیڑ عمر نے اپنا نام اسونگھ بتایا۔ راجندر نے ٹھیکے دار ملوت رائے کے ہاتھوں کی لکھی چٹھی میرے نام کی دی۔ میں نے اسے پڑھا اس میں لکھا تھا کہ "میں کل صبح آؤں گا دونوں کو نیچے کام پر لگا دو۔ جب کہ گل بادشاہ کو اوپری ہال کی صفائی کے لئے اپنے ساتھ لگاؤ، میں نے دو سائیکلیں تمہاری تفریح اور دور بازار سے ضرورت کا سامان خریدنے کی غرض سے بھیجی ہیں۔" ملوت رائے نے یہ بھی لکھا تھا کہ۔ "تم لوگ کام کے بعد ان سائیکلوں کا استعمال کرنا جب بہت ضرورت پڑ جائے۔"

ان دونوں مزدوروں کے آنے سے ہمیں ذہنی ڈھارس محسوس ہونے لگی تھی۔ لیکن یہ ڈھارس وقتی ثابت ہوئی۔ ہوا یہ کہ پہلے دن ہی بڈھے مزدور راجندر کے سر پر ایک وزنی پتھر گر گیا تھا۔ وہ اچھا خاصہ زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ آیا ہوا مزدور اسونگھ اپنی سائیکل پر بیٹھا کر اسپتال لے گیا۔ کس اسپتال میں لے کر گیا اس کا نام معلوم نہ تھا۔ لیکن وہ جلدی میں یہ کہہ گیا کہ "وہ اس کی مرہم پٹی کروا کر تقریباً دو گھنٹے بعد واپس آجائے گا۔"

وہ شام تک جب نہ آیا تو ہمیں تشویش اور پریشانی لاحق ہوئی۔ گل بادشاہ نے اپنے سر پر تفکرانہ انداز میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اسونگھ کدھر مر گیا۔ وہ ابھی تک آیا نہیں۔"

"ہمیں تھوڑی دیر اور انتظار کرنا چاہیے۔"

میں نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ اس نے میری تجویز کو رد کرتے ہوئے کہا۔ "اتنا تو انتظار کر لیا ہے۔" ہم تھوڑی دیر اور ان کی راہ دیکھتے رہے۔

"یار ایک غلطی ہو گئی۔ غلطی یہ ہوئی ہے کہ ہمیں بھی راجندر کے ساتھ جانا چاہیے تھا اب کیا کیا جائے؟ گلزار تو میرے ساتھ چل ہم دونوں اسے ڈھونڈتے ہیں۔ وہ نہ جانے کس اسپتال میں گیا ہے؟"

"میں یہاں اکیلا نہیں رہوں گا۔ رمیش نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔ "میں گل بادشاہ کے ساتھ جاؤں گا۔ میں یہاں اکیلا کیوں رہوں؟" ہم دونوں آپس میں اس مسئلہ پر ناحق لڑنے لگے تھے۔ "لگتا ہے راجندر کی حالت اسپتال میں زیادہ خراب ہو گئی ہے اس لئے اسونگھ واپس نہیں آیا۔ وہ شام نگر کے کس اسپتال میں لے کر گیا ہے؟ یہ تک ہم نے نہیں پوچھا۔"

گل بادشاہ نے جھنجھلا کر کہا۔ "تم آپس میں لڑو نہیں۔ تم دونوں ادھر رہو...... میں انہیں ڈھونڈتا ہوں۔"

"آپ کدھر جائیں گے؟" رمیش نے گل بادشاہ سے پوچھا تو اس نے غصے سے جواب دیا......

"میں چاہے جہنم میں انہیں تلاش کروں۔ لیکن تم میں سے ایک بندہ نیچے مندر کے صحن میں کام کرے گا۔ اور دوسرا اوپر ہال میں۔ اور میں کوشش کروں گا کہ جلد از جلد یہاں پہنچ جاؤں رمیش تم نیچے کام کرو اور گلزار اوپر کام کرے گا۔" وہ یہ کہہ کر دوسری سائیکل لے کر نئے مزدوروں کو تلاش کرنے نکل گیا۔

میں نے رمیش کو کہا "تو مندر کے صحن کی صفائی کر میں اوپری منزل کی صفائی کرتا ہوں۔" میں اپنی دھن میں اکیلا مندر کی اوپری منزل میں صفائی کر رہا تھا کہ اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی بھاری جسم نے

اپنا قدم آگے بڑھایا ہو۔ مندر کی چھت میں جمی مٹی۔ دھول غبار بن کر اٹھی پہلے تو میں یہ سمجھا کہ شاید کوئی بھونچال آگیا ہے۔ لیکن پھر یہ دھمک رک گئی۔ میں نے چونک کر ادھر دیکھا۔ وہاں کچھ غیر معمولی نہ تھا۔ دونوں بت اپنی جگہ موجود تھے۔ لیکن ان کے سامنے سے بڑے دو پتھر سرک کے نیچے آگئے تھے۔ میرے لئے یہ بڑی حیرت انگیز بات تھی۔ "یا الٰہی یہ کیا ماجرہ ہے؟" میں نے سوچا "میں رمیش سے جا کر پوچھتا ہوں کہ تم نے کچھ زلزلہ جیسی آواز سنی ہے کہ نہیں۔" میں ابھی سیڑھیوں کے درمیان کے راستے میں تھا کہ مجھے زوردار آواز سنائی دی جو کہ رمیش کی آواز تھی "گلزار بھائی مجھے بھگوان کے لئے اس بت سے بچاؤ۔"

بچاؤ بچاؤ کی آوازیں پہلے سے زیادہ تیز ہونے لگی تھیں۔ میں بھاگا بھاگا رمیش کے پاس پہنچا تو وہاں میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ کیونکہ رمیش کی ٹانگوں کو کسی نادیدہ قوت نے ایک بھاری پتھر سے کچل دیا تھا۔

یہ دیکھ کر میری اپنی حالت بہت ابتر ہو گئی تھی، میں نے رمیش کو شدید زخمی حالت میں دیکھا تو اس سے گھبراہٹ میں پوچھا "کس نے تجھے مارا ہے؟"

رمیش نے انتہائی تکلیف میں اوپری منزل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "بڑا بت۔" وہ یہ کہہ کر بے ہوش ہو گیا۔

میں اسے کندھے اٹھا کر گل بادشاہ کے کمرے میں لایا۔ شدید خون اس کی ٹانگوں سے بہہ رہا تھا۔ میں نے خون کو روکنے کی بہت کوشش کی۔ رمیش بدستور بے ہوش پڑا ہوا تھا لیکن زندہ تھا۔ ادھر گل بادشاہ بھی واپس نہیں آیا تھا۔ میری حالت اس ویرانے میں اپنے سامنے پڑے مرتے رمیش کو دیکھتے ہوئے نہ گفتہ ہو رہی تھی۔

اسی دوران مجھے مندر کی اوپری منزل سے بالکل گل بادشاہ جیسی آواز آئی۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔ "گل زار عباسی اوپر آؤ۔ اوپر آؤ۔"

"یا الٰہی یہ کیا ماجرہ ہو رہا ہے؟" میں خود کلامی کی صورت میں بولنے لگا تھا۔ مجھے بار بار اوپری منزل سے آوازیں آرہی تھیں۔ گلزار آؤ۔ جلدی اوپر آؤ۔"

بہر حال میں حوصلہ اور ہمت مجتمع کر کے اوپر گیا۔ تو وہاں ایک اور نہ قابل بیان صورت حال میرے سامنے تھی۔ اوپر ایک بت موجود تھا۔ لیکن دوسرا چھوٹا بت موجود نہ تھا۔ اور اس جگہ گل بادشاہ بھی موجود نہ تھا۔ میں نے اس دوران ایک اور دھمک چوکیدار کے کمرے کی سمت سنی۔ جہاں رمیش شدید زخمی حالت میں پڑا تھا۔ وہاں سے ڈرز ڈرز کی ایسی بھیانک آوازیں آئیں کہ سارا مندر لرز کر رہ گیا۔

میں فوراً سیڑھیوں سے سنبھلتا اور قدرے گرتا پڑتا۔ جب گل بادشاہ کے کمرے میں گیا تو وہاں میں نے دیکھا کہ رمیش کے چہرے کو بڑی بے رحمی سے ایک بھاری پتھر سے کچل کر مارا گیا تھا۔ اس کے چہرے کا قیمہ جیسا حال تھا۔ رمیش کا چہرہ بالکل مسخ ہو کر رہ گیا تھا، جسے دیکھ کر مجھے ابکائی آنے لگی تھی۔ میں وہ منظر دیکھ کر بے ہوش ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میرے بے ہوش جسم پر ٹھنڈا پانی ڈالا گیا تو میں ہڑبڑا کر اٹھا تو میری دھندلی نگاہوں کے سامنے زخمی راجندر سر پر پٹی باندھے کھڑا تھا۔ اور اس کے ساتھ اسوسنگھ کھڑا تھا۔ "یہ کیا ہو گیا؟ رمیش کو کس نے اس بے رحمی سے مارا ہے؟" اسوسنگھ نے جیسے چلاتے ہوئے مجھ سے سوالات کیے۔

میں نے روتے اور ڈرتے ہوئے جواب دیا۔ "اوپر والے بت نے مارا ہے۔"

"تو پاگل تو نہیں ہو گیا ہے خود ہی مار کر اس قتل کا الزام بے جان، بے ضرر بتوں پر ڈال رہا ہے۔ شرم کر تو جھوٹ بولتا ہے۔"

"میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے رمیش کو نہیں مارا۔" میں نے ان کے سامنے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"تو بکواس کرتا ہے تو نے ہی رمیش کو مارا ہے۔" تھوڑی دیر بعد گل بادشاہ انتہائی پریشانی میں آیا تو

اس نے ان دونوں مزدوروں پر چڑھائی کر دی کہ وہ کہاں چلے گئے تھے لیکن جب اس نے رمیش کی کچلی ہوئی لاش کو دیکھا تو وہ چونک کر بولا۔ "اسے کسی نے قتل کر دیا! یہ کیا ہوا؟"

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا اسوسنگھ نے اسے بتایا "گل بادشاہ یہ کہتا ہے اسے اوپر والے بت نے مارا ہے۔"

"کیا کہا؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں گل بادشاہ واقعی رمیش کو اوپر والے بت نے مارا ہے۔" میں نے اسے سارا واقعہ بتایا۔

گل بادشاہ نے ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر مارتے ہوئے کہا۔ "ڈرامہ نہ کر، تو نے ہی رمیش کو مارا ہے، مجھے صاف صاف بتا دے، اصل معاملہ کیا ہے؟"

میں نے اس کے پاؤں پر گر کر کہا۔ "خدا کی قسم میں نے رمیش کو نہیں مارا۔ میں اسے کیوں مارتا؟"

"یہ جھوٹ بولتا ہے۔" راجندر نے زخمی حالت میں بھی میری ذات پر کچوکے مارتے ہوئے کہا۔

"یہ میرے بھائیوں کی طرح تھا، میں اسے کیوں مارتا؟" میں نے کہا۔

رمیش کی لاش کے کچلے ہوئے حصے کو ان تینوں نے سیٹ کیا۔ اس بے چارے کا منہ بھاری پتھر پڑنے کی وجہ سے بالکل قیمہ بن چکا تھا۔

گل بادشاہ نے اسوسنگھ کو کہا "تو فوری طور پر سائیکل لے کر جا شام نگر تھانہ جو یہاں سے 4 میل دور ہے وہاں پولیس کو اس واقعہ کی اطلاع دے تاکہ ہم اسے گرفتار کروا کے اپنے سر سے اس بوجھ کو ہٹائیں۔ بچے تو لاکھ چالاکی کر اور بے شک یہ کہتا رہ کہ تو نے رمیش کو قتل نہیں کیا۔ لیکن تمام شواہد، واقعات تجھے مقتول کے قتل کے جرم میں پھانسی کے پھندے کی جانب لے کر جا رہے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد اسوسنگھ اپنے ساتھ تین پولیس والے اور ایک تھانے دار کو لے آیا۔ تھانے دار نے آتے ہی رمیش کی لاش کو ہونقوں کی طرح دیکھتے ہوئے اپنے ساتھ آئے سپاہیوں کو کہا "اوئے یہ کتنا بھیانک قتل ہے بھگوان قسم میں نے ایسا سفاکانہ قتل اپنی نوکری میں پہلی بار دیکھا ہے۔"

میں سہما اور ڈرا ہوا ایک اینٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے وہاں جانوروں کی طرح بے دردی سے گریبان سے پکڑ کر فرش پر گرا لیا اور دو چار زوردار لاتیں میرے جسم میں مارتے ہوئے کہا۔ "بتا تو نے اسے کیوں مارا؟"

میں لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اسے اوپری منزل پر موجود بت نے قتل کیا ہے۔" تو اس نے مجھے بالوں سے پکڑا اور لاتیں مارتا ہوا اوپر والے ہال میں لے گیا۔ اس کے پیچھے پولیس والے اور مزدور بھی آئے۔ تھانے دار نے میری پشت پر تین چار لگا تار ڈنڈے مارتے ہوئے کہا۔ "دیکھو ان بتوں کو کیا یہ ہل سکتے ہیں۔ یہ یہاں صدیوں سے یونہی پتھروں کی طرح بے جان و بے حس ہیں۔"

تھانے دار دو تین منٹ تک بتوں کو بغور آگے پیچھے سے دیکھنے لگا۔ اس کے بعد وہ نیچے آیا جہاں رمیش کی لاش پڑی تھی اس نے ان پتھروں کی ہیبت دیکھی جس کے ذریعے مقتول کو کچلا گیا تھا۔ اس نے انہیں دیکھ کر حیرت سے کہا۔ "اس پتھر کو کم از کم تین چار بندے بمشکل سے ہلا سکتے ہیں۔" اس کے بعد اس نے رمیش کی کچلی ہوئی لاش کو مختلف زاویوں سے دیکھا۔ وہ بتوں کے پاس بھی گیا۔ آخر میں اس نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈلوا دی۔

تھانے دار نے گل بادشاہ، اسوسنگھ اور راجندر کے بیانات لئے۔ اور انہیں کہا۔ "تمہاری اس کیس کے سلسلہ میں مزید ضرورت پڑ سکتی ہے۔ لہٰذا تمہیں علی گڑھ میں تھانہ اور کورٹس میں آنا پڑے گا۔"

"سر! ہم غریب تو بڑی دور کے پردیسی ہیں کیسے بار بار ہم اس کیس میں ناحق دھکے کھائیں گے قتل تو گلزار نے کیا ہے۔" اسوسنگھ نے کہا۔

تھانے دار نے اسے اپنے پاس بلایا اور ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا، موٹی موٹی گالیاں دیں اور بولا۔ "یہ قتل کا کیس ہے اس میں زندگی اور موت ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ اس کیس کا عدالت ہر زاویے، اور شواہد

سے پرکھ کر بڑی احتیاط سے فیصلہ دیتی ہے۔ آئندہ آنے والی تاریخوں میں تم تینوں اس کیس کے اہم گواہ ہوگے۔ اور ہوسکتا ہے اس قتل کیس کا مدعا الٹا تم پر نہ پڑ جائے۔"

"وہ کیسے؟" گل بادشاہ نے پوچھا۔ "اب یہ ظاہری بات ہے کہ جب اس کے سر پر موت منڈلائے گی تو یہ ہاتھ پاؤں تو مارے گا۔ یہ کہہ سکتا ہے کہ اسے ہم تینوں نے مل کر مارا ہے۔"

"یہ ایسا نہیں کرسکتا۔ یہی قاتل ہے۔" اسونگھ نے تھانے دار کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"یہ تو۔ کہہ رہا ہے۔" تھانے دار نے تینوں کو اپنے پاس بلا کر کہا۔ اگر تم تینوں نے اپنی اور اس غریب کی جان مزید قانونی پیچیدگی سے بچانی ہے تو تم سارے مل کر میرے ساتھ تعاون کرو (اپنی انگلیوں کو مل کر رشوت کا اشارہ دے کر) تو میں اس کیس کا رخ کسی اور جانب پلٹ دیتا ہوں......

"سر! ہم انتہائی غریب مزدور لوگ ہیں۔ بھگوان کے واسطے ہماری اس کیس سے جان چھڑوائیں۔"

تھانے دار نے گل بادشاہ کو اپنے پاس بلوایا اور اسے کہا۔ "میرے تجربے کے مطابق گلزار اس کیس میں بچ جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو جس پتھر سے رمیش ہلاک ہوا ہے، اتنا بھاری ہے کہ اسے بمشکل چار آدمی اٹھاسکتے ہیں، بقول تم سب کے یہ وقوع کے وقت اکیلا تھا۔ یہاں دو سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ اکیلا اتنا بھاری پتھر اٹھا نہیں سکتا۔ اس کے لئے کم از کم پانچ افراد کی ضرورت ہے۔ (اور چار تم ہو) اور دوسرا اگر تمہاری بات مان بھی لی جائے تو موقع کا گواہ کوئی نہیں ہے۔ میرے تجربے کے مطابق یہ 100% بچ جائے گا۔ باقی آگے تم جو بولو۔ میں اس کیس کو کس طرح لے کر جاؤں۔ تعاون کرو تو......!"

ادھر میں نے بھیگی بلی کی مانند تھانے دار، سپاہیوں اور اپنے ساتھیوں کے آگے گڑگڑا کر التجائیں کیں اور انہیں یقین دلانے کی کوشش کی۔ "خدا کی قسم میں رمیش کو نہیں مارا۔" وہاں کھڑے ایک سپاہی نے درمیان میں دخل اندازی کرتے ہوئے بولا۔ اس کا مطلب ہے واقعی بت نے رمیش کو قتل کیا ہے؟"

"چند منٹ میں فیصلہ کرو ایسا نہ ہو کہ ملوت رائے ٹھیکے دار آجائے تو یہ سارا کھیل میرے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔"

تینوں مزدوروں نے آپس میں اکھٹے ہوکر اپنے سر جوڑے بالآخر تینوں نے تھانے دار کی ہتھیلی پر جوان کے پاس روپے موجود تھے رکھ دیئے۔

رشوت خور تھانے دار نے گل بادشاہ کے چوکیدار کے کمرے سے بھاری پتھر اٹھوایا۔ اسے اٹھانے سے سانس پھول گیا۔ تھانے دار نے رمیش کی لاش کی ضروری کاروائی کے بعد راجن پور اس کے گاؤں بھیج دیا۔ اور اپنی رپورٹ میں ثابت کردیا کہ رمیش کی موت ایسے بڑے پتھر کے نیچے دبنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ ٹھیکے دار ملوت رائے کو بھی یہی بتایا گیا تھا۔

سارے مزدور اس جین مندر کو منحوس کہہ کر بھاگ گئے۔ انہوں نے مزید کام کرنے سے انکار کردیا تھا۔ جن میں میں بھی شامل تھا۔

اس کہانی کے راوی گلزار عباسی نے یہ بھی بتایا کہ "ایک دن متعلقہ تھانے دار نے مجھے اپنے تھانے میں بلایا۔ میں نے جب اس کی نیکی اور تعاون کا ذکر کیا تو اس نے مجھے ایک کونے میں لے جا کر مجھ سے کہا۔ "سچی بات ہے۔ میں نے جب رمیش کے قتل اور تجھے دیکھا تھا تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ تو اس میں ملوث نہیں ہے۔ اور دوسرا میں جب تیرے ساتھ اوپر مندر میں پیوست دیوار کی جانب الٹے بت کی جانب گیا تو وہاں پشت والے بت کی زبان باقاعدہ ایک عام انسان کی طرح نکلی تھی۔ میں دلی طور پر دہل کر رہ گیا تھا۔ لیکن میں مصلحتاً چپ رہا تھا۔ اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ تم نے ویسے بھی عدالت سے بری ہوجانا تھا۔ خیر اس پراسرار نوعیت کے قتل کیس کے بہانے مجھے کچھ مال ہی مل گیا۔"

راز

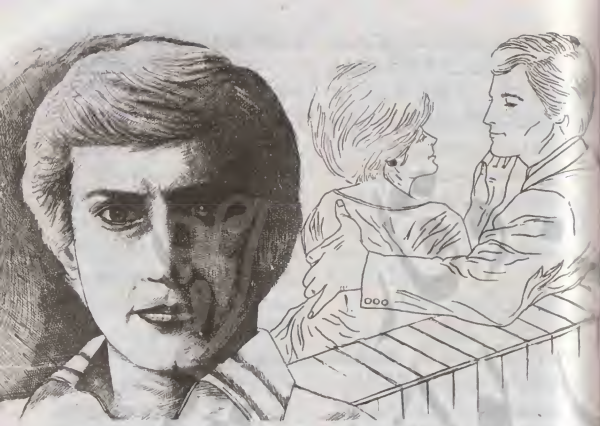

محمد عثمان علی - میاں چنوں

اب ذرا ریڈیو کی طرف دیکھو ایک آواز سنائی دی اور کلک کی آواز کے ساتھ ریڈیو خود بخود آن ہوکر بجنے لگا، دیکھنے والوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی، پھر اچانک ریڈیو دوبارہ کلک کی آواز کے ساتھ آف ہوگیا۔

سوچ کے افق پر جھلمل کرتی ایک ناقابل یقین عجیب وغریب دل ودماغ کو مبہوت کرتی کہانی

سرد...... ٹھٹھرتی ہوئی رات کا پہر ہے، دھند لمحہ بہ لمحہ پھیلتی جارہی ہے۔ ہر سوں نیم دانددھیرا پھیلا ہوا ہے۔ ماحول میں...... ہر جانب خاموشی کا گہرا سکوت پھیلا ہوا ہے۔ میں اس وقت ایک ایسی چیز کی نگر پر بیٹھا ہوا ہوں جسے بستر کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ چند آہنی ڈنڈوں اور تاروں کی مدد سے بنی ہوئی ہے۔ اس پر کوئی گدا بھی نہیں ہے۔ بس ایک زائد کمبل پڑا ہوا ہے۔ جس کا رنگ زیتونی ہے، یہ کسی بھی طرح کوئی آرام دہ چیز نہیں...... مگر یہ تو ان کی خواہش بھی ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ بے آرامی محسوس کروں...... مجھے سکون کی بجائے پریشانی لاحق ہو۔ تکلیف محسوس ہو۔ یہ جگہ کوئی تہہ خانہ ہے اور نہ ہی کسی اندھیری کوٹھی...... بنگلے کا کوئی خفیہ کمرا...... یہ حوالات ہے۔ شہر کا بڑا اور کسی فلمی ہیرو کی طرح مشہور ومعروف یہ پولیس اسٹیشن ہے۔ میں بات طویل نہیں کرنا چاہتا...... اس لئے

میں اس پولیس اسٹیشن کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے نہیں باندھوں گا۔

وہ میں (پولیس والے) مجھے اس پولیس اسٹیشن کی حوالات سے نکال کر ضلعی جیل میں منتقل کرنے کا منصوبہ بھی رکھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مجھے پھانسی گھر...... ہینگنگ ہاؤس روانہ کردیں گے...... اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھ پر پہلے مقدمہ چلے گا۔ مگر یہ صرف ایک رسمی کارروائی ہوگی۔ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ انہوں نے مجھے جس وقت اریسٹ کیا تھا تو میرے ہاتھ میں دھواں خارج کرتی ہوئی گن پکڑی ہوئی تھی، اور میرا دوست کناٹ، جس کے حلق میں ایک سوراخ ہوگیا تھا...... موت کے لمحات میں کچھ بولنے کی کوشش کررہا تھا۔ مگر موت نے اسے بولنے کی کچھ مہلت نہ دی۔ بلکہ میں نے فوراً اور اسی وقت اقبال جرم بھی کرلیا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں کیا کررہا ہوں۔ یہ حرکت کینے کے زیر اثر کی گئی تھی اور یہی بات انہوں نے کہی تھی کہ میں نے لارنس کناٹ کو جان بوجھ کر موت کے گھاٹ اتارا ہے۔

وہ قاتلوں کو مار ڈالتے ہیں، لہٰذا وہ مجھے بھی ختم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ لارنس کناٹ نے میری جان بچائی تھی۔ مگر میں ایسا سفاک نکلا تھا کہ میں نے اسی کو مار ڈالا تھا۔

بلاشبہ کچھ حقائق میرے حق میں بھی ہیں۔ مگر مجھے توقع نہیں کہ ''جیوری'' ان سے متاثر ہوگی......!''

لارنس کناٹ میرا برسوں پرانا دوست تھا۔ جنگ کے زمانے میں میرا اس کا رابطہ ٹوٹ گیا تھا، پھر ہماری ملاقات واشنگٹن میں ہوئی تھی۔ یعنی جنگ کے خاتمے کے چند سال بعد...... اس عرصے میں ہماری ذہنی ہم آہنگی میں کچھ فرق آگیا تھا۔ وہ اب ایک ایسا آدمی بن چکا تھا جس کے سامنے اپنا ایک مشن تھا، وہ کوئی کام بڑی محنت سے کررہا تھا۔ وہ کیا کررہا تھا......؟ اور اس کا یہ کام کیسا تھا......؟ اس کی نوعیت اس نے صیغہ راز میں رکھ چھوڑی تھی۔ اس کی زندگی میں ایسی کوئی چیز نہ تھی جو گفت وشنید کا ذریعہ بن سکتی...... اور رہی میری بات...... سو میری بھی اپنی طرز کی زندگی تھی۔ مگر میں کسی سائنسی تحقیق وغیرہ میں نہیں ہوا تھا۔ مجھے میڈیکل اسکول سے خارج کردیا گیا تھا، جبکہ کناٹ نے تعلیم جاری رکھی تھی۔ میں بہرحال اس پر شرمندہ نہ تھا۔ اس میں ندامت کی کوئی بات نہ تھی۔ دراصل میں لاشوں کو چیرنے پھاڑنے والا مزاج نہیں رکھتا تھا، مجھے یہ کام قطعی پسند نہ تھا اور میں اسے کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اور بدرجہ مجبوری اگر میں کرتا بھی تو نہایت بری طرح...... ظاہر ہے کہ اسکول تو مجھے چھوڑنا ہی تھا۔ سو میں نے چھوڑ دیا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ میرے پاس ڈگریوں کی لائن بھی نہ تھی، سینیٹ گارڈ کی نوکری کے لئے ڈگریوں کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ سینیٹ گارڈ کی نوکری...... بھلا اس پیشے کی کوئی وقعت ہوتی ہے کیا......؟ مگر مجھے پسند تھی۔ آئی لائیک اٹ، اگر گارڈ آس پاس موجود ہوں تو سینیٹر صاحبان خاصے مطمئن رہتے ہیں۔ اور ان کا رویہ دوستانہ رہتا ہے۔ ان سے اس عالم میں حکومت کے اندرونی معاملات کے بارے میں اچھی خاصی معلومات مل جاتی ہیں۔ پھر ایک سینیٹ گارڈ اکثر کارآمد آدمی ثابت ہوتا ہے۔ خصوصاً اخباری نمائندوں کے لئے اس کے ذریعے انہیں اخبار کے لئے ایسی خبریں مل سکتی ہیں جو سرخیوں کے ساتھ شائع ہوسکیں۔ حکومتی اراکان کو بھی اس سے کام کی باتیں معلوم ہوسکتی ہیں۔ جو ان کے پیشے کے لئے دوررس اثرات کی حامل ہوں۔

جب گیلری میں گرما گرم بحث ہورہی ہوتی ہے تو سینیٹ گارڈ کے کانوں میں حقیقتاً بہت مفید باتیں پہنچتی رہتی ہیں۔

لارنس کناٹ بھی ایسے افراد میں سے ایک تھا۔ ایک روز سڑک پر میری اس سے اتفاقیہ ملاقات ہوگئی تھی۔ ہمارے درمیان گپ شپ ہونے لگی۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ ''کیا میں اسے سینیٹ کی وزیٹر گیلری میں پہنچا سکتا ہوں۔ جہاں فارن ریلیشن پر ڈبیٹ ہونا تھی۔ پھر میں نے دوسرے روز فون کرکے اسے بتایا کہ ''میں

نے اس کے لئے ایک ''پاس'' حاصل کرلیا ہے۔''

پھر وہ اجلاس دیکھنے کے لئے پہنچ گیا۔ وہ اس وقت اپنی غم زدہ آنکھوں سے اشتیاق کے ساتھ ادھر متوجہ تھا۔ جب سیکریٹری آف اسٹیٹ تقریر کے لئے کھڑا ہوا تھا۔ اچانک ایک غیر متوقع چیخ فضا میں گونجی...... اور سینٹرل امریکنوں کے چند متعصب افراد نے اپنے ہتھیار نکال لئے تھے۔ اور اس بات کی کوشش میں لگ گئے تھے کہ وہ امریکی پالیسی کو بہ زور ہتھیار تبدیل کرسکیں۔ شاید قصہ آپ کے علم میں بھی ہو۔

ان کی تعداد تین تھی۔ دو کے پاس گنیں تھیں۔ ایک کے پاس ایک دستی بم تھا۔ پستول والوں نے دو سینیٹروں، ایک گارڈ کو زخمی کردیا تھا۔ میں وہیں موجود تھا۔ اور کناٹ سے باتیں کررہا تھا۔ میں نے اس شخص کو تاڑ لیا تھا، جس کے پاس دستی بم تھا اور میں نے اسے پھرتی کے ساتھ دبوچ لیا۔ اس نے بھی ردعمل میں جوابی حرکت کی۔ اور ہاتھ میں پکڑا ہوا دستی بم جھٹکے کے ساتھ اچھال دیا۔ میں نے اسے تو پکڑ لیا تھا۔ مگر اس کا پھینکا ہوا دستی بم فضا میں تھا۔ اس کی پن بھی نکلی ہوئی تھی۔ پھر میں اسے جھپٹنے کے لئے لپکا...... میرا دوست لارنس کناٹ مجھ سے آگے تھا۔ اس جلسے میں وہ لمحہ کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔

تمام معاملات بے حد سست اور ہولناک تھے۔

گھومتے ہوئے بم جیسے ہی زمین پر گرا۔ لارنس کناٹ بھی اچھلتے ہوئے اس پر جا گرا۔ افراتفری کے عالم میں بھاگتے ہوئے بیشتر لوگوں کے منہ سے دہشت بھری چیخیں نکل گئیں تھیں۔ میں بھاگتا بھاگتا ٹھٹھک گیا...... مجھے سو فیصدی یقین ہوگیا تھا کہ اب لارنس کناٹ مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہوجائے گا۔ بم کے پھٹنے کے ساتھ ہی لارنس کناٹ کے جسم کے بھی سینکڑوں بلکہ ہزاروں ٹکڑے ہوجائیں گے۔ اور اس کے گوشت کے خون آلود لوتھڑے ادھر ادھر اڑتے...... بکھرتے ہوئے جا گرے تھے۔ شاید مجھ پر بھی اس کے جسم کے خون آلود گوشت کے لوتھڑے آن گرتے۔

But اس سے پہلے کہ بم پھٹتے ہوئے کوئی جارحانہ ماحول پیدا کرتا، لارنس کناٹ نے بم پھٹنے سے قبل اپنے جسم کو بجلی کی سی حرکت دی اور کسی طرح اپنے جسم کے تلے سے بم اس قدر دور اور نیم ویران سے گوشے میں پھینک دیا کہ جب وہ پھٹا تو کسی پر کوئی اور کسی قسم کی آنچ نہ آئی۔

کیونکہ بم بہرحال پھٹا تھا۔ البتہ اس کے ٹکڑوں سے کسی کو کوئی زخم نہیں آیا تھا، اخباروں کی خبروں کے مطابق بم کے دھماکے سے لارنس کناٹ بے ہوش ہوگیا تھا۔ پھر وہ کوئی چھ گھنٹے تک غشی کی حالت میں ہی رہا تھا اور جب وہ غشی سے نکلا تھا، تب بھی وہ پورا دن نیم مردہ سا پڑا رہا تھا۔

اخبار والوں نے ہم دونوں کو ہیرو بنا کر پیش کیا تھا۔ خصوصاً لارنس کناٹ کو...... انہوں نے لارنس کناٹ کی بہت ہی تعریف کی تھی۔

☆......☆......☆

دوسرے روز میں اس سے ملنے گیا...... وہ مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوا تھا۔

وہ بولا۔ ''بروٹ۔ واقعی یہ ایک جان لیوا واقعہ تھا۔''

''لارنس۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم نے میری جان بچائی ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے افسردہ لہجے میں کہا۔

''معلوم نہیں۔ بس میں بم کی طرف لپکا تھا کہ اسے پھٹنے سے قبل کسی اور جانب پھینک دوں۔''

''اخباروں میں تمہاری جرأت کی بڑی تعریف لکھی گئی ہے۔ تمہاری بہادری کا یہ کارنامہ ہر نیوز پیپر میں شائع ہوا ہے۔'' میں نے اسے بتاتے ہوئے قابل تعریف انداز میں کہا۔ ''ان کا کہنا ہے کہ تم بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آئے تھے۔ کوئی بھی دیکھ نہیں سکا تھا کہ یہ سب بھلا کیسے ہوا......؟''

''بھلا وہاں اس ہلڑ میں غور سے کون دیکھتا۔ ؟'' کناٹ نے سنجیدگی سے بولتے ہوئے کہا۔

"میں نے ایک لمبی سانس لی اور پھر بولا۔" But میں دیکھ رہا تھا۔"

وہ لمحہ بھر تک خاموشی کے ساتھ مجھے دیکھتا رہ گیا۔

میں دوبارہ بولا۔ "میں تمہارے اور بم کے درمیان تھا۔ تم کسی بھی طرح مجھ سے گزر کر آگے نہیں جاسکتے تھے۔ نہ سامنے سے...... نہ اوپر سے نہ ہی میرے اندر سے...... مگر پھر بھی تم بم کے اوپر پہنچ گئے تھے۔"

اس نے ایگری ہونے والے انداز میں اپنا سر آہستہ سے جھٹکا۔

"یہی نہیں۔ تم بم پر گر گئے تھے۔ یہ بم تمہارے بدن کے تلے ہی پھٹا تھا۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ بات مجھے معلوم ہے کیونکہ میں خود تمہارے اوپر تھا۔ ہم نے پھٹ کر تمہیں گیلری کے فرش سے اٹھا کر پھینک دیا تھا پر تم اس کے باوجود بھی Save رہے...... کیا تم نے کوئی بلٹ یا بم پروف لباس پہنا ہوا تھا......؟"

اس نے اپنا حلق صاف کیا اور بولا۔ "دیکھو...... بات دراصل......"

"تمہید کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے فوراً اس کی بات کاٹ دی تھی۔

اس نے اپنا چشمہ اتارا۔ اسے صاف کیا۔ پھر اپنی غم زدہ آنکھیں ملیں اور بڑبڑایا۔ "تم نے شاید اخبار میں نہیں پڑھا۔ وہ بم ہم سے کوئی گز بھر فاصلے پر جا کر پھٹا تھا۔"

"کناٹ" میں نے بہت سکون بھرے انداز میں اس سے کہا۔ "میں خود اس جگہ موجود تھا۔ تم شاید یہ بات اگنور کر رہے ہو۔"

اب وہ خاصا ناخوش سا نظر آنے لگا تھا۔ اپنی کرسی پر کچھ ڈھیلا ہوتے ہوئے اس نے مجھے گھورا۔ لارنس کناٹ ایک مختصر سا آدمی تھا۔ کرسی بڑی سی تھی۔ اس میں وہ اور بھی مختصر سا لگا تھا مجھے...... وہ مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

پھر وہ ہنسا۔ مجھے اس ہنسی نے حیران سا کر دیا۔ لگ رہا تھا جیسے وہ خاصا خوش ہو۔

"چلو ٹھیک ہے بروٹ۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آخر کار، جلد یا بدیر یہ بات مجھے نہ کسی کو تو بتانی ہی تھی۔ تم ہی سہی تم میرے قابل اعتماد اچھے دوست ہو۔"

وہ ایک لمحے کے لئے رکا اور پھر ایک لمحے توقف کے بعد اس نے بولنا شروع کیا۔ تاہم میں باتیں نہیں بتاؤں گا کہ لارنس کناٹ نے مجھ سے کیا کہا تھا۔ البتہ اس کا کچھ حصہ ضرور...... بس وہ حصہ چھپاؤں گا جو اہم ترین ہے۔ اس اہم ترین حصے کو میں کسی کو بھی نہیں بتا سکتا۔ لارنس نے بولنے کی شروعات کچھ اس طرح کی تھی۔

"مجھے امید ہے بروٹ کہ تمہیں شاید وہ باتیں یاد ہوں گی۔" ذرا توقف کے لئے وہ رک کر مسکرایا۔ یہ خاصی شفیق سی مسکراہٹ تھی۔ "میرا مطلب ان بحثوں سے ہے۔ جو ہمارے درمیان کیفے ٹیریا میں بیٹھ کر ہوا کرتی تھیں۔"

"تم نے غالباً ایک بار کہا تھا کہ آدمی کے دماغ کے اندر بہت سی قوتوں کے علاوہ ایک قوت سائیکو کنسس کی بھی ہوتی ہے۔ کیا اس طرف اشارہ کر رہے ہو تم......؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پرخیال انداز میں کہا۔ "اگر میں غلط نہیں ہوں تو یقیناً تمہارا اشارہ اسی طرف ہے۔ کیوں ہے نا......؟"

"ہوں۔ گویا تمہیں یاد ہے۔" اس نے مثبت لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ تم نے کہا تھا کہ ذہن کی قوت سے انگلی تک ہلائے بغیر کسی اور ذریعے کے آدمی اپنے جسم کو فوری طور سے کسی بھی جگہ سے کسی اور جگہ منتقل کر سکتا ہے۔ تم نے کہا تھا کہ دماغ کے لئے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔" اس سے یہ بات کہتے ہوئے مجھے لگ رہا تھا جیسے میں اول درجے کا احمق ہوں۔ تھی بھی یہ ایک ایسی ہی بات...... بھلا صرف سوچ کے ذریعے جسم کس طرح...... کسی اور جگہ جا سکتا ہے مگر میں گیلری میں موجود تھا۔ میں نے اپنے ہونٹوں کو زبان سے تر کیا اور لارنس کناٹ کی طرف دیکھا۔

"میں پسینے میں نہایا ہوا تھا۔" لارنس کناٹ نے "ذرا تصور کرو۔"

مجھے امید ہے کہ میری حیرت میرے چہرے سے بھی ظاہر ہوئی ہوگی۔ Because اس نے میرا دل دہلا دیا تھا۔ سنجیدہ ہوتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا۔

"بالکل بروٹ۔ تم غلطی پر ہو۔ مگر ٹھیک بھی ہو۔ بے شک تنہا دماغ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔" کناٹ نے کہا اور اس کی آنکھیں چمک اٹھیں تھیں۔ ان میں ہیجانی کیفیت ابھر آئی تھی۔

"But" وہ دوبارہ بولتے ہوئے کہنے لگا۔ "کچھ ایسی تکنیکی اور طریقے ہیں جو ذہن کو مادی قوتوں سے منسلک کر دیتے ہیں۔" اس کا لہجہ رواں ہو گیا تھا "اور تم جانتے ہو کہ ہم جو کام کرتے ہیں وہ مادی قوتوں سے ہی کرتے ہیں۔ اس کے ذریعے تو ہر چیز ممکن ہوتی ہے۔ سمندر پر پرواز کی جا سکتی ہے۔ صرف سیکنڈ بھر میں کسی بم کے دھماکے کو بھی دور کیا جا سکتا ہے، اور تم نے یہی کام مجھے کرتے دیکھا تھا۔ مگر اس کے لئے انرجی یا توانائی درکار ہوتی ہے۔ دراصل فطری قوانین سے مفر نہیں...... نتیجے میں پورا ایک دن میں تقریباً مفلوج حالت میں پڑا رہا تھا۔ مگر یہ ایک مشکل کیس تھا۔ کسی گولی کو ہدف سے ہٹانے کا کام، نسبتاً زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اس سے بھی آسان کام یہ ہے کہ چیمبر میں سے کارتوس نکال کر جیب میں رکھ لیا جائے تاکہ گولی چل ہی نہ سکے۔ کیا تم انگلینڈ کے شاہی تاج کا ہیرا چاہتے ہو......؟ میں چاہوں تو اسے بھی تمہارے لیے حاصل کر سکتا ہوں۔ دوست۔"

"کیا تم مستقبل کے بارے میں بتا سکتے ہو......؟" میں نے کناٹ سے پوچھا۔

"نہیں"...... اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ تو توہم پرستی......"

"خیال خوانی کے بارے میں کیا کہتے ہو......؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں کچھ پرانی باتیں اور یاد آ گئی ہیں شاید"...... اس نے عام فہم لہجے میں بولتے ہوئے کہا۔ اب اس کے تاثرات صاف ہو گئے تھے پھر اس نے اپنے چہرے کا رخ میری طرف کیا۔ "مگر نہیں۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آئندہ دنوں میں اس سلسلے میں کچھ سامنے آ جائے مگر فی الحال ایسا ممکن نہیں۔ تاہم اور بھی ایسی بہت سی باتیں ایسی ہیں۔ جو اسی قسم کی کہی جا سکتی ہیں مگر وجود...... ان کا ہوتا ہے بھی...... بس ماننے اور نہ ماننے کی بات...... اپنی اپنی ہوتی ہے۔ جو دیکھتا ہے۔ وہ مانتا ہے متاثر ہوتا ہے۔ ان میں صرف مختلف الفاظ کو مہارت، دماغ کا فنکشن یا پراسرار جادو اور تجربے کی حرکات اسراری ہوتی ہے۔ میں چند ایسی باتیں مانتا ہوں۔ اور انہیں کر سکتا ہوں۔ میں جاری لمحے میں ہونے والی ہر بات سن سکتا ہوں۔ میں جو کچھ دیکھنا چاہوں...... دیکھ سکتا ہوں۔ چاہے وہ دنیا میں کسی بھی جگہ ہو رہا ہو۔ بے شک یہ ایک مشکل کام ہے۔ اٹ از سو ہارڈ ورک...... But میرے امکان سے باہر نہیں...... میں نے مریخ سیارے کو بھی دیکھا ہے۔ یہ بالکل ایک چٹانی تودے جیسا ہے۔"

میں نے اپنا حلق صاف کیا۔

"مجھے تم اپنا کوئی عملی مظاہرہ دکھاؤ۔"! میں نے

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں

انسان بھی کیا شے ہے۔

دولت کمانے کے لئے اپنی صحت کھو دیتا ہے اور

پھر صحت کو واپس پانے کے لئے اپنی دولت کھو دیتا ہے۔

مستقبل کو سوچ کر اپنا حال ضائع کرتا ہے، پھر

مستقبل میں اپنا ماضی یاد کر کے روتا ہے۔

جیتا ایسے ہے جیسے کبھی مرنا ہی نہیں ہے، اور

مرجاتا ایسے ہے جیسے کبھی جیا ہی نہیں۔

(محمد عمران۔ ٹنڈو آدم)

خواہش کی۔

میری یہ بات سن کر کناٹ مسکرایا۔اب اسے مزہ آنے لگا تھا۔ برسوں سے وہ اس راز کو اپنے سینے میں چھپائے ہوئے تھا۔اپنے تک رکھے ہوئے تھا۔اس دن سے جب اپنی تحقیق میں پہلا سراغ پایا تھا۔آج تک درمیان میں نہ جانے کتنا وقت اس نے تجربے کرتے ہوئے گزارا تھا۔ کتنی بار وہ ناکام ہوا تھا۔اب اسے یہ سب باتیں کسی سے کہنے کی اغلب ہو رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔اس بات پر کہ اسے کوئی معقول سننے والا ہمراز مل گیا تھا۔

"اچھا تو تم کچھ دیکھنا چاہتے ہو؟" اس نے کہا ۔"ٹھیک ہے۔"

اس نے کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی ۔ پھر میری طرف مڑ کر بولا ۔"بروٹ ۔ ذرا ادھر کھڑکی کی طرف دیکھو۔"

میں نے اس طرف نگاہ ڈالی ۔ وہ آپ سے آپ کھل رہی تھی ۔ پھر اس کے دونوں پٹ خود بخود......آپ سے آپ ہی بند ہو گئے۔

"اب ذرا ریڈیو (Radio) کی طرف دیکھو ۔" مجھے کناٹ کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

میں نے سر گھما کر ریڈیو کی سمت دیکھا۔ مجھے "کلک" کی آواز سنائی دی۔ اور وہ ریڈیو سیٹ خود بخود آن (ON) ہوتے ہوئے بجنے لگا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیلتے ہوئے سائیڈوں میں جا لگیں۔ مجھے یوں لگا جیسے کناٹ کوئی بہت بڑا جادوگر ہو۔

اس کے بعد ریڈیو دوبارہ "کلک" کی آواز کے ساتھ آف ہو گیا۔

"دیکھتے رہو ریڈیو کی طرف۔" کناٹ کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

میں نے ریڈیو پر نظریں جمائیں رکھیں۔ پھر مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ ریڈیو اپنی جگہ سے یکلخت غائب ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کناٹ سے کچھ کہتا۔ ذرا دیر بعد ہی وہ ریڈیو اسی جگہ موجود تھا۔ دوبارہ نمودار ہوتے ہوئے واپس اپنی جگہ پر آ چکا تھا۔

"میں نے اسے ماؤنٹ ایورسٹ پر پہنچا تھا۔" لارنس کناٹ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ میں نے ریڈیو کا الیکٹرک تار پلگ سے جدا ہوتے ہوئے دیکھا پھر وہ زمین پر گر گیا۔

"اوہ" مجھے کناٹ کی کراہ سنائی دی۔"بس اب مجھ میں دم نہیں رہا۔"

وہ ذرا دیر تک سانسیں درست کرتا رہا۔ پھر بولا ۔"اب میں تمہیں ایک ذرا مشکل اور لطف سا کام دکھاتا ہوں ۔" پھر اس نے ریڈیو کی طرف اشارہ کیا "اب میں اس بغیر تار کے ریڈیو کو چلا کر دکھاؤں گا۔ الیکٹرونکس خود۔" کناٹ نے اپنا منہ بند کیا۔

وہ بڑے غور سے ریڈیو پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔ میں نے اس کے ڈائل کو خود بخود حرکت میں آتے دیکھا۔ پھر اس کے اندر کھڑ کھڑاہٹ ہوئی۔ میں ہونٹوں پر ہونٹ جمائے اپنی جگہ پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں لارنس کناٹ کے عقب میں تھا۔ ٹھیک اس کے سر پر وہ چونکہ ریڈیو کی طرف متوجہ تھا، اس لئے اسے میری موجودگی کے بارے میں علم نہیں ہوا۔ قریبی ٹیبل پر ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ میں نے ایک زبردست خطرہ مول لیا۔ مگر میں ناکام نہیں رہا۔ ریسیور اٹھا کر میں نے سر کے قریب بلند کیا۔ اور زبردست انداز میں اس کی کنپٹی پر دے مارا ریسیور کی ضرب اس کی کنپٹی پر بے حد کاری ثابت ہوئی تھی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی کرب ناک چیخ نکلی تھی۔ اور پھر وہ تیورا کر وہیں فرش پر گر گیا۔ میں نے قدرے طاقت سے دو ضربات اور لگائیں ۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ کافی دیر تک بے ہوش رہے گا۔ میں نے اسے سیدھا کیا اور ریسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا۔

میں نے تمام کمرے کی اچھی طرح تلاشی لی۔ مجھے اپنے کام کی چیز ایک دراز میں سے مل گئی۔ یہ اس کے نوٹ تھے۔ یادداشتیں، ساری معلومات وہ راز...... سب کچھ کس طرح کیا جا سکتا تھا۔ سب کچھ تو تھا سب......

میں نے دوبارہ ریسیور اٹھایا، کناٹ کو ضرب لگانے کے لئے نہیں...... بلکہ فون کرنے کے لئے میں نے نمبر ڈائل کیے اور ریسیور کان سے لگا لیا۔ یہ فون میں نے واشنگٹن پولیس کو کیا تھا۔ فون کرنے کے بعد میں پاس پڑے ہوئے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں پولیس کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر جب مجھے ان کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دیئے۔ تو میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اپنی سروس گن سیدھی کی۔ اور فرش پر پڑے ہوئے کناٹ کے قریب پہنچ گیا۔ وہ اس دوران بے ہوشی کے عالم میں محو تھا۔ میں نے گن کی نال اس کے حلق میں لگا کر ٹریگر دباتے ہوئے فائر کر دیا۔

دھماکے کے ساتھ گن نے جھٹکا کھاتے ہوئے قہقہہ لگایا، کناٹ کا بدن پوری جان سے تڑپ کر یکلخت ساکت ہو گیا......خون کے سرخ سرخ چھینٹے میرے جسم کے ساتھ فرش پر ادھر ادھر برستے چلے گئے تھے۔ مجھے اپنے عقب میں بے شمار قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں ۔ دو گاڑیوں میں غالباً بیس، پچیس پولیس والے آئے ہوں گے۔ تاہم میں وہاں سے آسانی سے بھاگ سکتا تھا۔ مگر میں وہاں سے ایک قدم بھی نہیں ہلا...... کیونکہ میں دوسرا کناٹ نہیں بننا چاہتا تھا...... پھر یکلخت دھماکے کے ساتھ میرے عقب میں دروازہ کھلا......

☆......☆......☆

"دیکھئے۔ میں نے کہا تھا نا کہ لارنس کناٹ کو میں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں ۔ ہم دوست تھے اور مجھے اس پر بے حد اعتبار تھا۔ مگر یہ معاملہ بہت اہم تھا ۔زندگی سے بھی اہم ترین۔

یہ صرف (23 Words) یعنی 23 الفاظ تھے ۔ جن کے ذریعے سب کچھ کیا جا سکتا تھا۔ انہی 23 الفاظ کے ذریعے کناٹ یہ سب کچھ کہہ رہا تھا۔ یہ تمام جادوگری انہی 23 الفاظ کی تھی ۔ جو کوئی بھی پڑھنا جانتا تھا۔ ان 23 الفاظ کو پڑھ کر یہ کام کر سکتا تھا۔ حتیٰ کہ مجرم لوگ، غدار افراد، پاگل، سبھی آدمی...... یہ 23 الفاظ پر مشتمل فارمولا سب ہی استعمال کر سکتے تھے۔

لارنس کناٹ دیانت دار آدمی تھا اور ایک اچھا آئیڈیالسٹ بھی تھا...... مگر ذرا سوچئے......! اگر کسی آدمی کو خدائی مل جائے تو اس کا کیا حال ہو سکتا ہے؟ فرض کریں آپ کو صرف 23 الفاظ بتا دیئے جائیں۔ جن کی مدد سے آپ بینکوں کے سیف توڑ سکیں۔ بند کمروں میں گھس سکیں۔ دیوار کے آر پار جا سکیں...... فرض کریں کہ گولی سے آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچے...... بم آپ کو اڑا نہ سکے۔ یا آپ پلک جھپکتے ہی میں میلوں کا فاصلہ طے کر لیں......؟ تو پھر......؟

کہتے ہیں کہ "طاقت کا نشہ بہت بڑا ہوتا ہے۔" یہ آدمی کو آدمی نہیں رہنے دیتا۔ انسان کو شیطان بنا دیتا ہے ۔ اور پھر اگر مکمل اقتدار مل جائے تو پھر؟ یہ ایسے 23 الفاظ تھے جو مکمل اقتدار تھے۔ جسے چاہیں اور کسی وقت بھی آپ جیل سے نکال سکتے ہیں۔ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ مگر میں کسی کو یہ 23 الفاظ نہیں بتاؤں گا۔ اپنے قارئین کو بھی نہیں...... بے شک لارنس کناٹ میرا دوست تھا۔ مگر میں نے اسے نہایت سرد انداز سے مار ڈالا تھا ۔ مجھے معلوم تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں ۔ سب صرف یہ تھا کہ اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس عظیم راز کے ساتھ اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جو اسے ساری دنیا کا آقا بنا سکتا تھا۔

قارئین...... مجھ پر غصہ مت ہوں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ مرنے کے ساتھ یہ "23 الفاظ" کا عظیم فارمولا میں اپنے سے فنا کرنے جا رہا ہوں ۔ راز کو راز ہی بنا رہا ہوں ۔ کوشش کیجئے کہ یہ 23 الفاظ کا فارمولا کوئی مجھ سے حاصل کر لے اب آپ کے ذہن میں سوال اٹھے گا کہ میں یعنی بروٹ تو مرنے والا ہوں۔ پھر کیسے......؟ چلیے چپکے سے ایک بات ہونٹوں پر لے ہی آتا ہوں۔

However مجھ پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

چندرا دیوی

ایم الیاس

آخری قسط

خوف و ہراس پھیلاتی، ذہن پر سکتہ طاری کرتی، حیرت انگیزی کی دھوم مچاتی، جور و ستم کی بجلی گراتی، کالی شکتیوں میں تھلکہ مچاتی، لھولھان وادی کی پگڈنڈیوں پر دوڑتی بھاگتی، جادوئی کرشمہ سازیاں دکھلاتی، دل و دماغ پر ڈر کا سکہ بٹھاتی، گھٹا ٹوپ اندھیرے میں چنگھاڑتی، ہر پل ہر سو ہیبت ڈھاتی، اپنی نوعیت کی انوکھی کہانی۔

پُرتحیر کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے ذہن سے محو نہ ہونے والی ایک اچھوتی کہانی

چندرا دیوی ہندوستان آ گئی تھی۔ خونی مجسمہ کیفر کردار کو پہنچ چکا تھا۔ تنکا رام کا جنم ختم ہو چکا تھا۔

رندھیر سوامی کو بنگلور سے ممبئی آنے کے بعد بڑی مایوسی اور دل شکستگی ہوئی تھی۔ وہ ہندوستان ہی میں پیدا ہوا تھا۔ ایک عجیب و غریب اتفاق تھا کہ اسے آج تک ممبئی آنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ جب کہ وہ دہلی، ناگ پور، کولکتہ، مدراس، اور ملبار کئی مرتبہ ہو کر آ چکا تھا۔ یوں تو وہ ممبئی شہر کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سن چکا تھا۔ یہ شہر کی توقع کے برخلاف کہیں زیادہ غیر مہذب ثابت ہوا تھا۔ اسے ایسا لگا تھا کہ اس شہر میں آدمی نہیں جانور بستے ہیں۔ یوں لگتا تھا کہ تہذیب انہیں چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ مرد تو مرد لڑکیاں اور عورتیں بھی آزاد خیالی میں بہت خطرناک اور تیز تھیں۔ وہ مردوں کے لئے شکاری ہوتی تھیں۔ اس نے ایک سترہ برس کی لڑکی سے سر عام پوچھا۔

"مس......! کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ...... شیام کمار نوادرات سینٹر کہاں پر واقع ہے......! میں بنگلور سے آیا ہوا ہوں...... بڑی دیر سے اس کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔ اس کا کوئی صحیح پتا نہیں پا رہا ہے۔ میں نے سنا تھا کہ یہ بہت مشہور اور بڑی دکان ہے...... یہاں کا بچہ بچہ جانتا ہے...... بچہ تو کیا بڑے لوگ بھی نہیں جانتے ہیں۔"

"کیا آپ نوادرات خریدنے اتنی دور سے آئے ہیں؟" لڑکی نے جواب میں اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"جی ہاں......" اس نے سر ہلا دیا۔ "میں نوادرات خریدنے اور جمع کرنے کا بہت شوقین بلکہ دل دادہ ہوں...... یہ میری کمزوری ہے۔ اس دکان کا ایک اشتہار چھپا تھا کہ ممی برائے فروخت...... میں وہ ممی خریدنے آیا ہوں۔"

"کوئی ضروری ہے کہ آپ اس کی دکان پر خریدنے والی ممی خریدیں......؟" وہ بولی۔ "آپ کیا صرف ایک ممی میں دلچسپی رکھتے ہیں...... اگر آپ کو میں کوئی اور ممی دکھاؤں تو اسے آپ خریدنا پسند کریں گے؟"

"اس دکان کا مالک مصر سے ایک ممی لایا ہے...... جو سینکڑوں کی بلکہ ہزار برس پرانی ہے......" اس نے کہا۔ "آپ جس ممی کا ذکر کر رہی ہیں کیا وہ مصر سے ممی فروخت کے لئے آئی ہوئی ہے؟"

"جی نہیں......" لڑکی نے سر ہلایا۔ "یہ

ہندوستانی ممی ہے جو ایک ہزار سال قبل جو مصر سے آئے ہوئے ایک جادوگر نے یہاں شادی کی تھی۔ بیوی کے مرنے کے بعد اس کی چتا نہیں جلائی بلکہ اسے ممی بنالیا اور مرتے دم تک اسے ساتھ رکھا۔ اس آبادی کے لوگوں نے اس کی ممی تو دفن کردی لیکن اس جادوگر کی لاش کو ایک پہاڑی پر رکھ دیا۔ گدھوں نے اس کی لاش کھالی۔ دس برس قبل ایک مکان کی زمین کے نیچے تہ خانہ بنانے کے لئے کھودا گیا تو یہ ممی برآمد ہوئی۔ جسے جگدیش آنند نے خرید لیا...... وہ حادثوں میں لاوارث مرنے والوں کی ممی بناتا ہے اور کچھ عرصہ بعد اسے غیر ملکیوں یا آپ جیسے لوگوں کے ہاتھوں فروخت کردیتا ہے۔“

”یہ جگدیش آنند کون ہے......؟“ اس نے حیرت آمیز لہجے میں پوچھا۔ ”نہ میں نے کبھی اس کے متعلق سنا اور نہ ہی ممی کے بارے میں......“

”حیرت کی بات ہے۔“ لڑکی نے پلکیں جھپکائیں۔ ”ہندوستان ٹائمز میں دو برس قبل اس کا انٹرویو شائع ہوا تھا اس ممی کے بارے میں...... میں اس کی سکریٹری ہوں۔ آپ پہلے جگدیش آنند کے ہاں چلیں پھر شیام کمار کے سینٹر سے......“

رندھیر سوامی اس کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوگیا۔ اس نے سوچا کہ پہلے وہ جگدیش آنند کی ممی دیکھے گا...... بعد میں شیام کمار کی...... ان میں جو بہتر حالت اور ارزاں قیمت کی ہوگی خرید لے گا۔ وہ لڑکی اسے لے کر ایک عمارت میں پہنچی۔ اسے زینے پر ٹھہرنے کے لئے کہا کہ وہ دیکھ کر آتی ہے کہ وہ اپنے فلیٹ میں ہے یا نہیں...... کیوں کہ تھوڑی دیر پہلے وہ ڈیوٹی انجام دے کر نکلی ہے۔ شاید اس کا باس نوادرات کی طرح خریداری کے لئے گیا ہوا نہ ہو...... لڑکی اوپر چلی گئی۔ دفتر دوسری منزل پر تھا۔ رندھیر سوامی اس لڑکی کے متعلق سوچے بغیر نہ رہ سکا۔ لڑکی نہایت حسین اور جاذبیت سے بھرپور تھی...... پھر وہ ممی کے بارے میں سوچنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ آئی اور اسے دوسری منزل کے فلیٹ پر لے گئی۔ اس نے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ اندر داخل ہونے کے بعد لڑکی نے دروازہ بند کیا۔ پھر اسے کمرے میں رکھے ہوئے صوفے کی طرف اشارہ کیا اور بیٹھنے کے لئے کہا۔ پھر وہ اس سے بولی۔

”جگدیش آنند صاحب معروف ہیں۔ میں انہیں اطلاع کرتی ہوں۔ آپ انتظار فرمائیں۔“

وہ سامنے والے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ دروازہ بند ہوگیا۔ رندھیر سوامی کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ یہ نشست گاہ تھی۔ اس میں ایک صوفہ سیٹ، ایک تپائی اور چار کرسیاں رکھی تھیں...... ایک دیوار پر مشہور فلمی اداکارہ کی پینٹنگ تھی جس میں وہ نیم عریاں حالت میں تھی۔ جو دل کو برمانے لگی تھی۔ یہ اداکارہ فلموں میں بولڈ کردار ادا کرنے میں مشہور تھی۔ رسوا بھی تھی......

چند لمحوں کے بعد سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا۔ جو لڑکی اسے یہاں لائی تھی۔ وہ باہر آئی۔ اسے دیکھ کر وہ حیرت سے اچھل پڑا۔ اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ وہ بے لباس حالت میں اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ رندھیر سوامی کھڑا ہوگیا۔

”یہ کیا......؟“ جگدیش آنند کہاں ہیں...... ممی کہاں ہے......“

”مردہ ممی میں کیا رکھا ہے......“ لڑکی نے شوخی سے کہا۔ ”اس زندہ ممی کے بارے میں کیا خیال ہے......؟ یہ بھی ایک نوادر ہے۔“

اس نے ایک لمحہ کے لئے لڑکی کو غور سے دیکھا...... اس کے چہرے اور سراپا پر تنقیدی نگاہ ڈالی...... واقعی لڑکی نہایت غضب کی تھی اور کسی نوادر سے کم نہیں تھی۔ اس کی جوانی کی کرشمہ سازیوں نے اس کے سارے بدن میں مستی دوڑا دی۔ جوبن کی گردش تیز ہوگئی۔ یہ کوئی ایسی نوجوان لڑکی نہیں تھی جو اس کی زندگی میں پہلی بار آئی۔ ایسے کئی نوادر آئے تھے۔ وہ یہاں کسی لڑکی یا عورت کے ساتھ وقت گزاری کے لئے نہیں آیا تھا۔ بنگلور شہر میں ایسے نوادرات کی کوئی کمی نہیں...... وہ

سمجھ گیا تھا یہ لڑکی اسے پھانس کر لائی ہے...... جب وہ غلاظت کے دلدل میں دھنستا جارہا ہو تب اس کا کوئی ساتھی بدمعاش آ کر اسے بلیک میل کرے اور بٹوہ چھین کر لاتوں اور گھونسوں سے تواضع کر کے دھکے دے کر نکال دے۔

اس سے پہلے لڑکی اس کے قریب آ کر اس کے گلے میں اپنی عریاں مرمریں اور سڈول باہنیں حمائل کر کے اس کے جذبات میں ہل چل مچا کر خود سپردگی کی حالت میں بستر پر لے جائے وہ برق سرعت سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ باہر سے کنڈی لگائی اور تیزی سے سیڑھیاں اترتا نیچے آ گیا۔ جس وقت وہ دروازے کی کنڈی لگا رہا تھا اس نے لڑکی کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”سریش شکار ہاتھ سے نکل گیا...... باہر سے دروازہ بھی بند کر کے گیا ہے۔“

وہ نیچے آ کر ایک قریبی بازار کی بھیڑ میں گم ہوگیا۔ اب اسے کسی بات کا کوئی ڈر اور خوف نہیں رہا تھا۔ اس لڑکی نے اسے لوٹنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ لیکن اب اسے مزید ہوشیار رہنے کی ضرورت تھی۔ کسی پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا تھا۔

وہ یہاں سیر و تفریح کرنے اور فلمی اداکاروں سے ملنے اور ان کے آٹوگراف لینے نہیں آیا تھا...... اسے غیر معمولی اور نادر اشیاء جمع کرنے کا جنون کی حد تک شوق تھا...... یہ شوق اسے ورثہ میں ملا تھا۔ اس کا باپ بھی دولت مند تھا۔ اور وہ بھی دولت مند تھا۔ باپ نے بے پناہ دولت اور لاکھوں کی جائیداد اور کاروبار چھوڑا تھا...... اس کے باپ نے اپنے گھر میں جو عجائب خانہ مرتے وقت چھوڑا تھا۔ وہ اسے توسیع کرتا جارہا تھا۔ اس کے گھر کے عجائب خانے میں جو جو نوادرات تھیں وہ ہندوستان کے کسی عجائب گھر میں نہیں تھیں۔ اس لئے کہ اس نے بڑی محنت کی...... دور دراز کے سفر کئے...... رقم خرچ کی تھی...... تب کہیں جا کر یہ ایک مثالی عجائب خانہ بنا تھا۔

اس کے عجائب خانہ میں تبت کی برفانی مخلوق کی دس کھوپڑیاں...... نیوگنی کے قبائیلیوں کے بڑے بڑے خوفناک سر...... افریقہ کے آدم خور قبیلوں کے وہ زیورات جو انسانی ہڈیوں سے بنائے گئے تھے۔ ان کے نیزے بھالے...... تیر کمان...... ڈھول...... قدیم مجسمے جو ہندوستان میں ہزاروں سال پہلے بنائے گئے تھے...... اور بھی ان گنت اور غیر معمولی اشیاء سے اس نے سجایا ہوا تھا۔

اس کا یہ عجائب گھر کاروباری مقصد کے لئے نہیں تھا۔ وہ ان اشیاء سے لاکھوں کما سکتا تھا...... یہ صرف اس کی ذاتی تسکین تھی...... اس کے عجائب گھر میں دنیا کی ہر لڑکی کے مجسمے بھی تھے جو فطری حالت میں تھے...... ان پر دھوکا ہوتا تھا کہ یہ سچ مچ کی لڑکیاں ہیں۔ وہ اسے مقفل رکھتا تھا۔ یہ عجائب گھر تہہ خانے میں تھا۔ چوری چکاری کا اندیشہ نہ تھا۔

وہ اکثر راتوں کو ان اشیاء کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ جو اس کے ذاتی تسکین کا باعث تھیں۔ اس کے دو ایک قریبی اور بچپن کے دوستوں نے اس کا عجائب گھر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے صاف انکار کردیا تھا۔ اس نے شادی اس لئے نہیں کی تھی کہ اس کی بیوی جانے کیسی ہو......؟ وہ اس کے شوق اور جنون میں رکاوٹ نہ بن جائے۔ جب کبھی بھی اسے عورت کی طلب ہوتی تو وہ ایک رات کے لئے لے آتا تھا۔

اس نے اپنے نوادرات میں کسی چیز کی جو کمی محسوس کی تھی وہ ممی کی تھی...... وہ مصر کسی وجہ سے جانہ سکا تھا...... وہ اس غیر معمولی شے کو لا کر اپنے عجائب خانے کی زینت بنانا چاہتا تھا۔ جب اس نے اخبارات میں ایک روز اشتہار پڑھا...... ممی برائے فروخت...... وہ اسے خریدنے کی غرض سے ممبئی شہر آ گیا تھا۔

رندھیر اس بازار میں آ کر بہت بری طرح جھنجھلا گیا تھا...... اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ بازار میں جیب کترے گھوم رہے ہیں۔ اس لئے وہ بڑا محتاط تھا۔ سب سے زیادہ وہ تنگ اور پریشان تھا پھیری والوں سے جو

ہاتھوں میں اشیا اٹھائے فروخت کررہے تھے اور ان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے کہ خریداری کرلی جائے...... منع کرنے کے باوجود باز نہیں آتے تھے...... دوسرے بھکاری تھے۔ ان میں نوجوان اور عورتیں...... ہر عمر کی اور ہر صوبے کی...... ساڑی بلاؤز میں ملبوس...... جن کی گود میں بچے نہیں ہوتے تھے وہ کسی نہ کسی طرح بے حجابی کی نمائش کرتیں...... ان میں دو ایک نے پوچھا تھا......

"صاحب جی...... ساتھ چلوں...... خوش کردوں گی۔"

ایک کونے میں بھیڑ بہت کم تھی۔ ایک بھکاری نے آگے بڑھ کر راستہ روک لیا جو اچانک سامنے آ گیا تھا۔ رندھیر کے رکتے ہی اس نے اپنی آنکھ کا ڈھیلا حلقے سے باہر نکال لیا...... اس کی بے جان آنکھ حلقے سے نکل کر گالوں پر لٹکنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی گندی ہتھیلی رندھیر کے سامنے پھیلادی۔

رندھیر کو بھکاری کی اس حرکت پر ترس کے بجائے غصہ آ گیا۔ لیکن وہ کیا کرسکتا تھا۔ اس نے جیب سے ایک سکہ نکال کر بھکاری کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ بھکاری نے سکہ لے کر جیب میں ڈالا اور لٹکی ہوئی آنکھ دوبارہ حلقے میں فٹ کردی۔

رندھیر نے جو پتا نوٹ کیا تھا وہ اس محلے میں تھا۔ ابھی بھی وہ اس محلے کے بازار میں تھا۔ وہ شیام کمار کا پتا پوچھنے ایک دکان کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ایک راہ گیر اس سے بری طرح ٹکرا گیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ گرنے لگا تو اس راہ گیر نے اسے سنبھال لیا۔ پھر معذرت کرکے تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ رندھیر کو ایک دم سے احساس ہوا یہ شخص پاکٹ مار تھا۔ اس نے اپنی جیب خالی محسوس کی۔ وہاں ہاتھ لگایا تو بٹوا غائب تھا۔ اس نے فوراً ہی پلٹ کر، وہ بدمعاش تیزی سے بھیڑ میں سے گزر رہا تھا۔ لباس کی وجہ سے اس کی شناخت ہو رہی تھی۔ بٹوے میں اس کی بڑی رقم تھی۔ وہ واپس جا بھی نہیں سکتا تھا اور نہ ہوٹل میں ٹھہر اور کھا پی سکتا تھا۔ وہ فوراً ہی چیخنے لگا۔

"اس لال قمیض والے کو پکڑو...... میرا بٹوا نکالا ہے...... چور...... چور......"

وہ تیزی سے اس کے تعاقب میں دوڑا۔ لال قمیض والا بھی اسے آتا دیکھ کر اور چور چور کا شور سن کر آگے کی سمت تیزی سے لپکا۔ تیز دوڑنے لگا۔ رندھیر کو بھیڑ چیر کر بھاگ کر اس بدمعاش کو پکڑنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ بدمعاش اور اس کے درمیان فاصلہ بڑھتا جارہا تھا۔ کسی نے بھی اس بدمعاش کو پکڑنے کی کوشش نہیں کی تھی...... کیوں کہ اس کے ہاتھ میں کھلا چاقو نظر آرہا تھا۔

مخالف سمت سے چندرا دیوی آرہی تھی۔ ایک لحظہ میں اس نے تاڑ لیا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ بجلی کی سی سرعت سے اس بدمعاش کی راہ میں حائل ہوگئی اور ہذیانی لہجے میں چیخ کر بولی......"اس کا بٹوا دے دو...... ورنہ اچھا نہیں ہوگا......"

"میں کہتا ہوں میرے سامنے سے ہٹ جاؤ......" وہ دہاڑا۔ "نہیں تو یہ چاقو تمہارے سینے میں اتار دوں گا......"

"نہیں......" چندرا دیوی نے کہا۔ "تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے...... تم نے بٹوا نہیں دیا تو تمہارے ہوش ٹھکانے لگادوں گی۔"

بدمعاش کو غصہ سے زیادہ حیرت ہوئی۔ ایک حسین اور نوجوان عورت کتنی بے خوفی اور دیدہ دلیری سے اس کا راستہ روک کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے دھمکی دے رہی تھی...... وہ اس کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر ذرہ برابر بھی خوف زدہ نہیں تھی۔ اس نے فضا میں چاقو لہراتے ہوئے کہا۔

"یہ فلم کی شوٹنگ نہیں ہو رہی ہے...... میں کہتا ہوں...... ہٹو میرے راستے سے...... ورنہ تمہیں جان سے ماردوں گا۔"

چندرا دیوی ہٹی نہیں...... بڑے سکون واطمینان سے کھڑی رہی...... بدمعاش کسی قیمت پر بٹوا واپس دینا نہیں چاہتا تھا۔ یہ پھولا ہوا عام بٹوؤں سے قدرے بڑا تھا بے حد پھولا ہوا...... وزن سے اس نے اندازہ کرلیا

تھا کہ اس میں ہزاروں کی رقم ہے۔ اس نے فضا میں چاقو والا ہاتھ بلند کیا تاکہ اس کے سینے میں بھونک دے۔ جیسے ہی وہ چندرا دیوی پر حملہ آور ہوا چندرا دیوی نے جھکائی دے کر چاقو والے ہاتھ کی کلائی بڑی پھرتی سے پکڑ لی اور اس کا ہاتھ مروڑ کر اس کی کمر پر لے گئی۔ بدمعاش دنگ رہ گیا۔ وہ کوئی دبلا پتلا یا کمزور نہ تھا۔ جب کہ وہ عورت نازک اندام سی تھی۔ اس کے ہاتھ کی گرفت کلائی پر اس قدر مضبوط تھی کہ وہ چھڑا نہ سکا۔ چندرا دیوی نے اس کی کمر پر گھٹنے سے ایک زوردار ضرب لگائی تو اس کی چوٹ اتنی شدید تھی کہ وہ چیخنے اور کراہنے لگا۔

پھر بھی اس نے چاقو نہیں پھینکا...... چندرا دیوی نے اس سے کہا کہ "چاقو اور بٹوا جیب سے نکال کر پھینک دو......" اس نے بٹوا بھی نہیں پھینکا۔ وہ اس موقع کی تاک میں تھا کہ چندرا دیوی کے چاقو گھونپ دے...... جب اس نے چاقو پھینکا نہ بٹوا پھینکا تو چندرا دیوی نے نہ صرف اس کی کلائی کبوتر کی گردن کی طرح مروڑ دی بلکہ کلائی توڑ کر...... اس کی کمر پر دو تین بار گھٹنے کی ضربیں لگا کر ایک طرف زور سے دھکا دے کر پھینک دیا۔ نہ صرف اس کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ گیا بلکہ پتلون کی جیب سے بٹوا بھی نکل کر گر پڑا۔ رندھیر نے لپک کر بٹوا اٹھالیا۔

وہ بدمعاش دوسرے ہاتھ سے ٹوٹی کلائی پکڑ کر اور تکلیف سے زمین پر ماہئی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ اس کی دل خراش کراہیں فضا میں گونجنے لگیں۔ یہ تماشا دیکھنے کے لئے ایک بھیڑ جمع ہوگئی تھی۔ وہ لوگ حیرت سے...... بھونچکا ہو کر ایک مرد کو عورت کے ہاتھوں سے پٹتا دیکھ رہے تھے...... وہاں جو لڑکیاں اور عورتیں جمع ہوگئی تھیں اس بدمعاش کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں اور چندرا دیوی سے کہہ رہی تھیں......

"اس حرام زادے کو ایسی مار مارو کہ کبھی یہ کسی عورت یا لڑکی کا پرس چھین کر بھاگ نہ سکے......" ایک عورت نے غصے سے کہا۔ "یہ میرا پرس ایک مرتبہ چھین کر بھاگا تھا...... جس میں پانچ سو روپے تھے۔ تھانے میں رپورٹ درج کرائی تو کمینہ، ذلیل، سور انسپکٹر کہنے لگا۔ "ہم پرکاش پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے اور نہ تمہاری ایف آئی آر کاٹیں گے......"

"بہن...... اسے اتنا مارو...... اتنا مارو کہ مر جائے...... ایک روز اس نے چھرا دکھا کر میرے دو کڑے اتار لئے تھے۔ پولیس اس سے بھتہ لیتی ہے۔ اس لئے اس کے خلاف کوئی شکایت درج نہیں کی جاتی ہے۔" دوسری عورت نے کہا۔

"میرا بٹوا بھی اس نے جیب سے نکالا جس میں میری تنخواہ تھی۔" اس شخص نے آگے بڑھ کر اس بدمعاش کی پسلی پر ایک زوردار لات رسید کی تو وہ بلبلا اٹھا...... میں بھی رپورٹ کرنے گیا تو تھانے دار بولا۔ "جانتے نہیں ہو یہ کون ہے...... یہ تمہارا باپ ہے۔"

ایک چالیس برس کا شخص بھیڑ میں سے نکل کر آیا۔ بدمعاش کے منہ پر تھوکتے ہوئے بولا۔

"یہ بس میں میری جیب کاٹ رہا تھا تو میں نے اسے پکڑ لیا۔ ہم دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔ زخمی بھی ہوگئے...... اس نے مجھے بری طرح زخمی کیا تھا اور میرے دو دانت بھی توڑ دیئے تھے...... جب ہم تھانے پہنچے تو الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے...... اس نے تھانے دار سے میری شکایت کی تھی میں نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا...... میں مرتے مرتے بچا...... پھر مجھے حوالات میں بند کرایا گیا اور دس ہزار روپے رشوت دینے پر رہائی ملی تھی۔"

پھر اس بدمعاش پر لاتوں اور مکوں کی بارش کردی...... چندرا دیوی نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ صرف اتنا کہا۔

"میں نے اس کی کلائی توڑ دی ہے...... اب یہ نہ تو کسی کی جیب کاٹ سکتا ہے اور نہ ہی پرس چھین کر بھاگ سکتا ہے...... چندرا دیوی نے کہا۔ "اب یہ کسی سرکاری اسپتال میں چار پانچ مہینے سے پہلے ڈسچارج نہیں ہوگا......"

"اب سب یہاں سے چل دو......" ایک شخص نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "کوئی سپاہی یا پولیس کی گشتی گاڑی آ گئی تو مصیبت کھڑی ہو جائے گی...... اسے اچھی سزا مل گئی ہے......شریمتی جی آپ نے جو کام دکھایا ہم دل میں عشق عشق کررہے ہیں...... آپ تو بڑی بہادر اور دلیر نکلیں......"

اس شخص کی بات سن کر مجمع بادلوں کی طرح چھٹ گیا...... رندھیر...... چندرا دیوی کے ساتھ ہولیا...... وہ تھوڑی دور جا کر بولا...... "آپ نے بڑا زبردست کارنامہ انجام دیا...... اور آپ کے کارن مجھے بڑا مل گیا۔ ورنہ میں تو کہیں کا نہیں رہتا...... یہاں میرا کوئی جاننے والا نہیں جو مجھے دس روپے بھی قرض دے سکے...... میں ایک مسافر ہوں؟" پھر اس نے رک کر کہا۔ "آپ کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھول سکتا۔"

"آپ کہاں سے آئے ہیں......؟" چندرا دیوی نے پوچھا۔ "کیا فلمی دنیا میں قسمت آزمائی کرنے آئے ہیں......؟"

"بنگلور سے آیا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "مجھے فلموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"پھر آپ کس لئے ممبئی آئے......؟" چندرا دیوی نے سوال کیا۔ "کیا سیر و تفریح کی غرض سے......؟"

"میں نوادرات کی خریداری کرنے آیا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نوادرات جمع کرنے کا شوقین ہوں۔"

"بنگلور اور میسور شہر میں نوادرات کی کیا کمی ہے جو اس کی خریداری کے لئے یہاں آئے...... کیا خاص نوادرات ہیں؟"

"جی ہاں......" رندھیر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "شیام کمار کے پاس ایک فراعنہ مصر کی ممی ہے جو وہ مصر سے لایا ہے اور اسے فروخت کرنا چاہتا ہے...... اس نے اخبارات میں ممی برائے فروخت کا اشتہار ہندوستان ٹائمز میں دیا تھا۔ اس کی نوادرات کی دکان ہے۔ اس کا پتا میں کوئی ایک گھنٹے سے تلاش کررہا ہوں۔ کوئی صحیح پتا نہیں پارہا ہے...... کیا آپ میری رہنمائی کرسکتی ہیں......"

رندھیر نے جیب سے کاغذ کی ایک چٹ نکال کر چندرا دیوی کی طرف بڑھائی جس پر شیام کمار کا پتا لکھا ہوا تھا۔

"دیکھئے مسٹر......!" چندرا دیوی نے اس کے ہاتھ سے چٹ لیتے ہوئے کہا۔ "یہ ممبئی شہر ہے۔ یہاں ایک سے ایک ٹھگ، جعل ساز، دھوکے باز اور لٹیرے بیٹھے ہیں۔ کوئی بھروسے کے قابل نہیں۔ اس کے علاوہ بدمعاش اور پاکٹ مار اور غنڈے بھی ہیں...... ابھی آپ لوگوں کی زبانی اس بدمعاش کے متعلق مرد اور عورتوں کی گفتگو سن چکے ہیں۔ میں آپ کو پتا بتائے دیتی ہوں۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ پھونک پھونک کر قدم رکھیں...... یہ ایک اتفاق تھا جو میں ادھر آ نکلی۔ اگر میں جوڈو کراٹے کی ماہر نہ ہوتی تو آپ کا بٹوا گیا تھا۔"

"آپ تو میرے لئے فرشتہ بن کر آئیں...... میں ساری زندگی آپ کے لئے پرارتھنا کرتا رہوں گا اور آپ کے مشورے پر عمل کروں گا......" وہ ممنونیت سے بولا۔ "کاش! میں آپ کی اس دیا کا کوئی صلہ دے سکتا۔"

"اچھا آیئے......" چندرا دیوی بولی۔ "میں نے آپ کو انسانیت کے لئے بچایا۔ آپ کی پرارتھنا میرے لئے بڑی دیا ہوگی۔"

چندرا دیوی نے گلی کے ایک نکڑ پر کھڑے ہو کر ایک گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی سو قدم چلنے کے بعد ایک بنگلہ نما لال رنگ کا مکان ہے۔ اس کے دروازے کی پیشانی پر ایک تختی لگی ہوئی ہے۔ جس پر جلی حروف سے لکھا ہوا ہے...... شیام کمار نوادرات سینٹر...... اچھا اب اجازت دیں۔"

رندھیر، چندرا دیوی کا شکریہ ادا کر کے اس گلی کی طرف بڑھ گیا۔ گلی تاریک تھی اور دونوں طرف کئی منزلہ

یم عمارتیں تھیں جن کے رنگ و روغن بارشوں کی نذر گئے تھے اور اب وہ برہنہ حالت میں تھیں۔ ان کے سایوں نے گلی کو وحشت ناک بنا دیا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ یہ عمارتیں بھوکی عفریت ہیں جو اس کو لنے کے لئے منہ پھاڑے گھور رہی ہیں...... اسے ایک جانا خوف سا محسوس ہونے لگا...... وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں نڈے بدمعاش اسے گھیر نہ لیں اور چاقو کے زور پر اس بٹوا لے کر بھاگ جائیں...... ایک بات اس کی سمجھ بالاتر تھی کہ شیام کمار نے اپنی نوادرات کی دکان اس گلی میں کیوں کھولی ہے...... اس کی دکان کو کسی بازار یا ہوٹل کی دکان ہونا چاہئے تھا تاکہ غیر ملکی و ملکی سیاح ریداری کے لئے آ سکیں۔ یہ تو بھوت گلی لگتی تھی۔ اس سے جیسے کوئی نادیدہ آواز کہہ رہی تھی...... لوٹ جاؤ...... بھاگ جاؤ...... ورنہ تمہیں موت کی نیند سلا دیا جائے گا...... پھر اس کے کانوں میں بے ہنگ، بھونڈے اور ڈراؤناک قہقہے گونجنے لگے...... پھر وہ استہزانہ ہنسی بن گئے...... لیکن وہ ممی کے حصول کے لئے اتنا بے قرار تھا کہ دہشت زدہ ہونے کے باوجود آگے بڑھتا گیا۔

چند قدموں کی مسافت طے کرنے کے بعد وہ مکان آ گیا جس کے دروازے کی پیشانی پر شیام کمار سینٹر کی تختی لگی تھی۔ دروازے پر پہنچ کر اس یک دل میں ڈر اور خوف دامن گیر تھا وہ دم توڑ گیا۔ دروازے پر لائن کی تختی جھول رہی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر گھسا تو ایک عجیب سی رچی بسی بو نے اس کا سواگت کیا۔ وہ نوادرات کی دکان نہیں بلکہ کسی پنساری کی دکان دکھائی دی۔ کیوں کہ اس میں مرتبان اور ٹاٹ کی بوریاں رکھی تھیں۔ ان میں سے جڑی بوٹیاں جھانک رہی تھیں۔

وہ صحن میں کھڑا ہوا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا کرے...... کیوں اسے کوئی دکھائی نہیں دیا...... دوسرے لمحے سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا۔ اس میں سے ایک دراز قد شخص باہر آیا۔ اس کی جسامت گینڈا نما تھی۔ وضع قطع اور چہرے مہرے سے وہ دکان دار نہیں بدمعاش قسم کا لگا۔ لیکن جب اس نے رندھیر کو مخاطب کیا تو اس کے لہجے میں بڑی نرمی اور شائستگی تھی۔ اس شخص نے رندھیر کو دیکھ کر اندازہ کرلیا تھا کہ وہ مقامی نہیں بلکہ جنوبی ہند کا باشندہ ہے۔ اس نے رندھیر کو نمستے کرنے کے بعد بڑے مہذب اور مودبانہ لہجے میں کہا۔

"خوش آمدید جناب......! میں آپ کی کیا سیوا کرسکتا ہوں؟"

"میں نے فراعنہ مصر کی ممی برائے فروخت کا اشتہار اخبار میں دیکھا تھا......" رندھیر نے کہا۔ "میں اسے خریدنے کے لئے بنگلور سے یہاں آیا ہوں...... کیا میں اسے خرید سکتا ہوں......؟"

"کیوں نہیں...... کیوں نہیں......" وہ خالص کاروباری لہجے میں کہنے لگا۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ جیب میں رقم ہو تو دنیا کی ہر شے خریدی جاسکتی ہے۔ پیسے میں بڑی طاقت اور جادو ہے...... کسی کی بیوی بھی خرید سکتے ہیں......" وہ بولا۔

"میں ممی خریدنے آیا ہوں...... ممی موجود ہے یا فروخت ہوگئی ہے؟" رندھیر نے پوچھا۔

"تم کس لئے ممی خریدنا چاہتے ہو......؟" اس نے سوال کیا۔ "کیا تم بنگلور کے عجائب گھر سے تعلق تو نہیں رکھتے جو ممی خریدنے آئے ہو؟"

"دراصل بات یہ ہے کہ مجھے اپنے عجائب گھر کے لئے ممی چاہئے۔" رندھیر نے اس انداز میں سرگوشی کی جیسے وہ منشیات کا سودا کررہا ہو۔

"ہاں مل جائے گی......" اس نے کہا۔ "لیکن میں اس کی قیمت ڈالر، پونڈ یا یورو میں لوں گا۔ ہندوستانی کرنسی میں نہیں۔"

"میں امریکی ڈالر بھی لایا ہوں...... آپ جس ملک کی کرنسی میں کہیں اس کی قیمت دوں گا۔"

"قیمت کے بارے میں کیا خیال ہے......؟" شیام کمار نے کہا۔ "آپ کو کچھ اندازہ ہے......؟"

"جی نہیں...... مجھے قیمت کے بارے میں اس لئے کوئی اندازہ نہیں ہے کیوں کہ میں پہلی بار کوئی ممی خرید رہا ہوں۔" رندھیر بولا۔ "بہرحال اس کی کوئی

مناسب قیمت ہونا چاہئے...... لیکن آپ ایک بات یاد رکھیں...... مجھ سے کوئی دھوکا بازی نہیں چلے گی۔ کیوں کہ مصر میں جو ممیاں فروخت ہوتی ہیں۔ ان کے متعلق مجھے خاصا علم ہے...... دوسری بات یہ ہے کہ میں نوادرات خریدتا رہتا ہوں۔ اس لئے اس بات کو آپ پیش نظر رکھیں۔ میری دلچسپی کو کمزوری نہ سمجھیں۔"

"دھوکے بازی اور کسی قسم کے فراڈ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔" شیام کمار نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ "لیکن آپ یہ بات جانتے ہوں گے کہ آج کے دور میں ممی ایک نایاب چیز ہے...... میں نے خود مصر جا کر اسے خریدا ہے...... اکثر فرعنہ کے مقبروں سے ممیاں چرالی گئی ہیں۔ میں اسے کس مشکل سے لایا ہوں۔ کیا کیا پاپڑ بیلے ہیں یہ آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔"

"کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ ممی فروخت ہوگئی ہو؟" رندھیر نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"نہیں......" شیام کمار نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "میرے پاس رکھی ہوئی ہے۔"

"حیرت کی بات ہے کہ اس قدر نایاب ممی فروخت نہیں ہوئی اب تک...... جب کہ اس کی اشتہار بازی بھی کر چکے ہیں۔"

"یوں تو اس کے بہت سارے خریدار آئے تھے ان سے سودا طے نہ ہو سکا۔" شیام کمار نے جواب دیا۔

"وہ کس لئے......؟" رندھیر بولا۔ "کیا آپ نے اس کی بہت زیادہ قیمت لگائی تھی......؟"

"اس لئے کہ وہ اسے کوڑیوں کے مول خریدنا چاہتے تھے۔" شیام کمار نے کہا۔ "یوں بھی میں نے اس کی بڑی مناسب قیمت رکھی ہے۔"

"میں سودا کرنے سے پہلے ایک نظر ممی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔" رندھیر نے کہا۔ "آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں......؟"

"اس میں اعتراض کی کیا بات ہے؟" شیام کمار کہنے لگا۔ "یہ ایک اصولی اور کاروباری طریقہ ہے...... مال دیکھے بغیر سودا کیسے ہو سکتا ہے۔ میں خود چاہتا ہوں کہ اسے آپ ایک نظر دیکھ لیں۔"

شیام کمار نے اپنی بات ختم کر کے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا...... اور پھر وہ عقبی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس دروازے پر ایک دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ دونوں ایک تنگ سی راہ داری سے ہوتے ہوئے ایک بڑے سے کمرے میں پہنچ گئے۔ اس کی دیوار کے سہارے چھ تابوت رکھے تھے۔ رندھیر نے حیرت سے کہا۔

"یہاں تو چھ تابوت رکھے ہیں...... کیا ان میں ممیاں رکھی ہوئی ہیں؟" آپ نے تو صرف ایک ممی کا بتایا تھا۔

"میں تابوت بھی فروخت کرتا ہوں۔" شیام کمار نے جواب دیا۔ "صرف ایک تابوت میں ممی موجود ہے۔"

پھر وہ ایک تابوت کی طرف بڑھا۔ اس نے سب سے پہلے رکھے تابوت کا ڈھکن اٹھایا اور پلٹ کر رندھیر سے بولا۔

"اس ممی کو اچھی طرح سے دیکھ لیں...... لیکن اسے ہاتھ مت لگانا۔ یہ بے حد نرم و نازک ہے۔ اسے بڑی احتیاط سے دیکھنا ہے۔"

رندھیر دھڑکتے دل سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ جیسے ہی اس کی نگاہ ممی پر پڑی تو اس کے دل کی دھڑکن اور تیز ہوگئی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ دل سینہ شق کر کے نکل آئے گا۔ وہ بے حد جذباتی سا ہو گیا تھا۔ وہ مبہوت سا ہو کر خواب ناک نظروں سے ممی کو دیکھنے لگا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ وہ کوئی ممی دیکھ رہا ہے......؟ وہ صرف سپنوں میں ممی دیکھتا تھا۔ لیکن آج اس کا سپنا حقیقت بن گیا تھا۔ وہ خود پر بدقت تمام قابو پاتے ہوئے تابوت کے اور قریب ہو گیا...... کپڑوں کی دھجیوں میں لپٹی ہوئی ممی کا جائزہ لینے لگا...... ممی جس کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی جگہ جگہ سے پیلا پڑ چکا تھا...... بعض جگہ تو کپڑے کا رنگ سیاہ دکھائی دے رہا تھا۔

اگر اسے یوں ہی کھلا چھوڑ دیا جائے تو ہوا سے سب کچھ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گا۔" شیام کمار نے اس کی پشت پر کھڑے ہو کر کہا اور پھر اسے جیسے چھوڑ دیا۔ "اس لئے بہتر یہ ہوگا کہ اسے کسی کیس میں رکھا جائے...... ہلانے یا جھلانے سے پرہیز کیا جائے۔ کیوں کہ یہ صدیوں پرانی ہے۔ مجھے بڑی احتیاط سے اسے لانا پڑا...... میں اگر احتیاط نہ کرتا تو یہ خاک کا ڈھیر ہوتی۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں......" رندھیر نے سر ہلا دیا۔ لیکن اس کی ساری توجہ ممی پر مرکوز تھی۔ اس کی آنکھوں میں تجسس کی چمک پیدا ہوئی۔ وہ سر سے پیر تک ممی کا پرشوق نظروں سے جائزہ لیتا جا رہا تھا...... پھر اس نے چشم تصور میں ممی کو اپنے عجائب گھر میں دیکھا۔ جہاں اس کے عجائب گھر میں ایک انمول، نایاب اور بے حد قیمتی نوادر کا اضافہ ہو گیا تھا...... اب اس کے عجائب گھر میں کسی نوادر کی کمی نہیں رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ اب وہ اکثر راتوں کو تنہائی میں اس کا نظارہ کرے گا۔ وہ ممی کو اس طرح غور سے دیکھا کرے گا جیسے اس وقت دیکھ رہا تھا۔ اس نے خود کو مصر کے ماضی میں محسوس کیا۔ وہ کھو سا گیا تھا۔

لیکن یہ کیا......؟ رندھیر نے چونک کر سوچا...... اس کی نگاہ ممی کے بائیں ہاتھ پر جم کر رہ گئی...... ممی کے دونوں ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے تھے۔ بایاں ہاتھ دائیں ہاتھ کے اوپر تھا...... بائیں ہاتھ کا کپڑا ہتھیلی کے مقام پر سے ہٹا ہوا تھا اور انگشتری والی انگلی کے مقام پر ہلکا سا ابھار دکھائی دے رہا تھا...... رندھیر نے پلٹ کر شیام کمار کی جانب دیکھا۔ وہ پرسکون انداز میں اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ پھر رندھیر کے چہرے پر چھائی پریشانی کو بھانپتے ہوئے بولا۔

"تم شاید تنہائی کے خواہش مند ہو تا کہ اسے غور سے دیکھو۔"

"جی ہاں...... جی ہاں...... اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو......" رندھیر نے جواب دیا۔

"بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے......" شیام کمار نے جواب دیا۔ "میں اپنے گاہک کو اچھی طرح سے اطمینان کر لینے کا موقع دیتا ہوں۔ آپ جتنا وقت چاہیں لے لیں......؟" اتنا کہہ کر وہ تیزی سے دروازے کی جانب چل دیا۔

جب رندھیر تنہا رہ گیا تو وہ سوچنے لگا کہ......

یقیناً اس پر قسمت کی دیوی مہربان ہو رہی ہے...... وہ ابھار یقیناً کسی انگوٹھا کا تھا...... وہ انگوٹھی سونے کی اور جواہرات سے مزین بھی ہو سکتی ہے اور صدیوں قبل کی انگوٹھی خود اپنی جگہ ایک نادر شے کی حیثیت رکھتی ہے...... اگر اس دکان کے مالک کو ممی کی انگلی میں موجود انگوٹھی کا علم ہو گیا تو وہ اس کی قیمت کہیں سے کہیں لگا دے گا...... لیکن اگر وہ دکان کے مالک کے علم میں لائے بغیر یہ ممی خرید لے تو سودا مہنگا نہیں پڑے گا...... اسے انگوٹھی بازار میں فروخت سے لاکھ دو لاکھ مل سکتے ہیں...... لیکن اسے اس کی ضرورت ہی کیا ہے......؟ وہ اس انگوٹھی اور ممی کو عجائب گھر کی زینت بنا دے گا جو اس کی آتما کی شانتی کا سبب بنے گی۔

اس نے دروازے کی طرف گھوم کر مالک دکان نے دروازہ ٹھیک سے بند کیا ہے یا نہیں......؟ جھری میں سے اس کی حرکات و سکنات نہ دیکھ رہا ہو۔ لیکن نہ صرف دروازہ ٹھیک سے بند تھا بلکہ کھڑکیاں بھی...... کھڑکیوں پر گہرے رنگ کے پردے پڑے تھے لہٰذا کمرے کا منظر آنے سے رہا تھا۔ اس نے اچھی طرح سے اپنا اطمینان کرنے کے بعد اس جگہ کو چھوا۔ جہاں ابھار دکھائی دے رہا تھا۔ ابھار خاصا سخت تھا...... البتہ اس مقام پر جہاں کپڑا ہٹا ہوا تھا ہلکی سی چمک بدستور دکھائی دے رہی تھی...... لیکن اس کا دل مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے محتاط انداز میں انگلی کے مقام پر سے کپڑے کو کھرچنا شروع کر دیا۔ چند لمحوں کے بعد انگوٹھی اس کی نظروں کے سامنے تھی اور اپنی آب و تاب دکھا رہی تھی۔ اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ وہ انگوٹھی کا جائزہ لینے کے لئے مزید آگے کی جانب جھکا۔

”لیکن یہ کیا......؟“ وہ چونک پڑا۔ ”نہیں...... نہیں...... ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا......؟“ وہ بڑبڑایا۔ ”لیکن حقیقت اس کے سامنے تھی...... وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہا تھا...... وہ انگوٹھی ہی تھی...... لیکن رندھیر کی نگاہیں ان الفاظ پر جمی ہوئی تھیں جو انگوٹھی کی چوڑی سطح پر جمی ہوئی تھی جس پر کندہ تھے۔ سروپا مدراس یونیورسٹی......“

رندھیر آنکھیں پھاڑے حیرت سے ان الفاظ کو گھورتا رہا۔ پھر اچانک اسے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ تیزی سے پلٹا...... اس کی نگاہوں نے شیام کمار کا ہاتھ بلند ہوتے اور چھوٹے دستے کی کلہاڑی برق رفتاری سے آتے دیکھا...... لیکن اچانک شیام کمار کا کلہاڑی والا ہاتھ فضا میں معلق ہوکر منجمد ہوگیا...... اس نے پوری طاقت صرف کردی کہ اس کلہاڑی سے رندھیر کا سر پھاڑ دے۔ لیکن صرف اس کا ہاتھ ہی نہیں بلکہ اس کا سارا جسم ساکت و جامد ہوگیا۔ اس میں ہلنا تو درکنار حرکت کرنے کی جنبش تک نہ رہی۔

”شیام کمار...... اب تمہارا کھیل ختم......“ ایک شیریں نسوانی آواز فضا میں گونجی۔

رندھیر نے چونک کر چندرا دیوی کی طرف دیکھا۔ اس کی حیرت دو چند ہوگئی۔ اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ اس کی محسنہ کھڑی تھی۔ جس نے کچھ دیر پہلے اس کا پرس غنڈے کی مرمت کرکے اس سے لے کر دیا تھا...... اب اس کی جان بچائی تھی۔ وہ نہ آتی تو موت کی بھینٹ چڑھ چکا ہوتا۔

شیام کمار خوف اور دہشت بھری نظروں سے اس عورت کو دیکھ رہا تھا جس نے اسے ساکت و جامد کردیا تھا...... رندھیر نے سوچا...... کیا یہ عورت ہپناٹائز کی ماہر ہے......“ پھر رندھیر نے بڑی ممنونیت سے کہا۔

”آپ دیوی ہیں...... دیوی ہیں...... یہ آپ کا دوسرا احسان ہے جو آپ نے مجھ پر کیا...... آپ کو کیوں کر علم ہوا کہ یہ مجھے قتل کرے گا...... جو بروقت پہنچ گئیں...... مجھے ایک نئی زندگی دی......؟“

”یہ شیام کمار شیطان کے نام سے مشہور ہے...... اس شہر کے نامی گرامی غنڈوں میں شمار کیا جاتا ہے...... رہزن ہے...... لٹیرا ہے۔ ممی کے بہانے لوگوں کو لوٹنے کا پروگرام بنایا...... آپ پہلا شکار تھے۔ جب آپ نے شیام کمار کا پتا پوچھا تو مجھے شک ہوگیا...... میں آپ کے پیچھے چلی آئی تاکہ ممکنہ خطرے سے بچاؤں...... میرا خیال تو یہ تھا کہ یہ کسی بہانے آپ سے رقم چھین لے گا...... لیکن یہاں آکر معلوم ہوا کہ اس کا کیا منصوبہ ہے...... یہ آپ کو قتل کرکے دوسری ممی بنانا چاہتا تھا...... یہ جو ممی ہے یہ ایک عورت کی ہے۔ لاوارث عورت...... مردہ خانہ سے لے آیا تھا۔ دوسرے کمرے میں ایک حوض بنا ہوا ہے...... آپ کو قتل کرنے کے بعد کیمیائی محلولوں کی بھاپ سے آپ کو غسل دیا جاتا...... جب غسل کا مرحلہ مکمل ہوجاتا تو اس کا آدمی جو اندر موجود ہے وہ آگے بڑھ کر ایک بڑے سے ہک کی مدد سے آپ کی لاش کو حوض سے گھسیٹ کر ایک بڑے سے صلیب پر لٹا دیتا...... اس کا ساتھی جو لنگڑا ہے ایسے کاموں میں ماہر ہے...... اس نے یہ مہارت سائنس کے پروفیسر کی لیبارٹری میں حاصل کی جو جانوروں پر تجربات کرتا تھا...... پھر وہ الماری میں سے دھجیوں کا گولہ نکالتا...... اور لاش کی گرد لپیٹنے کے لئے صلیب کے نزدیک پہنچ جاتا...... وہ دھجیوں کو لپیٹنے کا آغاز ہی کرتا شیام کمار کمرے میں داخل ہوتا...... لنگڑا فوراً اپنے ہاتھ روک لیتا جو تذبذب کا شکار رہا تھا۔

شیام کمار اسے کہتا...... ”مجھے امید ہے کہ تم نے اس کا اچھی طرح سے معائنہ کرلیا ہوگا......؟“ وہ لاش کی طرف اشارہ کرتا۔ ”کوئی انگوٹھی یا گھڑی وغیرہ باقی رہنا نہیں چاہئے...... مجھے امید ہے کہ تم ہر کام اچھی طرح سے آنکھیں کھول کر کیا کرو گے...... تمہیں یاد ہے جب میں ایک شخص کو اغوا کرکے لایا تھا اس کی گھڑی کلائی سے اتارنا بھول گئے تھے۔ اس لئے تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ ممی کا یہ نیا کاروبار ہے...... اسے کامیابی سے جاری رکھنا ہے تو ہر طریقے سے محتاط رہنا ہوگا...... اگر ہم نے احمقانہ قسم کی غلطیاں کیں اور جاری رہیں تو پھر سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا...... کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں اور پھر یہ کاروبار بند کرنا پڑے گا۔ گاہک آنا بند ہوجائیں گے......“ اس کا نوکر پوچھتا کہ ہم ممیاں کئی لوگوں کی بنائیں گے......؟ اگر اس شخص پر میں کڑی نگاہ نہ رکھتا تو میری توجہ بھی اس ابھار اور انگوٹھی پر نہیں پڑتی...... اگر میں اسے بروقت اس شخص سے نہ نمٹتا تو معاملہ پولیس تک چلا جاتا...... مردہ خانوں سے حاصل کی ہوئیں لاوارث لاشوں کی ممیاں بنانا اتنا سنگین جرم نہیں جتنا کہ اپنے گاہکوں کی ممیاں بنانا...... تم میری بات سمجھ رہے ہونا......“

”بدقسمتی سے شیام کمار کو یہ سب کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا۔“ چندرا دیوی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

چندرا دیوی مزید کچھ کہنے والی تھی کہ اندر سے شیام کمار کا لنگڑا ملازم جو دوسرے کمرے میں کھڑا ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ ایک چھرا لے کر آیا...... تاکہ چندرا دیوی کے سینے میں اتار دے...... چندرا دیوی نے اسے بھی ساکت و جامد کردیا۔

”یہ جو ممی ہے کیا یہ اس طرح بنائی گئی ہے جس طرح آپ نے بتائی ہے......؟“ رندھیر نے پوچھا۔

”ہاں......“ چندرا دیوی نے جواب دیا۔ ”وہ غریب اسی طرح سے نشانہ بنا ہے جس طرح میں نے بتایا ہے۔“

”لیکن آپ نے یہ سب کچھ کیسے اور کیوں کر معلوم کرلیا......“ رندھیر نے ششدر ہوکر پوچھا۔

”میں ٹیلی پیتھی جانتی ہوں...... میں نے شیام کمار کا ذہن پڑھ لیا تھا۔“ چندرا دیوی نے جواب دیا۔

”اب آپ ان دونوں کے خلاف کیا کارروائی کریں گی......؟“ رندھیر بولا۔

”میں پولیس کو باخبر کردوں گی......“ چندرا دیوی بولی۔ ”وہ ایک گھنٹے کے اندر آکر چھاپہ مارے گی...... قانون انہیں کیفر کردار تک پہنچا دے گا۔“

☆......☆......☆

چندرا دیوی نے آج پروگرام بنایا تھا کہ وہ سہ پہر کے وقت اپنی سہیلی اوشا کے ہاں جاکر وہاں سے اس کے ساتھ جوہو کے ساحل پر جائے گی۔ جون کا مہینہ تھا۔ سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ تفریح بھی ہوجائے گی۔ اوشا اسے بہت دنوں سے یاد کررہی تھی۔ اس وقت وہ ریلوے اسٹیشن پر اپنی ایک سہیلی کرن کو رخصت کرنے آئی تھی جو اپنے میکے جارہی تھی۔ گاڑی کی روانگی کے بعد جب وہ باہر جانے کے لئے بڑھی تو اسے ایک نسوانی آواز نے مخاطب کیا۔

”شریمتی جی......! کیا آپ میری بات سننا پسند کریں گی......؟“

اس آواز میں اپنائیت اور شناسائی کا انداز تھا لیکن چندرا دیوی کے لئے اس کی آواز میں نامانوسیت تھی۔

چندرا دیوی نے پلٹ کر دیکھا۔ جس عورت نے اسے مخاطب کیا تھا وہ اس کے لئے اجنبی تھی۔ پہلی بار وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ عورت اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے کسی اچھے گھرانے کی لگ رہی تھی۔ وہ شادی شدہ لگ رہی تھی۔ اس کے گلے میں منگل سوتر پڑا ہوا تھا۔ نہایت حسین، دلکش...... تناسب چھریرے بدن کی تھی۔ چہرے کے نقوش میں جو تیکھا پن تھا وہ دل کو چھو لینے والا تھا۔ آنکھیں بہت بڑی بڑی بھونرا جیسی کالی کالی تھیں اس کی گہرائیاں اتھاہ سمندر کی مانند تھیں۔

چندرا دیوی اس سے مسحور ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ چندرا دیوی نے محسوس کیا کہ وہ ہراساں اور پریشان سی ہے۔ لمبے سفر کی تھکاوٹ اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ میں چھوٹا سا اٹیچی اٹھا رکھا تھا۔ جس میں چند جوڑے آسکتے تھے۔ چندرا دیوی نے اس سے پوچھا۔

”فرمایئے...... میں آپ کی کیا سیوا کرسکتی ہوں...... معاف کیجئے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

”اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ یقیناً چندرا

دیوی ہیں۔" وہ رسیلی آواز میں بولی۔ "کیا میں نے ٹھیک پہچانا؟"

"ہاں...... میں چندرا دیوی ہوں......" چندرا دیوی نے حیرت سے کہا۔ "آپ نے مجھے کیسے پہچان لیا......؟"

"مجھے آپ کے متعلق شانتی کانت نے بتایا تھا......اس نے آپ کے حسن کی جو تعریف کی تھی۔ اس کے ناتے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا......آپ کے حسن کی تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں......واقعی آپ جیسی حسین عورت اس سرزمین پر نہ ہوگی۔"

شانتی اس کی بچپن کی سہیلی تھی۔ شادی کے بعد وہ شانتی کانت ہوگئی تھی۔ اس کا پتی سرکاری ملازم تھا۔ شادی کے بعد اس کے پتی کا مالدیپ جزیرہ تبادلہ ہوگیا تھا۔ شانتی کا ذکر ہوتے ہی اس کی یاد بے اختیار آئی تھی۔

"شانتی کیسی ہے......؟ کانت بھیا کیسے ہیں......؟ وہ مجھے بہت یاد آتی ہے......؟" چندرا دیوی بولی۔

"اچھی طرح...... جب بھی ان سے ملاقات ہوتی ہے صرف آپ کی باتیں اور آپ کی تعریف ہی کرتی رہتی ہیں۔ انہوں نے آپ کے نام ایک چٹھی لکھی ہے۔" اس نے پرس سے لفافہ نکال کر چندرا دیوی کی طرف بڑھایا۔ "آپ پڑھ لیں......"

چندرا دیوی نے لفافہ لے کر چاک کیا۔ اندر سے چٹھی نکال کر پڑھنا شروع کیا۔

میری جان شانتی......!

تو مجھے کتنا یاد آتی ہے شکنتلا سے پوچھ لینا۔ اب جون کے مہینے میں کانت کو ایک ماہ کی چھٹی ملے گی۔ تب میں آؤں گی...... میں شکنتلا کو ایک ضروری کام سے تیرے پاس بھیج رہی ہوں۔ یہ میری بڑی پیاری سہیلی ہے......اس پر ایک افتاد نازل ہوگئی ہے......جس نے اس کی اور اس کے پتی کی زندگی اجیرن کروی ہے۔ رات کی نیندیں حرام کردی ہیں۔ اس کی بپتا بڑی درد ناک ہے۔ اس کی پریشانی......خوف ودہشت تو ہی دور کرسکتی ہے......تو سن لے...... پر تجھے یہاں آنا پڑا ہے تو......تو ضرور آنا...... تیری اپنی شانتی کانت

چندرا دیوی اسے اپنے فلیٹ پر لے آئی۔ وہ دور دراز کے سفر سے آئی تھی اس لئے چندرا نے اس سے کہا کہ وہ نہا کر تازہ دم ہوجائے۔ جب وہ نہانے کے لئے چلی گئی تو چندرا دیوی نے کھانا تیار کرکے میز پر چن دیا۔ وہ نہا کر آئی تو اس کا حسن اور نکھر گیا تھا۔ کھانے کی میز پر چندرا دیوی نے محسوس کیا کہ وہ کھانا ٹھیک نہیں کھارہی ہے۔ وہ سمجھ گئی کہ پریشانی اور ہراساں ہونے کے باوجود کھانا نہیں کھارہی ہے۔

"سنو بہن شکنتلا......! تم کسی بات کی چنتا نہ کرو......تمہارا مسئلہ کتنا ہی گمبھیر، خوف ناک اور ناممکن کیوں نہ ہو میں اسے حل کردوں گی......تم صحیح جگہ آئی ہو...... شانتی نے تمہیں میرے بارے میں کیا بتایا......؟" چندرا دیوی نے دلاسا دیتے ہوئے پوچھا۔

"شانتی دیدی نے مجھ سے آپ کے متعلق اتنا کہا تھا کہ چندرا دیوی اس دنیا میں ایک ایسی واحد ہستی ہے جو پراسرار اور طاغوتی قوتوں کا توڑ اور سدباب کرسکتی ہے......کالا جادو ہو......آسیب ہو......کوئی بلا ہو......اس کا اثر اس پر نہیں ہوتا ہے۔"

"شانتی نے غلط نہیں کہا ہے......" چندرا دیوی بولی۔ "یہ ایک حقیقت ہے۔ لہٰذا تم سیر ہوکر کھانا کھاؤ۔"

چندرا دیوی کے دلاسہ نے نہ صرف اس کا دل خوش کردیا تھا بلکہ اس کی بھوک بھی کھل اٹھی تھی۔ اس نے سیر ہوکر کھانا کھایا۔ کھانے سے فراغت پانے کے بعد شکنتلا نے اس کا ہاتھ بٹایا اور یہ کہہ کر چائے بنائی تھی کہ وہ بہت عمدہ چائے بناتی ہے۔ شکنتلا نے چائے بنائی اور دونوں نشست گاہ میں آبیٹھیں۔ چائے پیتے ہوئے چندرا دیوی نے اس سے کہا۔

"اب تم اپنی دکھ بھری بپتا سناؤ......لیکن مجھے تم ایک دوست......سہیلی......ہم درد اور مخلص سمجھ کر من وعن سناؤ گی...... مجھ پر بھروسا کرو......تمہارا راز میرا راز

ہے......وہ کسی بھی صورت میں افشا نہ ہوگا۔"

"میں آپ سے کوئی بھی بات نہیں چھپاؤں گی......اب آپ میری داستان غم سنیں۔" پھر وہ کہانی سنانے لگی۔

"یہ تو آپ کے علم میں آچکا ہے کہ میرا نام شکنتلا ہے اور آپ کے علم میں یہ بات بھی آئی ہے کہ میں جزیرہ مالدیپ سے آئی ہوں اور وہاں کی رہائشی ہوں...... میرے پتی کے والدین اس سنسار میں نہیں ہیں۔ ان کا کوئی بھائی نہیں...... البتہ ان کی تین بہنیں ہیں جو ماں باپ کی زندگی میں ہی بیاہی جاچکی ہیں۔ اور وہ آسام میں رہ رہی ہیں......دو برس قبل میری شادی مالدیپ جزیرے ہی میں ہوئی تھی۔ میرے سسر ایک چھوٹے سے زمیندار تھے۔ لیکن میرے پتا جی ایک بڑے زمیندار ہیں۔ ان کی خواہش سے میری شادی بڑی دھوم دھام اور روایتی انداز سے ہوئی...... میں مالدیپ جزیرہ کی سب سے حسین لڑکی تھی اور آج بھی کوئی عورت میری طرح حسین اور جاذبیت سے بھرپور نہیں ہے۔ میری خوب صورتی کی تعریف اور چرچا سن کر میرے پتی پرکاش آنند نے اپنا رشتہ بھیجا......یوں تو میرے لئے رشتوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ بڑے بڑے دولت مند گھرانوں سے رشتے آرہے تھے۔ کیوں کہ ان کے چال چلن اچھے نہ تھے۔ دولت نے انہیں شرابی، کبابی اور آوارہ بنادیا تھا۔ جوا، عورت اور شراب سے دل بہلاتے تھے۔ میرے پتاجی نے اس لئے پرکاش کا رشتہ قبول کرلیا تھا کہ وہ نیک، محنتی اور سلجھے ہوئے نوجوان تھے۔ کسی برائی میں نہ تھے۔ مالدیپ جزیرہ میں وہ ایک مثالی نوجوان سمجھے جاتے تھے۔ وہ خوب صورت، وجیہہ اور دراز قد بھی تھے۔ میں اس بات پر خوش اور نازاں تھی کہ مجھے ایک اچھا پتی مل گیا ہے۔ ان کے اخلاق کی سبھی تعریف کرتے تھے۔

ایک دن ان کی ایک رشتہ دار میرے ہاں آئی تو اس نے میرے پتی سے دریافت کیا کہ......"تم کیا شکنتلا سے خوش ہو؟"

انہوں نے جواب دیا تھا کہ "میری بیوی نہایت خوبرو ہے، یہ سارا مالدیپ جزیرہ جانتا ہے......میرے اندازے سے کہیں زیادہ سگھڑ، سلیقہ شعار اور اچھی سیرت کی مالک بھی ہے۔ میں اپنی قسمت پر نازاں ہوں......ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایک عورت میں بہت ساری خصوصیات جمع ہوجائیں۔" اپنے پتی کے منہ سے اپنی تعریف سن کر مجھے کتنی خوشی ہوئی بیان نہیں کرسکتی۔ اس تعریف نے ہماری محبت کے رشتے کو لازوال بنادیا تھا۔

شادی کے بعد میرے پتی نے محسوس کیا کہ میں اپنے میکے جانا پسند نہیں کرتی ہوں۔ کبھی میرے پتا جی مجھے لینے آئے اور بہت زیادہ اصرار کیا تو صبح جاکر شام کو آگئی۔ ایک دن سے زیادہ ٹھہری نہیں۔ حالاں کہ لڑکیاں شادی کے بعد میکے جانے کے لئے بے چین رہتی ہیں۔ جب وہ اپنے میکے جاتی ہیں تو اس طرح خوش ہوجاتی ہیں کہ قید سے رہائی پاکر جارہی ہوں۔ میرے پتی یہ کہتے تھے کہ مجھے ان سے چوں کہ بہت محبت ہوگئی ہے اور ان کی جدائی میرے لئے سوہان روح بن جاتی ہے۔ اس لئے میں میکے جانا نہیں چاہتی ہوں۔ حالاں کہ میکہ مالدیپ ہی میں اور دس بارہ میل کی دوری پر تھا لیکن اس کے باوجود میں نہیں جاتی تھی۔ میرے پتی کہتے کہ......"آخر تم جاتی کیوں نہیں ہو؟......شادی کے بعد سے تم ان دو برسوں میں پورے دو دن کبھی نہیں رہیں۔ جب کہ تمہارے ماں باپ چاہتے ہیں کہ دو ایک دن تو رہ جاؤ......" میں جواب دیتی کہ آپ نے مجھ پر اپنی محبت کا جو جادو کیا ہے وہ دنیا کے ہر بڑے سے بڑے جادو سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اب یہ میرا گھر ہے۔ مجھے نہ صرف اس گھر سے بلکہ آپ سے اتنی شدید محبت ہوگئی ہے کہ میرا دل نہیں چاہتا کہ ایک دن کیا ایک لمحہ کے لئے بھی آپ سے جدا اور قرب سے دور رہوں......

میں آپ کو بتادوں کہ ہمارا مکان دو منزلہ ہے۔ دوسری منزل پر ہماری رہائش ہے۔ پہلی منزل پر میرے پتی نے اناج کا گودام بنا رکھا ہے۔ سب سے نیچے نوکر میاں بیوی رہتے ہیں۔ جب بارش شروع ہوئی تھی تب

ہم میاں بیوی طوفان کی زد میں آ گئے تھے۔ وہ کسی تھکے ماندے مسافر کی طرح گہری نیند سو رہے تھے۔ میں بھی نڈھال اور تھکن سے چور چور تھی۔ جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ گرمی اور حبس کی وجہ سے میری نیند اچاٹ ہوگئی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد میرے پتی کی میری دلخراش چیخ کی آواز کے ساتھ ان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے...... میرے منہ سے ایک اور چیخ نکل گئی۔ انہوں نے حیران ہو کر مجھ سے پوچھا کہ یہ کس کی چیخ تھی......؟ پھر انہیں احساس ہوگیا کہ یہ میری چیخ تھی۔ انہوں نے گھبرا کر میری طرف دیکھا اور بولے۔ ''کیا بات ہے شکنتلا تمہارا چہرہ سفید کیوں پڑتا جارہا ہے...... تمہارے چہرے پر لہو کی ایک بوند بھی نظر نہیں آرہی ہے......؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا......؟''

میری آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں اور میرا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ میں ان سے لپٹ گئی۔

''ہاتھ...... ہاتھ...... وہ ہاتھ پھر آ گیا ہے......؟'' میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''کون سا ہاتھ......؟ کس کا ہاتھ......؟'' انہوں نے میرا شانہ تھپ تھپاتے ہوئے دریافت کیا۔

''اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا لیکن کھڑکی کی طرف دیکھا نہیں...... نہ مجھ میں اتنی ہمت تھی کہ کھڑکی کی طرف دیکھوں...... میں نے ان کے چوڑے چکلے سینے میں اپنا چہرہ چھپا کر دیکھا۔ میں خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپنے لگی۔ انہوں نے فوراً ہی مجھے اپنی آغوش سے نکال کر ایک طرف ہٹایا تاکہ کھڑکی کے پاس جا کر دیکھیں۔ میں نے فوراً ہی ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ''نہیں...... نہیں...... آپ نہ جائیں۔'' میں نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

''تم ڈر کیوں رہی ہو......؟ میں کھڑکی کے پاس جا کر دیکھتا ہوں...... شاید کوئی چور ہوگا جو کھڑکی کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھ کر اوپر آنے کی کوشش کر رہا ہوگا۔''

جب وہ بستر سے اترنے لگے تو میں نے ان کا بازو تھام لیا اور گڑگڑانے لگی کہ...... ''بھگوان کے لئے آپ نہ جائیں...... وہ ہاتھ کہیں آپ کا گلا نہ دبا دے......'' میں خوف کی وجہ سے اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ میرے پتی نے اس بات کا احساس کرنے کے باوجود اپنا بازو چھڑایا اور کھڑکی کے پاس جا کر باہر جھانکا اور چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ اس کھڑکی سے انہیں کچھ نظر نہ آیا تو انہوں نے دوسری کھڑکیوں کے پاس جا کر چند لمحوں تک جھانکا پھر میرے پاس آ کر بولے۔ ''دور دور تک کسی ہاتھ یا کسی چیز اور آدمی کا نام و نشان تک نہیں ہے۔''

پھر انہوں نے بستر پر آ کر مجھے اپنی آغوش میں لے کر تسلی دی کہ...... ''کوئی ہاتھ وغیرہ نہیں ہے...... تم نے شاید کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے...... جیسے ہی تمہاری آنکھ کھلی تمہیں وہم ہوگیا کہ کوئی چور چوکھٹ پر ہاتھ رکھ کر کمرے میں داخل ہونے کے لئے چڑھ رہا ہے......''

ان کے دلاسے سے میرا خوف کسی حد تک کم ہوگیا...... لیکن میں نے اصرار کیا کہ میں تمام کھڑکیوں کے پٹ بند کردوں......

پھر انہوں نے مجھے سمجھایا کہ...... اس طرح تو کمرے میں گھٹن ہو جائے گی۔ اس لئے کہ پہلے ہی ہوا بند ہے۔ کمرے میں گھٹن ہو جائے گی...... اور حبس بھی ہو رہا ہے۔ ان کی بات ماننے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ تب میں نے منہ پر چادر رکھ لیا اور بستر پر دراز ہوگئی تاکہ میں اس ہاتھ کو دوبارہ نظر آنے کی صورت میں نہ دیکھ سکوں۔ تیرے چہرے پر خوف جو چھایا ہوا تھا۔ اسے بھانپ کر انہوں نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ میرا خوف کم اور دور کرنے کے لئے ان کے ہونٹوں نے میرے چہرے اور ہونٹوں پر بوچھار کردی...... میں گرم جوشی اور خود سپردگی سے اس لئے پیش نہ آ سکی کہ مجھے نیند کی دیوی لوریاں دینے لگی تھی۔ میں جلد ہی سو گئی...... صبح بیدار ہوئی تو نیند کی حالت میں، میں نے جو ڈراؤنے خواب دیکھے تھے وہ ذہن پر بوجھ بنے ہوئے اور سینے میں وحشت سی ہوگئی تھی۔ میرے پتی نے بتایا کہ...... ''تم سو تو گئی تھی لیکن نیند کی حالت میں بڑبڑاتی رہی تھی۔

ہاتھ...... شیطانی ہاتھ...... مجھے بچاؤ...... بچاؤ......''

میرے پتی نے کہا کہ ''میں سمجھ گیا ہوں کہ تم نے بہت زیادہ جذباتی اثر لے لیا ہے...... ہاتھ تمہارے اعصاب پر کسی آسیب کی طرح سوار ہوگیا ہے...... بعض اوقات ڈراؤنے خواب انسانی ذہن پر بہت زیادہ اندازہوتے ہیں۔ لہٰذا اس خواب کو بھول جانے کی کوشش کرو۔''

جب صبح میں بیدار ہوئی تھی تو سہمی ہوئی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ میری طبیعت نارمل ہوگئی تھی۔

دو راتیں خیریت، سکون اور اطمینان سے گزر گئیں۔ میرے سینے میں وحشت جو تھی وہ ختم ہوگئی تھی۔ جو ہاتھ میں نے دیکھا تھا وہ نظر نہ آیا۔ تیسرے دن رات کے وقت بارہ بجے تک ہم دونوں جاگتے، پیار و محبت کی دنیا میں بہت دیر تک بھٹکتے اور سرشار ہوتے رہے۔ اس لئے بھی کہ چاندنی رات تھی چاندنی راتیں عورت کو بہت زیادہ جذباتی بنا دیتی ہیں۔ سفر سے واپس پر وہ اتنے تھکن سے دو چار تھے کہ نیند نے انہیں جلد ہی آغوش میں لے لیا...... یوں تو میں بھی نڈھال سی تھی کہ لیکن مجھ پر جو سرشاری تھی اس نے سونے نہیں دیا۔ جیسے یہ سہاگ رات تھی۔

رات کے وقت ایک بجے کا عمل ہوگا۔ میں نے اپنے پتی کا شانہ بری طرح جھن جھوڑ کر نیند سے بیدار کردیا۔ میرے پتی نے چونک کر میری شکل حیرت سے دیکھی۔ اس وقت میری حالت مردے سے بھی بدتر ہو رہی تھی۔ میرا سارا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں نے پھر اسی کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہنا چاہا تو میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ چند لمحوں کے بعد میں بدقت اتنا کہہ سکی۔

''ہاتھ......؟''

میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے کہیں گے کہ تم نے پھر کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے...... یہ تمہارا واہمہ ہے...... لیکن یہ کہنے کے بجائے وہ بڑی سرعت سے کھڑکی کی طرف لپکے۔ انہوں نے کھڑکی کے پاس پہنچ کر باہر جھانکا...... پھر وہ سر اور جسم کمر تک نکال کر جھانکنے لگے۔ تھوڑی دیر تک جھانکنے کے بعد میرے پاس آ کر بولے۔

''میں نے چاروں سمتوں میں دیکھا......'' حد نگاہ تک کسی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ البتہ میں نے اس کالی بلی کو جو گھر کے باہر ہر وقت نظر آتی ہے۔ عقبی دروازے کے پاس بیٹھا ہوا پایا ہے۔ تم نے جو ہاتھ دیکھا ہے میرے خیال میں وہ تمہارے اعصاب پر مسلط ہو کر رہ گیا ہے۔''

میں انہیں کیا بتاتی اور کیا کہتی...... بتانے کی بات نہیں تھی۔ کیوں کہ وہ پتی تھے۔ میرا سینہ بری طرح دھڑک رہا تھا۔ سانسوں کا زیر و بم قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ اس روز آسمان صاف تھا اور چاندنی رات بھی تھی۔ انہوں نے مجھے ایک گلاس پانی پلایا تو میرے حواس قدرے بحال ہوئے۔ میں نے انہیں ان کے پوچھنے پر مختصر طور پر صرف اتنا بتایا کہ ''ایک خوفناک قسم کا کالا ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ پر ابھرا تھا جسے دیکھتے ہی میں چیخ پڑی تھی......'' اصل بات یہ تھی کہ طوفان کے گزرنے کے بعد تو میرے پتی کپڑے پہن کر بستر پر دراز ہوئے تو ان کی آنکھ فوراً لگ گئی تھی۔ لیکن مجھ میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ میں شب خوابی کا لباس جو سرہانے کی میز پڑا تھا اسے پہن لوں اور کمرے میں جو روشنیاں ہو رہی ہیں انہیں گل کردوں...... معاً میری نگاہ کھڑکی کی طرف اٹھی تو ایک مرد کا چہرہ دیکھا۔ میں نے اسے اپنی طرف بڑی محویت اور ہوس بھری نگاہوں سے دیکھ پایا۔ معلوم نہیں وہ کب سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ ایک دم سے خوف ناک ہاتھ میں تبدیل ہوگیا۔ میرے سارے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اس ہاتھ کو دیکھ کر میرے اوسان خطا ہوگئے۔ میں ایک چیخ مار کر پتی سے لپٹ گئی۔ اگر میں اپنے پتی کو بتاتی ایک انسانی چہرہ کھڑکی کی چوکھٹ سے مجھے گھور رہا تھا...... میرے بیدار ہوتے ہی وہ خوف ناک، مکروہ اور سیاہ ہاتھ میں بدل گیا...... میری اس بات کا انہیں یقین نہیں آتا...... یہ کیسے ہوسکتا ہے...... وہ اس لئے شک میں مبتلا ہو جاتے کہ میں فطری حالت میں تھی۔ میں یہ بات دانستہ گول کر گئی تھی۔

میں اس ہاتھ کو دو ایک مرتبہ دیکھ چکی تھی......اور پھر وہ چہرہ جس نے مجھے بے حجابی کی حالت میں دیکھا تھا اور پھر خوفناک سیاہ ہاتھ میں تبدیل ہو گیا تھا...... یہ واہمہ نہیں تھا۔ یہ ایک ایسی حقیقت تھی کہ میں اسے کسی صورت سے جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ میں نے اپنے پتی کی بات رکھنے کے لئے کہہ دیا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں...... میں نے اپنا واہمہ جھٹک دیا ہے۔ آپ فکر مند، پریشان اور اذیت میں مبتلا نہ ہوں۔'

میری بات سن کر میرے پتی بہت خوش ہوئے۔ وہ اس لئے بھی خوش ہوئے تھے کہ میں ایک دم نارمل سی ہو گئی تھی...... لیکن ہم دونوں کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی تھی...... وہ اس لئے بھی بہت زیادہ خوش تھے کہ ایک اذیت سے نجات ملی۔ لیکن میں جانتی تھی یہ خوشی دیر پا ثابت نہیں ہوگی۔ یہ خود فریبی ہے۔ لیکن یہ بات اپنے پتی کو سمجھانے سے رہی تھی۔

چوتھے روز میں نے نہا کر اپنا ایک بہترین جوڑا پہنا جو میرے پتی نے شادی کی پہلی سالگرہ پر تحفہ میں دیا تھا۔ پھر میں اپنی خالہ سے ملنے ملازمہ کے ساتھ چلی گئی۔ وہ میرے والدین کے گھر کے پاس ہی رہتی تھیں۔ میں نے اپنا وقت ان کے ہاں اور ماں باپ کے ہاں بھی گزارا تھا۔ میں سر شام گھر آئی بہت خوش تھی۔ اس رات ہم دونوں نے خوشی منا کر سوئے بارہ بج چکے تھے۔ ہم دونوں تھکن کے باعث گہری نیند میں سو گئے۔

اس رات بھی کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ آسمان گہرے سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ مغرب کے بعد وہاں اچانک چاروں سمتوں سے بادل امڈ آئے تھے۔ تھوڑی دیر تک موسلا دھار بارش بھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد بارش کا سلسلہ ختم گیا۔ گرمی اور حبس کا وہی عالم تھا جو کئی دنوں سے چلا آ رہا تھا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں میرے پتی نے بتایا کہ...... میں اچانک نیند سے بیدار ہو گیا...... گہری نیند سے اس طرح بیدار ہونے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی...... حبس تو تھا لیکن چھت کا پنکھا پوری رفتار سے چل رہا تھا...... میں نے پھر سونے کی کوشش کی تو لگا میری نیند آنکھوں سے کوسوں دور ہے...... پھر میں نے تمہاری طرف کروٹ لی۔ اور پھر محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ تم گہری نیند میں غرق تھیں...... تمہارے لمبے ریشمی سیاہ بال تکیے پر بکھرے ہوئے تھے...... تمہارے حسین چہرے پر ایک معصوم مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ لیکن تم سو رہی تھیں۔ لیکن تمہارا حسن جاگ رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اندھیرا اور گہرا ہو گیا...... اتنا گہرا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہے تھا۔ حتیٰ کہ تمہارا چہرہ بھی جو سرخ و سفید ہے۔ اندھیرے کی آغوش میں سما گیا تھا۔ آسمان پر مشرقی افق سے اور گہرے بادل بھی آئے اور چھا گئے تھے۔ دوسرے لمحے زوردار بارش شروع ہو گئی تھی۔ اس بارش نے میرے جذبات میں ہل چل سی مچا دی تھی۔ میں کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر بستر پر آیا اور تمہارے پاس دراز ہو گیا۔

بمشکل چھ سات منٹ گزرے ہوں گے میں نے اپنے ہاتھ کی پشت پر ہاتھ کا لمس محسوس کیا...... میں یہ سمجھا کہ یہ تمہارا ہاتھ ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے محسوس کیا کہ اس ہاتھ میں تمہارے ہاتھ کی وہ پھولوں جیسی نرمی...... محبت کی گرمی اور گداز پن نہیں ہے...... انگلیاں بھی پتلی، لمبی اور نازک سی نہیں ہیں...... یہ کوئی اور ہی ہاتھ ہے بے حد سرد...... جیسے برف کا تو وہ...... اس میں کھردرا پن ہے...... فولاد جیسی سختی ہے...... انگلیاں موٹی اور سلاخوں جیسی ہیں...... پھر وہ ہاتھ میرے ہاتھ پر کسی کن کھجورے کی طرح رینگنے لگا۔ میرے سارے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ ہو گئی اور رگوں میں لہو منجمد ہونے لگا۔ اس لمحے سب سے پہلے جو خیال آیا وہ یہ تھا کہ کہیں وہ پراسرار...... خوف ناک، سیاہ اور مکروہ ہاتھ تو نہیں ہے جو تم دو تین بار دیکھ چکی ہو...... شاید یہ کسی بدمعاش کا ہو جو تمہارا ہاتھ سمجھ کر اس پر رینگ رہا ہو۔

یہ خیال آتے ہی میں نے اپنے حواس اور اپنی ساری قوت مجتمع کی اور اپنی پوری قوت سے اپنے ہاتھ کو کھینچ کر ایک دم سے جھٹکا۔ پھر میں نے فرش پر دھپ سے کسی چیز کی آواز سنی...... پھر میں بجلی کی سی تیزی سے پلنگ سے کود کر نیچے آیا اور سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ فوراً سوئچ آن کیا...... کمرا ایک دم سے روشنی میں نہا گیا۔ میں نے دیکھا۔ کمرے میں کوئی نہیں ہے۔ میں نے فوراً ہی فرش کی طرف اور پلنگ کے نیچے جھانک کر دیکھا...... شاید وہ بدمعاش پلنگ کے نیچے نہ چھپا ہو۔ معاً میری نظر سامنے والی کھڑکی پر پڑی تو میں دم بخود کھڑا رہ گیا۔ میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ میں نے جو منظر دیکھا وہ ناقابل یقین تھا......

میں نے کھڑکی کی چوکھٹ پر ایک سیاہ رنگ کا انتہائی بدصورت اور مکروہ ہاتھ دیکھا...... یہ ہاتھ کلائی تک کٹا ہوا تھا۔ میرے سارے بدن پر جھرجھری بجلی کی رو کی طرح دوڑ گئی۔ مگر میں مضبوط اعصاب کا مالک نہ ہوتا تو یقیناً بے ہوش ہو جاتا اور فرش پر گر جاتا...... جتنی دیر میں میں نے بندوق اٹھائی اتنی دیر میں وہ منحوس ہاتھ نظروں سے گدھے کے سر کے سینگ کی طرح غائب ہو گیا۔ کمرے میں روشنی ہونے کے باعث تمہاری آنکھ کھل گئی۔ تم نے گھبرا کر پوچھا کہ کیا بات ہے۔ جب میں نے تمہیں اس کٹے ہاتھ کا واقعہ سنایا تو تمہارا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ تم رونے لگیں۔ تمہارے آنسوؤں نے میرا سینہ بھگو دیا اور میں نے تمہیں سمجھایا کہ رونے دھونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا...... میرے پوچھنے پر وہ بولے کہ ہمارا کوئی دشمن ہے۔ جو سفلی علم سے ہماری جان لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ تم پریشان اور فکر مند نہ ہو میں کل ہی کسی پنڈت یا سادھو مہاراج سے مل کر اس ہاتھ کے بارے میں دشمن کے جادو کا توڑ کرتا ہوں۔

میرے پتی ناشتا کرنے کے بعد کسی پنڈت کی تلاش میں چلے گئے۔ جب وہ دن ڈوبنے سے پہلے گھر آئے تو انہوں نے مجھے دیکھا۔ میں اس وقت بے ہوشی کی حالت میں پڑی تھی۔ بستر پر دراز تھی۔ میرے پاس میری خالہ پریشان اور ہراساں سی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے...... میں تھوڑی دیر پہلے ہی بے ہوش ہوئی

کامیاب بک ڈپو اردو بازار کراچی

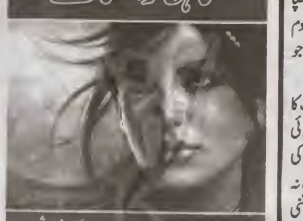

تھی۔ ایک ملازم ڈاکٹر کو لینے گیا ہوا تھا۔ وہ پنڈت جی کو کمرے میں لے کر آئے۔ انہوں نے ایک گلاس پانی منگوا کر اس پر کوئی منتر پڑھ کر پھونکا۔ پھر اس پانی کے کچھ چھینٹے میرے منہ پر مارے۔ چند لمحوں کے بعد مجھے ہوش آنے لگا۔

جب میں پوری طرح ہوش میں آ گئی اور چاروں طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھا...... جب میں نے اپنے پتی اور ملازموں کو دیکھا تو میرا خوف وڈر بڑی حد تک کم ہوگیا۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر میرے پتی پنڈت جی کو نشست گاہ میں لے گئے۔ پھر انہوں نے نوکروں سے کہا کہ رات کا کھانا تیار کریں۔ جب نوکر کمرے سے نکل گئے تو میں اور خالہ کمرے میں رہ گئیں۔ تب انہوں نے آ کر مجھ سے دریافت کیا کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟

میں نے اپنے پتی کو بتایا دوپہر کے کھانے سے فراغت پانے کے بعد میں کچھ دیر تک بیٹھی اخبار پڑھتی رہی...... جب مجھے جمائیاں آنے لگیں تو میں نے دروازہ بند کیا اور سونے کے لئے بستر پر دراز ہوگئی۔ گہری نیند سو گئی۔ سونے سے پہلے میں نے تمام کھڑکیاں بند کرلی تھیں...... میری آنکھ کھلی تو میں نے دروازے پر دستک کی آواز سنی...... اسی دستک سے میری نیند ٹوٹی تھی۔ میں سمجھی کہ آپ آگئے ہیں۔ میں نے بستر سے نکل کر لباس اور بالوں کو درست کیا۔ میں نے دروازہ بھی نہیں کھولا تھا کہ دوبارہ دستک ہوئی۔ میں نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ پھر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ باہر کوئی بھی نہیں ہے...... راہ داری خالی پڑی ہے...... کمروں کے دروازے بند تھے اور ان کی کنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔

معاً میری نگاہ فرش پر پڑی تو میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی...... ایک خوفناک بدصورت اور کٹا ہوا ہاتھ میرے پیروں کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا...... اس ہاتھ کو دیکھ کر میری روح فنا ہوگئی۔ معلوم نہیں اس وقت میرے اندر اتنی طاقت کہاں سے آ گئی کہ...... میں نے اس ہاتھ کو پوری قوت سے لات رسید کی۔ وہ راہ داری میں قدرے دور جا گرا۔ میں نے جھٹ سے دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگادی۔ پھر دروازے سے ٹیک لگا کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ چند لمحوں کے بعد میری سانسیں اور دل قابو میں آیا تو کھڑکی کی طرف سرعت سے بڑھی تاکہ پٹ کھول کر نوکروں کو آواز دے کر بلاؤں...... کھڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے قدم یک لخت رک گئے اور میرے جسم کا سارا خون خشک ہو کر رہ گیا...... دل اچھل کر حلق میں آ گیا...... وہ کٹا ہوا بدصورت اور مکروہ ہاتھ قالین پر کھڑا ہوا تھا...... اور میری طرف بڑھ رہا تھا...... میں نے ایک زوردار دل خراش چیخ ماری اور پلٹ کر دروازے کی طرف بھاگی۔ لیکن اس ہاتھ نے میرے دائیں پیر کو اپنی گرفت میں لے لیا...... اس ہاتھ کی گرفت اتنی سخت تھی کہ مجھے اپنے پیر کی ہڈی چٹختی محسوس ہونے لگی۔ میں زور زور سے چیخنے لگی۔ پھر میں دہشت سے بے ہوش ہوگئی۔ پھر کیا ہوا مجھے معلوم نہیں۔

پنڈت جی نے کمرے میں جانے سے پہلے ہم سے ایک لوہے یا لکڑی کا صندوقچہ منگوایا تھا...... ہم نے ایک لوہے کا صندوقچہ فراہم کردیا۔ ساری رات ہم میاں بیوی نے آنکھوں پر کاٹی...... رات کے دو بجے ہم نے اوپر والے کمرے سے پنڈت جی کی گرج دار آوازیں سنیں...... بھونڈے...... بھیانک اور بے ہنگم قہقہوں کی آوازیں بھی سنائی دیتی رہیں...... پو پھوٹنے کے بعد پنڈت جی نیچے آئے تو ان کے ہاتھ میں وہ صندوقچہ تھا جو ہم نے ان کے طلب کرنے پر دیا تھا...... انہوں نے کہا کہ اس ہاتھ کو انہوں نے اس صندوقچے میں قید کردیا ہے۔ لہٰذا اسے دریا میں بہت دور جا کر پھینک دیا جائے۔ ناشتہ کرنے کے بعد میرے پتی اس صندوقچہ کو دریا میں پھینکنے کے لئے لانچ بوٹ میں روانہ ہوئے...... میرے پتی نے ان سے پوچھا کہ...... یہ ہاتھ کیا بلا ہے......؟ یہ عفریت بن کر تنگ کرتا رہا ہے......؟

پنڈت جی نے میرے پتی کو یہ جواب دیا کہ یہ کٹا ہوا ہاتھ بلا نہیں بلکہ ایک انسانی ہاتھ ہے...... یہ تمہاری بیوی کا بدترین دشمن ہے...... چوں کہ تمہاری

حسین وجمیل بیوی نے اس کی محبت کا جواب نفرت، غصے اور حقارت سے دیا اور اس کی کوئی بات نہیں مانی...... اس سے شادی کرنے سے صاف انکار کردیا...... تمہاری پتنی کی عزت کا دشمن بن گیا تھا۔ تمہاری پتنی نے اپنی عزت پر آنچ آنے نہیں دی...... یہ اس علاقے میں چھپا ہوا تھا تاکہ انسان کے روپ میں آ کر تمہاری پتنی کی عزت سے جی بھر کے کھیل سکے...... چوں کہ تمہاری پتنی ایک نیک ہستی اور پاک دامن ہے اس لئے بھگوان نے اس کی رکھشا کی...... اسے اس بات کا دکھ، غصہ اور نفرت تھی کہ تمہاری بیوی نے اس سے نہ صرف شادی سے انکار کیا اور اپنی عزت بھی محفوظ رکھی......

میرے پتی نے یہ لانچ بوٹ جو کرائے پر لی تھی اس سے دو کام لئے...... ایک تو بہت دور جا کر صندوقچہ کو دریا برد کردیا...... پھر پنڈت جی کو بھی چھوڑ آئے۔ پنڈت جی نے میرے پتی کو اس کٹے ہوئے ہاتھ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا کوئی مبالغہ نہیں تھا...... پنڈت جی کی ایک ایک بات بالکل سچ تھی...... میں دل میں سخت حیران تھی انہیں ان تمام باتوں کا کیسے پتا چل گیا؟...... یہ باتیں میرے پتی کے علم میں نہیں تھیں اور نہ ہی انہیں اعتماد میں لیا تھا...... اس لئے کہ یہ سب باتیں بتانے کی نہیں تھیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میری زندگی میں ایک دل دہلا دینے والا واقعہ پیش آئے گا۔ میں نے خواب وخیال میں بھی نہیں سوچا تھا۔

میرا خیال تھا کہ میرے پتی میرے کردار اور اس کٹے ہاتھ کے متعلق جان کر بدظن نہ ہو جائیں۔ ازدواجی زندگی میں تلخی اور بدگمانی کا زہر سرایت کر کے بسا بسایا گھر اجاڑ دے گا...... لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جس بات سے میں ڈر رہی تھی...... میرے پتی نہ صرف وسیع الخیال ہیں بلکہ ٹھنڈے مزاج کے بھی ہیں...... انہوں نے نہ تو اس موضوع پر کوئی بات کی اور نہ ہی میرے ماضی کے متعلق کریدا۔

اس بدصورت...... خوف ناک اور شیطانی ہاتھ سے نجات پانے کی خوشی میں دو دن کے بعد میرے پتی نے دعوت عام کا اہتمام کیا۔ گاؤں والوں اور عورتوں نے اس دعوت عام کے بارے میں معلوم کیا تو ان سے یہ کہہ دیا کہ چوں کہ کاروبار میں بہت فائدہ ہوا ہے اس لئے انہیں بھی خوشیوں میں شریک کیا گیا ہے...... یہ دعوت دوپہر سے سہ پہر تک جاری رہی تھی......

ظاہر ہے اس ہاتھ نے اس قدر دہشت زدہ کیا تھا کہ اس نے چین سکون غارت کردیا تھا۔ رات کی نیندیں حرام ہو کر رہ گئی تھیں۔

دو مہینے کا عرصہ خیروعافیت سے گزر گیا...... ایک تو دل سے اس کا ڈر خوف نکل گیا تھا اور دوسرا یہ کہ ان واقعات کو ہم دونوں بھول گئے تھے۔ دو ایک مرتبہ میرے پتی کو کاروبار کے سلسلے میں سری لنکا جانا پڑا تھا...... میرے پڑوس میں ایک نوجوان لڑکی تھی۔ میں اسے ساتھ سلا لیتی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی بستر پر سوئی تھیں۔ مسہری اتنی بڑی تھی کہ چار افراد بیک وقت سو سکتے تھے۔ اب مجھے کوئی خوف اور ڈر محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے کہ میرا اعتماد لوٹ آیا تھا۔

مالدیپ جزیرہ کے بارے میں یہ بتاتی چلوں شاید آپ بھی واقف ہوں گی کہ یہ چھوٹے بڑے ساڑھے تین ہزار جزیروں پر مشتمل ہے...... اس جزیرے کی آمدنی سیاحوں سے ہوتی ہے...... اس جزیرے کا پانی اس قدر صاف شفاف ہے کہ کوئی پانی میں کتنی ہی گہرائی میں کیوں نہ جائے اس طرح دکھائی دیتا ہے جس طرح ایک آدمی بے لباس...... دنیا میں کہیں بھی دریا کا پانی صاف وشفاف اور خوب صورت نہیں...... سیاح تفریح وطبع کے لئے آتے ہیں...... خصوصاً وہ غیرملکی سیاح جو جلدی امراض کا شکار ہوتے ہیں...... ان کے جسموں پر دانے ہوتے ہیں...... جنہیں خارش ہوتی ہے...... وہ نہانے کے بعد بدن خشک کر کے کریم اور لوشنز لگاتے ہیں۔

جس سے تب کہیں جا کر انہیں جلدی امراض سے نجات مل جاتی ہے...... یورپی مرد عورت سیاح سن باتھ لینے بھی آتے ہیں تاکہ ان کی گوری رنگت سانولی ہو جائے...... انہیں سانولی رنگت میں بے حد کشش اور

دل کشی نظر آتی ہے...... ان جزائر پر مکان، ہوٹل، مہمان خانے اور ہوٹل ہوتے ہیں...... اور لوگ اپنے مکانوں کو ہوٹل کی طرح بنا رکھا ہے۔ امریکی ڈالر، یورو اور پونڈ کرنسی ان کی آمدنی ہے۔ زرعی ملک بھی ہے...... یہاں جو اشیاء آتی ہیں وہ چارٹرڈ ہوائی جہازوں سے......

ستمبر کا پہلا ہفتہ تھا۔ میرے گھر والے...... والدین، بھائی اور بہنیں تین دن رہ کر گئے تھے...... ان کا جزیرہ میرے جزیرے یعنی دارالخلافہ سے بہت دور تھا۔ اس لئے بھی میں نے انہیں تین دن روک لیا۔ میں نے ان کی روانگی کے وقت ان سے کہا کہ آئندہ ہفتے میں میکے آ کر ایک ہفتہ رہوں گی۔ انہیں یقین نہ آیا...... اور ان کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی تھی۔ وہ لوگ میری زبان سے یہ الفاظ سننے کے لئے کب سے تڑپ رہے تھے۔ میں اور میرے پتی نے دانستہ اس کٹے ہوئے ہاتھ کا واقعہ انہیں نہیں سنایا تھا۔

میرے پتی مجھے خوش دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے...... آخر وہ کیوں نہ خوش ہوں۔ اس لئے کہ میں ایک ایسی عزیز ترین ہستی تھی۔ جو انہیں جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ وہ نشاط انگیز لمحات میں کہتے تھے...... تم دنیا کی سب سے حسین ترین عورت ہو...... تم میں چاند کی سی سندرتا ہے...... میں نے خواب میں بھی تم جیسی عورت نہیں دیکھی...... میں تمہیں پا کر دنیا کا خوش ترین شخص بن گیا ہوں۔

وہ ایک رات اپنے دوست کی بہن کی شادی میں شرکت کا پروگرام بنا رہے تھے...... یہ چودھویں کی رات تھی۔ چاند اپنے شباب کی آخری منزل پر تھا۔

دوسرے لمحے میں بری طرح چونک پڑی اور سینہ دھک سا ہو کر رہ گیا...... میری مسکراہٹ کافور ہو گئی پتی کی آنکھوں میں خوف کے سائے اور چہرے پر سفیدی دیکھ کر، انہوں نے مرتعش ہاتھ سے اس کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جس سے پورا چاند جھانک رہا تھا...... میں نے جو منظر دیکھا اس کا یقین نہیں آیا...... میری آنکھیں دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں...... دل اچھل کر حلق میں دھڑکنے لگا...... اس کھڑکی کی چوکھٹ پر وہی خوفناک قسم کا مکروہ ہاتھ کھڑا تھا اور اس کا سایہ کمرے کے فرش پر پڑ رہا تھا...... پھر ایک سرد لہر چاقو کی طرح کاٹتی ہوئی میری ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی۔

میں ششدر تھی کہ یہ ہاتھ صندوقچہ سے اور اس دریا سے کیسے نکل آیا؟...... یہ باتیں سوچنے اور پتی سے سوال کرنے کا نہیں تھا...... میرے پتی نے فوراً ہی بستر سے نکل کر سوئچ آن کیا...... پھر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی وہ ہاتھ کسی ڈھیٹ بچے کی طرح اپنی جگہ کھڑا تھا۔ پھر مجھے ایسا لگا جیسے وہ ہم پر ہنس رہا ہو اور تمسخر اڑا رہا ہو...... ورنہ یہ ہاتھ روشنی ہوتے ہی پھر غائب ہو جاتا تھا...... اس ہاتھ کو اس طرح کھڑا دیکھ کر میرے سارے بدن میں ایک عجیب سی سنسناہٹ دوڑ گئی۔ میرے پتی نے غصے کی حالت میں بندوق اٹھا کر شست باندھی تھی کہ وہ ایک دم سے غائب ہو گیا جیسے گدھے کے سر سے سینگ...... پھر وہ کھڑکی کے پاس جا کر باہر جھانکنے لگے...... جب وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر میرے پاس آئے تو میں گھٹنوں میں سر دیئے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ انہوں نے بندوق رکھ کر مجھے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر بولے کہ ”دور دور تک اس شیطانی ہاتھ کا پتا نہیں ہے۔ اب وہ نہیں آئے گا۔“ وہ مجھے سینے میں جذب کر کے دلاسا دیتے رہے۔

دوسرے دن صبح آٹھ بجے ایک دردناک خبر ملی کہ امرلال کی نوجوان بیٹی جھیل پر نہانے گئی تھی...... وہ حسب معمول سورج نکلنے سے قبل جاتی تھی۔ اس وقت اس کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوتا تھا...... اس لئے بھی سویرے آ کر نہاتی تھی کہ آزادی، سکون اور اطمینان سے نہا سکے۔ اس کا شمار جزیرہ مالدیپ کی حسین لڑکیوں میں ہوتا تھا...... بہت سارے گھرانے اسے اپنی بہو بنانا چاہتے تھے...... کئی لڑکے اس کی محبت میں گرفتار تھے...... کسی ہوس پرست نے اس تنہائی سے فائدہ اٹھا کر اپنی خواہش کا نشانہ بنانے کے بعد اس کا گلا دبا کر افشائے راز کے خوف سے جان سے مار دیا۔ اس کے

جسم اور چہرے پر ایذا اور تشدد کے نشانات تھے۔ لیکن جب پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آئی تو یہ عجیب سا انکشاف ہوا کہ اس کی عزت پر کوئی آنچ نہیں آئی...... لڑکی نے مزاحمت کی تھی اس لئے وہ اپنی آبرو بچا کر مر گئی...... یوں بھی وہ ایک باعزت لڑکی تھی۔

پورے جزیرہ مالدیپ میں خوف و ہراس پھیل گیا...... ہر کسی کا یہ خیال تھا کہ اس کٹے ہوئے خوفناک ہاتھ نے اس لڑکی کی جان لے لی...... جب پولیس کو اس کٹے ہوئے ہاتھ کے بارے میں بتایا تو اس نے حقیقت کو تسلیم نہیں کیا...... اس نے تین مشکوک نوجوانوں کو گرفتار کر لیا۔ پولیس نے ان سے پوچھ گچھ کے بعد رہا کر دیا۔

اس کے تیسرے دن پولیس انسپکٹر کی نہایت حسین و جمیل اور نوجوان بیوی اپنے کمرے میں مردہ پائی گئی۔ اس کا لباس تار تار تھا...... حیرت کی بات یہ تھی کہ جب اس کٹے ہاتھ نے اس کا لباس تار تار کرنے کے بعد جب اس پر تشدد کیا...... ایذا پہنچائی تو وہ عورت چیخی کیوں نہیں...... اگر چیخی تھی تو کیا گھر والوں نے اس کی آواز نہیں سنی...... وہ اپنے گھر میں اکیلی تھی اس کا علم بعد میں ہوا...... لیکن کیا پڑوسیوں کو بھی اس کی آواز سنائی نہیں دی۔ سب انسپکٹر کا کہنا تھا کہ شاید اس نے انسپکٹر کی بیوی کو اس ہاتھ سے گلا دبوچ کر جان سے ختم کر دیا...... پھر لباس تار تار کر کے اس کے جسم کو ایذا دی اور تشدد کا نشانہ بنایا...... پھر شاید اس کے جسم کا نظارہ کرتا رہا...... اس کا شوہر ایک قاتل کی تلاش میں کولمبو گیا ہوا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی جو رپورٹ آئی وہی تھی جو امرلال کی بیٹی کی تھی...... پولیس کا کہنا تھا کہ کوئی جنونی قاتل ہے...... نفسیاتی مریض ہے...... اس کی کمزوری عورت کو بے لباس دیکھنا...... جسمانی تشدد کرنا ہے۔

پھر کیا تھا...... لڑکیوں اور عورتوں نے گھروں سے اکیلے نکلنا بند کر دیا...... کوئی جھیل یا تالاب پر نہانے جاتی تو اکیلی نہیں جاتی تھی۔ چار پانچ لڑکیاں یا عورتیں ساتھ ہوتی تھیں۔ وہ ڈنڈوں سے مسلح ہوتی تھیں...... پھر وہ نہاتی تھیں۔

ادھر سب سے برا حال تو میرا تھا۔ میرے پتی نے مجھ سے کہا کہ میں میکے جا کر کچھ دن رہ کر آؤں...... وہ کوشش کریں گے کہ کسی بڑے سادھو یا پنڈت کی مدد سے اس بلا کو قابو کر لیں گے۔ مگر میں یہ چاہتی تھی کہ وہ بھی میرے ساتھ چلیں...... ان کے لئے یہ مشکل امر تھا۔ کیوں کہ بارش کا موسم ختم ہوا تھا۔ کاروبار ان کی عدم موجودگی سے متاثر ہو جاتا اور پھر انہیں کولمبو بھی جانا تھا۔ انہوں نے مجھے تسلی دی اور احتیاطی تدابیر بھی بتا دی۔

میں نے دن میں بھی کمرے میں اکیلے رہنا چھوڑ دیا تھا...... جب میں اوپر نیچے جاتی تو میرے ساتھ کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا...... کوئی چھ سات دنوں سے اس ہاتھ نے ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ وہ مسلسل پانچ چھ راتوں سے مسلسل جاگ رہے تھے...... ادھر مسلمانوں نے دو ایک عاملوں کی خدمات حاصل کیں...... ہندوؤں نے پنڈتوں کی...... ہندو مسلمان مل جل کر بھائیوں اور گھر کے خاندان کے فرد کی طرح رہتے تھے...... یہ افتاد بدقسمتی سے صرف ہندوؤں پر نازل ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی طرف وہ ہاتھ اس لئے نہیں گیا تھا کہ وہ لوگ نماز پڑھتے تھے اور ان کی مذہب کی مقدس کتاب جسے وہ قرآن کہتے تھے ہر گھر میں موجود تھی...... اور پھر کوئی مسلمان لڑکی یا عورت نہانے تالاب پر نہیں جاتی تھی۔

اس ہاتھ نے ایک گرو مہاراج کی کلائی توڑ کر رکھ دی تھی...... دو تین پنڈت جو آئے کولمبو سے وہ سادھو مہاراج کا حشر دیکھ کر واپس چلے گئے...... ان کے جانے کے دوسرے دن ایک اور جوان عورت کھیت میں مردہ حالت میں پائی گئی...... اس کا گلا گھونٹا گیا تھا۔ لیکن اس کی عزت تاراج کر دی گئی تھی...... یہ سب انسپکٹر کی بیوی تھی۔

انسپکٹر ان پراسرار اور دہشت ناک واقعات کے بارے میں میرے پتی کی بات ماننے کے بجائے...... مشتبہ افراد کو گرفتار کرنا شروع کر دیا...... پولیس کے نزدیک یہ توہم پرستی تھی...... پولیس کو عقل تو اس روز آئی تھی جب تھانے دار کی نوجوان بیٹی نے رات کے وقت

کھڑکی میں ایک خوفناک، مکروہ اور سیاہ کٹا ہاتھ کھڑکی میں دیکھ کر چیخیں مارنا شروع کردیں...... سارا گھر بیدار ہوکر اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی...... تھانے دار کی بیٹی گریجویٹ تھی۔ باپ کو اپنی بیٹی کی بات کا یقین کرنا پڑا۔ پھر مشتبہ افراد کو رہا کردیا۔

صرف لڑکیوں اور عورتوں پر نہیں نوجوان لڑکوں اور مردوں پر بھی ایسی دہشت مسلط ہوگئی تھی کہ وہ دن ڈوبنے سے پہلے ہی گھروں میں گھس جاتے تھے......

میرے پتی کسی کام سے کولمبو گئے ہوئے تھے...... میں اپنے کمرے میں بیٹھی بالوں میں کنگھی کررہی تھی۔ بوا فرش پر بیٹھی پیاز کاٹ رہی تھی...... اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ میں نہا کر آئی تھی۔ بالوں کو جھاڑ کر کمرے میں آئی اور مسہری پر بیٹھ کر بالوں میں کنگھی کی اور جوڑا باندھ رہی تھی تب میں نے اپنی گود میں کوئی بھاری چیز محسوس کی جو میری گود میں کلبلا رہی تھی۔ میں نے چونک کر دیکھا تو میری جان ہی نکل گئی۔ حلق میں کانٹے چبھنے لگے...... وہی خوف ناک کٹا قاتل ہاتھ میری گردن میں پڑا تھا جو اب تک کئی عورتوں کی جانیں لے چکا تھا...... اس سے پہلے کہ میں اس قاتل ہاتھ کو جھٹکتی اس نے ایک دم سے اچھل کر میرا گلا پکڑ لیا اور دبانے لگا۔ میں نے چیخنے کی کوشش کی تو چیخ نہ نکل سکی۔ میری آواز حلق میں اٹک گئی۔ میں نے ہمت کرکے ہاتھوں سے اس گلے کو پکڑ لیا اور اس ہاتھ کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی اور جدوجہد کرنے لگی۔ میں نے اپنا سارا زور لگادیا تھا اس لئے کہ میں لمحہ بہ لمحہ موت سے قریب ہوتی جارہی تھی...... پھر اس کوشش میں مسہری سے فرش پر گر پڑی۔

اس خونی ہاتھ کی گرفت رفتہ رفتہ گلے پر اور سخت ہوتی گئی۔ میرے سینے میں دم گھٹنے لگا۔ پھر میرے کانوں میں بھیانک قہقہے گونجنے لگے۔ وہ میری اس بے بسی کا تمسخر اڑا رہا تھا...... میری نظروں میں ایک انتہائی مکروہ اور خبیث چہرہ گھومنے لگا...... بوا نے جو یہ منظر دیکھا تو اس کے اوسان لمحے کے لئے خطا ہوگئے......

ہاتھ پیروں میں جان نہ رہی...... دوسرے لمحے جانے اس میں کہاں سے اتنی ہمت آگئی کہ اس نے مجھے ہر قیمت پر بچانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے اندر نفرت اور غصے کی تیز لہر اٹھی...... اسے وہ معصوم لڑکیاں اور عورتیں یک لخت یاد آگئیں۔ جنہیں زیادتی کا نشانہ بنا کر موت کے منہ میں پہنچایا تھا...... وہ کسی غضب ناک شیرنی کی طرح اپنی جگہ سے اٹھی اور پیاز کاٹنے والی چھری لے کر میرے پاس پہنچی اور مجھ سے کہا کہ میں اپنا ہاتھ اس خونی ہاتھ پر سے ہٹالوں۔ اس وقت میری ہمت جواب دے چکی تھی۔ میرے ہاتھ آپ ہی آپ بے جان ہوکر گر پڑے تھے۔ ایسا لگا تھا کہ اب مجھے موت سے کوئی بچا نہیں سکتا...... میں زندگی سے مایوس ہوچکی تھی۔ جیسے ہی میرے ہاتھ بے جان ہوئے بوا نے فوراً ہی اس خونی ہاتھ کی پشت پر چھری بھونک دی۔ بوا نے اپنی پوری قوت لگادی تھی۔ اس چھری کی نوک کا چبھنا تھا کہ وہ ایک دم سے غائب ہوگیا...... اس ہاتھ کے غائب ہوتے ہی بوا نے مجھے دیکھا...... غشی کی حالت میں...... میں گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ فوراً ہی ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ بروقت طبی امداد سے میری جان بچ گئی۔

دوسرے دن بوا اپنے کمرے میں مردہ پائی گئی......

اس کٹے ہوئے خونی ہاتھ نے بوا سے انتقام لے لیا تھا۔ نہ صرف اس کا گلا گھونٹا تھا بلکہ زیادتی بھی کی تھی......

بوا کی موت کا میں نے اس لئے بہت زیادہ اثر لیا تھا کہ اس نے اپنی جان پر کھیل کر مجھے اس موذی ہاتھ سے میری جان بچائی...... پھر دوسرے دن اسے اس ایثار اور بہادری کا جو صلہ ملا وہ موت کی صورت میں تھا...... میں اس قدر دہشت زدہ ہوگئی تھی کہ ایک لمحے کے لئے بھی میں اپنے پتی کو جانے نہیں دیتی تھی...... میں دو تین دن میں قدرے نارمل ہوگئی...... ایک رات ہم دونوں دیر تک جاگتے اور محبت کی وادی میں بھٹکتے رہے...... چوں کہ بہت گرمی بھی تھی۔ اس لئے میں نے نہانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں شاور کے نیچے کھڑی نہا رہی تھی۔ پھر میں نے دیکھا تو وہ کٹا ہوا ہاتھ تھا۔ میں نے

ایک چیخ ماری......

''ہاتھ...... ہاتھ......'' میری آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ ''بچاؤ...... بچاؤ......''

جب میرے پتی غسل خانے میں گھس آئے تو وہ غائب ہوچکا تھا...... میں ان سے لپٹ گئی۔ میرا دل اس بری طرح دھڑک رہا تھا جیسے وہ سینہ شق کرکے باہر نکل آئے گا۔

دہشت سے میری حالت دگرگوں ہوگئی تھی...... صبح ہوتے ہی میرے پتی مجھے میکے چھوڑ گئے...... پھر میرے پتی کوئی دس دن بعد مجھے لینے آئے تو انہوں نے مجھے بتایا کہ نہ تو وہ خونی ہاتھ وہاں آیا اور نہ ہی کوئی واردات ہوئی...... میں نے انہیں بتایا کہ وہ منحوس ہاتھ یہاں پہنچ گیا ہے...... میں نے انہیں بتایا کہ ایک روز میں نے کپڑوں کی اٹیچی کھولی تاکہ کپڑے نکال کر انہیں لے جاؤں۔ سہیلیوں نے دریا کنارے نہانے کا پروگرام بنایا ہوا تھا...... وہ شیطانی ہاتھ کپڑوں پر اس طرح پڑا تھا جیسے گہری نیند سورہا ہو...... مجھے دیکھتے ہی یک لخت حرکت کرنے لگا...... پھر ایک دم سے اچھل کر کپڑوں پر کھڑا ہوگیا...... اس کے تیور سے ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے اچھل کر میرا گلا دبوچ لے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹیچی سے باہر آتا میں نے اٹیچی بند کردی اور شور مچا کر گھر والوں کو جمع کرلیا۔ میرے والد، بھائی اور محلے کے بھائی کے دوست لڑکے اور پڑوس چاقو، ڈنڈوں، اور لاٹھیوں سے کمرے میں گھسنے کے بعد اٹیچی کو گھیر لیا۔ پھر میرے بھائی نے اٹیچی کو کھولا...... اس میں وہ خونی ہاتھ موجود نہیں تھا...... غائب ہوچکا تھا۔ تمام کپڑے کھول کھول کر دیکھے۔

اس کے دوسرے دن اس جزیرے کی ایک عدالت کے ایک جج کی حسین وجمیل بہو کا گلا دبوچ لیا تھا جو کمرے میں گرمی کے باعث شب خوابی کے لباس میں سورہی تھی، کمرے کی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ نائٹ بلب کی روشنی میں وہ گہری نیند سورہی تھی اس کا سراپا جاگ رہا تھا۔ اس کا پتی ایک نامور وکیل ہے۔ جب اس نے اپنی بیوی کی چیخیں سنیں تو وہ ملحق کمرے سے حیران و پریشان دوڑا، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ اس کی بیوی اس بری طرح کیوں چیخ رہی ہے۔ وہ یہ سمجھا کہ کھڑکی کے راستے شاید کوئی چور گھس آیا ہوگا...... جب وہ کمرے میں آیا تو اس نے ایک عجیب اور خوف ناک دہشت منظر دیکھا کہ ایک کٹا ہوا انسانی ہاتھ اس کی بیوی کا گلا گھونٹ رہا ہے...... جب اس نے اپنی بیوی کو درد اور تکلیف سے تڑپتا دیکھا تو اس سے رہا نہ گیا۔ اس منظر نے تو اس کی ساری طاقت سلب کرلی تھی۔ پھر بھی اس نے لپک کر بستر کے پاس جاکر اس منحوس ہاتھ کو پکڑ لیا اور اس کی انگلی پکڑ کر اور پوری طاقت جمع کرکے اسے اپنی طرف کھینچا تو وہ ہاتھ غائب ہوگیا...... اس کی بیوی دہشت اور صدمے سے بے ہوش ہوگئی تھی۔

وہ کوئی دو دن تک بے ہوش رہی...... اس کے ہوش میں آتے ہی اس کا پتی علاج کے لئے اسے کولمبو لے گیا۔ سری لنکا...... مالدیپ سے قریب ہے اور وہاں بڑے بڑے فزیشن، سرجن اور اسپتال اور کلینک موجود ہیں۔ وہاں علاج کے بعد وہ لرزے کی مریضہ بن گئی...... کسی کا ہاتھ حتیٰ کہ اپنے شوہر کا ہاتھ بھی قریب آنے نہیں دیتی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے بھی خوف زدہ تھی...... پھر اس نے نفسیاتی علاج کرایا تب کہیں جاکر وہ ٹھیک ہوئی۔

اس واقعہ کے تیسرے روز میں نے اپنے بڑے بھائی سے بازار سے مچھلی منگوائی...... بھائی نے تھیلا لاکر میرے ہاتھ میں تھمادیا۔ جب میں نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو مچھلی کے بجائے میرے ہاتھ میں کٹا ہوا ہاتھ تھا...... میں نے حواس باختہ ہوکر اسے پھینکا تو وہ موری میں جاگرا...... پھر وہ موری کے راستے غائب ہوگیا۔ میں غش کھا کر گرگئی۔

اسی روز شام کے وقت دریا کنارے ایک حسین، نوجوان دوشیزہ فلنی جیونت کی لاش ملی جس کا لباس تار تار تھا...... ایسا لگتا تھا کہ لڑکی نے مزاحمت کی تو ہوس کار نے تشدد کرکے اس کی بے حرمتی کی ہے اور اس کے سارے جسم پر سرخ سرخ گہرے نشانات تھے......

ین دن بعد جو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ملی تو اس میں بتایا گیا تھا کہ اس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے۔ پولیس نے حسب عادت اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا کہ ایک کٹے ہاتھ نے اس کی بے حرمتی کر کے جان لے لی...... انسپکٹر نے اس لڑکے کو گرفتار کر کے جو اس سے محبت کرتا تھا...... اسے قتل کا کیس قرار دیا۔ اس واقعہ سے اس جزیرہ پر کہرام مچ گیا تھا۔ پولیس کا کہنا تھا کہ وہ دونوں آپس میں محبت کرتے تھے...... تنہائی میں ملتے تھے۔ لڑکی نے کسی وجہ سے شادی سے انکار کر دیا اور ان کے درمیان تلخ کلامی...... نفرت کا اور غصے کا اظہار ہوا...... جس پر لڑکے نے مشتعل ہو کر لڑکی کو اس کی بے حرمتی کر کے اسے قتل کر دیا۔ دوسرے ہی دن دریا کنارے دو پولیس افسران نے دیکھا کہ سب انسپکٹر کی بیوی کا کٹا ہاتھ بے حرمتی کر رہا ہے...... انہیں صرف ہاتھ نظر آیا جو اس کے سارے بدن پر رینگ رہا تھا۔ پھر انہوں نے دیکھا وہ ہاتھ اس کا گلا گھونٹ رہا ہے...... وہ ہوش میں آ کر درد اور تکلیف سے چیخنے لگی۔ ایک افسر نے لڑکی کے پاس اس ہاتھ کو پکڑا تو وہ غائب ہو گیا...... لڑکی نے اپنے بیان میں بتایا کہ نہانے کے بعد جب وہ کپڑے پہن کر جانے لگی تو وہ ہاتھ اس کے سینے پر آ گیا اور اس پر نشہ سا چھانے لگا...... اس نے خود سپردگی سے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ کسی مرد کے بازوؤں میں محصور ہے۔ اسے چہرہ نظر نہیں آیا۔ اس لئے کہ اس کی پلکیں منوں بھاری تھیں اور آنکھوں کے سامنے دھندسی تھی۔ اس نے صرف ہاتھ کو محسوس کیا جس نے اس کا لباس تار تار کر کے بے حجاب کر دیا...... وہ دونوں بہت دور نکل گئے...... جب اسے ہوش آیا تو وہ ہاتھ اس کا گلا دبا رہا تھا...... اسے بچایا نہ جاتا تو وہ بچ نہیں سکتی تھی۔

تین دن بعد میرے پتی آئے تو میں ان کے ساتھ اپنے گھر آ گئی۔ میرے پتی کو ایک سادھو مہاراج نے ایک کالا دھاگا دیا اور کہا کہ میں اسے گلے میں باندھے رکھوں...... میں نے اسے گلے میں ڈال لیا...... لیکن اس کالے دھاگے سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ تین روز پہلے کی بات ہے کہ رات کو ہم دونوں پیار و محبت کی باتیں کر رہے تھے کہ میں نے کھڑکی کی چوکھٹ پر دو کٹے ہوئے ہاتھ دیکھے...... ایک ہاتھ نے پہلے ہی کیا کم فتنہ مچا رکھا تھا کہ اب دوسرا ہاتھ بھی نظر آنے لگا...... ان دونوں ہاتھوں پر میرے پتی نے بندوق اٹھا لی...... ان کا نشانہ لے کر پے در پے دو فائرنگ جھونک دیئے...... لیکن ان پر گولیوں کا کوئی اثر نہ ہوا...... دوسرے لمحے ایک انتہائی خوفناک اور استہزائیہ قہقہہ گونجا...... پھر وہ دونوں ہاتھ جیسے ہنسنے لگے...... یہ ہے خونی ہاتھ کی کہانی جس نے نہ صرف کئی جانیں لے لی ہیں بلکہ اس جزیرے کے لوگوں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے...... اس قدر خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے کہ ہر شخص غم زدہ اور بیمار ہو کر رہ گیا ہے...... حسین لڑکیوں کے ماں باپ اور عورتوں کے پتی بھی بہت پریشان ہیں۔

شانتی کانت کے علم میں سارے واقعات تھے۔ جب میں نے انہیں دو ہاتھوں کے بارے میں بتایا تو وہ بولیں کہ...... تم پریشان اور فکرمند نہ ہو۔ ممبئی جا کر چندرا دیوی سے ملو۔ وہی ایک ایسی ہستی ہے جو ان دونوں ہاتھوں سے نجات دلا سکتی ہے۔ لہٰذا میں بڑی آشائیں لے کر آئی ہوں۔"

"تم مایوس، اور دل برداشتہ نہ ہو......" چندرا دیوی نے اسے دلاسا دیا اور اس پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی۔ شکنتلا بلا کی حسین اور بذات خود ایک جادو تھی...... اس کے بے حد لانبے چمکیلے سیاہ ریشمی بال...... اس کی بڑی بڑی بھونرا جیسی سیاہ آنکھیں...... اس کے چہرے کے تیکھے تیکھے نقش و نگار اور نکلتا ہوا قد...... اس کے سراپا کے جادو میں اس کا چھریرا بدن جگمگا رہا تھا...... اسے دیکھ کر ہر کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ بھگوان نے اسے فرصت میں بنایا ہوگا...... چندرا دیوی نے اپنی زندگی میں بہت کم ایسی حسین لڑکیاں دیکھی تھیں...... یہ حسینۂ مالدیپ تھی...... بلکہ کوئی بھی حسینہ عالم اس کے آگے ماند تھی۔ اس کی آواز بھی دلکش تھی...... قدرت نے اسے ہر چیز

جیسے بڑی فیاضی سے دی تھی۔ چندرا دیوی نے کہا۔ "تم مجھے ایک دوست، سہیلی سمجھ کر اپنی کہانی سنا سکتی ہو...... تم مجھے اپنی زندگی کا وہ واقعہ سناؤ جو تم نے آج تک کسی کو نہیں سنایا...... حتیٰ کہ اپنے پتی اور کسی قریبی سہیلی کو نہیں سنایا اور نہ اپنی ماں اور بہن کو اعتماد میں لیا۔"

شکنتلا بڑے زور سے اچھل پڑی...... اس نے اپنا جھکا ہوا خوش نما سر اوپر اٹھایا۔ چندرا دیوی کی طرف حیرت سے دیکھا اور بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"کون سا واقعہ......؟ میں نے آپ کو بہت سارے واقعات سنائے ہیں۔"

"وہ واقعہ جس نے خونی ہاتھ کو جنم دیا...... وہ خونی ہاتھ جو تمہاری جان اور عزت و آبرو کا دشمن بنا ہوا ہے...... اب تک تم محض اتفاقات کی وجہ سے اس سے بچتی رہی ہو...... کل ایسا بھی ممکن ہے کہ...... وہ ہاتھ تمہاری نظروں کے سامنے تمہارا سہاگ اجاڑ دے...... پھر تمہارے گھر کے ایک ایک فرد کو نشانہ بنائے...... تم مجھ پر بھروسا رکھو...... میں تمہاری کہانی کسی کو بھی نہیں سناؤں گی۔ میں تمہیں اس بات کی ضمانت دیتی ہوں اس خونی ہاتھ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دوں گی۔"

شکنتلا...... چندرا دیوی کی یہ بات سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ چندرا دیوی اس واقعہ کی تہہ میں پہنچ جائے گی۔ اب فرار کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ اسے رام کہانی سنانے کے سوا چارہ نہیں رہا تھا۔

"کیا وہ واقعہ سنانا بے حد ضروری ہے......؟" شکنتلا نے بہ مشکل اپنے آنسوؤں پر قابو پا کر پوچھا۔

"ہاں جانی......!" چندرا دیوی نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "اس لئے کہ میں جاننا چاہتی ہوں کہ تم کس مصیبت میں پھنسی تھیں؟"

"ٹھیک ہے......" شکنتلا نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں آپ سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گی۔"

"اچھا......" چندرا دیوی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں کافی اور سینڈوچز بنا لاتی ہوں...... اتنی دیر میں خود کو سنبھال لو۔"

جب چندرا دیوی ٹرالی دھکیلتی ہوئی کمرے میں آئی تو شکنتلا نارمل ہو چکی تھی۔ وہ اپنی کہانی سنانے لگی۔

"یہ تو آپ جانتی ہیں کہ میں خاص طور پر جزیرہ مالدیپ سے ملنے اور اس سنگین مسئلے کو حل کروانے آئی ہوں...... میں جزیرہ مالدیپ کی حسین ترین لڑکی مانی جاتی ہوں...... جزیرہ مالدیپ میں ہزاروں جزیرے ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ میری جیسی حسین لڑکی پیدا ہوئی نہ ہوگی...... کاش......! میں اس قدر حسین نہ ہوتی اور میرا حسن میرے لئے مصیبت نہ بن جاتا...... بچپن سے ہی میرے حسن کا چرچا ہونے لگا تھا اس کی وجہ میری اٹھان تھی...... اسکول میں لڑکیوں نے میرا نام حسن کی دیوی رکھ دیا...... میں اس نام سے اس قدر مشہور ہوئی کہ لوگ میرا اصل نام تک بھول گئے...... مگر گھر والے مجھے شکنتلا ہی کہہ کر پکارتے تھے...... میں جوان کیا ہوئی میرا حسن...... اور قیامت خیز ہو گیا۔ میں نے میٹرک امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور کالج میں داخلہ لے لیا...... میں نے محسوس کیا کہ کالج اور میرے علاقے کے لڑکے بھی مجھ میں دلچسپی لینے لگے ہیں...... بلکہ میرے حصول کے خواب دیکھتے ہیں اور بہت سارے گھرانے مجھے اپنی بہو بنانے کے خواہش مند ہیں...... کچھ لڑکوں نے مجھے محبت بھرے خط لکھنے شروع کئے...... میں پڑھے بغیر ہی انہیں پھاڑ دیتی تھی...... کالج میں لڑکے مجھ سے بات کرتے تو میں ان سے بڑی سادگی، نرمی اور اخلاق سے بات کرتی تھی۔ مجھ میں پندار حسن بالکل بھی نہ تھا...... مجھے ایسے لڑکوں سے سخت نفرت تھی جو لڑکیوں کو ندیدی نظروں سے گھورتے تھے...... میں ان لڑکوں کی بری نظروں اور ان کے بے ہودہ عشقیہ خطوط سے بہت ہی پریشان تھی...... مجھے اندازہ نہ تھا کہ میں تعلیم حاصل کرنے والے ایسے لغو، بے ہودہ اور گھٹیا قسم کے خط لکھ سکتے ہیں اور لکھتے ہیں...... میں اس بات سے ڈرتی تھی کہ ان میں سے کوئی خط گھر والوں کے ہاتھ لگ گیا تو وہ

میرے بارے میں کیا سوچیں گے......؟

اگر انہوں نے مجھے گھر میں بیٹھالیا...... کالج سے نکال دیا...... گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگادی تو یہ بڑے دکھ کی بات ہوگی...... مجھے صرف تعلیم سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ جب کہ میری کچھ ہم جماعت لڑکیاں اور سہیلیاں جو خوب صورت اور پرکشش بھی تھیں انہیں تعلیم سے زیادہ عشق و محبت سے دلچسپی تھی...... ان کی آنکھوں میں انجانے خواب لہراتے تھے...... وہ پیاسی سی ہوتی تھیں...... وہ نہ صرف لڑکوں سے محبت کرتی تھیں بلکہ ان کے درمیان عشقیہ خطوط کا تبادلہ بھی ہوتا تھا...... وہ چھپ چھپ کر کالج کے لڑکوں اور اپنے عاشقوں سے ملتی تھیں۔ ان میں کچھ لڑکیاں بہت دور تک چلی گئی تھیں...... عزت کھو کر پچھتا رہی تھیں۔ کیوں کہ ان لڑکوں نے ان سے جی بھر کے فائدہ اٹھانے کے بعد اور سے شادی کرلی تھی۔

لڑکیاں...... مجھے لڑکوں کے خط دکھایا کرتی تھیں...... اور وہ تنہائیوں میں ملاقات کے احوال مزے لے لے کر بیان کرتی تھیں...... ان کی ملاقاتیں مندروں کے قرب و جوار میں جو جھاڑیاں تھیں وہاں ہوتی تھیں...... لیکن میرے دل میں کوئی ہل چل نہیں ہوتی تھی...... میں اس بات کو خوب جانتی اور سمجھتی تھی کہ یہ لڑکے محبت کا فریب دے کر فائدہ اٹھاتے ہیں...... وہ بھونرے ہوتے ہیں...... یوں میں بھی دوسرے مزاج کی لڑکی تھی...... میری سوچ بھی مختلف تھی۔ میں ان لڑکیوں کو بڑی بوڑھیوں کے انداز میں سمجھاتی رہتی تھی کہ وہ ان چکروں میں نہ پڑیں...... عشق و محبت کے بجائے تعلیم پر توجہ دیں۔ یہ لڑکے فریبی اور دغاباز اور بھیڑیے صفت ہوتے ہیں...... محبت غریب لڑکیوں کو راس نہیں آتی ہے۔

مالدیپ شہر میں ایک پنڈت جی جگدیش شرما تھے...... وہ مندر میں اپنا وقت گزارتے تھے۔ وہ بڑے نیک، شریف اور مخلص تھے۔ ان کی بڑی عزت تھی اور احترام بھی کیا جاتا تھا...... ایک مرتبہ چیچک کی وبا پھیلی تو ان کی پتنی موت کی نذر ہوگئیں...... ان کا بیٹا سریش بچ تو گیا لیکن اس کا چہرہ داغوں سے بھر گیا...... پتنی کی موت کے بعد انہوں نے دوسری شادی نہیں کی...... ان کی پتنی صرف ایک لڑکا چھوڑ کر مری تھی...... انہوں نے اس خیال سے دوسری شادی نہیں کی کہ تھی ان کا اکلوتا اور بدصورت بیٹا کہیں سوتیلی ماں کے ظلم و ستم کا شکار نہ ہوجائے...... سریش جوان ہوا تو احساس محرومیوں کا شکار ہوگیا...... آوارہ اور بدمعاش اور غنڈہ بن گیا...... لوگ کہتے تھے کہ اوتار کے ہاں شیطان نے جنم لیا ہے۔ باپ نے اسے سدھارنے کی ہر ممکن کوشش کی...... وہ راہ راست پر نہیں آیا صدمے نے ان کی جان لے لی۔

مالدیپ میں ایک شخص تھا...... اس کا نام تھا مہی پال...... وہ سفلی اور پراسرار علوم کا بڑا ماہر تھا...... جادو ٹونے اور گنڈوں کو اس نے ذریعہ معاش بنایا ہوا تھا...... وہ نہ صرف کالے جادو کا توڑ جانتا تھا بلکہ کالا جادو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا...... جسونت نے باپ کی موت کے بعد اس کی شاگردی کرلی تھی...... تین چار برسوں میں اس نے اپنے استاد سے بہت کچھ سیکھ لیا تھا...... وہ بھی ایک جادوگر بن گیا تھا...... وہ کسی نہ کسی موقع پر اپنے کمالات دکھا کر لوگوں کو مرعوب اور متاثر کرتا رہتا تھا...... مہی پال جب تک زندہ رہا کسی کو بلاوجہ پریشان کیا اور نہ اس نے جسونت کو اس بات کی اجازت دی کہ اس علم سے کسی کو ہراساں کرے...... اس کی موت کے بعد جسونت کو جیسے ہر بات کی چھوٹ مل گئی...... لوگ اس کی حرکتوں سے نالاں اور پریشان رہنے لگے۔

وہ ایک بدنیت شخص تھا...... لڑکیاں اور عورتیں اس کی کمزوری تھیں...... اس نے اپنے جادو کے زور سے کئی لڑکیوں اور عورتوں کو تباہ کیا...... اس میں ان لڑکیوں اور عورتوں کا زیادہ...... دوش تھا...... اس لئے کہ وہ اس کے پاس اپنے خوابوں ارگھریلو جھگڑوں سے نجات پانے کے لئے آتی تھیں وہ بڑا چرب زبان تھا اور سبز باغ دکھاتا تھا...... اس نے اپنے جادو کے زور سے ان سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ لڑکیاں اس کی شکل سے خوف کھاتی تھیں...... اس وقت جب کوئی لڑکی اور عورت اپنی غرض سے آتی

تھیں اس پر ایسا منتر پھونک دیتا تھا کہ اس کا چہرہ اسے بھلا سا لگتا تھا...... اور پھر وہ ہپناٹائز بھی کرکے ان کی عزت سے کھیلتا تھا۔ وہ ان سے رقم بھی اینٹھتا تھا۔

جو غیر ملکی سیاح عورتیں مالدیپ آتی تھیں وہ ان کا گائیڈ بن جاتا تھا اور اپنی شکل بہت خوب صورت بنالیتا تھا۔ یہ عورتیں جنس زدہ ہوتی تھیں...... وہ اپنے جادو منتر اور ہپناٹائز سے ان عورتوں کو پھانستا تھا۔ اس کے پاس غیر ملکی کرنسی کی بہتات تھی۔ سیزن میں وہ سب سے زیادہ غیر ملکی کرنسی کماتا تھا...... ان امریکی عورتوں سے...... جو بڑی پارسا بنتی تھیں۔ وہ اپنی راتیں شباب اور مرد کے بغیر نہیں گزارتی تھی وہ انہیں شراب گراں قیمت پر فروخت کرتا تھا۔ اپنے جادو منتر سے اس کی آمدنی بڑھتی جارہی تھی۔

وہ ہائی اسکول اور کالج کی لڑکیوں کا دیوانہ تھا...... اس لئے وہ لڑکیوں اور عورتوں کو چھیڑتا...... فقرے کستا...... آنکھوں ہی آنکھوں میں دعوت گناہ دیتا تھا...... لڑکیاں اسے دیکھے بغیر گزر جاتی تھیں...... وہ مجھے دیکھ کر سینے پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتا اور مودبانہ انداز سے نمسکار کرتا تھا۔ لیکن اس نے کوئی معیوب حرکت سرراہ نہیں کی تھی۔ لیکن جب کبھی میں کسی کام سے گھر سے نکلتی تو اسے اپنے تعاقب میں ضرور دیکھتی جیسے وہ ہر لمحہ میری راہ تکتا رہتا ہو۔

لیکن وہ مجھے روزانہ ایک خط ضرور لکھتا تھا۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا جو اس نے ناغہ کیا ہو۔ میں نے صرف اس کا ایک ہی خط پڑھا تھا...... اس نے اس میں لکھا تھا کہ...... میری رانی...... میرے دل کی رانی...... تم نہیں جانتی ہو میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں...... جب تم میری نظروں سے اوجھل رہتی ہو اس وقت میری حالت ایک بے آب مچھلی کی طرح ہوتی ہے...... لیکن نظروں سے اوجھل ہو کر میرے دل میں بسی ہوتی ہے...... رات جب میں سونے کے لئے بستر پر دراز ہوتا ہوں تو بستر پر اس طرح کروٹیں بدلتا ہوں جیسے انگاروں پر لوٹ رہا ہوں...... رات کس طرح کاٹتا ہوں...... جدائی کا ایک ایک لمحہ کس طرح سے اذیت ناک اور سوہان روح ہوتا ہے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتی ہو...... میرے چشم تصور میں تم ہی تم ہوتی ہو......

بات یہ ہے کہ ایک رات، پونم کی رات میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہیں دیکھنے کے لئے آیا...... اس سے پہلے دو مرتبہ اندھیری راتوں میں تمہارے صحن میں اترا تھا...... گرمی اور حبس تھا...... تمہارے کمرے میں نائٹ بلب جل رہا تھا...... گرمی اور حبس کے باعث تم مختصر اور نامناسب سے لباس میں مسہری پر گہری نیند سو رہی تھیں...... میں پھو پھٹنے تک اندھیرے میں کھڑا تمہارا توبہ شکن نظارہ کرتا رہا...... میرے جذبات تند ہونے لگے...... میں نے دل اور جذبات پر کس طرح جبر کیا یہ میرا دل اور میں جانتا ہوں......

میں اب ہر روز راتوں کو آکر تمہارا چہرہ اور سراپا نظروں میں جذب کرتا ہوں...... لیکن اب مجھ میں صبر اور برداشت کی تاب نہیں رہی ہے...... میری رانی......! میرے دل کو تڑپاؤ نہ...... وہ پہلے سے زخمی ہے...... اسے مزید لہولہان نہ کرو...... ورنہ میں مرجاؤں گا......" اس میں مزید ایسی بے ہودہ اور شرمناک باتیں لکھی ہوئی تھیں کہ میں بیان نہیں کرسکتی...... وہ لفنگا تھا...... میں نے وہ خط پھاڑ کر پھینک دیا...... جواب نہ دینے کے باوجود وہ روزانہ خط لکھتا اور میں پھاڑ پھاڑ کر پھینکتی رہی...... دو ایک ایسے خط ملے جو کھلے لفافے میں تھے...... اس میں اس نے مرد کی عریاں تصویر بنائی ہوئی تھیں...... وہ ایک اچھا آرٹسٹ تھا...... میں نے والدین کو اس بات سے چھپایا ہوا تھا کہ یہ کمینہ...... ذلیل اور شیطان مجھے روزانہ خط لکھتا ہے۔

اس کا ایک خط جو لفافے کے فرش پر پڑا تھا وہ دھمکی آمیز تھا...... اس میں اس نے لکھا تھا کہ تم تین دن کے اندر اندر عقبی دروازے کے باہر ملو...... اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میں نہ صرف تمہاری بلکہ تمہارے گھر والوں کی زندگی اجیرن کرکے رکھ دوں گا...... میں ایسا جادو جانتا ہوں کہ تم میری بانہوں میں آکر

سما جاؤ گی۔ اپنی عزت میرے حوالے کردو گی...... پھر میں تمہاری بہن اور بھابھی کو نشانہ بناؤں گا...... تمہاری ماں کو بھی۔ وہ بھی اپنی عزت بچا نہ سکے گی۔

میں نے اسے گیدڑ بھبکی سمجھی۔ میں یہ بات جانتی تھی کہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں...... اگر اسے کچھ کرنا ہوتا تو کب کا کر چکا ہوتا۔

میں رات گیارہ بجے تک جاگ کر پڑھتی رہتی تھی۔ میرا کمرا سب سے پیچھے اور کونے میں تھا...... اس کا ایک دروازہ اور کھڑکی عقبی راستے کی طرف تھی...... عقبی دروازے کے پاس تین چار کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں...... ان میں غلہ اور لکڑیاں رکھی تھیں...... اس کے علاوہ اور بھی ضرورت کا سامان موجود تھا۔ ایک طرح سے یہ اسٹور بھی تھا۔

آسمان کے چوڑے چکلے سینے پر چودھویں رات کا چاند کسی دلہن کی طرح لگ رہا تھا...... گرمی کے باعث میں چولی اور گھاگھرے میں سوتی تھی...... میں ایسی گہری نیند سوئی تھی کہ مجھے اپنا ہوش نہ لباس کی بے ترتیبی کا...... میں نیم عریاں حالت میں تھی...... نیند میں گرمی کی وجہ سے بلاؤز کے بٹن کھول لئے تھے...... اگر میرے گال پر مچھر نے کاٹا نہ ہوتا تو جانے کتنی دیر تک سوتی رہتی...... آنکھ کھلتے ہی معاً میری نگاہ کھڑکی پر پڑی تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا...... وہ مردود کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ کھڑکی میں سلاخیں نہ ہوتی اور میں نے دروازے کی اندر سے چٹخنی لگائی نہ ہوتی تو وہ اندر آ جاتا اور پھر وہ مجھے درندگی کا نشانہ بناتا...... اس کے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خباثت چھائی ہوئی تھی اس کی آنکھوں میں ہوس بھری تھی...... میرے تن بدن میں آگ لگ گئی کہ اس کمینے کی یہ مجال میرے گھر میں گھس آئے...... میں نے پوری قوت جمع کر کے چیخنا چاہا تھا کہ گھر والے بیدار ہو جائیں...... اس نے جادو کے زور سے میرا منہ بند کر دیا...... میرا چہرہ ایک دم سے سفید پڑتا چلا گیا تھا اور سامنے آئینے میں مجھے اپنا چہرہ دکھائی دیا...... اس میں لہو کی ایک بوند تک نہ تھی...... دوسرے لمحے میں نے دیکھا اس کی آنکھوں سے روشنی نکل رہی ہے۔

پھر اس کی آنکھوں سے شعاعیں پھوٹنے لگیں اور میری آنکھوں میں گھسنے لگیں...... وہ آہستہ آہستہ کچھ پڑھتا جا رہا تھا...... چند لمحوں کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرا سارا غصہ اور نفرت جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ پھر اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''میری رانی......! ادھر آؤ...... یہ لبادہ تمہارے جسم پر اچھا نہیں لگ رہا ہے...... اسے اتار پھینکو...... وہ دیکھو آسمان پر چاند بھی بے نقاب ہے...... اپنا جلوہ دکھا رہا ہے...... تم بھی چاند بن جاؤ...... میری چاند......!''

میں سحر زدہ سی ہو کر اس کی طرف بڑھی۔ میں نے اس کے حکم پر بلا چوں و چرا اور جھجک کے عمل کیا۔

میں چوکھٹ پر پہنچی...... ہم دونوں کے درمیان سلاخوں والی کھڑکی حائل تھی۔

''میری رانی......! بات نہیں بن رہی ہے...... تم ایسا کرو...... دروازہ کھول کر باہر آ جاؤ......''

پھر میں کسی معمول کی طرح دروازے کی طرف بڑھی۔ میں چوں کہ اس کے طلسم کی اسیر تھی اس لئے کسی بات کا ہوش تھا اور نہ اپنی اس حالت کا...... میں دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ پھر وہ مجھے سامنے بند کمرے میں لے گیا۔

میں سحر زدہ سی ہو کر اس کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ مجھے اپنی آغوش میں لینے کے لئے بے تاب سا ہو رہا تھا...... اس کی آنکھوں میں ہوس ناچ رہی تھی...... اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ چپکی ہوئی تھی...... چوں کہ میری نگاہ اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھی اور بستر کی طرف بڑھ رہی تھی کہ مجھے ایک دم سے ٹھوکر لگی...... ٹھوکر میرے پیر کے انگوٹھے میں لگی تھی...... ٹھوکر کے لگتے ہی میرے منہ سے کراہ نکلی۔ میں درد کی شدت سے بلبلا کر فرش پر بیٹھ گئی...... میں نے دیکھا کہ فرش پر کلہاڑی پڑی ہے...... اس کے پھل کی نوک سے میرا انگوٹھا لگا تھا۔ دوسرے لمحے میں اپنی تکلیف بھول کر ایک دم سے اچھل پڑی اور

ششدر سی ہو گئی کہ یہاں کیسے آئی اور وہ بھی اس حالت میں......؟ یقین نہ آیا کہ بدن پر ایک دھجی تک نہیں...... خون نکلنے سے جادو ٹوٹ گیا تھا...... اس پر نگاہ پڑتے ہی میں سارا معاملہ سمجھ گئی۔ میں نے جھٹ سے کلہاڑی اٹھا لی اور سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی...... اس نے فوراً ہی کھڑے ہو کر مجھ پر جست لگائی۔ میں چوں کہ چوکنا اور مستعد تھی اس لئے بجلی کی سی تیزی سے ایک طرف ہٹ گئی۔

ایک طرف لکڑیوں کا جو ڈھیر رکھا تھا وہ اس پر جا گرا...... معلوم نہیں اس وقت مجھ پر کیسا اندھا جنون سوار ہو گیا۔ میں آج بھی سوچ کر حیران ہوتی ہوں...... نفرت، غصے اور اشتعال نے مجھے ہر قسم کی سوچ اور ہوش سے بیگانہ کر دیا...... میں نے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے کلہاڑی کو تھام لیا...... پھر آنکھیں بند کر کے اس ذلیل پر پوری قوت سے وار کر دیا...... اسے اتنی مہلت بھی نہیں مل سکی تھی کہ وہ اٹھ کر بیٹھ سکے۔ اپنا دفاع کر سکے اور میرے حملے سے اپنے آپ کو بچا سکے...... اس کے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکلی...... میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو لرز کر رہ گئی اور میرا سارا لہو جسم میں خشک ہو گیا...... اس کا دایاں ہاتھ کلائی تک کٹ کر فرش پر پڑا تھا اور درد سے تڑپ رہا تھا۔ تڑپتے تڑپتے وہ تحلیل ہونے لگا۔ پھر نظروں سے اوجھل ہونے لگا۔

میں کٹا ہوا خون آلود ہاتھ دیکھ کر خوف و دہشت سے بے ہوش ہو گئی۔ میں ہوش میں آئی تو اندازہ نہ ہو سکا کہ کتنی دیر تک بے ہوش رہی۔ میں فرش پر ہاتھ کے پاس بے ہوش پڑی تھی...... میں جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی...... میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں...... اپنے آپ کو بے لباس دیکھ کر کمرے میں آئی...... کپڑے پہن کر اس کوٹھری میں آ گئی۔

کچھ دیر تک تذبذب اور سوچ کے دوراہے پر کھڑی رہی...... پہلے تو یہ خیال آیا کہ گھر والوں کو جگا کر اس واقعہ کے بارے میں بتا دوں۔

پھر میں نے سوچا کہ...... معلوم نہیں گھر والے کیا نتیجہ اخذ کریں...... نوکروں کو بھی اس واقعہ کے بارے میں کسی نہ کسی طرح معلوم ہو ہی جائے گا۔ پھر طرح طرح کی کہانیاں اور قصے عام ہو جائیں گے...... میری اور میرے گھر والوں کی رسوائی اور بدنامی ہو گی...... مجھے کوئی اور ہی تدبیر کرنی ہو گی۔ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ اس ذلیل کی چیخ سن کر پڑوسی اور گھر والے بیدار نہ ہوئے۔

پھر میرے ذہن میں ایک تدبیر بجلی کی طرح آئی...... بہتر ہے کہ زبان بند رکھی جائے...... میں نے فوراً کوٹھری کے ایک کونے سے سامان ہٹا کر وہاں کھدائی کی...... اور اس خون آلود ہاتھ کو گڑھے میں دبا کر مٹی سے فرش ہموار کر دیا۔ اس طرح کہ پتا نہیں چلے کہ یہاں کھدائی ہوئی تھی...... پھر وہاں سامان رکھ دیا...... لکڑیوں پر جو خون کے دھبے اور چھینٹے پڑے تھے انہیں مٹانا تھا...... میں نے صابن کو گیلے کپڑے میں لگا کر اس سے صاف کر دیا۔

پھر اپنے کمرے میں انگوٹھے کے زخم صاف کئے...... اور سونے کے لئے بستر پر دراز ہو گئی...... میں یہ سوچ کر کانپ گئی کہ اگر مجھے ٹھوکر نہ لگتی تو میری عزت نہ بچتی اور میں نے اس کا ہاتھ کاٹ کر اچھا کیا...... وہ مردود اپنی آرزو پوری نہ کر سکا...... اب وہ کبھی میری عزت کے درپے نہیں ہو گا...... یہ سارا واقعہ ڈراؤنے خواب کی طرح لگ رہا تھا۔

میں نے اس ہولناک واقعہ کا کسی سے بھی ذکر نہیں کیا...... اس روز سے وہ شیطان کہیں دکھائی نہیں دیا۔ وہ اچانک اور پراسرار طور پر لاپتہ ہو گیا تھا...... میں نے سکون و اطمینان کا سانس لیا۔

اس طرح ایک برس بیت گیا...... اس واقعہ کے ایک برس بعد میری شادی ہو گئی...... پھر میں مالدیپ آ گئی...... میری شادی کو دو برس کا عرصہ بھی نہیں گزرا کہ مجھ سے انتقام لینے کے لئے وہ آ گیا۔ میں نے اس کے جس ہاتھ کو کاٹ دیا تھا اس ہاتھ سے وہ معصوم لڑکیوں کو موت کے گھاٹ اتار رہا ہے...... ان کی عزت برباد کر رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اس مردود کو ایسی عبرتناک سزا دیں کہ وہ کتے کی موت مرے۔''

وہ اپنی کہانی ختم کر کے سسکیاں بھرنے لگی۔

☆......☆......☆

تیسرے دن چندرا دیوی اور شکنتلا مالدیپ میں تھیں۔

چندرا دیوی اپنی سہیلی شانتی کانت کے ہاں ٹھہری تھی...... چندرا دیوی نے یقین دلایا تھا کہ وہ دوسرے دن ہی اس ہاتھ کا خاتمہ کردے گی...... چندرا دیوی نے اسے ایک انگوٹھی دی کہ وہ پہن لے...... کٹا ہوا ہاتھ اگر آیا تو اس سے ڈر اور خوف کی بات نہیں وہ بال بیکا کرنا تو دور کی بات ہے قریب بھی نہیں آئے گا۔

رات کے وقت شکنتلا جب اپنے پتی کو چندرا دیوی سے ملاقات کے بارے میں بتا رہی تھی اس وقت دونوں ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ پر آئے...... انہوں نے اندر گھسنے کے لئے بڑا زور لگایا...... لیکن وہ ناکام رہے۔

دوسرے دن سہ پہر کے وقت چندرا دیوی اس شیطان کی تلاش میں نکلی...... ایک بہت ہی چھوٹا سا جزیرہ جس پر کوئی آبادی نہیں تھی...... اس لئے کہ اس میں ڈھلان تھی...... زیادہ سے زیادہ دو مکانوں کی گنجائش تھی اس لئے وہاں کوئی مکان یا آبادی نہیں تھی۔ صرف ایک کٹیا تھی جسے منحوس ہاتھ نے اپنا مسکن بنایا ہوا...... ایک پندرہ برس کی لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ وہ اس وقت انسانی روپ میں تھا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی اسے جادو کے زور پر ایک قریبی جزیرے سے اٹھا لایا تھا...... اسے اپنی غرض پوری کرنے کے لئے بے ہوش کیا ہوا تھا۔ وہ لڑکی نہایت حسین وجمیل تھی۔ اسے چندرا دیوی کی آمد کی خبر نہ تھی۔ اس وقت اس نے لڑکی کو بے لباس کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ چندرا دیوی نے تیز لہجے میں کہا۔

"خبردار...... جو تم نے اسے ہاتھ لگایا۔"

اس شیطان نے پلٹ کر چندرا دیوی کو حیرت سے دیکھا۔ اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا کہ...... کوئی عورت اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے......؟ اسے جتنی حیرت ہوئی اتنی خوشی بھی کہ شکار چل کر اس کے پاس آیا تھا...... وہ پہلی بار اس قدر حسین عورت کو دیکھ رہا تھا۔

"کون ہو تم......؟" جسونت غرایا۔ "پیاری چیز ہو......"

"تمہاری موت......" چندرا دیوی بولی۔ "تمہیں سزا دینے آئی ہوں...... تم نے بڑے پاپ ہیں...... میں تمہیں ایک لمحے میں موت کی نیند سلا ہوں...... لیکن ایسا نہیں کروں گی۔ اس لئے تم مو کے آنے تک اذیت بھری زندگی گزارو......"

"تم میرا بال تک بیکا نہیں کر سکتی۔" استہزائیہ لہجے میں بولا۔ "میں تمہیں جی بھرنے تک کی زینت بناتا رہوں گا۔"

چندرا دیوی نے اسے ایک معذور اور اپا بنا دیا...... صلاحیت سے اسے محروم کردیا...... پھر لڑکی ہوش میں لا کر اس کے گھر پہنچا دیا...... وہ دس دن تک مالدیپ میں رہ کر واپس آگئی۔

☆......☆......☆

ایک روز اس سے ملنے سریش کمار آیا اور بولا "تم دنیا بھر کے نیک کام کرتی رہتی ہوں۔ لیکن ایک کام نہیں کر سکتی ہو۔"

"وہ کیا......؟" چندرا دیوی بولی۔ "تم حکم کرو۔"

"میرے لئے ایک جیون ساتھی تلاش کرو۔ اب میں بغیر شادی کے نہیں رہ سکتا...... ایک لڑکی میری نظر میں ہے کیا تم اسے رام کر سکتی ہو؟"

"کیوں نہیں......" چندرا دیوی بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ اس کے دل پر چوٹ لگی تھی۔ اس لئے کہ وہ سریش سے محبت کرتی تھی۔ "کون ہے وہ؟"

"تم......" سریش کمار نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

چندرا دیوی کو یقین نہ آیا۔ وہ سرخ ہو کر بولی۔

"سریش......! میری بات سنو...... میں......"

سریش کے ہونٹوں نے اس کے شیریں ہونٹوں کو بولنے نہیں دیا...... اس پر مہر محبت ثبت کردی۔

(ختم شد)

بدروح

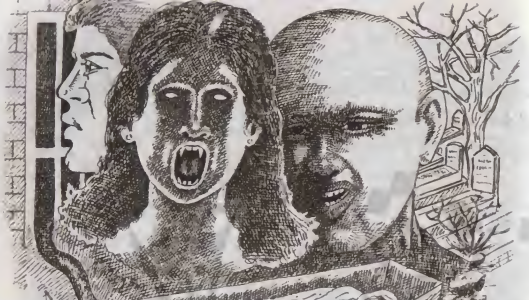

شاہد سلیم۔ حسن ابدال

بزرگ نے جیسے ہی قرآنی آیات پڑھ کر نوجوان پر پھونک ماری تو نوجوان کا چہرا بگڑ گیا اور اس نے ایک بھیانک چیخ مار کر بھاپ نکلتے پانی کی طرف بڑھا اس کی چیخیں بدستور نکل رہی تھیں۔ اس کی چیخوں سے پورا قبرستان لرز گیا۔

دل ودماغ پر خوف ودہشت طاری کرتی اپنی نوعیت کی ایک انوکھی اچھوتی اور خطرناک کہانی

سعدیہ اور نعیم کی جوڑی بے مثال تھی۔ نعیم کا سعدیہ کے ساتھ بہت اچھا رویہ تھا۔ وہ دونوں اگر کسی بات پر لڑ پڑتے تو سعدیہ ایک اچھی بیوی کی طرح خاموش ہو جاتی تاکہ بات آگے نہ بڑھے۔ یہی بات نعیم کو پسند تھی۔

نعیم ایک مل میں کام کرتا تھا جس سے اچھا خاصا گزارا ہو جاتا تھا۔ ایک روز کام سے واپسی پر اسے کافی دیر ہوگئی۔ راستے میں ایک پرانا قبرستان پڑتا تھا۔ اس جگہ تو دن میں بھی ڈر لگتا تھا مگر نعیم ایک نڈر اور دلیر جوان تھا۔ رات تقریباً گیارہ بجے جب وہ قبرستان سے گزر رہا تھا تو اسے دور سے روشنی نظر آئی۔ اس روشنی میں ایک سایہ نظر آیا۔ وہ آہستہ آہستہ جب درختوں کی اوٹ لیتے ہوئے وہاں گیا تو حیران رہ گیا۔ وہاں کوئی پنڈت اپنی زبان میں کچھ پڑھ پڑھ کر آگ جو اس کے آگے جل رہی تھی اس پر پھونک رہا تھا اور کوئی چیز آگ میں پھینکتا تو دھواں اٹھتا۔

نعیم کو ایک شرارت سوجھی، اس نے قریب ہی پڑا ہوا ایک پتھر اٹھا کر آگ میں پھینک دیا تو ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔ چیخنے چلانے کی آوازیں ہر سو آنے لگیں۔ پھر بلند آواز سنائی دی۔

"مورکھ! تو نے میرے عمل میں خرابی کی اور میری جان چلی گئی، مگر جس آتما پر میں یہ عمل کررہا تھا۔ وہ تیرا پیچھا مرنے تک نہیں چھوڑے گی۔ تیرے ذریعے وہ انسانوں کا خون پیئے گی اور تجھ سے میرا انتقام بھی لے گی۔" اس کے بعد ایک آندھی سی چلنے لگی۔

نعیم وہیں ساکت ہوگیا۔ خون اس کی رگوں میں منجمد ہوگیا اور چلنے کی سکت نہ رہی۔ پھر آندھی آہستہ آہستہ تھمنے لگی اور وہاں صرف دھواں رہ گیا۔ پھر دھوئیں نے ایک خوف ناک بلا کی شکل اختیار کرلی۔ اب وہ بلا آہستہ آہستہ نعیم کی طرف بڑھنے لگی۔ نعیم کو کسی نادیدہ طاقت نے وہاں رکنے پر مجبور کردیا تھا۔ جب وہ بدروح نعیم کے بالکل قریب آئی تو اس کی آنکھیں تیزی سے گھومنے لگیں۔ وہ پھر دھوئیں کی شکل اختیار کرگئی، پھر وہ دھواں نعیم کے جسم میں حلول کرگیا۔ نعیم کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

گھر میں اس کی بیوی سعدیہ کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہورہی تھیں مگر وہ نعیم کا انتظار کررہی تھی، جب اس کی آنکھیں بند ہونے کو آئیں تو دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی۔ سعدیہ نے جلدی سے آنکھیں کھولیں اور اس نے سوچا "نعیم تو اس قدر زور سے دستک نہیں دیتا۔" پھر خیال آیا۔ "دیر سے آنے کی وجہ سے ایسا کررہا ہے۔" وہ اٹھی اور اس نے دروازہ کھولا تو نعیم کمرے میں داخل ہوا۔ سعدیہ نے نعیم کی آنکھوں میں عجیب سی اجنبیت محسوس کی مگر نظر انداز کردی اور بولی۔ "آپ نے اتنی دیر کردی۔"

نعیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ "میں نے آپ کے لئے آپ کی پسند کی چیزیں بنائی ہیں۔" سعدیہ نے چہکتے ہوئے کہا۔

"گوشت۔" نعیم نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

سعدیہ سمجھی کہ نعیم مذاق کررہا ہے۔ ایک تو وہ گوشت کھاتا نہیں، دوسرا وہ غرا کر مجھے ڈرا رہا ہے۔" سعدیہ نے پھر سوال کیا۔ "اچھا آپ پیئیں گے کیا؟" اسے پتہ تھا کہ نعیم سوپ پیتا ہے۔

"خون!" نعیم نے بدستور غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

سعدیہ گھبرا گئی کہ آج نعیم کو کیا ہوگیا ہے؟ جب اس نے نعیم کے چہرے کی طرف دیکھا تو خوف سے اس کی گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔ کیوں کہ اس کا چہرہ بگڑا ہوا تھا اور اس کے ہاتھوں پر لمبے لمبے بال نمودار ہوگئے تھے۔ نوکیلے ناخن بڑھ رہے تھے اور نعیم اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اور سعدیہ کی جانب بڑھنے لگا۔ تو سعدیہ بے اختیار چیخنے لگی۔

ادھر نعیم کی والدہ نعیم کے دیر سے آنے کی وجہ سے ٹھیک طرح سے سو نہ سکی تھیں۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگیں کہ چیخ کی آواز کہاں سے آئی؟ وہ اسے اپنا وہم سمجھ کر لیٹنے ہی لگی تھیں کہ چیخ کی گھٹی گھٹی آواز دوبارہ سنائی دی۔ وہ پہچان گئیں کہ یہ آواز سعدیہ کی ہے۔ ادھر نعیم اٹھا اور بڑھتے ہوئے ناخن سعدیہ کی گردن میں پیوست کردیئے اور پھر آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں کے لمبے نوک دار ناخنوں سے اس نے سعدیہ کا گلا ادھیڑ دیا تو گلے میں سے بھل بھل خون بہنے لگا۔ بدروح اس کا سارا خون پی کر، تیز تیز قدموں سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

ادھر نعیم کی والدہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی سعدیہ کے کمرے میں گئیں تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جب وہ اندر گئیں تو دہشت سے ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ خوف سے ان کے منہ سے چیخ بھی نکل نہیں رہی تھی۔ پورا زور لگا کر چیخیں تو دوسرے کمرے سے ان کی بیٹی اور بیٹے بھاگتے ہوئے آئے تو ان کی بھی چیخیں نکل گئیں کیوں کہ سامنے ہی سعدیہ کی گردن ادھڑی ہوئی لاش پڑی تھی۔ آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں اور ان میں سے خوف نمایاں طور پر نظر آرہا تھا۔ ان کی والدہ بے ہوش تھیں۔ نورین نے انہیں سنبھالا۔ نعیم کے دونوں بھائی رضوان اور عمران جلدی سے سعدیہ کی لاش کے نزدیک گئے تو خوف سے کانپنے لگے۔ وہ جلدی سے باہر آگئے۔

پہلے صحن میں پھرتے رہے اور وہاں سے جب کچھ نہ ملا تو کمرے میں جا کر ٹارچیں اور ریوالور لے آئے۔ گیٹ سے باہر نکلے، باہر آکر ٹارچیں روشن کرلیں۔ جب ٹارچوں کی روشنی زمین پر پڑی تو بڑے بڑے پیروں کے نشانات تھے۔ وہ نشانات کی مدد سے آگے چل پڑے۔ تھوڑے

فاصلے پر جا کر پیروں کے نشانات ختم ہوگئے تھے۔ جہاں نشان ختم ہوئے وہاں نعیم پڑا ہوا تھا۔ ان دونوں نے نعیم کو جلدی سے آواز دی۔ "نعیم بھائی آپ۔" تو نعیم کھڑا ہوگیا۔ ایک دم کھڑا ہونے سے اس کے چھوٹے بھائی گھبرا گئے۔

ٹارچوں کی روشنی نعیم کے منہ پر ماری تو نعیم کا چہرہ بگڑ رہا تھا، دونوں کے خوف سے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ نعیم تیزی سے ان کی طرف بڑھنے لگا۔ پہلے تو وہ خوف سے ساکت ہوگئے لیکن پھر یکلخت ان میں حرکت پیدا ہوگئی، وہ دونوں سرپٹ بھاگ کھڑے ہوئے اور گھر جا کر دم لیا۔

وہ سعدیہ کے کمرے میں پہنچے تو وہاں نورین اور ان کی والدہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ محلے کی عورتیں بھی اکٹھی ہوگئی تھیں اور کافی خوف زدہ تھیں۔

تمام عورتوں کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ امی اور نورین کہہ رہی تھیں "کسی بھیڑیئے نے ہماری سعدیہ کو مار دیا" مگر انہیں کیا پتہ کہ وہ بھیڑیا کون ہے؟

ادھر نعیم کو بدروح ایک پرانے قبرستان میں لے گئی اور وہاں اسے ایک قبر میں لٹا دیا۔

نعیم بدروح کی مرضی سے ہر کام کررہا تھا۔ اس کی اپنی تمام ذہنی اور جسمانی طاقتیں ختم ہوچکی تھیں۔ وہ کسی کو نہیں پہچان سکتا تھا۔

صبح ہوچکی تھی۔ اور سعدیہ کے والدین اور بہن بھائی روتے پیٹتے ہوئے وہاں آگئے تھے۔ اور گھر والوں نے سعدیہ کی موت کی انہیں ساری تفصیل بتادی تھی۔

ادھر رضوان اور عمران پریشان تھے کہ بدروح نعیم کی شکل میں کیوں تھی؟ پھر کسی کو خیال ہی نہ رہا کہ نعیم کہاں ہے؟ خیال اس وقت آیا جب وہ جنازہ لے جانے لگے۔ نعیم کو بہت ڈھونڈا گیا مگر نعیم انہیں کہاں ملنے والا تھا۔ آخر تھک ہار کر انہوں نے سعدیہ کو دفنا دیا۔

سعدیہ کی تدفین کے بعد انہیں نعیم کا خیال آیا۔ جب رات ہوئی تو ان کی والدہ نے رضوان اور عمران سے پوچھا۔ "نعیم کا کچھ پتہ چلا؟ بل والوں سے پوچھو۔"

دونوں بھائیوں نے ماں کو رات والا سارا واقعہ سنایا۔ یہ سن کر ان کے رونگٹے کھڑے ہوگئے کیوں کہ انہیں پتہ تھا کہ سعدیہ ہمیشہ دروازہ بند رکھتی تھی اور نعیم کے آنے پر ہی کھولتی تھی۔

ادھر نعیم کی شکل میں بدروح کو پھر خون کی طلب محسوس ہوئی۔ وہ قبر میں سے باہر نکلا اور دوبارہ گاؤں کی طرف چل پڑا۔ راستے میں اسے گاؤں کا چوکیدار مل گیا۔ گاؤں کے چوکیدار نے اسے پہچان لیا اور بولا......

"تمہارے گھر والے تمہیں تلاش کررہے ہیں" مگر وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ نعیم کے ناخن بڑھنے شروع ہوگئے۔ چوکیدار چیخ بھی نہ سکا اور موت کی آغوش میں چلا گیا۔ بدروح نے ایک اور انسان کو موت کی نیند سلا دیا۔ جب صبح کے وقت چوکیدار اپنے گھر نہیں پہنچا تو اس کی بیوی کو تشویش لاحق ہوگئی اور جب لوگ چوکیدار کو ڈھونڈنے لگے تو جھاڑیوں میں اس کی کٹی پھٹی لاش کو دیکھ کر خوف سے کانپنے لگے۔

گاؤں میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ ہر صبح کسی نہ کسی کی کٹی پھٹی لاش ملنے لگی۔ ادھر نعیم کے بھائیوں نے پورا گاؤں چھان مارا مگر نعیم نہ ملا۔ پورے گاؤں میں نعیم کی گمشدگی کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔

ایک دن اسی گاؤں کا ایک نوجوان عثمان شہر سے واپس آرہا تھا، اسے کافی دیر ہوگئی تھی۔ وہ قبرستان کے راستے سے آرہا تھا۔ اس کے پاس پاور فل ٹارچ تھی۔ جب قبرستان کے وسط میں پہنچا تو اسے آہٹ سی محسوس ہوئی۔ عثمان نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا تو کوئی اس کے پیچھے آرہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ گاؤں میں ہر روز صبح کے وقت ایک لاش ملتی ہے۔ اس لئے اسے اپنی موت کا یقین ہوگیا کہ یہی وہ بلا ہے جو بے دردی سے لوگوں کا خون پیتی ہے۔ اس نے ٹارچ کی روشنی پیچھے آنے والے پر ڈالی تو وہ حیران رہ گیا کہ وہاں تو نعیم موجود تھا۔ نعیم آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا چہرہ خوف ناک ہونے لگا۔ عثمان کو پتہ چل گیا کہ نعیم کے جسم میں کوئی بدروح حلول کرگئی ہے اور اس کا اگلا شکار میں ہی ہوں۔ نعیم کو دیکھتے ہی عثمان نے دوڑ لگا دی۔ بدروح بھوکی تھی وہ بھی دوڑ پڑی۔ مگر عثمان تو جیسے بجلی کا بنا ہوا تھا۔ وہ "بچاؤ بچاؤ" کرتا ہوا گاؤں کی طرف بھاگا۔ سب لوگ گھروں سے

باہر نکل آئے۔ بدروح سٹپٹا گئی چنانچہ وہ وہاں سے واپس پلٹ گئی۔

لوگوں نے جب عثمان سے وجہ دریافت کی تو کہنے لگا۔ "شہر سے آتے ہوئے مجھے کافی دیر ہوگئی تھی۔ میں قبرستان کے راستے آرہا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے آہٹ سی محسوس ہوئی۔ جب میں نے پیچھے دیکھا تو کوئی میرے پیچھے تھا۔ جب میں نے ٹارچ کا رخ اس کی طرف کیا تو حیران رہ گیا کہ وہ نعیم تھا۔

عثمان کی باتیں سن کر تمام لوگوں کو یقین ہوگیا کہ کسی بدروح نے نعیم کے جسم پر قبضہ کرلیا ہے۔ لوگوں نے فیصلہ کرلیا کہ جہاں بھی نعیم نظر آئے تو اسے قابو کرنا ہے۔ رضوان اور عمران نے رات والا واقعہ کسی کو نہ بتایا تھا۔ گاؤں والوں کی زبانی سنا تو انہیں بھی یقین ہوگیا کہ یہ واقعی نعیم ہے۔

انہی دنوں گاؤں میں ایک درویش آئے وہ بہت پہنچے ہوئے تھے ہر کسی کی مشکل حل کرتے ہیں۔ انہیں لوگ شاہ صاحب کے نام سے جانتے تھے۔ وہ کسی ایک جگہ مستقل نہ رہتے تھے۔ ان کی جلالی آنکھیں، نورانی چہرہ اور سفید داڑھی تھی۔ جب وہ گاؤں میں داخل ہوئے تو لوگوں نے انہیں اپنا مسئلہ بتایا۔ شاہ صاحب فوراً نعیم کے گھر گئے۔ سب سے پہلے وہ نعیم کے کمرے میں گئے اور آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنے لگے۔ جب آنکھیں کھولیں تو ان کی آنکھیں سرخ ہوچکی تھیں۔ وہ بولے۔ "بدروح خون کی پیاسی تھی، شیطان کے پجاری نے اسے انسانی خون کا لالچ دیا اور اسے پرانے قبرستان میں لے آیا اور وہ اس پر عمل کر کے غلام بنانا چاہتا تھا مگر نعیم نے اس کے عمل میں خرابی کی۔ وہ پجاری تو مر گیا مگر بدروح کے ذہن میں عمل کی وجہ سے یہ بات پہنچ گئی کہ یہ میرا آقا ہے اور اس کے دل میں اپنے آقا کے لئے انتقام کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ نعیم کے جسم میں سما گئی اور اسے اپنا غلام بنالیا۔"

نعیم کی والدہ شاہ صاحب کے قدموں میں گر پڑیں اور روتے ہوئے بولیں۔ "شاہ صاحب میرے نعیم کو بچا لیں۔" شاہ صاحب نے نعیم کو بچانے کی حامی بھرلی۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ نعیم کے دونوں بھائی اوٹ میں تھے۔ شاہ صاحب قبرستان کے وسط میں کھڑے تھے۔ ان کے آگے پانی کا ایک بھرا ہوا ٹب موجود تھا۔ ٹب کے اردگرد گول دائرے میں آگ جل رہی تھی۔ شاہ صاحب منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر پانی پر پھونک مار رہے تھے۔ اچانک پانی میں سے بھاپ نکلنے لگی، تو شاہ صاحب با بلند آواز میں قرآنی آیات پڑھنے لگے ان کی آنکھیں بند تھیں، جب انہوں نے آنکھیں کھولیں تو وہ خون کے کبوتر کی مانند تھیں۔ انہوں نے ایک طرف منہ کر کے پھونک ماری تو قبرستان میں ایک ہولناک چیخ بلند ہوئی۔

ایک طرف سے نعیم آتا دکھائی دیا۔ شاہ صاحب کے سامنے آیا اور بولا۔ "آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟" شاہ صاحب کچھ نہ بولے اور مسلسل قرآنی آیات پڑھتے رہے۔ وہ جانتے تھے کہ بدروح میری توجہ ہٹانا چاہتی ہے۔ بدروح کا حربہ ناکام ہوگیا۔ شاہ صاحب نے آیات پڑھ کر اس پر پھونک ماری تو وہ ایک دہشت ناک چیخ کے ساتھ پانی کی طرف بڑھنے لگی۔

نعیم کے دونوں بھائی خوف زدہ ہوچکے تھے۔ نعیم کا چہرہ بگڑ چکا تھا۔ وہ بے اختیار پانی کی طرف جانے لگا۔ وہ آگ پر سے گزر کر پانی کے ٹب میں بیٹھ گیا، وہ بے اختیار چیخنے لگا، چیخوں کی آواز سن کر گاؤں کے کچھ لوگ بھی بلا سے نجات کا تماشہ دیکھنے وہاں آگئے۔ بلا پانی میں بیٹھی تو اور زیادہ بھاپ نکلنے لگی۔ اس کی چیخوں سے پورا قبرستان لرز گیا۔ مجبوراً بدروح کو نعیم کا جسم چھوڑنا پڑا۔ جب وہ اپنے اصلی چہرے کے ساتھ نعیم کے جسم سے نکلی تو وہاں موجود تمام لوگ خوف سے کانپنے لگے۔ جب وہ آگ کے پاس گئی تو آگ نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جلد ہی اسے راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کردیا۔ یوں بدروح اپنے انجام کو پہنچ گئی، اس کے ختم ہوتے ہی نعیم کو ہوش آگیا اور وہ بے چینی سے آگے پیچھے دیکھنے لگا اور بولا "میں کہاں ہوں؟" نعیم ٹھیک ہوچکا تھا۔ نعیم کی ماں اور بھائیوں نے اسے گلے لگایا اور شاہ صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

ہوائی مخلوق

نظارت نصر۔ فیصل آباد

بلی کی آنکھوں سے زندگی معدوم ہونے لگی اور جہاں بلی کے منہ سے خون نکل کر بہہ رہا تھا تو اس خون کی لکیر سے ایک عجیب الخلقت خوفناک سانپ تخلیق پارہا تھا اور جب نوجوان نے آیت الکرسی پڑھی تو اچانک......

اسماء الحسنٰی اور قرآنی آیات کو عقیدت سے پڑھتے ہی خونی بلائیں بھاگ جاتی ہیں

"یہ ساری مصیبتیں تب سے ہی میرے سر پر پڑی ہیں جب سے میں نے اس بلی کو مارا ہے......" میں کاشف کے پوچھنے پر پھٹ پڑا اور واقعہ تھا بھی یہی۔ جس دن سے میں نے اس موٹی بھدی، بھوری بلی کو اینٹ مار کر زخمی کیا تھا۔ میں ایک مسلسل عذاب میں گرفتار تھا۔ کبھی کوئی حادثہ پیش آجاتا تو کبھی کوئی۔ اس ڈر سے میں گھر تو کیا اپنے شہر سے بھی بھاگ کر اپنے ایک دور پار کے کزن کے گھر آگیا تھا۔

میرا یہ کزن، میرے ابو کی ماموں زاد بہن کا بیٹا تھا۔ یہ لوگ شروع سے ہی گاؤں میں رہتے تھے۔ جب کہ میرے دادا دادی بہت پہلے ہی گاؤں چھوڑ کر پہلے ایک قصبہ اور پھر وہاں سے شہر چلے گئے۔ میرے والد قصبہ میں جب کہ میں شہر میں پیدا ہوا تھا۔ اس وجہ سے میرے سوچنے کا انداز بھی آج کل کی نوجوان شہری نسل کی طرح تھا۔ میں

جنوں بھوتوں وغیرہ کا قائل نہیں تھا۔

مجھے شرم تو محسوس ہوتی تھی مگر یہ سچ تھا کہ مجھے صرف مسلم گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے مسلمان سمجھا جاتا تھا۔ ورنہ مجھے دین کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ میں سال میں ایک آدھ بار ہی نماز پڑھا کرتا تھا۔ وہ بھی مارے باندھے۔ گھر میں ماحول بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ ڈراموں فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔ ماں باپ دونوں نوکری پیشہ تھے، اور اولاد اپنی من مانی کرنے والی۔ تربیت کے نام پر ہمارے والدین نے ہمیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں مسلمان ہونے کے باوجود جنوں کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا حالانکہ قرآن میں پوری سورہ جن موجود ہے۔ اور مسجد جن بھی آج تک قائم ہے جہاں جن نماز پڑھنے آتے ہیں۔ خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں تب مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔

کاشف نے مجھے تسلی اور دلاسہ دیا پھر بولا۔

"تم چینج کر کے فریش ہو جاؤ۔ میں اتنے میں کھانا لگواتا ہوں......" خود میں بھی اتنا طویل سفر کر کے تھک گیا تھا فوراً راضی ہو گیا۔ جب میں نہا کر اور کپڑے تبدیل کر کے آیا تو کاشف دسترخوان پر کھانا لگوا چکا تھا۔ میرے لئے یہ بھی پہلا تجربہ تھا۔ ہمارے گھر میں تو میز پر کھانا کھایا جاتا تھا۔ تاہم میں نے اس بارے میں کاشف سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ کھانا کافی مزیدار تھا۔ لیکن میں دل میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہی کھانا زمین کے بجائے میز پر چنا گیا ہوتا تو اس کا مزہ دوبالا ہو جاتا۔

کھانے کے بعد ہم دونوں پھر کمرے میں آ گئے۔ مجھے کچھ کچھ یاد تھا کہ کاشف کی دو بہنیں اور ایک بھائی تھا۔ مگر اس وقت گھر میں کاشف کے سوا کوئی نہیں تھا۔ مجھے تجسس لاحق ہو گیا۔ میں نے پوچھ ہی لیا۔

"یار! کیا بات ہے گھر میں کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا؟" کاشف مسکرا دیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں اصل میں، کسی عزیز کی شادی ہے تو سب لوگ وہاں گئے ہیں"

میں نے فوراً پوچھا۔ "اور تم کیوں نہیں گئے؟"

"دراصل میں اس طرح کے شور ہنگامے کو پسند نہیں کرتا۔ اس لئے ذرا کم ہی ایسی جگہوں پر جاتا ہوں......"

میں نے بغور کاشف کا جائزہ لیا۔ وہ سر جھکائے کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ اگر میں غیر جانبداری سے رائے دوں تو وہ مجھ سے کہیں زیادہ پرکشش پرسنالٹی کا مالک تھا، مگر شلوار قمیض کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں اس کی پرسنالٹی دب گئی تھی۔

کاشف نے لکھنے کا شغل ترک کر دیا اور کاپی بند کر کے بولا...... "اگر تم آرام کرنا چاہتے ہو تو کر لو۔ میں اس وقت کھیتوں میں جا رہا ہوں کچھ کام ہے......"

میں نے لمحے بھر کو سوچا۔ نہانے سے تھکن کافی ہو گئی تھی۔ پھر میری خود پسند طبیعت یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ گاؤں کے لوگوں میں میری ٹپ ٹاپ دیکھ کر کس طرح کے جذبات ابھرتے ہیں۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"ارے نہیں آرام کا کیا ہے رات کو ہوتا رہے گا۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" کاشف نے سر ہلا دیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کاپی بھی اس نے ہاتھ میں لے لی۔ یقیناً اس میں فصلوں سے متعلق کوئی حساب کتاب درج تھا۔ ہم دونوں گھر سے نکل آئے۔ کاشف کا حویلی نما گھر اندر سے اگرچہ کافی اچھے طریقے سے آراستہ تھا مگر باہر سے کسی قدیم متروک حویلی جیسا لگ رہا تھا۔ باہر نکل کر کاشف گلیوں میں سے ہوتا ہوا کھیتوں کی جانب بڑھنے لگا۔ شام اتر رہی تھی۔ ہلکی ہوا میں چہل قدمی بہت مزہ دے رہی تھی۔ میں اردگرد کے ماحول کو بغور دیکھتا اس کے ساتھ چلتا جا رہا تھا۔ تب ہی سامنے سے آتے دو لڑکوں نے ہمیں روک لیا۔ ہمیں کیا انہوں نے کاشف کو روکا تھا۔ کیونکہ میں تو بالکل انجان بندہ تھا۔ سلام دعا کے بعد وہ کاشف سے فصلوں اور کھادوں کے متعلق گفتگو کرنے لگے، میں لاتعلق سا پاس کھڑا تھا مگر میں نے نوٹ کیا وہ لڑکے ستائشی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے پھر ان میں سے ایک نے میرا تعارف چاہا۔ تو کاشف نے اسے بتایا کہ "یہ ملنے کی خاطر شہر سے گاؤں آیا ہے۔"

تھوڑی دیر میں وہ لڑکے بے تکلفی سے مجھ سے

باتیں کر رہے تھے۔ میں بھی ان کی کمپنی انجوائے کر رہا تھا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی کھیتوں کو چل دیئے۔ کاشف نے مجھے بتایا کہ وہ اس کے کلاس فیلو تھے۔ مگر میٹرک کے بعد انہوں نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اسی وقت مجھے پتہ چلا کہ کاشف بی ایس سی ایگری کلچر کر چکا تھا۔ مجھے اپنی ہستی اس کے سامنے اور بھی کچھ ڈاؤن ہوتی ہوئی محسوس ہوئی کیونکہ میں نے صرف بی اے کیا تھا۔ اور ایک چھوٹی سی فرم میں فی الحال پی اے کی سیٹ پر کام کر رہا تھا۔ گھر میں روپے پیسے کی جو ریل پیل تھی وہ سب ابو کی ٹھیکیداری کی وجہ سے تھی۔

کاشف کے کھیت گاؤں کے ساتھ ہی تھے۔ باتیں کرتے ہم جلد ہی وہاں پہنچ گئے۔ عبداللہ اور اسلم نامی دونوں لڑکے اب مجھ سے شہر کی مختلف باتیں پوچھ رہے تھے اور میں بھی کاشف کو متاثر کرنے کے لئے خوب ڈینگیں مار رہا تھا۔ حالانکہ مجھے علم ہو چکا تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ تو ظاہر ہے شہر میں رہ کر ہی پڑھا ہوگا۔ مگر اس وقت میں اسے اپنے رعب میں لینا چاہتا تھا۔

کاشف اگر میری بات سمجھ بھی گیا تھا تب بھی اس نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ بنیادی طور پر وہ ایک بردبار اور سنجیدہ مزاج کا سلجھا ہوا شخص تھا۔ کھیتوں میں گندم کی لہلہاتی فصل کھڑی تھی۔ دور تک پھیلے سبزے میں کھڑے ہونا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے فوراً اپنا بیش قیمت سیل فون نکالا اور لگا تصویریں بنانے۔ کچھ مقصد ان دیہاتی نوجوانوں کو متاثر کرنا بھی تھا۔ جس میں کافی کامیاب بھی رہا۔ وہ مجھ سے موبائل مانگ کر دیکھنے لگے، میں فخر سے انہیں موبائل کے کارنامے دکھانے لگا۔ کاشف مجھے ان کے ساتھ باتوں میں مصروف چھوڑ کر اپنے کارندوں کی طرف چلا گیا تھا۔

مجھے تو شاید سورج غروب ہونے کا ادراک نہ ہوتا مگر جب چلتے چلتے اچانک موبائل کی روشن اسکرین تاریک ہو گئی تو میرے ساتھ ساتھ وہ دونوں بھی حیران ہو گئے۔ میں سمجھا کہ فون پاور آف ہو گیا ہے۔ میں اسے پھر سے آن کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک سامنے گندم کے کھیت میں ہلچل سی مچ گئی۔ نیم تاریکی میں کچھ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر ہم تینوں نظر جما کر ادھر دیکھنے لگے۔ اگلے ہی لمحے ہم تینوں اچھل کر کھڑے ہو گئے بلکہ میرے منہ سے تو ہلکی سی چیخ بھی نکل گئی۔

گندم کے کھیت سے چار فٹ لمبا اور کافی موٹا تازہ سانپ نکل کر ہم پر حملہ آور ہو گیا۔ میں تو چیخ مار کر بھاگ کھڑا ہوا جب کہ وہ دونوں ادھر ادھر بھاگ کر ڈنڈا تلاش کرنے لگے۔ سانپ کی شاید ان پر نظر ہی نہ پڑی تھی وہ میرے پیچھے لپکا۔ کھیتوں کے درمیان بنی اس چھوٹی سی پگڈنڈی پر بھاگنا کچھ ایسا بھی آسان نہیں تھا۔ اور میری رفتار بھی اتنی تیز نہیں تھی۔ میں نے بھاگتے بھاگتے پلٹ کر دیکھا سانپ میرے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ اسی وقت مجھے ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل زمین پر جا گرا۔ ایک مٹی کا بڑا ڈھیلا میرے قریب گر کر بکھر گیا۔ پھر جیسے مٹی کے ڈھیلوں کا مینہ برسنے لگا۔ میں سانپ کے خوف سے جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے خوش گوار موسم میں بھی مجھے پسینے آ رہے تھے۔ میں بھاگنا چاہتا تھا کہ پیچھے سے عبداللہ نے مجھے آواز دے کر روک لیا، وہ اشارے سے مجھے دکھا رہا تھا کہ سانپ دائیں طرف والے گندم کے کھیت میں گھس گیا تھا۔

اتنے بڑے کھیت میں سانپ کو تلاش کرنا ناممکن تھا، ان دونوں نے اپنے ہاتھوں میں اٹھائے مٹی کے ڈھیلے پھینک دیئے۔ ڈنڈا دستیاب نہ ہونے پر انہوں نے مجھے سانپ سے بچانے کے لئے کھیت سے مٹی کے ڈھیلے اٹھا لئے تھے۔ دوڑنے سے میرا سانس پھول رہا تھا۔ اور شرمندگی کے مارے میری نظر نہیں اٹھ رہی تھی کہ وہ دونوں کیا سوچتے ہوں گے کہ میں کتنا بزدل تھا کہ بجائے سانپ کا مقابلہ کرنے کے میں بھاگ نکلا تھا۔ لیکن پھر میں نے خود کو تسلی دی۔ میں بھاگنے میں حق بجانب تھا۔ اگر سانپ ان کے پیچھے دوڑتا تو وہ بھی اسی طرح کے ردعمل کا مظاہرہ کرتے۔ میری ٹانگیں ابھی تک کانپ رہی تھیں۔ بہرحال میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

وہاں کھڑے رہنا اب نادانی تھی۔ سانپ پھر حملہ آور ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ہم تینوں وہاں سے چل پڑے۔ موبائل خود بخود کام کرنے لگا تھا۔ گھر کی طرف واپس آتے ہوئے پہلی مرتبہ مجھے خیال آیا کہ کاشف نہ جانے کدھر چلا

گیا تھا۔ ہم تینوں خاموش تھے۔ شاید سانپ کی ان کھیتوں میں موجودگی نے انہیں بھی فکر مند کر دیا تھا۔ ابھی ہم بمشکل چند گز چلے تھے کہ سامنے سے ایک بپھرا ہوا سانڈ آتا دکھائی دیا۔ وہ اتنا جسیم تھا کہ جھٹ پٹے اندھیرے میں ایک عفریت کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بھاگنے کی وجہ سے جیسے زمین ہل رہی تھی۔ میرے ساتھی لڑکوں میں سے ایک چلایا۔

"اوئے بھاگو! یہ مالی پتہ نہیں کہاں سے آ گیا ہے......" اس کی بات سن کر میں ازحد پریشان ہو گیا۔ سانڈ کے ارادے خطرناک معلوم ہو رہے تھے اور میں پہلے ہی سانپ کی وجہ سے دہشت زدہ تھا۔ رہی سہی کسر اسلم کی گھبرائی ہوئی وارننگ نے کر دی۔ ہم تینوں پلٹ کر بھاگے۔ وہ دونوں تو گاؤں کے جوان تھے۔ ان راستوں کے عادی، لمحے بھر میں مجھ سے کہیں آگے نکل گئے جب کہ میرے لئے ان پگڈنڈیوں پر بھاگنا دشوار تھا۔ مگر جب جان پر بنی ہو تو انسان سب کچھ کر گزرتا ہے۔ میں بھی جان توڑ کر بھاگ رہا تھا۔

دونوں لڑکے میری نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے کیونکہ وہ کھیتوں میں دائیں بائیں بھاگ گئے تھے۔ میں کھیت میں اترنے سے ڈرتا تھا۔ ایک تو سانپ کا خوف دوسرے مجھے علم تھا کہ میں کھیت میں اپنی موجودہ رفتار بھی برقرار نہیں رکھ سکوں گا۔ میں نے بھاگتے بھاگتے پلٹ کر دیکھا۔ سانڈ عجیب و غریب آوازیں پیدا کرتا انتہائی غصیلے انداز میں میرے نہ صرف پیچھے آ رہا تھا بلکہ درمیانی فاصلہ بھی بہت کم ہو گیا تھا۔ اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ میرے موبائل کی روشنی اسے میرا پتہ بتا رہی ہے۔ میں نے تیزی سے موبائل آف کر دیا۔ میرا سانس پھول چکا تھا اور دوڑنے کی رفتار بھی کم ہو رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں کسی بھی لمحے گر جاؤں گا اور وہ سانڈ مجھے روند کر رکھ دے گا......

اسی وقت مجھے اپنے دائیں طرف بھی کسی کے بھاگنے کی آواز سنائی دی۔ لیکن میں اس وقت اتنا حواس باختہ تھا کہ اس پر کوئی توجہ نہ دے سکا اور صرف اپنے پیچھے آتی عفریت سے بچنے کے لئے اندھا دھند بھاگتا رہا۔ پتہ نہیں میں کس سمت جا رہا تھا اور کتنا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ درخت اور پودے عجیب ہیبت ناک شکلیں بنائے میری روح فنا کر رہے تھے۔ مگر جان مجھے اتنی پیاری تھی کہ میں اس جھٹ پٹے اندھیرے میں بھی بھاگا جا رہا تھا۔

میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ دونوں لڑکے اتنے بے مروت نکلے تھے کہ اپنی جان بچا کر بھاگ گئے اور مجھے مرنے کے لئے اس عفریت کے سامنے تنہا چھوڑ گئے۔ اسی وقت مجھے اپنے دائیں طرف سے کاشف کی تیز آواز سنائی دی۔

"سیدھے بھاگتے جاؤ فیصل! اور اپنا موبائل میری طرف پھینک دو۔ میں تمہیں بچا لوں گا......"

کاشف کی مضبوط آواز مجھے اندھے کنوئیں میں مدد کے لئے اترنے والا ڈول محسوس ہوئی۔ میں نے ہاتھ میں پکڑا سیل فون اندازے سے اپنے برابر قدرے فاصلے پر بھاگتے سائے کی طرف پھینک دیا اور خود سیدھا بھاگتا گیا۔ میرا سانس اس قدر پھول چکا تھا کہ میں باوجود کوشش کے بھی منہ سے کوئی لفظ نہ نکال سکا۔

چند لمحوں بعد مجھے احساس ہوا کہ میرے پیچھے آتے غضبناک سانڈ کے قدموں کی دھمک اب نہیں آ رہی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک حیرت انگیز منظر میرے سامنے تھا۔ کاشف میرے سیل فون کی ٹارچ سے سانڈ پر روشنی ڈالے اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا بلند آواز سے کچھ تلاوت کر رہا تھا۔ اور غصیلا سانڈ اپنی سرخ آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا مگر یہ دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھ گیا کہ وہ دھیرے دھیرے پیچھے کو کھسک رہا تھا...... تب مجھے پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ یہ اسی مالی کا شاخسانہ تھا۔

میں وہیں رک گیا اور اپنی دھونکنی کی طرح چلتی سانسیں بحال کرنے لگا۔ میری ٹانگوں میں سے جان نکلی جا رہی تھی۔ میں دھم سے اپنے قیمتی سوٹ کی پرواہ کیے بغیر کچی زمین پر بیٹھ گیا۔ البتہ میری نگاہیں ابھی تک کاشف اور سانڈ پر جمی ہوئی تھیں دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ دفعتاً کاشف نے سانڈ کی طرف پھونک ماری تو سانڈ بلبلایا اور پلٹ کر بھاگا۔ اور قریبی چھ سات فٹ اونچے گنے کے

کھیت میں گم ہو گیا......

کاشف تیز قدموں سے میری طرف آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے سر پر ٹوپی تھی۔ شاید وہ مغرب کی نماز ادا کرنے چلا گیا تھا۔ اور پیچھے مجھ پر یہ مصیبت ٹوٹ پڑی تھی۔ میرے قریب آ کر اس نے پوچھا...... "فیصل! تم ٹھیک تو ہو......؟"

میں نے کمزور سی آواز میں جواب دیا...... "ہاں یار! شکریہ اگر تم بروقت نہیں آ جاتے تو یہ سانڈ آج لازماً مجھے کچل ڈالتا......"

وہ میرے قریب بیٹھ گیا۔ پھر کہنے لگا...... "مجھے اسلم نے بتایا تھا کہ تمہارے پیچھے "مالی" لگ گیا ہے۔ جب کہ میں آج ہی مالی کو ساتھ والے گاؤں میں دیکھ آیا تھا۔ مجھے علم تھا کہ وہ یہاں نہیں آیا ہوگا۔ پھر مجھے تمہاری کہانی کا بھی پتا تھا۔ اس لئے میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ کوئی ہوائی چیز ہے۔ پھر میں تمہیں بچانے کے لئے دوڑ پڑا......"

میں اس کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔

"ایک تو یہ مالی کیا بلا ہے۔ اور دوسرا یہ بتاؤ کہ تم نے اسے بھگا کیسے دیا؟" کاشف مسکرا دیا اور پھر بولا......

"اٹھو گھر چلتے ہیں، تم بھاگتے بھاگتے کافی دور نکل آئے ہو راستے میں بتاتا ہوں سب کچھ......"

میں نے ہمت مجتمع کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ سانڈ کا خوف سر سے ٹلا تو مجھے ماحول کی تاریکی، حشرات اور مینڈکوں کی آوازوں سے پراسرار ہوتے ماحول سے خوف آنے لگا تھا۔

کاشف کا ساتھ مجھے بہت حوصلہ دے رہا تھا۔ وہ ٹارچ سے روشنی پھینک کر راستہ دکھا رہا تھا چلتے چلتے بولا......

"گاؤں میں حکومت کی طرف سے اچھی بریڈنگ کے لئے سانڈ چھوڑے جاتے ہیں۔ ہر گاؤں کا ایک سانڈ ہوتا ہے۔ یہ زمینوں پر جس کی مرضی فصل کھائے کوئی نہیں روکتا۔ لیکن اسے بیچنا یا ذبح کرنا جرم ہے اس سانڈ کو گاؤں کے لوگ مالی کہتے ہیں۔ اور جہاں تک تعلق ہے اس بات کا کہ میں نے اسے بھگا کیسے دیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کے کلام میں بڑی طاقت ہے۔ بس پڑھنے والے کو اس پر اعتقاد ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ ایسی چیزیں اندھیرے میں حملہ آور ہوتی ہیں اور روشنی سے خوف کھاتی ہیں بس اسی طرح میں نے بھی اسے بھگا دیا۔ لیکن اب میرا خیال ہے کہ مجھے تمہاری حفاظت کی غرض سے ہر وقت تمہارے ساتھ رہنا چاہیے۔ تاکہ آئندہ ایسی کوئی چیز تمہیں نقصان نہ پہنچا سکے......"

میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ اچانک کاشف نے پوچھا...... "تم نماز تو پڑھتے ہو گے؟"

میرا سر شرمندگی سے جھک گیا۔ مگر میں جھوٹ نہیں بول سکتا تھا اسے آپ میری خوبی کہہ لیں، میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اس وقت بھی میں نے اعتراف کر لیا۔ "نہیں یار! بس کبھی اس طرف دھیان ہی نہیں دیا۔"

کاشف لمحے بھر کو چپ ہوا پھر بولا......

"فیصل نماز پڑھا کرو۔ نماز سو مصیبتوں سے بندے کو بچاتی ہے۔ آج کی بات کو سوچو، اگر تم اس وقت نماز پڑھنے میرے ساتھ گئے ہوتے تو کبھی بھی وہ مخلوق تمہیں اتنا پریشان نہیں کرتی......"

میں خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر میں نے اسے سانپ کے متعلق بھی بتا دیا...... وہ بولا......

"مجھے لگتا ہے وہ بھی سانپ نہیں ہوگا جو صرف تمہارے پیچھے دوڑا تھا...... وہ بھی یہی مخلوق ہوگی اپنا پہلا وار ناکام ہوتا دیکھ کر اس نے روپ بدل کر حملہ کر دیا......"

میں چپ چاپ اس کی بات سنتا رہا۔ خود میرا دل بھی یہی کہہ رہا تھا کہ وہ سانپ بھی اصل میں ایسی ہی کوئی چیز تھی۔

گھر پہنچ کر میں نے کاشف کے کہنے پر نہا کر کپڑے تبدیل کر لئے اور وضو بھی کر لیا...... کاشف کے ساتھ عشاء کی نماز ادا کی اور پھر آیت الکرسی پڑھ کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

سونے سے قبل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اگلی صبح واپس لوٹ جاؤں گا۔ کیونکہ گاؤں میں آ کر مجھ پر حملے ہونے میں

شدت آ گئی تھی۔ میں نے اس وقت کو کوسا جب میں نے اس بلی کو اینٹ مار کر زخمی کیا تھا......

واقعہ یہ تھا کہ ہمارے کوٹھی نما عالی شان گھر کے سامنے ہی ایک بلی نے ڈیرا لگا لیا تھا۔ وہ دیکھنے میں بڑی بدصورت تھی جب بھی میں گھر سے نکلتا یا گھر میں جاتا تو وہ بھاگ کر یوں میری طرف آتی جیسے میری پالتو ہو۔ جب کہ مجھے اس کی شکل سے ہی شدید نفرت تھی۔ میں اسے دھتکار دیتا تو وہ میاؤں میاؤں کر کے دانت نکال لیتی جیسے حملہ آور ہونا چاہتی ہو۔ پہلے تو میں نے کئی مرتبہ نظر انداز کیا مگر کب تک۔ بالآخر ایک دن مجھے غصہ آ ہی گیا......

میں آفس سے کچھ لیٹ واپس آیا تھا۔ کام کافی پڑا تھا، باس نے ڈانٹ ڈپٹ بھی کی اور کام بھی زیادہ کروا لیا۔ میرا موڈ بہت خراب تھا۔ ایسے میں جیسے ہی میں نے گاڑی گھر کے سامنے روکی، وہ بلی بھاگ کر میری جانب آئی۔ میرا غصہ اور بڑھ گیا، میں گاڑی سے نکلا اور قریب ہی پڑی ایک اینٹ اٹھا کر بلی کو دے ماری تب تک مجھے پتہ نہیں تھا کہ وہ بلی عام بلی نہیں تھی ورنہ میں کبھی ایسی حماقت نہیں کرتا...... اینٹ بلی کی پچھلی ٹانگوں میں لگی تھی۔ وہ بری طرح زخمی ہو گئی...... اور اپنے پچھلے جسم کو گھسیٹتی ہوئی کرب ناک آوازیں نکالتی کچھ فاصلے پر کھڑی ایک فروٹ کی خالی ریڑھی کے پیچھے چلی گئی۔ میں بھی مطمئن ہو کر گاڑی گھر میں لے گیا۔

اگلی صبح جاگنے پر مجھے بلی والا واقعہ بالکل بھی ذہن میں نہیں تھا۔ جیسے ہی میں گاڑی میں بیٹھا۔ پچھلی سیٹ سے کسی کے دو ہاتھ میری گردن پر جم گئے۔ دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے ان ہاتھوں کی گرفت ختم کرنے کی کافی کوشش کی مگر بے سود۔ خوش قسمتی سے اسی وقت میری امی کسی کام سے اس طرف آ گئیں۔ دور سے مجھے گاڑی میں بیٹھا دیکھ کر زور سے بولیں......

"کیا بات ہے فیصل! تم ابھی تک آفس نہیں گئے؟"

اس کے ساتھ ہی میرے گلے پر سے ہاتھوں کا دباؤ ختم ہو گیا۔ میں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا پچھلی سیٹ بالکل خالی تھی۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ مگر اس واقعے کو میں اپنا وہم نہیں سمجھ سکتا تھا۔ کیونکہ میری کھانسی اور آئینے میں نظر آتی سرخ گردن اس بات کی گواہ تھی کہ ابھی کسی نے مجھے گلا دبا کر مارنے کی کوشش کی تھی......

میں گاڑی سے اتر گیا۔ میرا دل ڈرا ہوا تھا۔ میں نے امی سے کہا......

"اصل میں میری طبیعت کچھ خراب ہو رہی ہے اس لئے میں آج آفس نہیں جانا چاہتا......"

انہیں خود بھی اپنے کام پر جانے کی جلدی تھی۔ وہ ایک بیوٹی پارلر چلاتی تھیں۔ سو مزید کریدے بنا چلی گئیں۔ میں وہاں سے اپنے کمرے میں آ گیا۔

میں نے دوا کھائی اور بستر پر لیٹ گیا۔ ارادہ تھا کہ کچھ دیر آرام کر کے پھر کوئی اور کام کروں گا مگر میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے ایک بہت ڈراؤنا خواب دیکھا کہ میں کسی بلند جگہ پر کھڑا ہوں...... آندھی کی وجہ سے میرے قدم ڈگمگاتے ہیں۔ میں خود کو گرنے سے بچانے کے لئے بہت کوشش کرتا ہوں کہ پیچھے سے کوئی مجھے دھکا دے دیتا ہے...... میں اس بلند جگہ سے نیچے گرتا ہوں......

ابھی میں زمین پر نہیں پہنچا تھا کہ راستے میں کسی عجیب سے بہت بڑے ہاتھ نے مجھے پکڑ لیا۔ وہ فضا میں معلق صرف ایک ہاتھ تھا۔ کوئی جسم وغیرہ نہیں تھا۔ اس ہاتھ نے مجھے کمر سے یوں پکڑ رکھا تھا جیسے کوئی بچی اپنی گڑیا دبوچ لیتی ہے۔ پھر اس ہاتھ نے مجھے بھینچنا شروع کر دیا۔ میرا دم گھٹنے لگا مجھے لگا کہ میں کسی بھی وقت دم توڑ دوں گا اور میری ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔ مارے تکلیف کے میں چلانے لگا تو اس ہاتھ نے مجھے زمین پر پٹخ دیا...... میرے منہ سے بھیانک چیخ نکلی اور میری آنکھ کھل گئی۔ اس کے بعد نیند کو میں ترس گیا۔

جب بھی سوتا ایسا ہی کوئی نہ کوئی ڈراؤنا خواب مجھے بیدار کر دیتا۔ اگر میں ٹونٹی کو ہاتھ لگاتا تو اس میں سے مجھے کرنٹ لگ جاتا۔ کبھی میرے کمرے کا دروازہ اتنی سختی سے بند ہو جاتا کہ کھلتا ہی نہیں اور میں کئی گھنٹے اپنے کمرے میں

محبوس رہ کر گزارتا......

میرے گھر والے بھی ان واقعات سے آگاہ ہو گئے تھے۔ میری امی نے ایک دو عاملوں سے بھی رابطہ کیا تھا مگر کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا تھا۔ سو میں ڈر کے مارے آفس سے چھٹیاں لے کر اس گاؤں میں آ گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر میں کچھ دن منظر سے غائب رہوں گا تو شاید اس طرح کے واقعات پیش آنا بند ہو جائیں...... لیکن یہاں آ کر یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ اس گاؤں میں مجھ پر ہونے والے حملوں میں اور بھی شدت آ گئی تھی۔

اگلی صبح میں نے ناشتے کے بعد کاشف کو بتایا کہ میں واپس جانا چاہتا ہوں تو اس نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے کام والی ماسی کو آواز دی۔ جب وہ آئی تو کاشف نے کہا......

"ماسی! فیصل کے کپڑے استری کر دو۔ ہم کہیں جا رہے ہیں......" وہ سر ہلا کر چلی گئی۔ یہ ماسی کاشف کے گھر کے سبھی کام کرتی تھی۔ کیونکہ کاشف کا گھرانہ خاصا خوشحال تھا اس لئے گھر کا کام کاج نوکر کرتے تھے۔ اس کے جانے کے بعد کاشف میری طرف متوجہ ہوا......

"دیکھو فیصل میں جانتا ہوں کہ تم کل کے واقعات سے گھبرا کر واپس جا رہے ہو...... مگر شاید تم نہیں جانتے کہ اگر اس طرح کے واقعات پیش آنے لگیں تو جگہ بدل دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایسی چیزوں کے لئے یہ فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اس لئے تم یہاں سے واپس جانے کے بجائے اس کا کوئی حل سوچو......"

میں حیران رہ گیا میں بھلا کیا حل سوچ سکتا تھا۔ مجھے تو ایسے معاملات کی الف، ب کا بھی علم نہیں تھا...... اور کسی بھی مسئلے کا حل تب ہی نکالا جا سکتا ہے جب اس سے متعلق پوری آگاہی حاصل ہو، یہی بات میں نے کاشف سے بھی کہہ دی...... وہ دھیمی اور پرسکون مسکراہٹ کے ساتھ بولا......

"میری الماری میں کئی ایسی کتابیں موجود ہیں تم انہیں پڑھو۔ باقی میں بھی کوئی حل سوچتا ہوں......"

اسی وقت مجھے خیال آ گیا کہ اس نے ماسی سے کہیں جانے کی بات کی تھی۔ میں نے پوچھ لیا وہ بولا......

"کہیں خاص تو نہیں جانا۔ بس یہاں قریب ہی ایک اللہ والے کا مزار ہے وہاں جائیں گے، فاتحہ پڑھ کر لوٹ آئیں گے...... ہر جمعرات کو وہاں جانا میرا معمول ہے......"

تب مجھے یاد آیا کہ اس روز بھی جمعرات ہی تھی۔ بادل نخواستہ ہی سہی میں وہاں رکنے اور اس کے ساتھ مزار پر جانے کے لئے تیار ہو گیا...... تیار ہو کر ہم وہاں چلے گئے۔

مزار قدرے ویران سی جگہ پر موجود تھا۔ ایک کمرے کے اندر کچی قبر تھی۔ جس پر سبز غلاف چڑھا ہوا تھا۔ ایک طرف دیوار میں پرانی اگر بتیوں کی باقیات پھنسی ہوئی تھیں۔ کاشف نے فاتحہ پڑھی پھر ایک طرف رکھے گھاس کے جھاڑو سے صفائی کی، جالے اتارے اور ادھ جلی اگر بتیوں کو نکال کر الگ کر دیا اور ساتھ لائی ہوئی اگر بتیاں وہاں پھنسا کر انہیں سلگا دیا۔ میں نے بھی کاشف کی دیکھا دیکھی فاتحہ پڑھ ڈالی...... لیکن میں ان بزرگ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا......

کاشف نے سرگوشی میں مجھ سے کہا دعا کرو کہ "اے اللہ جس طرح تو نے اپنے اس بندے کو جنات پر فتح عطا فرمائی تھی! اسی طرح مجھ کو بھی انؔ سے نجات عطا فرما......"

میں نے بالکل انہی الفاظ میں دعا مانگ لی۔ میرے دل کو ایک تقویت کا سا احساس ہوا۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ مجھ میں حوصلہ بڑھ گیا ہے۔ اب شاید میں پہلے کی طرح بزدلی کا مظاہرہ کر کے بھاگتا نہیں...... بہرحال یہ تو وقت آنے پر ہی معلوم ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر وہاں گزار کر ہم دونوں واپس آ گئے۔ اس دن میں نے کاشف کی الماری سے اس کی منتخب کی ہوئی ایک کتاب بھی پڑھی اور پانچ وقت نماز بھی...... شام کو کھانا کھا کر ہم نے کچھ دیر چہل قدمی کی اور گھر کو لوٹ آئے۔ کچھ دیر گپ شپ کر کے میں سونے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کاشف نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

"میں ایک چکر دوسری حویلی کا لگا کر ابھی آتا ہوں

دیکھ لوں کہ چاچا نے سب مویشی باندھ دیئے ہیں یا نہیں......"

میں وہ حویلی بھی دیکھ چکا تھا۔ ان کی بھینسیں، گائیں، اور بکریاں اس حویلی میں بندھی ہوئی تھیں۔ اور چاچا کرمو ان کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ میں نے سر ہلا کر اسے جانے کی اجازت دے دی اور خود جا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

لیٹنے سے پہلے میں نے کتاب میں پڑھے ہوئے طریقے کے مطابق آیت الکرسی پڑھ کر خود دونوں ہاتھوں پر پھونک مار کر سر سے لے کر پاؤں تک ہاتھ اپنے جسم پر پھیر لئے۔ اور بستر پر دراز ہو گیا۔ ابھی میں غنودگی میں تھا کہ مجھے ایسا لگا کہ جیسے کوئی باہر سے دروازے پر ہلکی ہلکی دستک دے رہا ہو۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کاشف کچھ کہنا چاہتا ہو اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ مگر یہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ سامنے وہی بلی کھڑی تھی......

دروازہ کھلتا دیکھ کر وہ تیزی سے مجھ پر حملہ آور ہونے کے لئے جھپٹی۔ اب وہ بالکل ٹھیک نظر آ رہی تھی۔ میں نے اضطراری انداز سے دروازہ بند کرنا چاہا۔ جب کہ بلی اندر گھسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وقت کا سلسلہ ایسا تھا کہ اس کا سر اندر تھا اور دھڑ باہر رہ گیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ بلی کی آنکھیں ابل کر باہر آ گئی تھیں اور پہلے سے بھی ڈراؤنی لگ رہی تھیں......

میں نے پوری قوت سے دروازہ بند کر دیا۔ اس وقت میرے پورے وجود کا زور ہاتھوں میں منتقل ہو گیا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ اگر بلی مرنے سے بچ گئی تو مجھے ضرور مار ڈالے گی۔ بلی کے منہ اور ناک سے خون بہنے لگا۔ اس کے کھلے ہوئے منہ سے جھانکتے ہوئے نوکیلے دانت اور باہر کو نکلی ہوئی زبان بڑی خوف ناک لگ رہی تھی مگر میں نے ہمت نہ ہاری...... اور دروازے کو لگاتار دباتا ہی رہا۔ بلی کی کھلی ہوئی بلکہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے زندگی معدوم ہونے لگی اسی وقت میری نظر زمین پر پڑی جہاں بلی کے منہ سے نکل کر گرنے والا خون بہہ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس خون کی لکیر سے ایک سانپ تخلیق پا رہا تھا۔ اسی وقت کمرے کے باہر قدموں کی چاپ ابھری۔ پھر کاشف کی تیز آواز سنائی دی......

"فیصل آیت الکرسی پڑھو۔ جلدی کرو ورنہ یہ کوئی اور شکل اختیار کر لے گی......"

کاشف کی آواز نے میرے خوف کو دور جھٹک دیا۔ وہ خود بھی بلند آواز سے آیت الکرسی پڑھ رہا تھا میں بھی پڑھنے لگا۔ سانپ کا پھن نیچے گر گیا اور وہ تڑپنے لگا۔ چند لمحوں میں دونوں ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ مگر میں نے آیت الکرسی پڑھنا نہیں چھوڑی......

کچھ دیر کے بعد مجھے کاشف کی آواز سنائی دی۔ "دروازہ کھول دو فیصل!"

میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول دیا۔ بلی کا بے جان جسم اسی طرح پڑا رہا۔ کاشف کے ہاتھ میں لوہے کی ایک سلاخ تھی۔ اس نے اس سلاخ کے ذریعے بلی کا مردہ جسم اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دیا۔ اور پھر سرخ رنگ کا سانپ بھی جو قریب ہی مرا پڑا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے مجھے مبارک دی...... مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں ایک موذی بلا سے چھٹکارا پا چکا تھا......

لیکن جب پوری رات کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا تو مجھے یقین آ گیا کہ میری جان اس بلا سے چھوٹ گئی تھی۔ پھر میں آزادی کے احساس کے ساتھ پورا ہفتہ کاشف کے گھر رہا۔ اس کے گھر والے بھی شادی سے واپس آ گئے تھے۔ میں نے وہاں بہت انجوائے کیا۔ لیکن سب سے زیادہ خوشی مجھے اس بات کی تھی کہ کاشف جیسے مخلص اور دین دار دوست کا ساتھ میسر آ گیا تھا۔ اور اس نے مجھے بھی اسی راہ پر چلا دیا۔ تب سے اب تک میں روزانہ پانچ وقت نماز پڑھتا اور تلاوت کرتا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کے بعد مجھے کبھی کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا...... "بے شک اللہ کے راستے پر چلنے میں دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی ہے۔"

خیر کی فتح

ع۔ک آفاقی۔ آزاد کشمیر

اچانک زمین شق ہوئی اور ایک ہاتھی نما عجیب الخلقت شخص نمودار ہوا، شق ہونے والی زمین ہموار ہوگئی تو اس کی آواز سنائی دی۔ "مجھے کیوں بلایا ہے؟" اس کی آواز سے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے دو پہاڑ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے ہوں۔

صدیوں سے موجود ایک خوفناک اور حیرتناک بلا کی دل پر دہشت طاری کرتی کہانی

میں میٹرک کے ایگزام سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس لئے سوچا کہ کوئی کام سیکھوں، سو میں ایک جاننے والے ٹیلر ماسٹر کی دکان پر جانے لگا۔ فارغ بیٹھنے سے اچھا تھا کہ ہنر ہاتھ میں آ رہا تھا اور ساتھ ہی کچھ رقم بھی۔ شہر ہمارے گاؤں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا، میرے پاس ایک سائیکل تھی، میں صبح کے وقت سائیکل سے شہر دکان پر جاتا اور شام کو واپس آ جاتا تھا۔ راستے میں ایک کھنڈر نما مکان پڑتا تھا۔ اس مکان کے بارے میں مشہور تھا کہ اس میں آسیب کا بسیرا ہے، کوئی کہتا اس میں ایک بھٹکی ہوئی روح ہے اور کسی کا مفروضہ تھا کہ، جن رہتے ہیں اس مکان میں۔ خیر جتنے منہ اتنی باتیں۔ مگر میں اس دن رات کے وقت اس مکان کے پاس پہنچا تو کچھ عجیب طرح کے واقعات نظر آئے۔

ہوا یوں کہ میں دکان سے کچھ لیٹ واپس آیا تھا۔

چاند کی دس تاریخ تھی، آسمان پر روشن چاند اپنے جلوے بکھیر رہا تھا ہر چیز بہت واضح نظر آرہی تھی۔ چاندنی اتنی تھی کہ سارا علاقہ جگمگ جگمگ کررہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا سفید کبوتر اس مکان پر منڈلا رہا تھا، کبوتر اتنا خوب صورت تھا کہ میں اسے دیکھنے میں محو ہوگیا اور اس کبوتر کی کشش مجھے اپنی طرف کھینچنے لگی اور پھر اسی دوران وہ کبوتر اس مکان میں چلا گیا۔ کبوتر کی خوب صورتی اور جاذبیت مجھے مکان کی طرف کھینچنے لگی تھی اور پھر میں کسی انجانے خیال کے تحت مکان میں داخل ہوگیا۔ اندر کی حالت خستہ تھی۔ میرے مکان میں داخل ہوتے ہی ہلکی قسم کی روشنی کمرے میں پھیل گئی، جسے دیکھ کر میں اچنبھے میں پڑ گیا۔ جگہ جگہ مکڑیوں کے جالے تھے۔ جس سے پتا چلتا تھا کہ یہ مکان طویل عرصہ پرانا ہے۔ جانے کس نے اور کس مقصد کے تحت بنوالیا تھا۔

بہرحال اس مکان میں جو چیز مجھے عجیب لگی تھی وہ ایک بڑی سی کالے رنگ کی کتاب تھی۔ مجھے تجسس ہوا تو آگے بڑھ کر کتاب کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ اچانک اس حصہ کی چھت دھڑام سے نیچے گر پڑی اور پھر اس وقت کسی نادیدہ قوت نے مجھے اٹھا کر مکان سے باہر پھینک دیا۔ میں ہکا بکا رہ گیا کہ میرے ساتھ یہ کیا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ اپنے سینے پر پڑے اس لاکٹ پر تھا جس پر لفظ اللہ کندہ تھا۔

میرا دماغ زیادہ بلکہ بہت زیادہ الجھا ہوا تھا کہ اس کتاب کی کیا خاصیت ہے کہ ہاتھ لگانے سے چھت گر پڑی۔ اور سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ چھت صرف اس جگہ سے گری جہاں کتاب موجود تھی۔ مجھے اگر ذرا سی تاخیر ہوجاتی تو شاید اس وقت دوسرے جہاں کی سیر کررہا ہوتا۔

قابل توجہ بات یہ تھی کہ میرے گلے میں جو لاکٹ تھا۔ میں نے اس پر ہاتھ رکھا تو یہ واقعہ وقوع پذیر ہوا۔ "تو کیا اس لاکٹ کی بھی کوئی اہمیت ہے؟" میں نے سوچا۔

یہ لاکٹ مجھے میرے نانا جان نے دیا تھا۔ وہ ایک نیک اور برگزیدہ بزرگ تھے۔ میری اماں نے مجھے بتایا تھا کہ جب میری پیدائش ہوئی تھی تو نانا جان ہمارے گھر میں موجود تھے۔ انہوں نے میرے کانوں میں اذان دی۔ اور پھر یہ لاکٹ میرے گلے میں ڈالا تھا جس پر لفظ اللہ کندہ تھا۔ "تو کیا اس لاکٹ میں کوئی مصلحت پوشیدہ تھی؟" میں نے سوچا۔

بہرحال میں خوف زدہ اور سہما ہوا تھا، میں نے اپنی سائیکل اٹھائی اور گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر آکر ہاتھ منہ دھویا، نماز عشاء پڑھی اور کھانا کھا کر اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ کر سوگیا۔

وہ بزرگ بہت خوب صورت تھے، سفید بال روئی کی طرح، بے داغ سفید لباس، ہاتھ میں تسبیح اور نورانی چہرہ، میں نے انہیں دیکھا تو یوں لگا کہ انہیں پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔ "کچھ تعلق ہے میرا ان سے؟ کوئی رشتہ ہے؟" میں اسی شش و پنج میں تھا کہ ان کی شفقت بھری شیریں آواز سنائی دی! "نواسے! تم مجھے پہچاننے کی کوشش کررہے ہو؟" ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

میرے ذہن میں بجلی کا کوندا سا لپکا۔ "نانا جان! آپ؟ آپ یہاں کیسے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نواسے! حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔" میری بات سنو! تم نے آج جس مکان کا اور پھر اس میں رونما ہونے والے واقعات کا سامنا کیا ہے۔ یقیناً تم حیرت زدہ ہوگے، مگر میں جو باتیں بتا رہا ہوں، نہایت توجہ سے سنو!" پھر وہ تمام باتیں بتاتے چلے گئے اور میرے سامنے ایک انوکھی کہانی کی پرتیں کھلتی چلی گئیں۔ پھر وہ خاموش ہوگئے۔

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں ہڑبڑا کر بستر پر اٹھ بیٹھا۔ اذان فجر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ "تو کیا میں خواب دیکھ رہا تھا؟" میں نے سوچا۔ "ہاں وہ خواب ہی تھا کیونکہ نانا جان کو اس دنیا سے گئے ہوئے چھ برس گزر چکے تھے۔"

"تو کیا نانا جان اتنے پہنچے ہوئے بزرگ تھے؟" اچانک مجھے خیال آیا، دوسرے لمحے اس خیال کی تردید

ہوگئی۔ مجھے یہ سوچنے کے بجائے ان کی ہدایت پر عمل کرنے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ یہ بات ٹھیک تھی۔

چودھویں کا چاند ہر سو اپنی روشنی بکھیر رہا تھا۔ میں اس وقت اسی بوسیدہ سے مکان میں موجود تھا۔ جس کی آدھی چھت گر چکی تھی جب کہ باقی سلامت تھی۔ میں اس سلامت چھت کے نیچے ایک بڑا سا حصار کھینچ کر اس میں بیٹھ گیا۔ اور نانا جان کی بتائی ہوئی "قرآنی آیات" پڑھنے لگا۔ کافی دیر گزر گئی۔ آدھی رات ہوگئی کہ میرے عمل کا اثر ظاہر ہونا شروع ہوگیا۔

وہی کبوتر ٹوٹی ہوئی چھت سے اندر داخل ہوا۔ میں نے دیکھا ایک چھوٹا سا تیر اس کے دائیں پہلو میں پیوست تھا۔ چاند کی روشنی براہ راست کبوتر کے سر پر پڑ رہی تھی۔ کبوتر میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے مدد کا طالب ہو۔ مجھے ترس آنے لگا۔ دل میں خیال آیا تو میں حصار سے اٹھنے والا تھا کہ اس بے زبان کے لئے کچھ کروں۔

مگر اسی وقت میرے ذہن میں آواز گونجی۔ "نواسے! تم حصار میں بیٹھ کر عمل کروگے تو حصار سے باہر نظر آنے والا ہر منظر تمہارے لئے فریب ہوگا۔ لہٰذا جذبات میں آکر حصار سے باہر مت نکلنا۔" یہ آواز میرے نانا جان کی تھی اور مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں واپس بیٹھ گیا اور پھر کبوتر کو دیکھا تو میرے سر کا فیوز بھک سے اڑ گیا اب وہاں کبوتر کا نام ونشان نہیں تھا۔

"لاحول ولاقوۃ۔ یہ کیا ماجرا ہے؟" میں نے سر جھٹک کر سوچا۔ بہرحال میں دوبارہ آیات قرآنی پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔

تین چار اور بھی دیگر واقعات وقوع پذیر ہوئے۔

آخر وہ گھڑی آگئی جس کے لئے یہ سب کچھ ہوا تھا۔ میں تیزی سے آیات قرآنی پڑھ رہا تھا کہ اچانک میرے سامنے سے زمین شق ہوگئی۔ اور ایک ہاتھی جیسا بھیانک شکل آدمی نمودار ہوا۔ مجھے اس کو دیکھ کر ڈر لگا، ساتھ ہی نانا جان کے الفاظ گونجے۔ "وہ تم کو کچھ نہیں کہے گا۔ تم بس اس کو ہدایت کردینا کہ....." یہ الفاظ یاد آتے ہی میں پرسکون ہوگیا۔ ہاتھی نما شخص (اگر اسے شخص کہیں تو ورنہ وہ

تین چیزیں

انسان پوری زندگی میں تین چیزوں کے لئے محنت کرتا ہے۔

میرا نام اونچا ہو۔ میرا لباس اچھا ہو۔ میرا مکان خوبصورت ہو۔ لیکن وفات ہوتے ہی اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اس کی تین چیزوں کو بدل دیتا ہے۔ نام: مرحوم، لباس: کفن، اور مکان: قبر۔

(نعمان حیدر۔ کراچی)

تو کوئی اور بلا تھی) میرے سامنے کھڑا تھا۔ شق ہونے والی زمین دوبارہ ہموار ہوچکی تھی۔ ہاتھی نما انسان بولا۔ "آپ نے مجھے کیوں یاد کیا؟" یقیناً وہ آہستہ بولا ہوگا۔ مگر مجھے یوں لگا جیسے دو پہاڑ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے ہوں۔

"ہاں! میں نے بلایا ہے اور اس لئے بلایا ہے کہ پروفیسر پرکاش کمار تم پر قبضہ کرنے کے لئے عمل کررہا تھا مگر میں نے اس کا عمل ناکام بنادیا ہے۔"

میری بات ابھی جاری تھی کہ وہ ہاتھی نما انسان گرج اٹھا۔ "کس کی ہمت ہے کہ وہ مجھ پر قبضہ کرے۔"

میں نے کہا۔ "تم جاؤ اور اسے ہلاک کردو، ورنہ وہ......"

وہ دوبارہ گرجا۔ "ورنہ، ورنہ کیا؟ آپ کا بہت شکریہ نوجوان کہ آپ نے مجھے اس کے بارے میں بتا دیا، اب میں خود نمٹ لوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے پاؤں زور سے زمین پر مارا تو زمین شق ہوگئی اور وہ اس میں غائب ہوگیا۔

میں دوزانو حصار میں بیٹھا تھا۔ چاند کی روپہلی روشنی اندر آرہی تھی۔ میرا کام ختم ہوگیا تھا۔ اب مجھے صرف اس ہاتھی نما مخلوق کا انتظار کرنا تھا۔ یہ انتظار بھی زیادہ دیر نہیں رہا، اسی طرح زمین شق ہوئی تو وہ برآمد ہوا

اور بولا۔ ”آپ کا مجھ پر احسان ہے کہ مجھے بروقت مطلع کیا۔ میں آپ کو یہ تحفہ دے رہا ہوں۔“ اس نے ایک آئینہ آگے بڑھایا۔ وہ آئینہ اچھا خاصا بڑا تھا۔ ”یہ آئینہ آپ کی دنیا کے آئینوں جیسا نہیں ہے بلکہ آپ اس کو سامنے رکھ کر جس جگہ کے بارے میں بھی کہیں گے وہ جگہ آپ کو اس میں نظر آئے گی۔“ ہاتھی نما انسان آئینے کی خصوصیت بتاتے ہوئے بولا۔ واقعی یہ انوکھی چیز تھی۔ پھر وہ ہاتھی نما انسان شق ہوئی زمین میں سما گیا۔

میں حصار سے باہر نکل آیا اور کمرے سے باہر جانے لگا۔ میری زندگی کی یہ رات عجیب ترین رات تھی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں ایسا موڑ بھی آئے گا جو محیر العقول ہوگا۔

بہر حال میں گھر پہنچ گیا اور اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔

پرکاش کمار کو بچپن ہی سے پراسرار علوم سیکھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ وہ کہا کرتا تھا ”میں کالا جادو سیکھ کر بہت بڑا جادوگر بنوں گا۔“

اس کے ایک دوست نے کہا۔ ”پرکاش! کالا جادو سیکھنے سے بہتر ہے کہ تم تعلیم پر توجہ دو۔“

پرکاش بولا۔ ”تعلیم بھی تو حاصل کر رہا ہوں مگر کالا جادو ضرور حاصل کر کے رہوں گا۔“

کہتے ہیں کہ شکر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے۔ پرکاش کمار کو بھی مل گئی۔ اسے کوئی کالا علم جاننے والا مل گیا۔ پرکاش نے خود کو اس کا شاگرد بنا لیا اور کالا جادو سیکھنے لگا۔

غرض وقت گزرتا چلا گیا۔ پرکاش کمار نے جادو ٹونے میں مہارت حاصل کر لی۔ اب وہ پروفیسر پرکاش کمار کے نام سے جانا جاتا تھا۔ پروفیسر کو اس علم پر مکمل دسترس حاصل کرنے کا شوق تھا۔ اس کی یہ خواہش تھی کہ وہ جادو کے زور پر طاقت ور بن جائے۔ کوئی بھی جادوگر اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔

انہی دنوں پروفیسر کو اپنے علم کے ذریعے ایک ایسی مخلوق کے بارے میں معلوم ہوا۔ جو شکل و صورت میں انسان کی طرح مگر سائز میں کہیں زیادہ بڑی تھی۔

وہ مخلوق بہت زیادہ حیرت انگیز صلاحیتوں کی مالک تھی۔ جو کوئی ان کے ایک فرد پر قابو پا لیتا۔ وہ طاقت ور ترین بن سکتا تھا۔ پروفیسر نے اس مخلوق کو تسخیر کرنے کی ٹھان لی لیکن وہ یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ پہلے بھی کسی نے اس مخلوق پر قبضہ کیا ہے کہ نہیں؟ تب اسے معلوم ہوا کہ ایک طویل عرصہ پہلے ایک جادوگر نے اسے تسخیر کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اس کو تسخیر کر لیا۔ اس سے ہر جائز و ناجائز کام کروانے لگا۔ اسی دوران اس جادوگر کا اپنے استاد سے جھگڑا ہو گیا۔

استاد کا کہنا تھا کہ وہ اتنے ظلم نہ کرے مگر اس جادوگر کا موقف تھا کہ وہ اب طاقت ور ہو گیا ہے دنیا میں کوئی اس کا ہم پلہ نہیں۔ اس پر اس کے استاد نے اس سے وہ کتاب چھین لی جس میں اس نے منتر وغیرہ لکھے تھے۔ انہی منتروں میں ایک منتر اس مخلوق کی تسخیر کا بھی تھا۔ استاد نے اس سے وہ کتاب چھین کر اپنے مکان میں رکھ دی اور اس کے گرد حصار قائم کر دیا۔ جادوگر نے کتاب کو حاصل کرنے کی بہت کوشش کی مگر بے سود اس نے استاد پر حملے بھی کروائے مگر اسے کتاب حاصل نہ ہوئی۔ پھر وقت گزرتا چلا گیا۔ وہ جادوگر طبعی موت مر گیا۔ استاد بھی چلا گیا۔ مگر کتاب اسی مکان میں رہ گئی۔

پروفیسر یہ ساری معلومات حاصل کر کے اس کتاب کو حاصل کرنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ بہر طور اسے ایک منتر مل گیا جس کے چودہ دن پڑھنے سے کتاب پر قائم حصار ٹوٹ جاتا اور وہ کتاب مل جاتی۔ مگر ایک شرط تھی کہ اگر اس دوران اس کتاب پر کسی مسلمان کا ہاتھ پڑ گیا تو پروفیسر کی ہلاکت لازمی تھی اور یہ ہلاکت وہی مخلوق کرتی لیکن پروفیسر نے یہ رسک لے لیا۔ اور منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ اس نے یہ کام پہلے چاند کی رات شروع کیا تھا۔ یوں چودھویں چاند کی رات اس کا عمل ختم ہو جاتا اور کتاب مل جاتی۔

مگر بدقسمتی سے ابھی دس روز ہی گزرے تھے کہ میرا ہاتھ اس کتاب پر پڑ گیا۔ اور پھر جو کچھ ہوا، اور پھر وہ ہو گیا جس کے متعلق پروفیسر نے سوچا بھی نہیں تھا۔

میں نے چودھویں رات کو ”آیات قرآنی“ پڑھ کر اس مخلوق کو بلایا اور اس کو پروفیسر کے بارے میں مطلع کیا۔ اس مخلوق نے غصے میں آ کر پروفیسر کی گردن کی ہڈی توڑ دی۔ پھر مجھے عجیب و غریب آئینے کا تحفہ دیا اور غائب ہو گئی۔

یہ سب باتیں مجھے میرے نانا جان نے بتائی تھیں۔ لیکن میں اب تک الجھن میں تھا۔ کیونکہ ابھی بہت سی باتیں معلوم کرنے والی تھیں۔

ایک رات نانا جان پھر مجھے خواب میں نظر آئے۔ میں نے اپنی الجھنیں سلجھانا شروع کر دیں۔ سب سے پہلے میں نے پوچھا۔ ”نانا جان! میں نے جو کبوتر دیکھا تھا دسویں رات کو اس کا کیا راز ہے؟“

وہ ہلکی ہنسی کے ساتھ بولے۔ ”نواسے! کچھ راز قدرت کی طرف سے ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں افشا کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔“

میں نے پھر جلدی سے پوچھا۔ ”مگر وہ کبوتر تو مجھے دوبارہ بھی نظر آیا تھا۔ اس کے پہلو میں تیر لگا ہوا تھا۔“

”ہاں بیٹے! مجھے سب معلوم ہے۔ وہ نظر کا فریب تھا۔ تم جانتے ہو کہ خیر و شر کی قوتیں ازل سے برسرپیکار ہیں اور ابد تک رہیں گی۔ اس جنگ میں کبھی خیر کی فتح ہوتی ہے کبھی شر کی مگر شر کی فتح عارضی ہوتی ہے۔ اس کبوتر کو تم خیر کی قوت سمجھ سکتے ہو۔ لیکن بعد میں آنے والا جس کے پہلو میں تیر پیوست تھا۔ وہ محض فریب نظر تھا۔ تمہیں ورغلانے کے لئے۔“ وہ تفصیل بتاتے ہوئے بولے۔

میں نے پوچھا۔ ”وہ جو کتاب تھی۔ میں نے اس کو ہاتھ لگایا اور اس کے عین اوپر والی چھت گر گئی۔ اسے کوئی اور بھی ہاتھ لگا سکتا تھا؟“

”لگا سکتا تھا مگر قدرت نے جس کام کے لئے جس کو مقرر کیا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور اس کام کو سرانجام نہیں دے سکتا۔“ وہ سمجھانے والے انداز میں بولے۔ وہ ہر بات کا مبہم جواب دے رہے تھے۔

میری کیفیت کو انہوں نے جان لیا۔ ”نواسے! تم الجھن میں پڑ گئے ہو کہ ہر سوال کا جواب صحیح نہیں مل رہا۔ تم نے مولانا الطاف حسین حالی کا یہ شعر پڑھا ہوگا کہ۔

محرم بھی ایسا ہے جیسا کہ نامحرم
کچھ کر نہ سکا جس پر ہاں بھید کھلا تیرا!

”یہاں بھی یہی حالت ہے۔“ انہوں نے گویا ”کوزے میں دریا“ والا محاورہ بول کر بات کو واضح کر دیا۔

میں نے مزید سوال کیا۔ ”وہ جو ہاتھی نما مخلوق تھی اس کے بارے میں بتائیں۔“

وہ پھر ہنسے اور بولے۔ ”نواسے! وہ مخلوق اللہ کی ہزاروں تخلیق کردہ مخلوقات میں سے ایک ہے۔ وہ بہت زیادہ طاقت ور اور حیرت انگیز صلاحیتوں کی مالک ہے۔ مگر اس کی یہ صلاحیتیں انسان سے کم ہیں۔ انسان کوشش کر کے اس پر قابو پا سکتا ہے۔ کیونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اگر کوئی اسے اچھے کام کے لئے قابو کرے تو کوئی حرج نہیں لیکن اگر کوئی دوسرے ذرائع سے کرے جیسے پروفیسر پرکاش کمار نے کیا، یا اس سے پہلے جادوگر نے کیا تو وہ طریقہ غلط ہے اور ایسا طریقہ اختیار کرنے والوں کے لئے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔

”نواسے! تم نے ایک عظیم کام کیا ہے۔ مگر تم پر بہت سے راز عیاں ہونے سے رہ گئے ہیں۔ یہ راز۔ راز ہی رہیں گے۔ کوئی ان سے پردہ نہیں اٹھا سکے گا۔“ اور نانا صاحب غائب ہو گئے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا، منظر بدل گیا۔ آنکھیں کھول کر بستر پر بیٹھ گیا۔ فضا میں ابھی تک نانا جان کی خوشبو رچی بسی تھی۔ پتا نہیں اس خوشبو میں کیا اثر تھا کہ میرا الجھا ہوا ذہن پرسکون ہونے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں پوری طرح پرسکون ہو گیا۔ ”اور سوچنے لگا کہ اگر یہ راز قدرت کی طرف سے راز ہے تو میں کون ہوتا ہوں ان کو افشا کرنے والا۔“

پھر مجھے نیند آ گئی کیونکہ ابھی رات کے پہر باقی تھے۔

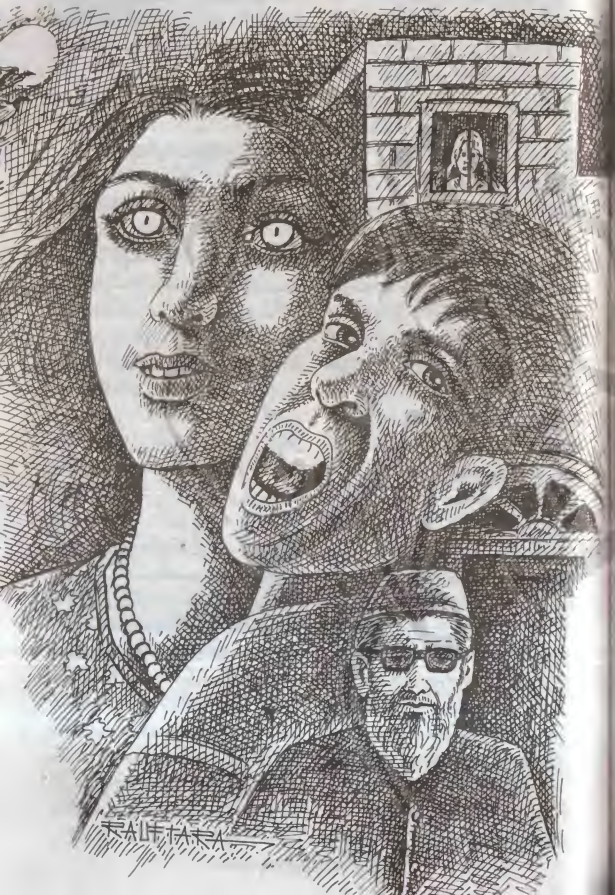

شمیکا

ڈاکٹر اختر ہاشمی۔کراچی

قسط نمبر 3

ایک انسان اور ایک ماورائی مخلوق کی چاہت و خلوص اور دیدہ دلیری پر مبنی شر کے خلاف برسر پیکار، خوفناک حیرت ناک عجیب و غریب حالات و واقعات کے گرد گھومتی ہوئی سوچ کے افق پر محو پرواز اپنی نوعیت کی ناقابل فراموش دلفریبی سے معمور، دل میں کسک پیدا کرتی اپنی مثال آپ داستان حیرت جو کہ پڑھنے والوں کے ذہن سے برسوں محو نہ ہوگی۔

اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کیلئے دل پر اثر کرنیوالی ایک زبردست اور حیرت انگیز روداد

"**بیٹا!** ہمارے پہنچنے میں دیر ہوگئی اور ایک جادوگر جو عامل کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے اس کے محبوب کو جادو کے ذریعے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اسی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوگئی ہے۔ جب تک اپسرا کو شک تھا تب تک اسے کچھ نہیں ہوا تھا کیوں کہ اسے یقین تھا کہ اس کی سچی محبت اس سے کوئی چھین نہیں سکتا۔ اس کے محبوب کو اس سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ مگر جب اسے اپنے محبوب کی موت کا علم ہوا، اور یقین آ گیا تو ایک بڑا صدمہ اس کے دل کو پہنچا۔ تب سے اس کی یہ حالت ہے۔" عامل بابا نے بے بسی سے کہا۔

"بابا اپسرا کو کیا یہ پتا لگا کہ اس کے محبوب کو اس دشمن عامل یا جادوگر نے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔" میں نے بڑے تجسس سے پوچھا۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی اور شمیکا کے چہرے پر غصے کے رنگ آ جا رہے تھے۔

"یہ اس رات کی بات ہے جب اپسرا اس عامل جادوگر کو لعن طعن کرتے اور بھلا برا کرنے کے لیے اس کے گھر جا پہنچی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ سورج مکمل طور پر غروب ہو چکا تھا۔ اپسرا نے عامل جادوگر کے گھر پہنچ کر دروازے پر دستک دی تو دروازہ اس کی بیوی نے کھولا تھا۔

"ظالم عامل کہاں ہے۔" اپسرا نے بڑی نفرت بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔ عامل جادوگر کی بیوی نرم دل کی اور زمانہ شناس عورت تھی، وہ معاملے کی نزاکت کو سمجھ گئی۔ وہ اپنے جادوگر شوہر کے کالے کرتوتوں کے متعلق معلومات رکھتی تھی، اسے اس کے گھناؤنے کام اور کاروبار سے نفرت تھی۔ وہ اپسرا کا غصہ دیکھ کر سمجھ گئی، اس کے جادوگر شوہر نے ضرور اس کے ساتھ کوئی ظلم وستم یا جبر وتشدد کیا ہوگا۔ تبھی لڑکی نے اس کے شوہر کو ظالم عامل کہہ کر مخاطب کیا ہے۔

"آؤ بیٹی ......اندر آؤ۔ وہ تو اس وقت گھر پر موجود نہیں ہیں۔ مجھے بتاؤ کیا کام ہے، کیا میں تمہاری کچھ مدد کر سکتی ہوں؟" عامل جادوگر کی بیوی نے بڑے پیار سے اسے بیٹی کہہ کر مخاطب کیا تو اس کا غصہ قدرے ٹھنڈا ہو گیا تھا اور غصہ ٹھنڈا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عامل جادوگر گھر پر موجود نہیں تھا جس کو وہ برا بھلا کہتی یا جلی کٹی سناتی۔

"آؤ نا اندر تو آ جاؤ۔ میں بھی تمہاری طرح ایک عورت ہوں اور عورت کے دکھ درد کو سمجھتی ہوں۔ اس کا کرب محسوس کر سکتی ہوں۔ مجھے اپنے جادوگر شوہر

کے گھناؤنے کاروبار سے نہ صرف نفرت ہے بلکہ میں اسے کالے کرتوتوں کی وجہ سے پسند بھی نہیں کرتی ہوں۔" عامل جادوگر کی بیوی کی صاف ستھری اور شائستہ باتیں سن کر اپسرا اندر چلی گئی۔ عامل جادوگر کی بیوی نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر چارپائی پر بٹھایا اور ذرا توقف کے بعد بولی۔

"ہاں بتاؤ تمہارے ساتھ کیا زیادہ ہوئی ہے تاکہ ہم مل کر اس کا ازالہ کرسکیں۔" عامل جادوگر کی بیوی کی بے پناہ اپنائیت اور پیار نے اسے شک میں مبتلا کردیا تھا۔

"آپ تو اس ظالم عامل کی بیوی ہیں۔ آپ اس کے اس قدر خلاف کیوں ہیں اور مجھ اجنبی سے اس قدر ہمدردی کس لیے جتا رہی ہیں؟" اپسرا نے متجسس انداز میں پوچھ لیا۔

"بیٹی ایک عورت، عورت کو نہیں سمجھے گی تو کون سمجھے گا۔ میں تجھے اپنا دل چیر کر اپنے جذبات یا اپنی نیت اور ارادے تھوڑی دکھا سکتی ہوں۔ تم مجھ پر بھروسا کرو اور اپنی افتاد مجھ سے بیان کرو۔" عامل جادوگر کی بیوی کی باتوں میں صداقت کی خوشبو تھی۔ ان میں بناوٹی انداز یا معنوی لہجہ نہیں تھا۔ اس کی باتیں لومڑی کی طرح چکنی چوپڑی پھسانے والی نہیں تھی۔ آخرکار اپسرا کو یقین آہی گیا۔

"آنٹی! میں دلشاد سے سچی محبت کرتی ہوں۔ وہ بھی مجھے دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہے اور پسند کرتا ہے۔ ہماری محبت عروج پر پہنچ چکی ہے۔ ہم محبت کے راستوں پر بہت دور نکل چکے ہیں، جہاں سے واپسی کی راہ مسدود ہوچکی ہیں۔ ہم عشق کی اس نہج پر پہنچ چکے ہیں کہ جدائی و فرقت برداشت نہیں کرسکتے۔ ہمیں ایک دوسرے سے الگ کرنا، ہمارا قتل کرنے کے مترادف ہوگا۔ ہم ایک دوسرے سے الگ ہوکر دو پل بھی جی نہ سکیں گے۔ دلشاد کی حالت بھی مجھ جیسی ہے۔ وہ جس دن مجھے نہ دیکھے دیوانہ سا ہوجاتا ہے۔ پاگلوں کی طرح میرا پتا راہ چلتے لوگوں سے پوچھتا پھرتا ہے۔"

"میں سمجھ گئی بیٹی! تم دونوں ایک دوسرے کے لیے دو جسم ایک قلب ہو، ایک جان ہوں۔ مگر مجھے میرے ظالم شوہر کے بارے میں بتاؤ۔ اس نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے۔ کہیں اس نے تم دونوں کو جادو کے زور سے جدا تو نہیں کردیا۔ تم میں جدائی تو نہیں ڈال دی۔" عامل جادوگر کی بیوی نے پوچھا۔

"نہیں آنٹی۔ دراصل ایک اور حسین و جمیل لڑکی نے میرے محبوب پر ڈورے ڈالنا شروع کردیئے ہیں۔ وہ ہر قیمت پر میرے دلشاد کو مجھ سے چھین لینا چاہتی ہے۔ اس نے اس رقابت کے جذبے سے مغلوب ہوکر اور اپنی دشمنی کو ہوا دینے کے لیے تمہارے شوہر سے رابطہ قائم کیا ہوا ہے اور وہ اپنی دولت کے طاقت سے تمہارے شوہر کو خرید چکی ہے۔ وہ صرف اس کام پر کہ میرا دلشاد مجھ سے بدظن ہوکر اس ناگن کا ہوجائے۔ پیسہ پانی کی طرح بہا رہی ہے۔ تمہارے شوہر نے بھی اس سے رقم لے کر جادو کرنا شروع کردیا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ مجھ سے کھچا کھچا رہنے لگا ہے مگر ہے بہت ناخوش۔ اس کو خود سمجھ نہیں آرہا ہے کہ اسے کیا ہوگیا ہے۔ جب جادو کا زور چلتا ہے تو وہ پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ جسے وہ اپنی جان، اپنی زندگی سمجھتا تھا۔ اس سے دور رہنے لگا ہے۔ آنٹی میں چاہتی ہوں کہ آپ اپنے عامل جادوگر شوہر سے کہیں کہ وہ اس ناگن عورت کی بات نہ مانے۔ اس کے پیسے اس کے منہ پر دے مارے۔ دو پیار بھرے دلوں کو ایک دوسرے سے جدا نہ کرے۔ ورنہ ہم دونوں الگ الگ رہ کر مرجائیں گے۔ دلشاد اسے بھی نہیں مل سکے گا۔ مگر دلشاد کی روح تک مجھ سے پیار کرتی رہے گی۔ کیوں کہ میں نے سنا تھا کہ وہ ناگن عورت ناکام ہونے کے بعد کہہ رہی تھی کہ وہ دلشاد کو موت کے گھاٹ اتار دے گی۔ چاہے اس کے لیے اسے کتنا ہی پیسہ کیوں نہ خرچ کرنا پڑے۔ اپسرا کی آنکھیں نم آلود ہوچکی تھیں۔

"عامل جادوگر کی بیوی نے نہ صرف اسے تسلی اور دلاسا دیا بلکہ اس کی ڈھارس بھی بندھوائی اور وعدہ کیا

کہ وہ اپنے شوہر کو اس کے خلاف کارروائی سے منع کرے گی اور بزورِ قوت روکنے کی کوشش بھی۔ اپسرا نے یہ بھی شکایت کی تھی کہ دو دن سے اس کا محبوب لاپتا بھی ہے۔ نجانے وہ اس جادو کے اثر سے گھبرا کر کہاں چلا گیا ہے۔ باتوں باتوں میں رات کافی گزر گئی تھی۔ اپسرا نے اپنے گھر واپس آنے کے لیے اجازت چاہی تو عامل جادوگر کی بیوی نے اسے یہ کہہ کر روک لیا کہ آج رات وہ اکیلی ہے۔ اس کا شوہر آج کی رات گھر نہیں آئے گا۔ وہ کسی قبرستان میں چلہ کشی کرنے کے لیے گیا ہوا ہے۔ لہٰذا اپسرا اس کے پاس رک جائے اور وہیں سو جائے۔ اس طرح خوب گپ شپ بھی رہے گی اور دل کی بھڑاس بھی نکالیں گی اور آئندہ کا لائحہ عمل بھی تیار کریں گی کہ وہ عامل جادوگر کو جادو چھوڑنے پر مجبور کرے یا پھر اس کا ساتھ چھوڑ دے۔ اس طرح اس کا شوہر معصوم سی عورتوں کی زندگیاں برباد کرتا رہے اور وہ دیکھتی رہی، وہ پیار بھرے دلوں کے درمیان نفرت پیدا کرے اور جدائی ڈالتا رہے اور وہ خاموش رہے۔ وہ میاں بیوی میں ناچاقی پیدا کردے اور اس کا گھر ہنسی خوشی بسا رہے، یہ کیسے ممکن تھا۔ دکھی دلوں کی بددعائیں لے کر کوئی کیسے، کب تک اور کیوں کر شاد رہ سکتا تھا۔ لہٰذا عامل جادوگر کی بیوی نے کہا کہ وہ آج اس کی تنہائی کی ساتھی بن جائے۔ کل سے وہ عامل جادوگر کو اس گھناؤنے کاروبار سے روک دے گی یا پھر ہمیشہ کے لیے اس کا ساتھ چھوڑ کر اپسرا کے گھر آجائے گی۔ اپسرا کو اس عامل جادوگر کی بیوی کا یہ فیصلہ بہت اچھا لگا اور اس نے اس رات وہیں قیام کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ عامل جادوگر کی بیوی نے اس کے لیے اپنا بستر پیش کردیا تھا اور اپنے شوہر کے بستر پر خود سوگئی تھی۔ رات دیر گئے تک انھوں نے خوب باتیں کیں اور آئندہ زندگی کے منصوبے بنائے۔ اپسرا نے آنٹی سے اس دعا کے لیے بھی کہا کہ اس کا محبوب دلشاد دو دن سے جہاں کہیں بھی ہو، خیریت سے ہو، آنٹی نے دل سے دعا کی اور رفتہ رفتہ ان دونوں کو نیند کی آغوش نے اپنے اندر سمیٹ لیا۔

"میرے محبوب تم کہاں تھے۔ دو دن سے تمہارا دیدار نہیں ہوا تو میں نے کھانا بھی نہیں کھایا اور ایک گھونٹ بھی پانی نہیں پیا۔ تم مجھے بغیر بتائے، مجھ سے ملے بغیر کہاں چلے گئے تھے۔ آئندہ کبھی تم نے ایسا کیا تو میں ناراض ہوجاؤں گی اور تم سے بولوں گی بھی نہیں۔" اپسرا کی نظر جیسے ہی اس کے محبوب پر پڑی وہ دیوانہ وار دوڑتی ہوئی گئی اور اس کے چوڑے سینے سے جالگی۔

"جانِ من، تمہارے بغیر میرا بھی یہی حال ہے۔ مجھے نا چاہتے ہوئے بھی تم سے دور کیا جارہا ہے۔ یہ رقابت کا جذبہ جانی دشمنی سے بھی خطرناک ہوتا ہے۔ اس ناگن عورت نے ہماری محبت کو ڈس لیا ہے۔ مگر ہاتھ اس کے بھی کچھ نہیں آئے گا۔" دلشاد نے اپسرا کو اپنی بانہوں میں کستے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"تم دو دن سے کہاں تھے۔ بتاؤ...... نا، مجھے بے چینی ہو رہی ہے۔ میری بے تابی میں اضافہ ہونے لگا ہے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ کہیں اس ڈائن عورت نے تمہیں اپنے جال میں پھانس نہ لیا ہو۔ دیکھو جان! تمہارے بغیر میرا جسم واقعی بے جان ہوگیا تھا۔ تم آئی ہو تو اب جان میں جان آئی ہے۔" اپسرا نے دلشاد کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دھڑکتے دل پر رکھ لیا تھا۔ دو جوان جسموں کا لمس پتھر کو بھی پگھلا دیتا ہے۔ وہ دونوں محبت کی آگ میں تو جل ہی رہے تھے۔ آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے بدن کی حدت بھی محسوس کرنے لگے۔ وہ ٹھٹھرتی سردی میں بھی ننگے پاؤں کھڑی تھی مگر اس کے اندر کی گرمی اسے گرمائے دے رہی تھی۔ اور اس وقت تو اس کے محبوب کی رفاقت اور ہاتھ کا لمس اسے مسحور ہی نہیں مست بنائے دے رہا تھا۔

یک دم دلشاد نے اسے خود سے جدا کیا تھا۔ جیسے کسی کی آمد پر دو پیار کرنے والے ڈر جاتے ہیں اور ایک جھٹکے سے الگ الگ ہوجاتے ہیں۔ دلشا اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے کٹورے میں بھرے دیکھ رہا تھا اور آج اس کے کتاب چہرے کی تلاوت جی بھر کرنا چاہتا تھا مگر رفتہ رفتہ اس نے اپسرا کو خود سے الگ کیا۔ اپنا ہاتھ اس

کے سینے سے ہٹایا اور دور ہوتا گیا۔ دلشاد کی اس ادا سے اسے رنج ہوا تھا اور جب اس نے دلشاد کو خود سے دور ہوتے دیکھا تو وہ صدمے سے نڈھال ہوگئی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔

''دلشاد تم کہاں جارہے ہو۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ دلشاد میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گی۔'' دلشاد نے اس کی ایک نہ سنی اور وہ اس کی نظروں سے دور، بہت دور ہوتا چلا گیا۔ وہ اچانک ٹھہر کر گویا ہوا۔

''اپسرا...... مجھے بھول جاؤ۔ اب ہم کبھی بھی مل نہ سکیں گے۔ دنیا والوں نے ہمیں ایک دوسرے سے جدا کردیا ہے۔ ایک جان کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کردیا ہے۔ دولت جیت گئی، رقابت جیت گئی، محبت ہار گئی، چاہت ہار گئی۔'' یہ کہتے ہوئے دلشاد کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی ٹوٹ کر بکھرنے لگی تھی۔ وہ مرد ہوکر رونے لگا تھا۔ کس قدر کاری ضرب اس کے دل پر لگی ہوگی۔ یہ بات وہی جان سکتا ہے، جس کے دل پر بیتی ہو۔ اپسرا اس کی طرف ننگے پاؤں دوڑنے لگی۔ وہ جس قدر دلشاد کے قریب ہونے کی کوشش میں اپنی رفتار تیز کرتی، دلشاد اسی تیزی سے اس سے دور ہوتا گیا۔ وہ ٹھوکر کھا کر گری تو ایک درد بھری ٹیس دلشاد کے منہ سے نکلی۔ سنو جانِ تمنا، آج مری تم سے آخری ملاقات ہے۔ اس کے بعد ہم کبھی بھی نہیں مل سکیں گے۔ اس ظالم سماج نے ہمارے درمیان نظر نہ کرنے والی دیواریں حائل کردیں ہیں۔ ہمارے دلوں کے ٹکڑے کردیئے ہیں۔ ہمارے محبتوں کے تاج محل کو چکنا چور کردیا ہے۔ مجھے تم سے دور کردیا ہے۔''

''غور سے سنو اپسرا۔ میں بھی تمہاری طرح عامل جادوگر کو سمجھانے آیا تھا۔ مگر وہ پہلے ہی سے میری گھات میں بیٹھا تھا۔ اس ناگن عورت کے ساتھ جس نے اپنی دولت کے بل بوتے پر مجھے خریدنے کی کوشش کی تھی۔ جب میں عامل جادوگر کے گھر میں داخل ہوا تو اس وقت وہ عورت اور عامل جادوگر کے علاوہ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ عامل جادوگر اس عورت کے کہے میں مجھ پر مزید جادو ٹونے کے کام میں مصروف تھا۔ تبھی اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا تھا کہ وہ دیکھو میرے جادو میں کتنی طاقت ہے۔ تمہارا عاشق سر کے بل چل کے تمہارے پاس آگیا ہے۔ مجھے دیکھ اور عامل جادوگر کے یہ جملے سن کر وہ ناگن لہراتی ہوئی اٹھی اور آکر میرے گلے سے لگ گئی۔ اس لمحے عامل جادوگر نے کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونک دیا۔ میں ایک پتھر کے مجسمے کی طرح ہوگیا تھا۔ مجھ میں حرکت کرنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ اتنی جنبش بھی نہیں کرسکا تھا کہ اس ناگن کو خود سے جدا کرسکتا۔ اس پر شہوت سوار تھی۔ وہ اپنے رقابت کے جذبے اور محبت کے ہاتھوں مجبور تھی یا پھر عامل جادوگر نے اسے ایسا کرنے کو کہا تھا۔ میں دیکھ تو سکتا تھا مگر بھاگ نہیں سکتا تھا۔ اس نے مجھے پتھر کا بنا دیا تھا تاکہ میں کوئی مزاحمت نہ کرسکوں، یا راہِ فرار بھی اختیار نہ کرسکوں۔ وہ ناگن عورت اپنے اور عامل جادوگر کے منصوبے کے مطابق من مانی کرنے لگی۔ میں پتھر کے مجسمے کی طرح ساکت و جامد کھڑا تھا۔ بس مجھ میں سننے، بولنے اور دیکھنے کی حس بیدار تھی۔ عامل جادوگر اپنے منتروں کے ذریعے میرا دل اور دماغ قابو کرنے کی کوشش کرتا رہا اور میرے جسم و بدن پر فتح پانے کی کوشش وہ ناگن کرتی رہی۔ وہ مجھے اطمینان و سکون سے ڈس لینا چاہتی تھی۔ وہ مجھے اپنا اس لیے بنانا چاہتی تھی کہ دن بھر وہ میرے ساتھ رہے اور جتنی بار اس کا دل چاہے مجھے ڈستی رہے اور اپنے من کی آگ بجھاتی رہی۔

لاکھ من مانی کے باوجود وہ ناکام رہی تو اس نے غصے سے عامل جادوگر کی طرف دیکھا اور افسوس کے ساتھ آنکھوں میں اپنی ناکام حسرت کا جنازہ اٹھ جانے کی شکایت کی۔ عامل جادوگر نے میرا سر سے پاؤں تلک بغور جائزہ لیا تو اس نے کہا تھا کہ دراصل ہم نے اسے پتھر کا مجسمہ بنا دیا ہے۔ مگر یہ نہیں سوچا کہ پتھر تو بے جان ہوتا ہے، بے حس ہوتا ہے، اس میں محسوس کرنے کی حس نہیں ہوتی، اس پر کسی کی محبت و چاہت، بوس و کنار اور

جسمانی لمس کا اثر نہیں ہوتا، نہ اس پر کسی عورت کی پرخمار شراب جیسی جوانی کا نشہ چڑھتا ہے۔ لہٰذا اسے دوبارہ انسان کی جون میں لانا ہوگا کیونکہ اس حالت میں اس کے سننے، دیکھنے اور بولنے کی حس تو بیدار ہے مگر محسوس کرنے اور کیف و سرور محسوس کرنے کی حس پتھرا گئی ہے۔ اس لیے اس پتھر پر تمہاری توجہ شکن جوانی کا، گداز بھرے بدن کا اور بدمست اداؤں کا اثر نہیں ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ مرد تمہارے قرب و لمس کی لذتوں سے محروم ہے اور اس پر تمہارے حسن و شباب کا جادو سر چڑھ کر بول نہیں رہا ہے۔ یہ باتیں سن کر وہ ناگن چیخی تھی کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں نے تمہیں اس کی اجرت اور منہ مانگی قیمت ادا کی ہے۔ مجھے میرے مقاصد میں ہر قیمت پر کامیابی چاہیے۔ میں کافی دیر خاموش رہا پھر گویا ہوا۔

''عامل جادوگر تو نے دولت کی خاطر دو پیار بھرے دلوں میں زہر بھر دیا ہے۔ تو نے ایک پاکیزہ محبت کا جنازہ اٹھا دیا ہے۔ ایسے ارمانوں کے پھولوں کو اپنے ناپاک قدموں سے روند دیا ہے جو ابھی کھلنے بھی نہیں پائے تھے۔ ان معصوم سے جذبات کی کلیوں کو نوچ پھینکا ہے جن کو ابھی چٹکنا باقی تھا۔ دو محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا کردیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود تو اور یہ ناگن عورت نہ مجھے حاصل کرسکے گی اور نہ میری محبوبہ کو کوئی نقصان پہنچا سکے گی۔ ہم اور ہماری روحیں مرنے کے بعد بھی ملتے رہیں گے اور ایک دوسرے کو تاقیامت پسند کرتے اور چاہتے رہیں گے۔ سچی محبت کرنے والوں میں ہمارا بھی شمار ہو کررہے گا اور تمہارا ذکر ہمیشہ راون کی نسل میں چلے گا۔ یہ تیری جادو کی دیواریں ہماری روحوں کے ملاپ کو روک نہ سکیں گی۔ تو نے بھلے دولت کے لالچ میں اندھا ہوکر اپنی انا اور خودی کو مار کر ہمارے اور ہمارے سچے پیار کے خلاف اقدامات کیے لیکن ہمارا عشق جیت گیا ہے۔ دیکھ یہ ناگن تمام تر جادوئی کوشش، چاہت اور جدوجہد اور ہر سر توڑ کوشش کے باوجود نہ میرا پیار حاصل کرسکی اور نہ میری مرضی۔ اسے نہ میرا جسم ملا اور نہ میری روح، یہ کم بخت سمجھتی تھی کہ دولت کے بل بوتے پر سب کچھ خریدا جاسکتا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ آج بھی یہ دھنواں ہوکر بھی خالی ہاتھ ہے اور مجھ سے محبت کی بھیک مانگ رہی ہے۔ میرا سر آج بھی فخر سے بلند ہے کہ میں نے اپنی محبوبہ کی امانت میں خیانت نہیں کی۔''

پھر وہ اپنی محبوبہ اپسرا کی جانب متوجہ ہوکر کہنے لگا۔

''اپسرا، مجھے افسوس ہے میں اپنے وعدوں کے مطابق تمہارے ساتھ جی نہ سکا۔ کیونکہ اس ظالم جادوگر نے اپنا جادو ناکام ہوتے دیکھ کر مجھے مار دیا ہے۔ مجھے قاتل کردیا ہے اور میرے خون میں اس ناگن عورت کا بھی ہاتھ ہے۔ ان دونوں نے میرے خون سے اپنے ہاتھ رنگ لیے ہیں۔ اب میں تمہارے پاس کبھی لوٹ کر نہیں آسکوں گا۔ مگر میں قیامت تک تمہارا انتظار بڑی شدت اور بے چینی سے کرتا رہوں گا۔ تب تک میری روح پیاسی رہے گی۔ جب تک تمہارے وصال اور ملن سے سیراب نہیں ہوجاتی۔ میں جارہا ہوں۔ تم اپنا دھیان رکھنا اور اگر ہوسکے تو میرے خون کا بدلا لینا۔ اس ظالم جادوگر اور اس ناگن عورت سے، ان دونوں نے اپنی اپنی ناکامی پر اور نامرادی پر بہت غصہ کھایا، طیش میں آئے اور پیر پٹخنے کے سوا کچھ نہ کرسکے۔ میں نے ہر طرح تمہاری محبت، تمہاری چاہت اور تمہاری امانت کی حفاظت کی ہے۔ اس میں ذرّہ بھر بھی خیانت ہونے نہیں دی ہے۔ ہم سرخرو ہوگئے ہیں۔ ہمارا پیار جیت گیا ہے۔ یہ شیطان صفت لوگ ہار گئے ہیں۔ تبھی انتقاماً ان دونوں نے مل کر میرے خون سے اپنے ہاتھ رنگ لیے ہیں اور پھر میری لاش پر رات بھر جشن مناتے رہے ہیں۔ خود کو گناہ آلود کرتے رہے ہیں۔ میں تمہیں ان سے انتقام کا جواز اور راستہ بھی بتاتا ہوں۔ انہوں نے میری لاش کے ٹکڑے کرکے ٹھیک اسی جگہ دفن کردیے ہیں جہاں پر تمہاری چارپائی ہے۔ میں تمہاری چارپائی کے نیچے دفن ہوں۔ تم چپ چاپ یہاں سے

چلی جانا اور جب عامل جادوگر گھر لوٹ آئے تو پولیس کو لے کر جانا اور اپنی چارپائی کے نیچے جگہ کھود کر دیکھنا۔ پولیس کے ساتھ تمہیں وہاں میری لاش ملے گی۔ ان ظالموں پر کسی صورت رحم نہ کھانا۔ دونوں کو پھانسی چڑھوا دینا۔ یہ دونوں نہ صرف میرے قاتل ہیں بلکہ ہماری محبت اور عشق کے خونی بھی ہیں۔ میں جارہا ہوں، کبھی لوٹ کر نہ آنے کے لیے۔"

اپسرا اس ڈراؤنے خواب سے جاگی تو وہ پسینے میں شرابور ہو رہی تھی۔ اور خوف اور صدمے سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ وہ غصے سے لال پیلی ہوگئی تھی اور جذبات میں بے قابو بھی۔ مگر پھر اس نے موقعے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے بمشکل خود پر قابو پایا اور ہوش کے ناخن لیے۔

"تب سے اپسرا کی یہ حالت ہے۔ اسے سکتہ ہوگیا ہے۔ وہ کسی سے کچھ کہتی ہے نہ کچھ سننے کی کوشش کرتی ہے۔ نہ کھاتی ہے، نہ پیتی ہے۔ اس حالت سے اس کے مردہ ہونے کا گمان ہوتا ہے۔" عامل بابا نے بڑی تفصیل سے ہمیں بتایا۔

"بابا کیا آپ ہمیں اپسرا کے پاس لے کر جاسکتے ہیں۔" شمیکا نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں بیٹی۔ میں تو خود سوچ رہا تھا کہ کوئی اگر میرا ساتھ دے تو میں اس کے ساتھ جاکر پولیس کو اطلاع دوں اور پولیس کے ساتھ عامل جادوگر کے گھر پہنچو اور اس جگہ کی نشان دہی کروں جس کی نشان دہی شیام نے اپسرا کے خواب میں کی تھی۔ جب پولیس کے سامنے شیام کی لاش آئے گی تو وہ عامل جادوگر کو گرفتار کرکے کیفر کردار تک پہنچادے گی۔" عامل بابا نے لاٹھی کا سہارا لے کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بابا، ہم پہلے پولیس کی مدد سے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر پولیس ناکام ہوئی، یا پولیس نے اس کی طرف داری کی تو پھر ہم خود ان سے نمٹ لیں گے۔" میں نے شمیکا نے ساتھ عامل بابا کو دیکھ کر کہا۔ ہم تینوں اپسرا کے گھر کی طرف چل پڑے جو زیادہ دور نہیں تھا۔ راستے میں باتیں کرتے رہے تھے جس سے وقت گزرنے اور سفر طے ہونے کا پتا بھی نہیں چلا۔ ہم بہت جلد عامل بابا کی رہنمائی میں اپسرا کے گھر پہنچ چکے تھے۔ عامل بابا نے اپسرا کے گھر کے دروازے پر دستک دی تو پہلی ہی دستک میں دروازہ کھول دیا گیا تھا۔

"آیئے عامل بابا، آپ خیریت سے ہیں۔"

دروازہ کھولنے والی کوئی ادھیڑ عمر کی عورت تھی جو اپسرا کی ماں لگ رہی تھی کیونکہ دونوں کی شکلوں میں بڑی مشابہت تھی۔

"ہاں میں خیریت سے ہوں۔ اپسرا کی طبیعت کیسی ہے؟" عامل بابا نے پوچھا۔

"اپسرا کی طبیعت قدرے بہتر ہوئی ہے مگر کسی بڑے صدمے سے وہ بہت نڈھال ہے اور شاید یہ صدمہ جان لیوا سا ہے۔ یہ بابو اور میم صاحب کون ہیں؟" اپسرا کی ماں نے پوچھا۔

ان دونوں نے تو اپسرا کو اس ظالم جن سے بچایا تھا جو مجھے زندہ دفن کرنے کے لیے صحرا میں لے گیا تھا۔ وہ مجھے اپسرا کے محبوب کا ساتھ دینے کی پاداش میں ایسا کرنا چاہتا تھا۔" عامل بابا نے ہمارا تعارف کرایا۔

"آیئے ، آیئے ......اندر آجایئے۔ آپ تو ہمارے محسن ہیں۔" اپسرا کی ماں نے ہمیں اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے کہا۔

"ماں جی ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ آپ ہمیں اجازت دیں کہ کچھ دیر کے لیے ہم اپسرا کو اپنے ساتھ لے جائیں۔" شمیکا نے اپسرا کی ماں سے اجازت طلب کی۔

"لیکن بیٹی اس حالت میں اپسرا کہیں جا کے کیا کرے گی۔" نہ تو وہ بول سکتی ہے اور نہ کچھ بتا سکتی ہے۔ اسے تو اپنا بھی ہوش نہیں ہے۔" اپسرا کی ماں نے مجبوری ظاہر کی۔

"اماں جی! ہم اپسرا کو اس حالت سے باہر نکالنے کے لیے تو ایسا سب کچھ کر رہے ہیں۔ یہ سمجھ لو کہ

ہم اپسرا کو اپنے ساتھ اس کا علاج کرانے کے لیے لے کر جارہے ہیں۔ انشا اللہ واپسی پر اپسرا آپ کو پہلے جیسی حالت میں ملے گی۔" میں نے اپسرا کی ماں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ اس نے عامل بابا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ عامل بابا نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔ تب وہ ہمیں اپسرا کے کمرے میں لے گئیں۔

اپسرا اپنے کمرے میں کسی پتھر کے بت کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ اور ایک طرف نظریں جمائے ہوئے دیکھے جارہی تھی۔ اسے ہمارے آنے اور ہماری آہٹ کا بھی علم نہ ہوسکا تھا۔

"چلو اپسرا۔ تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔" شمیکا نے اسے بازو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ ذرا سے اشارے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ مگر اس کے چہرے پر کوئی تاثرات نہیں تھے۔ نہ خوشی کے اور نہ ناگواری کے۔ وہ کٹھ پتلی کی طرح تھی۔ جدھر شمیکا نے اشارہ کیا، وہ ادھر چلتی بنی۔ شمیکا نے اس کے پاؤں میں چپل پہنائی اور ایک چادر اس کے سر اور سینے پر پھیلا دی۔ تب ہم عامل بابا کے ساتھ جادوگر کو گرفتار کرانے کے لیے پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئے۔

"آیئے بابا جی۔ آج پھر آپ کسی کو لے کر آگئے ہیں۔" ہیڈ کانسٹیبل نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا! جب تک زندگی ہے میں ستم زدہ اور مظلوموں کی مدد کرتا رہوں گا۔ اور ظالموں کے خلاف نہ صرف آواز بلند کروں گا بلکہ ان کے خلاف ہر قسم کی کارروائی سے بھی دریغ نہ کروں گا۔" عامل بابا نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ کی تعریف؟" پولیس کانسٹیبل نے میری اور شمیکا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹا! یہ میرے مہمان ہیں۔ جو اپسرا کو بھی جانتے ہیں۔ شہر سے آئے ہیں۔ اس لیے یہ اپسرا کو لے کر میرے ساتھ آگئے ہیں۔" ہماری طرف سے عامل بابا نے پولیس کانسٹیبل کو جواب دیا۔

"تو بتایئے بابا، آج کا کیس کیا ہے اور کس کے خلاف ہے۔" پولیس کانسٹیبل نے ہمیں چوکی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود عامل بابا کے پاس کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ گیا۔

"بیٹا، یہ کاغذی کارروائی کا کیس نہیں ہے۔ اس کیس میں ہمیں عملاً دخل ہونا پڑے گا۔ ورنہ بہت دیر ہوجائے گی۔" عامل بابا نے عجلت میں کہا۔

"لیکن بابا، ہمیں کیس تو پتا چلے اور کس کے خلاف اور کیا کارروائی کرنی ہے۔ کچھ بتایئے، نا۔" پولیس کانسٹیبل نے عاجزی ظاہر کی۔

"دراصل بیٹا۔ یہ اپسرا ہے۔ یہ ایک لڑکے شیام سے محبت کرتی تھی جو اسی گاؤں کا رہنے والا ہے، اسے رقابت میں ایک ناگن عورت نے عامل جادوگر کو دولت کا لالچ دے کر قتل کروادیا ہے۔ ہم عامل جادوگر اور اس ناگن عورت کو گرفتار کروانے کے لیے آپ کی مدد چاہتے ہیں۔" عامل بابا نے انکشاف کیا تو وہ چونکا۔

"بابا، یہ معمولی مسئلہ تو نہیں ہے۔ عامل جادوگر کی شہرت اور جادوئی طاقت سے شاید آپ واقف نہیں ہیں۔ وہ ہزار بار پولیس کو چکما دے چکا ہے اور پولیس والوں کو نقصانات بھی پہنچا چکا ہے۔ ہم تو خود اس کی گرفتاری کے خواہش مند ہیں، مگر ہم آسانی سے یہ کام کر نہیں سکتے۔" پولیس کانسٹیبل نے قلم کاغذ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کو عامل جادوگر کو گرفتار کرانے کے لیے کس قسم کی نفری، ہتھیار یا طاقت درکار ہے۔" شمیکا نے اس کی گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے پوچھا۔

"کم از کم ایک عورت جو معاشرے کی سب سے کمزور چیز ہے، اس کی مدد تو درکار نہیں ہے۔" پولیس کانسٹیبل نے شمیکا کو اوپر سے نیچے کی طرف دیکھتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے، ایک عورت کی نہیں تو پھر کس کی ضرورت ہوگی۔ ہم آج اور ابھی ہر صورت میں عامل جادوگر کو گرفتار کروانے چاہتے ہیں۔" میں نے بات کا

رخ پھیرا، ورنہ شمیکا کو غصہ آ گیا تھا اور غصے میں اس کی جناتی قوتیں عود آتی تو پھر اس کو بس میں رکھنا مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہوتا تھا۔ اس لیے اس بار پولیس کانسٹیبل سے میں نے دریافت کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ پولیس کانسٹیبل کوئی جواب دیتا، پولیس اسٹیشن کے مین گیٹ سے ایک پولیس جیپ اندر داخل ہوئی تو وہ اس کی طرف دوڑ پڑا۔ پہلے پولیس کانسٹیبل نے جیپ سے اترنے والے افسر کو سلوٹ کیا اور پھر اپنے ساتھیوں سے ہاتھ ملایا۔

''گنگو، یہ لوگ کون ہیں اور یہاں کیوں آئے ہیں؟'' اندر آنے والے آفیسر نے ہم سب پر نظر ڈالتے ہوئے کانسٹیبل سے پوچھا۔

''سر! یہ لوگ عامل جادوگر کے خلاف ایف آئی آر درج کرانا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آج اور اسی وقت اس کے گھر پر چھاپہ مارا جائے۔'' کانسٹیبل کے جواب دیا۔

''کیوں اور کس لیے چھاپہ مارا جائے۔ ایسا اس نے کیا، کیا کیا ہے۔'' آفیسر شاید انسپکٹر تھا۔ انسپکٹر نے اپنی کیپ سر سے اتار کر میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''سر! ان لوگوں کا کہنا ہے کہ عامل جادوگر نے اس لڑکی کے محبوب کو دولت کے لالچ میں اور ایک عورت کے کہنے میں آ کر قتل کر دیا ہے۔'' کانسٹیبل نے اپسرا کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔

''آپ لوگوں کے پاس کیا ثبوت ہے کہ عامل جادوگر نے اس کے محبوب کو قتل کر دیا ہے۔ کیا تم نے اسے قتل ہوتے دیکھا ہے، یا اس کی لاش کے پاس کچھ ایسے ثبوت ملے ہیں۔'' انسپکٹر نے میرے طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''انسپکٹر صاحب، اس لڑکی کا نام اپسرا ہے۔ یہ ایک دن اپنے محبوب شیام کی زندگی اور اپنی محبت کی بھیک مانگنے عامل جادوگر کے پاس گئی تھی، کیوں کہ دو روز سے شیام گھر سے غائب تھا۔ جب یہ اس عامل جادوگر کے گھر پہنچی تو وہ گھر پر موجود نہیں تھا، مگر اس کی بیوی نے اپسرا کو پیار سے اپنے پاس بٹھایا اور پوری بات سنی۔ وہ عورت بھی اپنے جادوگر شوہر سے تنگ آئی ہوئی تھی۔ اس نے اسے دلاسا دیا اور جادوگر سے اس کے خلاف کارروائی کرنے کا عزم کیا اور اسے روکا کہ وہ اکیلی ہے، وہ بھی ایک عورت ہے، جادوگر ایک دن اور رات کے بعد آئے گا، لہٰذا اس کی بیوی نے اپسرا کو اپنی تنہائی کے خوف سے اپنے پاس روک لیا۔ جس رات اپسرا اس کے گھر میں اس کی بیوی کے پاس سوئی، اس رات اپسرا کے محبوب نے خواب میں آ کر اسے بتایا کہ وہ اب آپس میں کبھی بھی مل نہیں سکتے ہیں، کیونکہ عامل جادوگر نے اسے قتل کر دیا ہے اور اس کی لاش اس چارپائی کے نیچے دفن ہے، جس پر وہ سو رہی ہے۔ اپسرا کی آنکھ کھلی تو اسے بجلی کا سا جھٹکا لگا اور اس کے دل کو بڑا صدمہ پہنچا، یہاں تک کہ اس کی یہ حالت ہو گئی کہ یہ اب تک بھی سکتے کے عالم سے باہر نہ نکل سکی۔'' میں نے پورے واقعے کا مرکزی خیال پیش کیا۔

''تو تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ ہم ایک خواب کو حقیقت مان کر عامل جادوگر کو قاتل سمجھیں اور اس کے گھر پر چھاپہ ماریں اور اس کا مکان ادھیڑ کر رکھ دیں اور شیام کی لاش کو تلاش کریں۔'' انسپکٹر نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''ہاں انسپکٹر صاحب! ایسا ہی کرنا ہوگا اور مجھے یقین ہے کہ یہ خواب محض خواب نہیں ہے بلکہ الہام ہے اور حقیقت یہی ہے کہ عامل جادوگر نے شیام کو قتل کر کے اپنے گھر ہی میں دفن کر رکھا ہوگا۔ ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جادوگر کے کان میں اس معاملے کی بھنک پڑ جائے اور وہ لاش کو وہاں سے نکال کر ٹھکانے لگا دے۔'' اس بار شمیکا نے زبان کھولی تھی۔ مگر اس کا لہجہ سخت تھا۔ انسپکٹر نے اس کے چہرے پر کچھ لکھا پڑھ لیا تھا۔ تبھی وہ سنجیدہ دکھائی دینے لگا تھا مگر پھر بھی اس نے اپنی وردی اور عہدے کا بھرم قائم رکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھو اگر ایسا نہ ہوا تو پھر تمہارے ساتھ مجھے

بھی شرمندہ ہونا پڑے گا۔'' انسپکٹر نے کیپ اٹھا کر سر پر ...لی اور ڈرائیور کو آواز لگائی۔

''رام ذرا گاڑی تو نکالو اور ساری نفری کو ساتھ ...لو، ہتھیاروں سے لیس ہو کر تیار ہو جاؤ۔ تھانے میں صرف گنگو رہے گا۔ ان لوگوں کے خواب کی حقیقت بھی ...آئیں۔''

''شکریہ انسپکٹر صاحب۔ دراصل ہمیں ساری فکر اپسرا کی ہے، اسے حقیقت حال معلوم ہو جائے تو اس صدمے سے نجات دلائی جا سکتی ہے۔'' میں نے انسپکٹر کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن اگر یہ سب سچ ہوا جو آپ بتا رہے ہیں تو اس صدمے سے یعنی اپنے محبوب کی لاش دیکھ کر اس کی جان بھی تو جا سکتی ہے۔ اسے دل کا دورہ بھی تو پڑ سکتا ہے۔ ایسی صورت میں آپ کی محنت اور خدمت سب کچھ رائگاں چلا جائے گا۔'' انسپکٹر نے اس بات کی طرف توجہ دلائی جس کی طرف کسی کا دھیان نہیں تھا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں انسپکٹر صاحب، لیکن میں اس معاملے کو سنبھال لوں گا۔ اس کے محبوب کے قاتل کو کیفر دار تک پہنچا کر اسے شانت کر دوں گا۔ اس طرح کسی حد تک اپسرا کو ذہنی سکون میسر آئے گا اور پھر رفتہ رفتہ اس کی حالت بہتر ہوتی جائے گی اور ایک دن وہ پہلے کی طرح نارمل ہو جائے گی۔'' عامل بابا نے انسپکٹر کی بات کا تسلی بخش جواب دیا تھا۔ عامل بابا کو یہاں کے لوگ نہ صرف جانتے تھے بلکہ ان کی بڑی عزت بھی کرتے تھے۔

عامل جادوگر کے گھر کے سامنے جیپ رکی تھی۔ تمام پولیس اہلکاروں نے گھر کو گھیرے میں لے لیا تھا اور اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھالی تھیں۔ انسپکٹر اور میں اس کے گھر کے دروازے کی سمت قدم بڑھا رہے تھے۔ جبکہ شمیکا اپسرا کو سہارا دے کر اور عامل بابا کا خیال کر کے آگے بڑھ رہی تھی۔ دوسری دستک پر جادوگر کی بیوی نے دروازہ کھولا تو وہ پولیس کو دیکھ کر ششدرہ گئی۔ اس نے عجلت میں دروازہ بند کر کے لوٹ جانا چاہا مگر انسپکٹر نے دروازے کے درمیان اپنا اسپیشل بوٹ رکھتے ہوئے اسے ایسا کرنے میں ناکام کر دیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ جب میں اور انسپکٹر صاحب گھر میں داخل ہوئے تو جادوگر کسی روئی کے پتلے میں سوئیاں چبھونے کا عمل کر رہا تھا۔ اس نے اپنے سامنے آگ روشن کر رکھی تھی اور وہ کچھ پڑھ پڑھ آگ میں پھینک رہا تھا، جس سے آگ کے شعلے ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں مگر شور اور دروازے کے پٹوں کی آواز سن کر جادوگر نے آنکھیں کھول دیں تو وہ اپنے سامنے مجھے اور انسپکٹر کو دیکھ کر پتھر کا مجسمہ بن گیا تھا۔

''بس کرو جادوگر صاحب، جتنے کالے کرتوت تم نے کر لیے ہیں، کافی ہیں۔ اب اپنے جادوگر کے زور سے کسی معصوم سی لڑکی کے محبوب کو موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کر رہے ہو یا کسی بیوی سے اس کا شوہر چھیننے کی تگ و دو میں مصروف ہو۔'' میں نے دو قدم آگے بڑھ کر جادوگر سے کہا تھا۔

''جا بچے...... چلا جا۔ اس وقت میرے سامنے سے چلا جا۔ انسپکٹر صاحب پھر کسی اور وقت آنا۔ میرا سارا جاپ ادھورا رہ جائے گا۔ میری ساری محنت رائگاں چلی جائے گی۔ جادوگر نے بڑے غصیلے انداز میں کہا تو ایسا لگا جیسے اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے ہو۔

''بند کرو اپنا یہ ڈھونگ اور پھانسی پر چڑھنے کی تیار کرو۔'' انسپکٹر نے روئی کے پتلے کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

''جادوگر، کئی ایف آئی آروں میں تیرا نام درج ہے مگر تو ہر بار ہمیں چکمہ دے کر فرار ہو جاتا ہے مگر آج قانون کے لمبے ہاتھ تیری گردن تک آ پہنچے ہیں۔ اب تو خود کو پھانسی کے پھندے سے نہیں بچا سکتا۔ نجانے کتنے بے گناہ لوگوں کو تو نے موت کے گھاٹ اتارا ہوگا اور کتنی نادان اور بے بس لڑکیوں کی عصمت کی دھجیاں اُڑائی ہوں گی۔'' انسپکٹر نے جادوگر کی گردن پر

چھڑی سے زور دیتے ہوئے کہا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور پینترا بدل کر گویا ہوا۔

"تو اس کا مطلب ہے پولیس والے نمک حرامی پر اتر آئے ہیں۔ کل تک میں جن کتوں کے سامنے گوشت لگی ہڈیاں ڈالتا تھا، آج وہ مجھ پر ہی بھونکنے کے لیے آگئے ہیں اور مجھے ہی کاٹ کھانے کو گھور رہے ہیں۔" جادوگر نے غصے سے کانپتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

لیکن مجھے یہ تو بتاؤ کہ کس جرم کی پاداش میں تم مجھے گرفتار کرنے آئے ہو۔ کون سے گناہ میں مجھے جیل میں بند کردینا چاہتے ہو، کس کے قتل کے ارتکاب میں مجھے پھانسی کی دھمکی دے رہے ہو۔ کیا کوئی ثبوت ہے میرے خلاف...... تم میں سے کسی کے پاس بھی؟" جادوگر نفرت سے گردن اکڑا کر دور جا کھڑا ہوا۔

"بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ باہر تمہارے گھر کے چاروں طرف اسلحے سے لیس سپاہی چوکنے کھڑے ہیں اور میں ان کو تمہیں فرار ہوتا دیکھنے پر گولی مارنے کا حکم دے چکا ہوں۔ لہٰذا ایسی حماقت کرنا۔" انسپکٹر صاحب نے اپنے اختیارات جتاتے ہوئے واضح کیا۔

"اور کوئی جادو ٹونا بھی آزمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے جادو کے تمام تر تیر بھی کند کردیے گئے ہیں۔" شمیکا نے کہا تھا۔

"تم ہمارا کچھ بگاڑ بھی نہیں سکتے ہو۔ کیونکہ میں نے رحمانی کلام سے اپنے تمام لوگوں کے گرد حصار قائم کردیا ہے تاکہ تمہارے سفلی علم اور ناپاک عمل سے بچے رہیں۔" عامل بابا نے وضاحت کی۔

"ہاں بابا، ہمارے پاس تمہارے خلاف ثبوت بھی ہیں اور تمہارے قاتل ہاتھوں کے نشانات بھی موجود ہیں۔ ابھی تو لاش تمہارے گھر میں موجود ہے اور پھر جب قاتل ہو، مقتول ہو اس کی لاش موجود ہو تو مجرم ایسی حالت میں گرفتار ہوتا ہے تو رنگے ہاتھوں پکڑا جانا کہلاتا ہے۔ ایسی صورت میں مجرم کے پاس اقبال جرم کرنے کے علاوہ کوئی جواز یا جواب نہیں بچتا۔" انسپکٹر صاحب نے اپنی باتوں سے جادوگر کی سٹی گم کردی تھی، پھر اس نے جادوگر کی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"تو یہ والی چارپائی تمہاری ہے، جس پر اپسرا سوئی تھی۔ اس کو خواب میں اسی چارپائی کے نیچے کا اشارہ کیا گیا تھا۔" انسپکٹر نے دونوں ہاتھوں سے چارپائی کو الٹ کر دوسری طرف پھینک دیا تھا۔ چارپائی کے بچھنے اور پھر اس پر بڑی سی چادر آجانے سے نیچے کی چیزیں نظر نہیں آرہی تھیں۔ چادر سمیت چارپائی کو ہٹایا گیا تو زمین صاف نظر آنے لگی۔ پانچ فٹ لمبائی اور تین فٹ چوڑائی کا فرش اکھڑا ہوا تھا۔ یہ کارروائی جادوگر کے ہوش اُڑا گئی۔ اب اس کی سمجھ میں ہر بات آنے لگی۔ وہ فرار کی راہیں تلاش کرنے لگا۔ انسپکٹر صاحب نے چار پولیس اہلکاروں کو اندر آنے کا حکم دیا۔ جیسے ہی چاروں پولیس اہلکار اندر آئے انسپکٹر صاحب نے دو کو زمین کھودنے اور دو کو جادوگر کو ہتھکڑی لگانے کا حکم دیا۔ جادوگر اب منتر پڑھنے لگا اور بڑبڑانے لگا۔ وہ زور زور سے چیخ چلانے لگا اور سب کو دھمکیاں دے رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"میرے موکل، تم سب کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ نہ صرف تم سب کو بلکہ تمہارے گھر والوں کا بھی جیون اجیرن کردیں گے۔ میں ابھی ابھی تم سب کو جلا کر راکھ کردوں گا۔" وہ جیسے ہی کچھ پڑھتا ہوا، ہوا میں اشارہ کرتا، شمیکا اس کے ہر اشارے کو زیر کر کے آگ میں جھونک دیتی۔ شاید ایک جن زادی اور جادوگر کی جنگ چھڑ چکی تھی جو وہ آپس میں بڑی خاموشی سے لڑ رہے تھے۔ اس جنگ کے بارے میں کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ ادھر عامل بابا روحانی طور پر سب کی حفاظت میں لگے ہوئے تھے۔ انھیں اپنی جان کی پروا نہیں تھی۔ وہ تو اپسرا کو، مجھے، شمیکا اور انسپکٹر کے ساتھ ساتھ پولیس اہلکاروں کو ہر قسم کے نقصانات سے بچانے کی فکر میں مبتلا تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے عامل جادوگر کی بیوی کو بھی اپنے پاس بلا کر حصار میں کھڑا کرلیا تھا۔ جوں جوں

سپاہی فرش کھود رہے تھے۔ جادوگر کے چہرے کے تاثرات بدل رہے تھے۔ اس کی آنکھیں تو شعلے اگل رہی تھیں مگر اس کا چہرہ فق ہوگیا تھا۔ اس پر زندگی سے مایوسی کی مردنی چھا گئی تھی۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ آج اس سے بڑی طاقتیں اس کے خلاف یکجا ہو کر آئی ہیں، اور اسے اس کے گھناؤنے جرم کی پاداش میں پھانسی چڑھا کر دم لیں گی۔ لاش برآمد ہونے پر وہ رنگے ہاتھوں پکڑا جائے گا اور پھر اس کے پاس اقبالِ جرم کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ وہ اس دن کو کوس رہا تھا، جب وہ اس ناگن عورت کے رنگ و روپ پر فریفتہ ہوگیا تھا، اور اس کی دولت پر مرمٹا تھا۔ آخر کار دولت کا لالچ اسے بھی لے ڈوبا تھا اور اس ناگن نے نہ صرف اس کو بلکہ اس کے گھربار اور تمام جادوٹونے کو بھی ڈس لیا تھا اور تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ اب تو وہ دولت کی ریل پیل اور عیاشی کرنے کے لیے زندہ ہی کب بچے گا۔

فرش پر جوں جوں کدالوں کی آوازیں پیدا ہوتی گئیں، توں توں اپسرا کے دماغ کی چولیں ہلتی گئیں۔

''ٹھہرو۔'' انسپکٹر صاحب نے کہا۔ ''دیکھو کسی کا سر نظر آرہا ہے۔ آرام آرام سے مٹی باہر نکال کر لاش کو نکال لو۔'' اس بار انسپکٹر صاحب بھی بڑے متاثر نظر آرہے تھے۔ جوں جوں لاش کے ٹکڑے باہر نکلتے رہے، ہم سب کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ ہر آنکھ اشک بار تھی، ہر دل پُرملال ہو رہا تھا۔ کوئی ظالم اور جابر ایسا سفاک بھی ہوسکتا ہے۔ جیسے ہی سپاہیوں نے لاش کے ٹکڑے جمع کر کے ملائے تو شیام کی میت بن گئی۔ شیام کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اپسرا کے منہ سے ایک دل دوز چیخ نکلی اور وہ فرش پر دھڑام سے گر کر بے ہوش ہوگئی۔ شمیکا نے اسے سنبھالا۔ انسپکٹر نے سپاہیوں کی مدد سے جادوگر کو جیپ میں بٹھایا۔

''بابا، اپسرا اور آپ گھر چلے جائیں۔'' انسپکٹر نے شمیکا کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور آپ میرے ساتھ تھانے چلیں تاکہ کاغذی کارروائی پوری کرلی جائے۔'' پھر انسپکٹر صاحب نے سپاہی کی طرف رخ کر کے کہا۔

''تم دونوں دوسری گاڑی منگوا کر لاش کو لے آؤ اور تم سب میرے ساتھ چلو۔'' انسپکٹر نے تمام پولیس اہلکاروں کا حکم دیا۔ پھر وہ جادوگر کی بیوی کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔

''آپ کو بھی ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔ گواہی اور مزید کارروائی کے لیے مگر آپ کسی قسم کا فکر نہ کریں، آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی اور نہ کوئی سزا۔ کیونکہ سزا گناہ گاروں کو ہوتی ہے۔ آپ تو بے گناہ اور بے قصور ہیں۔''

جب میں تھانے سے لوٹ کر آیا تو میرے ساتھ جادوگر کی بیوی بھی تھی۔ میں انھیں اپنی ضمانت پر اپنے ساتھ اپسرا کے گھر لے آیا تھا۔ اپسرا کی طبیعت کافی سنبھل چکی تھی مگر وہ اپنے محبوب کی موت اور ہمیشہ کی جدائی پر صدمے سے ایسی نڈھال تھی، جیسے اس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا گیا ہو۔ میں نے شمیکا کو ایک طرف لے جا کر کہا۔

''دیکھو شمیکا...... مجھے ایک مشکل ترین اور خطرناک مہم پر جانا ہے اور یہاں عامل بابا، اپسرا، رینا، نیلم اور شانتی کو بھی ہماری ضرورت ہے۔ رانی پور اور چندن پور گاؤں میں ان تمام لوگوں کی دیکھ بھال بھی کرنی ہے۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ تم ان لوگوں کے پاس تب تک ٹھہرو، جب تک میں وہ مہم سر کر کے نہیں آجاتا۔ اس طرح میرا مشن بھی پورا ہو جائے گا اور ان لوگوں کی تم دیکھ بھال بھی کرسکو گی اور وقتاً فوقتاً ان کے کام بھی آؤ گی اور اپنی عقل و خرد اور طاقت و قوت سے ان کی مشکلات کا حال بھی نکالتی رہو گی۔ کیا خیال ہے؟'' میں نے پیار سے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔

''جیسے آپ کی مرضی، اگر آپ کو اس مہم میں میری ضرورت پیش آگئی تو؟'' شمیکا نے خدشہ ظاہر کیا۔

''ہاں یہ بھی ممکن اور لازمی بات ہے۔ مگر

...، تم مجھ سے دور تو نہیں ہو۔ میں جب چاہوں گا وہی ... دہرا کر تمہیں اپنے پاس بلالوں گا اور تمہیں میری ...ورت پیش آئے تو تم چلی آنا۔ تمہارے لیے ہزاروں ...میٹر کا سفر بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ تمہاری جناتی ...اقتوں کے سامنے ایسے وقت کی بھی کوئی وقت نہیں ...۔ یہ فاصلے بھی ہیچ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ سماں بھی تم ...ہی خوشگوار بن جاتا ہے۔ تم آتی ہو تو بہار آتی ہے۔ تم ...جاتی ہو تو تمہارے ساتھ ہی بہار بھی لوٹ جاتی ہے۔''

...میں نے شمیکا کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو اس ...کے چہرہ حیا آلود ہوگیا تھا۔ مشرقی عورتوں والی شرم ...حیا نے اس کے چہرے پر قبضہ جمالیا تھا۔ اس کے نرم ...نازک اور رسیلے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھلنا چاہ ...رہے تھے مگر شرم مانع تھی۔ وہ میرے چہرے پر ...الوداعی نگاہیں جمانا چاہتی تھی مگر حیا رکاوٹ بن رہی ...تھی۔ آج تو وہ واقعی کسی شرمیلی اور نئی نویلی دلہن کی ...طرح شرمائے جارہی تھی۔ اس کی گردن کسی احساس کے بار سے اٹھ نہیں رہی تھی۔

''اپنا تمام تر شرمیلا پن اور شرم و حیا کا حسن ...ابھی ضائع کردو گی تو پھر دلہن بن کر تم پر نکھار کم آئے ...گا۔'' میری بات سن کر وہ میرے سینے سے آلگی اور اس ...نے اپنا خمیدہ سر میرے شانے سے لگا دیا۔ ہم کافی دیر ...اس حالت میں کھڑے رہے۔ دل تو چاہتا تھا کہ یہ وقت ...یہیں رکا رہے اور ہم کئی سال تک اسی کیف اور سماں، ...سرور آگیں لمحات اور خمار آلود موسم کا مزا لیتے رہیں اور ...زندگی کا کیف و سرور اور لطف دوبالا کرتے رہیں، مگر ...ہمارے نصیب میں ابھی عیش و نشاط کی زندگی بسر کرنا ...نہیں تھا، بلکہ خدمتِ خلق ہمارا مشن تھا۔ دنیا بھری پڑی ...تھی مظلوم، کمزور، نادان اور ستم زدہ لوگوں سے۔ ان کی ...مدد کرنا تھی، بے سہاروں کو سہارا دینا تھا۔ مظلوموں کو ...ظالموں کے شکنجے سے نجات دلانا تھی۔ کمزوروں کا ...مضبوط سہارا بننا تھا اور غریبوں، ناداروں اور فقیروں کے کام آنا تھا۔ شاید قدرت نے اس لیے قسطنطنا کی ...بیوی سے وہ بٹوا دلا دیا تھا، جس میں سے جتنے پیسے نکالتے تھے، اتنے ہی بھر جاتے تھے۔ اس سے میں نے کچھ لوگوں کی مدد کی تھی اور اس سے مزید غریبوں، بیواؤں، یتیموں اور ناداروں کے ساتھ ساتھ فقیروں کی امداد کا بیڑہ بھی اٹھایا تھا۔

''ٹھیک ہے میں یہیں رہ جاتی ہوں۔ آپ اپنا کام نمٹالیں۔'' شمیکا نے مجھ سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کے ماتھے پر ایک الوداعی بوسہ ثبت کردیا۔ ایک عجیب سا خمار میری رگ رگ میں اتر گیا۔ عورت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ اس کا حسن و شباب اور لمس دنیا کے ہر مرد کو پاگل بنا دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ بڑے بڑے بادشاہوں نے ایک عورت کی خاطر اپنا تاج و تخت ٹھکرا دیا تھا۔ شہزادے اپنی سلطنت کو چھوڑ کر کسی حسینہ کے عشق میں مبتلا ہوگئے تھے۔ شہنشاہوں نے بڑی بڑی جنگیں ایک عورت کے حصول کے لیے لڑی تھیں۔ ایک الوداعی بوسے میں یہ لذت تھی تو عورت کے قرب میں کیا سرور نہیں ہوگا۔ اس کے وصال میں کتنا کیف آتا ہوگا، اس کے ملن میں کیسا خمار ہوتا ہوگا۔ اس کے پہلو میں بیٹھ کر انسان خود کو دنیا کا خوش نصیب شخص تصور کرتا ہوگا۔ عورت کی قربت، محبت اور رفاقت پا کر وہ خود کو دنیا کا امیر ترین انسان گردانتا ہوگا۔ مجھے بھی اپنا گھر بسالینا چاہیے۔ یہ خیال مجھے اس بار بڑی شدت سے آیا تھا۔ جب سے اپسرا اور شیام کی محبت کی شدت دیکھی تھی اور پھر شمیکا کا حسن و شباب تو بیان سے باہر تھا، اس کے حسن و جمال کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا تھا۔ شمیکا سے ایک بار شادی کرنے کا مقصد تھا سینکڑوں خوب رو نوجوان اور باکرہ عورتوں سے شادی کرنا۔ کیونکہ میں نے اس کی جناتی شکتیاں محسوس کرلی تھیں۔ وہ کسی بھی حسین و جمیل عورت کا روپ دھار سکتی تھی۔ وہ کسی بھی عمر اور جسامت کی لڑکی بن سکتی تھی۔ وہ کوئی بھی رنگ اور جوبن والا شباب اپنا سکتی تھی۔ اور پھر اسے میری دوستی پر ناز تھا۔ وہ میرا کہا ماننے کو ترجیح دیتی تھی۔ حالاں کہ ابھی ہم نے ایک دوسرے کو میاں بیوی کی حیثیت سے قبول نہیں کیا تھا۔ جب وہ مجھے اپنا نفس

سونپ دے گی تو اس کی خود سپردگی کا عالم کیا ہوگا۔ وہ مجھے لبھانے کی خاطر کسی بھی کم سن نوجوان اور باکرہ لڑکی کا روپ دھارے گی۔ وہ میرا دل بہلانے کے لیے میری پسند کی شکل وصورت کو اپنا لے گی۔ مجھے وہ دنیا بھر کے کیف وسرور اور لذتوں سے آشنا کردے گی۔ جس طرح اس نے مجھے آدم زاد کی دنیا کے علاوہ جنات وشیاطین کی دنیا سے روشناس کرایا ہے۔ اگر ایسا ہوگا تو میں اس کا غلام بن کر رہوں گا۔ ہر وقت عشق ومستی کے نشے میں چور، ہر وقت خمار آلودہ۔

"تمہارا اگلا ہدف کیا ہے۔" شمیکا کے سوال نے مجھے کیف اور خیالات سے باہر آنے پر مجبور کردیا۔

"مجھے رینا کی پڑوسن صائمہ اور اریبہ کی بہن علیشا کے قاتل کو گرفتار کرا کے کیفر کردار تک پہنچانا ہے۔ اس سلسلے میں آج دو بجے انسپکٹر مس روبینہ سے ملاقات کرنی ہے۔ دیکھو شمیکا ہمیں اپنی زندگی اور طاقت انہیں لوگوں کی خدمت کرتے ہوئے صرف کرنی ہے۔ لہٰذا یہ تمہارا مشن بھی ہے اور میرا بھی۔ ہم خدمتِ خلق کے لیے خود کو وقف کرچکے ہیں۔ دیکھو وقت ہوا چاہتا ہے۔ اب مجھے اجازت دو، میں چلتا ہوں۔" شمیکا نے ہاتھ لہرا کر مجھے الوداع کہا تو اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے موتی ڈھلک کر مجھے رخصت کا پیغام دے رہے تھے۔

بیل کا بٹن دباتے ہوئے اریبہ نے دروازہ کھول دیا تھا۔ جیسے وہ دروازے پر کھڑی ہوکر میرا انتظار کررہی ہو۔

"کیا آپ تیار ہیں۔ مس روبینہ کی طرف چلیں۔" اریبہ نے دروازے سے باہر آتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں، میں اسی لیے آیا ہوں۔ لیکن کیا آپ کو خبر تھی کہ میں وعدے کے مطابق اور وقت پر پہنچ جاؤں گا۔" میں نے اس کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا جو ڈرائیور نے اسٹارٹ کررکھی تھی۔

"صوفی صد، کیوں کہ آپ جیسے لوگوں کے کاموں میں اپنا ذاتی کوئی مفاد نہیں ہوتا۔ بس عوام الناس کی خدمت کا جذبہ لے کر آگے بڑھتے رہتے ہیں اور لوگوں کا دل موہ لیتے رہتے ہیں۔ ان کی ہر طرح سے مدد اور خدمت کرتے ہیں۔"

اریبہ نے کار کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے پُرستائش نظروں سے دیکھا۔

"خدا کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے پہچاننے میں جلدی کی اور غلطی نہیں کی۔ ورنہ اکثریت تو بدگمان ہوتی ہے۔ پہلے شک کرتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ یقین۔ چلو اس طرح ہمارا مشن آسانی سے پایۂ تکمیل تک پہنچ سکے گا۔" میری باتیں سن کر وہ مسکرادی اور اس کے دل کو ڈھارس بندھی۔ شاید باتوں میں محسوس نہ ہوا، یا ڈرائیور نے کار کی رفتار تیز رکھی تھی۔ سفر بہت جلدی طے ہوگیا۔ اب ہماری کار فرسٹ ویمن پولیس اسٹیشن کے مین گیٹ میں داخل ہورہی تھی۔

"ہمیں انسپکٹر روبینہ اکرم سے ملنا ہے۔" میں نے ہیڈ محرر کو سلام کرنے کے بعد کہا۔ اس نے مجھ سے میرا نام پوچھ کر انٹرکام کا ریسیور اٹھایا۔

"پلیز میرا نام بھی بتائیے گا...... اریبہ۔" اریبہ نے ہیڈ محرر کو بتایا۔ ہیڈ محرر نے انٹرکام پر ہیلو کی آواز سننے کے بعد ہمارے نام بتائے اور بہتر کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

"آپ کو میڈم اپنے کمرے میں بلا رہی ہیں۔" ہیڈ محرر نے میڈم کے آفس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ہم اشارہ پا کر روبینہ اکرم کے کمرے کی طرف چل دیئے۔

"اری بے وفا۔ کس طرح بھولے سے میری یاد آگئی۔" روبینہ اکرم نے اریبہ کو گلے سے لگاتے ہوئے شکایت کی۔ شاید وہ اسے اور بھی برا بھلا کہتی اور شکوے شکایت کرتی مگر میری موجودگی نے اسے ایسا کرنے سے روکے رکھا۔

"روبینہ! تم جانتی ہوں کہ کنواں خود چل کر پیاسے کے پاس نہیں آتا بلکہ پیاسے کو ہی کنویں کے

پاس آنا پڑتا ہے۔"

"اری، رہنے دے اپنا فلسفہ اپنے پاس۔ نہ تو تو پیاسی ہے اور نہ میں کنواں۔ چل ادھر آ۔ یہاں بیٹھ اور تو نے اس نوجوان کا تو تعارف بھی نہیں کرایا۔" روبینہ اکرم نے میری طرف آنکھوں سے اشارے کرتے ہوئے کہا۔

"یہ مسٹر ارسلان ہیں۔ انسانی ہمدردی کے ناتے میرا ساتھ دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم تمہارے پاس چل کر آئے ہیں۔ اگر تم ہماری کچھ مدد کرسکو تو......"

"مدد کرسکو سے کیا مراد ہے ری۔ تو بھول گئی کہ کلاس روم اور امتحان کے کمرے میں بھی میں ہی سب سے زیادہ تیری مدد کرتی تھی۔ بہرحال ارسلان صاحب، آپ تشریف رکھیں۔ مجھے حیرت ہورہی ہے اس نفسانفسی اور افراتفری کے دور میں بھی کچھ انسان ایسے بھی ہیں جو اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔" روبینہ اکرم نے اریبہ کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا اور بیل کا بٹن دبایا۔ ذرا دیر بعد ایک لیڈی ہیڈ کانسٹیبل کمرے میں داخل ہوئی تو مس روبینہ اکرم نے اسے بحیثیت آفیسر اچھی سی چائے بنا کر لانے کا حکم دیا۔ وہ آرڈر سن کر چلی گئی۔

"روبینہ تجھے تو معلوم ہے کہ علیشا نے اپنی محبت کا چکر چلا کر اپنی پسند کی شادی کرلی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اس قدر محبت میں اندھی ہوگئی تھی کہ اپنی بڑی بہن کی بات بھی نہیں مانی تھی۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ جو بڑوں کے تجربات اور مشاہدات سے فائدہ نہیں اٹھاتا وہ نقصان میں رہتا ہے۔ جو بزرگوں کی بات نہیں مانتا، اسے خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔" اریبہ نے ذرا توقف کیا تو روبینہ سے یہ سسپنس برداشت نہیں ہوا۔

"ارے بھئی ذرا جلدی بتاؤ، علیشا کو کیا ہوا ہے اور تم کس سلسلے میں میری مدد چاہتی ہو۔" روبینہ اکرم نے اریبہ کے رخسار کو پیار بھرے انداز میں تھپ تھپایا تو اس کی آنکھیں نم آلود ہوگئیں اور اس کی آواز رندھ گئی۔

شاید اریبہ سے اپنی بات جاری رکھنا مشکل ہوگیا تھا۔ لہٰذا میں نے شروع سے آخر تک کی روداد جو اریبہ نے مجھے علیشا کی سنائی تھی، روبینہ کے گوش گزار کردی۔ اور میں اس مہم میں اپنی شمولیت کا جواز بھی صائمہ کی کہانی سنا کر پیش کررہا تھا۔

جب لیڈی پولیس کانسٹیبل چائے لے کر آئی تو ہم سب خاموش بیٹھے سوچوں کی وادیوں میں گم تھے۔ اس نے ہم تینوں کی طرف ایک ایک چائے کی پیالی بڑھادی۔ میری خاموشی نے روبینہ اکرم کے چہرے پر عجیب وغریب تاثرات پیدا کردیئے تھے۔ اس کا چہرہ متغیر ہونے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی وضاحت طلب کرتی یا اس سلسلے میں کچھ تبادلۂ خیال کرتی، اس نے اہلکار کو بیل دے کر اندر طلب کیا اور حکم دیا کہ جلدی سے موبائل تیار کرے اور دو اہلکار اسلحے سے لیس ساتھ لے۔ ہمیں ابھی اور اسی وقت دارالامان جانا ہے۔" روبینہ اکرم نے اندر آنے والے اہلکار کو گاڑی کی چابی دیتے ہوئے کہا۔

"ارسلان صاحب، بالکل ایسا ہی کیس میرے پاس آیا ہے۔ جس کا میں نے ابھی تک آپ لوگوں سے ذکر نہیں کیا۔ میرا خیال تھا کہ میں بھی آپ لوگوں کو ایک منفرد خیال کی کہانی سناؤں گی اور ہوسکا تو اس کے کردار سے بھی ملواؤں گی۔ ایک عورت ہے جو بہت بری حالت میں زخمی ہوکر مجھ تک پہنچی ہے۔ اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ وہ بہت مشکل سے مجھ سے آئی تھی۔ اس نے بھی بالکل یہی کہانی سنائی ہے۔ میں نے اسے دارالامان میں پناہ دے رکھی ہے۔ آپ چل کر اسے دیکھ لیں۔ وہ علیشا ہے یا کہ صائمہ؟ کیوں کہ ابھی تک اس نے مجھے اپنا نام نہیں بتایا ہے۔" روبینہ سے یہ حیرت زدہ انکشاف سن کر ہم دونوں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ اریبہ کو جس قدر فکر علیشا کی تھی، اس قدر افسوس مجھے صائمہ کا بھی تھا۔

روبینہ نے کیپ سر پر رکھی اور ہاتھ میں بید پکڑ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ ہم دونوں کو بھی حد سے زیادہ

تشویش تھی۔ کیوں کہ وہ علیشا تھی یا صائمہ، جو بھی تھی۔ اس سے حقیقت کا علم بخوبی اور آسانی سے ہو سکتا تھا۔ ڈرائیور نے موبائل کو اسٹارٹ کر رکھا تھا۔ روبینہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی اور ہم پچھلی نشستوں پر براجمان ہو گئے تھے۔ ہم دونوں کے دلوں کی دھڑکنیں زور زور سے شور مچا رہی تھیں۔ کلیجہ حلق میں بار بار آ رہا تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ دل سینہ چیر کر باہر آ جائے گا۔ کہتے ہیں ''ہمتِ مرداں، مددِ خدا'' ہم نے ہمت کی اور آغازِ سفر نیک نیتی سے کیا تو منزل قریب نظر آنے لگی۔ ہم بہت جلد اس دارالامان پہنچ چکے تھے۔ جہاں وہ عورت پناہ لیے ہوئی تھی۔ جس سے ہمیں ادریس خان یا ارباز خان کی حقیقت معلوم ہو سکتی تھی۔

انسپکٹر روبینہ نے متعلقہ کلرک سے رسمی سی بات چیت کی۔ اس کے بعد ہمیں ایک کمرے میں لے گئی۔ وہ ہمیں وہاں بٹھا کر کہیں چلی گئی۔ شاید اس اپاہج عورت کو لینے کے لیے۔ کچھ دیر بعد میں نے اس کمرے کی کھڑکی سے دارالامان کے صحن میں اچانک دیکھا تو ایک عورت وہیل چیئر پر بیٹھی تھی۔ جس کا منہ دیوار کی طرف تھا اور پشت میری طرف۔ یاد آیا کہ روبینہ نے بتایا تھا کہ اس عورت کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ چکی ہیں اور اس کے دماغ پر بھی شدید چوٹیں لگی تھیں۔ وہ ایک پہلو سے مجھے صائمہ نظر آنے لگی مگر صائمہ کی رنگت اس قدر گوری نہیں تھی، جتنی دودھیا رنگت اس وہیل چیئر پر بیٹھی عورت کی تھی۔ کیونکہ میں نے صائمہ کی جو تصویریں دیکھی تھیں، ان میں اس کی رنگت ایسی نہیں تھی۔ میں نے بہت اضطراب میں پہلو بدل کر اریبہ کو اس عورت کی طرف متوجہ کیا۔ اریبہ بھی اسے بڑے غور سے دیکھنے لگی۔ وہ علیشا کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اریبہ کو وہ عورت ہو بہو علیشا نظر آنے لگی۔ اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کے دلی جذبات اور محبت کے احساسات پر اوس پڑ گئی۔ اس نے بتایا کہ علیشا کے بال اس قدر دراز نہیں تھے جتنے کہ اس عورت کے ہیں اور اتنی جلدی بال اس قدر لمبے نہیں ہو سکتے۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، ہماری بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ روبینہ نجانے کس کام میں الجھ گئی تھی۔ ہمارے انتظار کی گھڑیاں لمبی ہوتی جا رہی تھیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ بغیر اجازت جا کر اس عورت کا چہرہ دیکھوں اور اریبہ کو بھی دکھاؤں۔ تاکہ ہم بہت جلد پہچان لیں کہ وہ صائمہ ہے یا علیشا مگر یہ دارالامان تھا اور اس قسم کی حرکت بد اخلاقی کے زمرے میں آ سکتی تھی اور ہم کو اس قدر عجلت کا مظاہرہ کرنے پر شرمندگی اٹھانا پڑتی۔ شاید اس بات سے روبینہ اکرم بھی برا مان جاتی اور کہتی کہ مجھ سے بھول ہوئی جو آپ لوگوں کو یہاں لے کر آئی۔ اگر یہ دارالامان کی بجائے ویمن پولیس اسٹیشن ہوتا تو ایسا کرنا ممکن تھا کیونکہ وہاں کی سربراہ اریبہ کی دوست روبینہ اکرم تھی۔ میں نے اریبہ سے کہا کہ وہ جائے اور اس عورت کا چہرہ بغور دیکھے بلکہ اس کی وہیل چیئر کا رخ میری جانب پھیر دے تاکہ میں بھی اسے دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر سکوں۔ اریبہ کی بے چینی بھی مجھ سے کم نہیں تھی۔ جیسے ہی اس نے میرے حکم کی تعمیل میں قدم اٹھانا چاہا۔ ویسے ہی کمرے میں روبینہ داخل ہو گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔ اس پر غصے کے تاثرات نمایاں تھے۔ اس سے پہلے کہ ہم روبینہ سے ماجرا دریافت کرتے وہ خود ہی بتانے لگی۔

''ارسلان صاحب! مجھے افسوس ہے کہ میری کوشش ضائع اور بے کار گئی۔ وہ قاتل شخص انتہائی چالاک نکلا۔ ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ اسے کسی بہانے سے لے اُڑا۔ میں تحقیق کرتی ہوں، اس غفلت اور لاپروائی میں کس کا قصور ہے، اس کو ملازمت سے سبکدوش کروادوں گی۔ ہم لوگ وہاں سے سر جھکائے اپنے اپنے گھر لوٹ آئے۔

میں اس ناگہانی معاملات پر ساری رات سوچتا رہا۔ مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔ ایک عجیب سا اضطراب تھا۔ حالاں کہ معاملہ میرا نہیں تھا۔ پرائی آگ تھی جس میں، میں اپنی خوشی سے جل رہا تھا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ

''سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے''

میں سوچ رہا تھا کہ وہ ظالم شخص اگر دارالامان سے اس عورت کو نہ لے جاتا تو بہت جلد اس کی گرفتاری عمل میں آ جاتی اور کچھ حقیقتِ احوال بھی معلوم ہو جاتی کہ اس نے صائمہ یا علیشا جیسی لڑکیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس عورت کی دونوں ٹانگیں کیوں ٹوٹ چکی تھیں۔ اگر اس کو اس کے ظالم شوہر نے دولت کے لالچ میں بیچ دیا تھا، یا خر کاروں کی نجی جیل میں بند کر دیا تھا تو وہ دونوں ٹانگیں نہ ہونے پر وہاں سے کس طرح فرار ہو کر آئی اور یہاں تک کیسے پہنچی اور اگر اسے قتل کرنے کے لیے کسی اونچی جگہ سے دھکا دیا گیا تھا تو وہ زندہ کیسے بچ گئی۔

آج دوسرا دن تھا مگر میری بے چینی میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ میں نے لاکھ اپنے ذہن کو جھٹکا دیا مگر پھر اسی نکتے پر مرکوز ہو کر رہا۔ دوسری پریشانی یہ تھی کہ ابھی تک ہمیں سرا بھی ہاتھ نہیں آیا تھا، جہاں سے کارروائی کا آغاز کرتے۔ اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف سے اریبہ کی آواز آئی۔

''ارسلان صاحب! میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو خواہ مخواہ اپنے مطلب کے لیے پریشان کر رہی ہوں۔''

''نہیں مس اریبہ، اس میں معذرت چاہنے کی کیا ضرورت ہے۔ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ دراصل میں رات بھر سوچتا رہا ہوں کہ ایک سنہری موقع اس ظالم شخص پر ہاتھ ڈالنے کا ضائع ہو گیا ہے۔ اب کیا کریں۔ اس مہم کی شروعات کہاں سے کریں۔'' میں نے فکرمندی سے جواب دیا۔

''ارسلان، میں بھی اس کے متعلق سوچتی رہی ہوں۔ ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے۔ ارباز خان سے علیشا کی ملاقات بی ایڈ کالج میں ہوئی تھی۔ لہٰذا اس ایجوکیشن کالج میں ارباز خان کا مکمل ریکارڈ یعنی نام و پتا ضرور ہو گا جس سے اس تک پہنچنے میں آسانی ہو گی اور ہمیں کارروائی کے لیے سرا بھی ہاتھ آ جائے گا۔ اس طرح تلاش کرنے میں چنداں دشواری نہیں ہو گی کیونکہ علیشا کے ڈاکومنٹس میں بھی وہی تعلیم کا عرصہ درج ہے جس میں وہ دونوں اس کالج میں داخل ہوئے تھے اور زیرِ تعلیم تھے۔'' اریبہ نے واقعی کام کی بات کی تھی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو اریبہ! اس طرح ادریس خان یا ارباز خان کا مستقل پتا جو اس نے اپنے آبائی گاؤں یا شہر کا درج کرایا ہو گا، حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کالج کے پرنسپل صاحب کو معاملے کی نزاکت سمجھانے پر وہ متعلقہ معلومات فراہم کرنے پر رضامند ہو جائیں گے۔ اس طرح ہم مس روبینہ اکرم کی مدد سے باقی کام سرانجام دیں گے۔ اریبہ تمہیں زحمت تو ہو گی ایجوکیشن کالج جا کر پرنسپل صاحب سے مل لو۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ انھیں سچ سچ بتا دینا تاکہ وہ با آسانی متعلقہ معلومات فراہم کر دیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ جھوٹ سے نفرت کرتے ہوں اور کام مشکل ہو جائے۔'' اریبہ میرے مشورے کے مطابق ایجوکیشن کالج چلی گئی اور میں گھر بیٹھا منصوبہ سازی کر رہا تھا۔ یکایک میرے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر شخص اپنی بیوی کے شانے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ شاید ان کی نظر بھی مجھ پر پڑ چکی تھی۔ وہ مجھے شہری بابو، شہری بابو کہہ کر پکارنے لگے۔ میں تیزی سے دروازے کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ بزرگ جوڑا کون ہیں اور ان کو مجھ سے کیا کام آن پڑا ہے اور پھر یہ میرا پتا کس طرح جان گئے ہیں۔ اور یہ مجھے شہری بابو، شہری بابو کیوں کہہ رہے ہیں۔ بہر حال میں نے دروازے پر پہنچ کر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔

''جی باباجی، آیئے اندر آجایئے۔ کیا آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے۔'' میں نے انھوں اندر آنے کا راستہ دیا۔

''ہاں بیٹا! تم ہی شہری بابو ہو......نا، جس نے لوگوں کی مدد کی ہے۔ مظلوم لوگوں کی مدد طاقت سے بھی

اور پیسے سے بھی۔" بزرگ مرد نے میرا اوپر سے نیچے تک کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"باباجی، مجھ سے جو ہوسکا میں نے کیا۔ آپ کو بھی میری ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ بتایئے کیا کام ہے۔" میں نے بزرگ شخص کو سہارا دے کر بینچ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا۔ ہمیں بھی اس مشکل وقت میں تم جیسے بہادر اور دیالو شخص کی ضرورت ہے۔ ہماری نوجوان بیٹی کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی۔ حکیموں اور ڈاکٹروں کو دکھایا مگر مرض ان کو سمجھ نہ آیا۔ مایوسی کفر ہے اس لیے ہم مایوس ہونا نہیں چاہتے۔ اس گاؤں میں تمہاری فیاضی اور بہادری کے چرچے مشہور ہوگئے ہیں۔ جو لوگ پرچون فروش، بنئے، چودھری صاحب اور بدمعاشوں، سے تم نے کیا اور جن غریب لوگوں کی تم نے اپنی سخاوت اور نیک نیتی سے مدد کی، اس کی مثال بھی اس گاؤں میں عام طور پر دی جانے لگی ہے۔ اس لیے ہم تمہارے پاس چلے آئے ہیں۔ برائے کرم ہماری بھی مدد کرو اور ہماری اکلوتی بیٹی کو اذیت ناک تکلیف سے بچالو۔" بزرگ جوڑی نے میرے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"میں نے بڑی ملائمت سے ان کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھے اور دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "باباجی! میں نہ تو ڈاکٹر ہوں اور نہ حکیم اور نہ کوئی بھگوان، کہ علاج معالجہ کروں یا دکھوں کا مداوا۔ مگر مجھے اپنی بیٹی کی حالت دکھادو۔ میں کوشش کروں گا، اگر میری کوشش سے وہ ٹھیک ہوگئی تو بہتر ہے۔ ورنہ میں معذرت چاہوں گا۔ ویسے ہوا کیا ہے تمہاری بیٹی کو۔" میں نے اس کے بارے میں دریافت کیا۔

"بیٹا! میری بیٹی انتہائی خوب صورت اور حسین وجمیل ہے۔ اس کے حسن وشباب کی مثال اس گاؤں میں نہیں ملتی۔ اس کے حسن کی سب سے بڑی خوبی وہ لمبے، سیاہ، گھنے اور چمک دار بال ہیں جس پر سب کی نظریں ہیں۔ اس کی سہیلیاں اس کے بالوں سے جلتی تھیں۔ عورتیں بدنظر لگاتی تھیں اور دیگر لوگ ان بالوں کو چھپا کر رکھنے کا مشورہ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ نوجوان اس کے بالوں پر عاشق ہوکر اپنا رشتہ بھیج دیتے تھے ایک روز ایک اجنبی فقیر ہماری گلی میں آیا۔ اس کی صدا پر میری بیٹی نے چھت پر سے جھانکتے ہوئے اسے چند سکے دیئے۔ تب اس فقیر نے کہا تھا کہ اپنی بیٹی کے بالوں کو چھپا کر رکھو۔ ورنہ بہت جلد کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ ہم نے اس کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ اس کے دوسرے دن ہی جب میری بیٹی سو کر اٹھی تو اس کے تمام بال گردن تک کٹے ہوئے تھے اور اسے تیز بخار چڑھ گیا تھا۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ اسے بھی خبر نہیں ہے کہ اس کے حسین، سیاہ اور چمک دار بال کس نے کاٹ لیے ہیں۔ اس رات سے ہی اس کے مرض میں دن بدن اضافہ ہورہا ہے۔ اب تو وہ سوکھ کر کانٹا ہوچکی ہے۔ کاٹو تو بدن سے ایک لہو قطرے کا نہیں نکلے گا۔ وہ کھاتی ہے، نہ پیتی ہے۔ بس خاموش اور مدہوش سی بستر پر پڑی رہتی ہے۔ شاید اس کی نبض ڈوبنے والی ہے اور سانس رک جانے کو ہے۔ شہری بابو جی ہماری اکلوتی بیٹی کو بچالو۔ ورنہ ہم لوگ بے سہارا ہوجائیں گے۔ آج تک ہم اس کے لیے تو زندہ ہیں۔ وہ تو ہمارا بوجھ ڈھورہی ہے۔ ورنہ آج کل کون بوڑھے ماں باپ کا سہارا بنتا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ رونے لگے تھے۔ میں نے ان کو دلاسا دیا اور ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہوگیا۔

ایک چنے کے کھیت سے ہم گزر کے اس کے آخری سرے پر پہنچے تو وہاں ان کا گھر تھا۔ جس کے اندر سے ہلکی ہلکی روشنی کی کرنیں باہر آرہی تھیں۔ میں نے ایک نظر ان کے مکان کا جائزہ باہر سے لیا۔ میری نظر ایک جگہ آکر ٹھہر گئی بلکہ میں ٹھٹھک کر رک گیا۔ میں نے بزرگ سے پوچھا۔

"باباجان یہ جو آپ کے مکان کے برابر میں گھر ہے، یہ کب سے بند ہے؟"

"بیٹا یہ تو عرصہ دراز سے بند ہے۔ اس میں ایک جوتشی رہتا تھا جو کاروبار کے سلسلے میں غیر ملک گیا تھا

واپس لوٹ کر نہیں آیا۔ تب سے یہ مکان اسی طرح بند ہے۔" بزرگ نے حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بتایا۔

"لیکن بیٹا، اس مکان کے بند ہونے سے ہماری بیٹی کی بیماری کا کیا تعلق ہے۔" اس بار بڑی بی نے پوچھا تھا۔

"اماں جی، یہ بھی بتادوں گا۔ پہلے میں آپ کی بیٹی اور اس کی حالت کو ایک نظر دیکھ لوں۔" میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ مجھے لے کر گھر میں داخل ہوئے اور پھر اپنی بیٹی کے کمرے میں۔ میں نے کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی مگر مجھے ان کی بیٹی کا کہیں وجود نظر نہیں آیا۔ بس ایک چارپائی پر لحاف پڑا تھا اور ایک کرسی خالی پڑی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"باباجی کہاں ہے آپ کی بیمار بیٹی۔"

"یہ ہے بیٹا۔" انھوں نے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لحاف کو سرکایا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ لحاف کے اندر ایک گڑیا کی طرح سے کوئی چھوٹی سی چیز گٹھری کی صورت سمٹی لیٹی تھی۔ وہ واقعی سوکھ کر کانٹا ہوچکی تھی۔ جیسے اس کے بدن سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا گیا ہو۔ اس لڑکی کی عمر بتا رہی تھی کہ واقعی یہ بہت کم عمر اور کم سن ہی ہے۔ ایسی جیسے سنِ بلوغت کو حال ہی میں پہنچی ہو۔ اس کے ہونٹ کبھی بے حد رسیلے رہے ہوں گے، مگر اس وقت سوکھی پاپڑی جمی ہوئی تھی۔ اس کے گال جیسے رخساروں کا گوشت ختم ہوگیا تھا اور اب ناک کی جگہ ہڈیوں نے لے لی تھی۔ میں نے ذرا اور قریب ہوکر دیکھا تو مجھے اس کے بدن پر نوجوانی کی کوئی علامت نظر نہیں آئی۔ اب میں نے بڑی بی سے کہا۔

"ذرا مجھے ان کے وہ بال دکھادیں جن کو کاٹ لیا گیا ہے۔" بڑی بی نے جواب دیا۔

"بیٹا وہ بال تو غائب ہوگئے ہیں مگر تم اس کے سر کی حالت دیکھ سکتے ہو۔" یہ کہہ کر بڑی بی نے اپنی بیٹی کو کروٹ کے بل لیٹا دیا۔ واقعی اس کے بالوں کو گردن تک کاٹ لیا گیا تھا، جس سے نہ صرف اس کے سر کی تمام تر خوب صورتی ختم ہوگئی تھی بلکہ اس کی نسوانیت پر بھی دھبہ لگا تھا۔ میں نے اس کی نبض ٹٹولی تو وہ ڈوب رہی تھی۔ تب میں نے گھبرا کر اس کے دل کی دھڑکنیں چیک کیں۔ وہ بھی جواب دینے والی تھیں۔ جب کہ اس کی حالت پر تو ڈاکٹر اور حکیم پہلے ہی مایوس ہوچکے تھے۔ میں سوچ کے گہرے سمندر میں ڈوب گیا۔ کیونکہ یہ وقت کچھ سوچنے اور سمجھنے کا نہیں تھا کچھ کر دکھانے کا وقت تھا۔ ورنہ پچھتاوے کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا۔ اتنی جلدی میں کیسا اور کیا کرنا تھا، یہ میرے بس کی بات نہیں تھی کیونکہ مجھے تو معاملہ سمجھ بھی نہیں آیا تھا۔ میری نظر فوراً شمیکا کی طرف اٹھ گئی۔ میں نے وہی جملے ادا کیے تھے پلک جھپکتے میں شمیکا میرے سامنے آموجود ہوئی۔ میں نے شمیکا کو مختصراً داستان بتائی اور اسے کچھ کرنے کو کہا۔ وہ ایک جن زادی تھی۔ اسے جنات اور شیاطین کے بھیانک کاموں کو گھناؤنے منصوبوں سے آگاہی تھی۔ اس نے کچھ سوچ کر اس لڑکی کے بالوں کو اپنی مٹھی میں مضبوطی بھینچ لیا اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگی۔ اچانک اس لڑکی میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پہلے تو اس کے ماں باپ کو غصہ آیا کہ ان کی پیاری، لاڈلی اور اکلوتی بیٹی کے بال اس قدر بے دردی سے کھینچے گئے تھے مگر وہ لڑکی کو اٹھ کر بیٹھتے دیکھ کر خوش ہونے کی بجائے حیران ہوئے تھے۔

"بتا تو کون ہے۔" شمیکا نے اس لڑکی کا منہ اپنی جانب موڑتے ہوئے پوچھا۔

"میں ان کے پڑوس میں رہتا ہوں۔" اس لڑکی کے منہ سے مردانہ آواز سن کر سب کی حیرت سے آنکھیں پھیل گئیں۔

"کیا تو نے اس لڑکی کے بال کاٹے ہیں؟" شمیکا نے دوسرا سوال کیا۔

"ہاں میں نے ہی اس کے سیاہ، گھنے، دراز اور چمک دار بال کاٹے ہیں۔" مردانہ آواز نے کہا۔

"لیکن کیوں۔ تم نے اس کے بال کاٹ کر اسے بدصورت کیوں کردیا ہے۔" شمیکا نے پھر سوال کیا۔

"اس لیے کہ اس کے بالوں پر اس کے کزن کا دل آگیا تھا۔ وہ اسے اپنانا چاہتا تھا۔ وہ جب بھی اس سے ملتا تھا، اس کے بالوں سے کھیلتا تھا۔ ان کو سہلاتا رہتا تھا۔ ان میں راتیں گزارنے کی باتیں کرتا تھا۔ ان کی چھاؤں میں زندگی بتانے کے وعدے کرتا تھا۔ ان کی خوشبو سے مست ہوجایا کرتا تھا۔ اس لیے میں نے ان بالوں کو ہی کاٹ دیا تاکہ وہ میرا رقیب اس کے قریب نہ آئے اور میں ہی اس کی زلفوں کا اسیر رہوں۔ وہ تمام فائدے میں حاصل کروں جو اس کا کزن کرنا چاہتا تھا۔" مردانہ آواز نے جواب دیا۔

"میں اس کا پڑوسی ہوں۔ میرا حق اس پر زیادہ ہے۔ میں دو سال سے اس کا حسن اپنی آنکھوں میں جذب کرتا رہا ہوں۔ جب یہ چھت پر نہانے کے بعد اپنے ریشمی بال سکھاتی تھی تو میں ان کی خوشبو سے اپنی سانسیں مہکایا کرتا تھا۔ میں اس کے بالوں پر اور اس کے حسن پر عاشق ہوچکا ہوں۔ میں اسے کسی اور کسی کا ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ میں نے اس لیے اس کے بال کتر کر بدصورت کردیا ہے تاکہ اس کا کزن اس سے بدظن ہوجائے اور میں اس کے قریب ہوجاؤں۔" مردانہ آواز نے جواب دیا۔

"لیکن تم ایک جن ہو اور یہ آدم زاد۔" شمیکا نے نجانے یہ سوال کیوں کیا تھا جبکہ وہ بھی ایک جن تھی اور میں آدم زاد۔

"تو کیا ہوا۔ میرا باپ بھی ایک جن تھا۔ اس نے بھی ایک آدم زاد عورت سے شادی کر رکھی تھی۔ لہٰذا میں بھی اس سے شادی کرکے زندگی گزاروں گا۔ اسے وہ تمام خوشیاں اور راحتیں دوں گا جس سے اس کی زندگی آرام دہ گزرے گی۔" مردانہ آواز نے وضاحت کے ساتھ ساتھ اپنی خواہش کا اظہار بھی کردیا تھا۔

شمیکا اور جن کے سوالات و جوابات سے میرے علم میں اضافہ ہو رہا تھا۔ لڑکی کے ماں باپ حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہروں سے حیرانگی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے، تم فی الحال اپنے اثرات کو اس کے جسم و بدن اور ذہن و دماغ سے رفع کرو۔ تاکہ اس کی حالت سدھرے اور یہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو۔ اور ہم اس سے اس کی مرضی معلوم کریں۔ اگر اس کی رضامندی ہوئی تو پھر اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔"شمیکا نے شاید مہلت چاہنے کے لیے ایسا کیا ہو۔

"لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس کے جسم و بدن اور ذہن و دماغ سے چلے جانے کے بعد مجھ پر کوئی بندش اور پابندی نہیں لگائی جائے گی اور نہ کوئی عملیات کے ذریعے حصار باندھا جائے گا۔" مردانہ آواز نے خدشات ظاہر کرتے ہوئے اس کا جسم چھوڑ کر جانے پر رضامندی کا اظہار کردیا۔

'میں تم سے کہہ رہی ہوں نرمی سے۔ اگر تم نے ضد کی تو میں زبردستی اور زور و جبر سے بھی کام لے سکتی ہوں۔ جو تم جیسے سرکشی جن کو حاضر کرسکتی ہے، وہ اور کیا کچھ نہیں کرسکتی۔' شمیکا نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

'ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں مگر میرے ساتھ ظلم اور زیادتی نہیں ہونی چاہیے، ورنہ میرا پورا خاندان تم سب سے بدلا لینے کے لیے تیار ہوجائے گا۔ میں اپنی چاہت، پیار اور محبوبہ کو پانے کے لیے ہر مشکل سے گزر جاؤں گا اور اپنی جان کی بازی بھی لگادوں گا۔" آخری باتوں کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ شمیکا نے اس لڑکی کے بال چھوڑ دیئے تو وہ نڈھال ہوکر بستر پر گر پڑی۔ اس کا بدن پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ شمیکا نے اس نے بوڑھے ماں باپ کو اس کا خیال رکھنے کے کو کہا اور مجھے لے کر اس مکان کے برابر والے گھر میں داخل ہوگئی جو عرصہ دراز سے ویران و سنسان اور بند پڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس لڑکی کے بال ایک چارپائی پر بکھرے پڑے ہیں۔ ایسے، جیسے کہ کوئی ان پر سوتا رہا ہو۔ ان کو بستر بنا کر بچھاتا رہا ہو، ان کی خوشبو سے مست ہوتا رہا ہو۔ میں نے آگے بڑھ کر اس لڑکی کے بال سمیٹے اور شمیکا کی طرف دیکھنے لگا۔

"دیکھا ارسلان۔ ہم جن لوگ جب کسی سے

محبت کرتے ہیں تو اپنی جان کی بازی بھی لگادیتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں تو انتہا تک کرتے ہیں۔ تم اس جن کی محبت پر غور کرو جو اس لڑکی کے حسین بالوں پر عاشق ہوا۔ اس کو دوسرے مردوں سے بچانے کے لیے اس کے بال کاٹ دیئے اور پھر ان بالوں کو اپنے بستر پر بچھا کر سوتا ہوگا اور اپنے جذبات کو تسکین دیتا ہوگا۔" شمیکا کی بات سن کر مجھے شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ میں بھی ایک مرد تھا اور شمیکا مخالف جنس۔ پھر ہم بھی تو محبت کے اسیر تھے۔ ایک دوسرے کو خاموش لفظوں میں چاہتے تھے پھر ہمارے جذبات سوئے ہوئے کیوں تھے۔ میں تو صرف اس انتظار میں تھا کہ شمیکا کو اپنے گاؤں لے کر جاؤں اور اپنے ماں باپ کے سامنے ان کی دعاؤں کے سائے میں اسے اپنالوں۔ پھر جی بھر کر عیش و نشاط کی زندگی گزاریں اور زندگی کا بھرپور لطف حاصل کریں۔ ہم چاہتے تھے کہ نکاح سے پہلے ملن سے باز رہیں تاکہ ہماری پاکیزہ محبت آلودہ نہ ہو، اور ہم پر داغ دار ہونے کا الزام نہ آئے۔ لیکن محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے چھونے اور پیار و محبت کرنے سے کس نے رکا ہے۔ ہم آغوش ہونے سے تو محبت آلودہ نہیں ہوتی۔ پھر میں شمیکا سے موقع ملنے کے باوجود اس قدر دور کیوں رہتا ہوں۔ میں نے گھبرا کر شمیکا کی طرف دیکھا، جس کی آنکھوں میں مجھے حسرت، ارمان، خواہش اور پیاس نظر آرہی تھی۔ میں نے فرطِ جذبات سے اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا اور اس کے بے مثال سراپے کو اپنی بانہوں میں حصار کرلیا۔ وہ شرم و حیا سے چھوئی موئی کی طرح سمٹ گئی تھی۔ میری بانہوں کا شکنجہ کستا جا رہا تھا۔ ہمارے جذبات میں ایک طوفان سا اُمڈ آیا تھا۔ جذبات سے مغلوب اور پیار و محبت سے سرشار نجانے کیسے ہمارے جسموں نے اس چارپائی میں پناہ ڈھونڈی جس پر وہ جن اس لڑکی کے بال بچھا کر سوتا تھا۔ میں بھی شمیکا کے بالوں سے دیر تک کھیلتا رہا۔ انھیں کھول کر بکھراتا رہا۔ اس کی کالی کالی گھٹاؤں جیسی زلفوں کو براق سی چاندنی پر بکھرا کر نظارہ کرتا رہا۔ اس کی زلفوں کی خوشبو میری نس نس میں اترتی گئی اور مجھے مست و بے خود کرتی رہی۔ میں نے شمیکا کی زلفوں کو سہلاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم مجھے دکھا سکتی ہو کہ اس لڑکی کے بال کیسے ہوں گے جس پر یہ جن فدا ہوگیا تھا۔" میری بات سن کر شمیکا نے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد میں نے ہاتھ ہٹایا تو میں حیران رہ گیا، یہ دیکھ کر کہ اب شمیکا کے بال پہلے سے بھی زیادہ گھنے ہوگئے تھے۔ اس قدر لمبے کہ کولہوں سے نیچے رانوں کو چھو رہے تھے، ان کی رنگت گھٹاؤں کو شرما دینے والی ہوگئی تھی۔ ان میں عجیب سی مست و بے خود کردینے والی خوشبو اُمڈ آئی تھی۔ ایسا ریشمی پن تھا کہ میں نے نہ کبھی کسی کی زلفوں میں دیکھا تھا اور نہ کہیں سنا تھا۔ اس کے گیسوؤں کی چمک آنکھوں میں ایک جسن پیدا کر رہی تھی۔ میں شمیکا کی زلفوں سے اس طرح کھیل رہا تھا جیسے وہ ناگ ان زلفوں سے کھیلا کرتا تھا جس میں اس کی ناگن کا تیل لگا ہوتا تھا۔ میں حد درجہ محبت کے جذبے سے مغلوب ہوچکا تھا۔ میری محبت کا جواب شمیکا نے بھی بھرپور انداز سے دیا تھا۔ اس میں یہ گرم جوشی پہلی بار دیکھی تھی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں نے فیصلہ کرلیا تھا اور اس فیصلے سے اس کو بھی آگاہ کردیا تھا کہ موجودہ مہم سے نمٹا کر سیدھے اپنے گاؤں چلیں گے اور وہاں جا کر سب سے پہلے شادی کریں گے۔ شادی کے بعد بھی تو انسانیت کی خدمت ہوسکتی ہے۔ جس طرح کسی پر ظلم کرنا گناہ ہوتا ہے، اسی طرح اپنے نفس پر ظلم کرنا بھی گناہ ہوتا ہے۔ شادی کا نام سن کر مجھ پر ایک عجیب سے خمار چھانے لگا تھا اور شمیکا کے چہرے پر لالی اُمڈ آئی تھی۔ وہ نظریں جھکا کر میرے جسم میں سمانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کیف اور سرور نے ہمیں دنیا و مافیہا سے بے خبر کردیا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ ایک عرصہ دراز تک یونہی لیٹے رہیں اور محبت کے لمحات میں سرشار رہے۔ مگر شمیکا نے کسی خطرے کی بو سونگھتے ہوئے مجھے ہوشیار کیا۔

"کیا ہوا۔" میں نے شمیکا سے پوچھا۔

(جاری ہے)

خونی ڈاکٹر

شہاب شیخ

اچانک ایک بھیانک خوفناک دہشت ناک اور فلک شگاف دل کو دہلاتی اور رونگٹے کھڑے کرتی چیخ قرب و جوار کے فضا کو منتشر کرگئی اور پھر چشم زدن میں ایک ناقابل یقین تصور سے کہیں آگے کا منظر رونما ہوا جسے دیکھ کر آنکھیں پتھرا گئیں۔

جسم میں گردش کرتے ہوئے لہو کو منجمد اور دماغ پر لرزہ طاری کرتی خوفناک کہانی

ابھی ذرا دیر قبل ہی پائلٹ نے مسافروں کو مخاطب کرتے ہوئے اطلاع دی تھی کہ وہ اب سے کچھ دیر بعد ایئر پورٹ پر اترنے والے ہیں۔ اس نے مسافروں کو کچھ اور ہدایات بھی دی تھیں اور اب جہاز نیچے آنے کے بعد رن وے پر اترنے ہی والا تھا۔

جیکسن اپنی سیٹ پر بیٹھا کھڑکی سے باہر کا نظارہ دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آج سے پچیس سال قبل جب وہ یہاں سے گیا تھا تو پچاس سال کا تھا لیکن وہ خود کو ہر طرح سنوار کر اور بہتر انداز میں رکھتا تھا اس لئے پچاس سال کا لگتا نہیں تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس کی عمر پینتیس چالیس برس ہوگی لیکن اب جبکہ وہ پچھتر سال کا تھا تو اپنی عمر کے دس پندرہ سال بڑا لگتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب وہ یہاں سے افریقہ گیا تھا تو ایک عام سا انسان تھا لیکن افریقہ جا کر اس نے مختلف قسم کے جادو سیکھے اور یوں اسے سخت جسمانی اور روحانی ریاضتوں، تکلیفوں اور محنت سے گزرنا پڑا اور اس پر اثرات مرتب ہوئے۔

کچھ ہی دیر بعد جہاز کے پہیوں نے رن وے کو چھولیا اور پھر ذرا دور جانے کے بعد وہ رک گیا۔

دیگر مسافروں کے ساتھ جیکسن بھی اٹھ کر جہاز سے باہر آ گیا۔ یہاں موسم بے حد سرد تھا۔ آسمان بادل چھائے ہوئے تھے۔

جیکسن جہاز کی سیڑھیوں سے نیچے اترا سامنے ہی ایک گاڑی کھڑی تھی جس میں مسافروں لاؤنج تک جانا تھا۔ دیگر مسافروں کے ساتھ وہ بھی گاڑی میں سوار ہو گیا۔

ذرا دیر بعد وہ لاؤنج میں تھا۔ اس نے متلا نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا جلد ہی اسے اس کا دوس ڈیوڈ نظر آ گیا جو کہ اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا ڈیوڈ کے چہرے پر خوشی اور جوش کے تاثرات تھے۔

جیکسن جب اس کے قریب پہنچا تو وہ والہا انداز میں جیکسن سے لپٹ گیا اور پر جوش جذباتی میں بولا۔ ”کیسے ہو میرے دوست۔؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو؟“ جیک نے اس کی بات کا جواب دے کر کہا۔ اس کا لہجہ پرسکو تھا اور چہرے پر جذبات یا جوش نظر نہیں آ رہا تھا دراصل یہ اس کی عادت تھی۔ وہ اپنے جذبات کو اندر رکھتا تھا اور ڈیوڈ اس بات سے بخوبی واقف تھا۔

آؤ آؤ...... لاؤ یہ بریف کیس مجھے دے دو

ڈیوڈ نے اس کے بریف کیس کی طرف ہاتھ بڑھا

کہا۔

”ارے تم تکلیف نہ کرو یار۔“ جیکسن نے کہا۔ ی زیادہ بھاری تو نہیں ہے۔“

”اچھا یہ بتاؤ کہ سفر کیسا گزرا؟“ ڈیوڈ نے سوال

”خوشگوار۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا کوئی حسینہ ساتھ بیٹھ گئی تھی؟“ ڈیوڈ نے ی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”نہیں...... بس اس لئے کہ میں اپنے شہر میں سال بعد واپس آ رہا تھا، یہاں آنے کی بے حد تھی۔“ جیکسن نے وضاحت کی۔

”او اچھا کیا۔“ ڈیوڈ دھیرے سے ہنس دیا۔ ذرا وہ دونوں ایئر پورٹ کی عمارت سے باہر آنے بعد پارکنگ کی طرف چل پڑے جہاں ڈیوڈ کی تھی۔

”یہ بتاؤ کہ تم نے کیا کیا عملیات سیکھ لئے“ ڈیوڈ نے جیکسن سے پوچھا۔ وہ جیکسن سے خط و کرتا رہتا تھا اس لئے اس کی کافی سرگرمیوں سے تھا لیکن جیکسن نے اسے کبھی یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کیا جادو سیکھ لئے ہیں، بس یہی کہتا تھا کہ جب وہ لندن واپس آئے گا تو تفصیل سے بتائے گا۔

”ابھی فوری طور پر تو میں تمہیں ان جادوگری وغیرہ کی تفصیل نہیں بتا سکتا، آرام سے بیٹھ کر بتاؤں گا۔“ جیکسن نے جواب دیا۔

”او کے او کے۔“ ڈیوڈ نے کہا۔

ذرا ہی دیر بعد وہ رولزی گاڑی میں گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ”نینسی تمہیں دیکھ کر بے حد خوش ہوگی۔“ ڈیوڈ نے گردن موڑ کر جیکسن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ نینسی ڈیوڈ کی بیوی کا نام تھا۔

”کیسی ہے اس کی صحت؟“ جیکسن نے دریافت کیا۔ پچھلے دو سال سے خطوط میں ڈیوڈ اسے لکھ رہا تھا کہ نینسی کی طبیعت خراب ہے۔ وہ بیمار رہتی ہے اور اسے چکر آتے رہتے ہیں۔

”اس کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی حالانکہ وہ کہہ رہی تھی کہ میں اسے بھی ساتھ لے آؤں لیکن بس اس کی خراب حالت کی وجہ سے میں اسے ساتھ نہیں لایا۔“ ڈیوڈ نے جواب دیا۔

”کیا تم اس کا صحیح طور پر علاج کروا رہے ہو؟“ جیکسن نے پوچھا۔

”ہاں بھئی، میں نے اس میں کبھی کوتاہی نہیں کی

۔''اس نے جواب دیا۔

''تو پھر آخر وہ کیوں ٹھیک نہیں ہو پا رہی ہے؟'' جیکسن جیب سے سگار نکالتے ہوئے بولا اس دوران جیب سے لائٹر بھی نکال رہا تھا۔

''پتہ نہیں...... ڈاکٹر تو خود حیران ہیں کہ جو دوائیں انہوں نے اسے دی ہیں ان کے استعمال سے تو اسے بالکل ٹھیک ہو جانا چاہئے تھا۔'' ڈیوڈ بولا۔

''تم نے ایک ہی ڈاکٹر سے علاج کروایا ہے؟'' جیکسن نے پوچھا اور سگار سلگا لیا۔

''نہیں...... اب تک تو میں چار ڈاکٹر بدل چکا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''حیرت ہے کہ وہ کیوں ٹھیک نہیں ہوئی۔'' جیکسن نے کہا۔

وہ لوگ مختلف انداز میں بات چیت کرتے ہوئے ڈیوڈ کے گھر پہنچ گئے۔ ڈرائنگ روم میں آنے کے بعد ڈیوڈ، ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے جیکسن سے کہا۔ ''آؤ میں تمہیں پہلے نینسی سے ملوادوں۔''

''ہاں بالکل۔'' جیکسن اور اس نے اپنا سامان وہاں رکھ دیا۔ پھر وہ دونوں ڈرائنگ روم سے نکل کر نینسی کے کمرے میں آ گئے۔ جیکسن کو نینسی کی حالت دیکھ کر بے حد افسوس ہوا۔ وہ بہت کمزور ہو چکی تھی۔ اس کی عمر تقریباً پچپن سال تھی لیکن وہ اسی برس کی دکھائی دے رہی تھی اس کی آنکھوں میں ویرانی تھی۔ وہ بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ جیکسن کو دیکھ کر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''جیکسن!...... کیسے ہو تم؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن...... یہ تم نے کیا حال بنا رکھا ہے؟'' جیکسن نے پوچھا اور اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''نہ جانے مجھے کون سی بیماری ہو گئی ہے کہ میں ٹھیک ہی نہیں ہو پا رہی ہوں۔'' وہ بولی۔

''جب تمہاری اور ڈیوڈ کی شادی ہوئی تھی تو تم بہت حسین ہوتی تھی لیکن افسوس کہ بیماری نے تمہیں کافی نقصان پہنچایا ہے، تمہاری عمر کی عورتیں تو جوان ہوتی ہیں۔ بہر حال میں اور ڈیوڈ مل کر کسی ایسے ڈاکٹر کو ضرور تلاش کر لیں گے جو تمہیں ٹھیک کرے۔'' وہ بولا۔

''تمہارا شکریہ۔'' نینسی نے غمگین مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

جیکسن اس کے ساتھ کچھ اور باتیں کرتا رہا۔ پھر اسے آرام کرنے کا کہہ کر ڈیوڈ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔ ''واقعی نینسی کی حالت تو بہت خراب ہے، میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی لاغر ہو چکی ہو گی۔''

''بس، میں بھی سوائے افسوس کے کچھ نہیں کر سکتا۔'' ڈیوڈ نے افسردگی کے ساتھ کہا۔

''فکر نہ کرو، ہم کوئی اچھا ڈاکٹر تلاش کر لیں گے۔'' جیکسن نے اسے تسلی دی۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ اب فوری طور پر تم کیا چاہتے ہو، کچھ کھاؤ پیو گے یا آرام کرو گے؟'' ڈیوڈ نے پوچھا۔

''میں صرف کافی پینا چاہتا ہوں۔'' جیکسن نے جواب دیا۔

''اوکے...... میں ابھی کافی لے کر آتا ہوں۔'' ڈیوڈ نے اٹھتے ہوئے کہا اور پھر وہ کچن میں آ گیا۔ اس نے کافی بنائی اور واپس جیکسن کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھ دی۔ جیکسن نے جھک کر ان میں سے ایک مگ اٹھایا جبکہ دوسرا مگ ڈیوڈ نے اٹھا لیا اور جیکسن کے مقابل صوفے پر بیٹھ گیا۔ کافی کی ایک چسکی لینے کے بعد اس نے جیکسن سے کہا۔ ''مجھے تو نینسی افسردہ اور پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔''

''ڈاکٹر آخر اسے کیا بیماری بتاتے ہیں؟'' جیکسن نے پوچھا۔

''ڈاکٹر واشن جو کہ آج کل اس کا علاج کر رہا ہے اس کا کہنا ہے کہ جسمانی طور پر تو نینسی ٹھیک ٹھاک ہے لیکن اسے نہ جانے کیوں کمزوری رہتی ہے، اس کا خیال ہے کہ شاید نینسی نے کوئی صدمہ دل کو لگا لیا ہے۔''

''کیا کوئی حادثہ یا سانحہ ہوا تھا؟'' جیکسن

نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی، بس ایک رات نینسی سوتے میں ڈر گئی تھی۔''

''کیا کوئی خواب دیکھا تھا؟'' جیکسن نے پوچھا۔

''نہیں...... دراصل ایک معمولی سی بات ہوئی تھی اس رات موسم خوشگوار تھا۔ کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ رات میں کسی وقت نینسی کی آنکھ کھلی تو اس نے وہاں ایک کالی بلی بیٹھی دیکھی نینسی نے اسے دیکھ کر چیخ ماری اور میری آنکھ کھل گئی۔ اس وقت میں نے بلی کو کھڑکی سے باہر کودتے دیکھا تھا۔ تب میں نے نینسی سے پوچھا تھا کہ کیا ہوا تو اس نے جواب دیا کہ بلی کا چہرہ بدل کر کسی خوفناک بلا جیسا ہو گیا تھا۔ نینسی پہلے بھی اس طرح واہموں کی باتیں کرتی رہتی تھی اس لئے میں نے یہی کہا کہ اسے بلی کے بارے میں بس وہم ہو گیا ہے جبکہ حقیقتاً تھا بھی ایسا ہی کیونکہ وہ ہمارے کمرے میں آتی رہتی تھی اور محلے بھر میں گھومتی رہتی تھی۔ بس اس وہم کا اثر نینسی نے لیا ہے، یہ میرا اپنا خیال ہے۔ اس کے بعد وہ خوف کا شکار رہنے لگی۔ پھر نزلہ، زکام، کھانسی اور بخار کی شکایت ہوئی پھر اسے کمزوری ہوئی جس کے بعد وہ کمزوری کا شکار ہوئی اور تب سے اب تک بیمار ہے۔'' ڈیوڈ نے تفصیلی جواب دیا۔

''تم نے اس سلسلے میں کسی سائیکاٹرسٹ سے رجوع کی؟'' جیکسن نے سوال کیا اور کافی کا مگ ہونٹوں سے لگا لیا۔

''ہاں کی تھی، ڈاکٹر رابنسن یہاں کا نامور سائیکاٹرسٹ ہے۔ میں نے اس سے بھی نینسی کا علاج کروایا لیکن اس نے علاج کے بعد کہا تھا کہ نینسی اس کی طرف سے بالکل کلیئر ہے۔ پھر میں نے کچھ اور ماہر نفسیات ڈاکٹروں سے بھی مشورہ لیا انہوں نے بھی نینسی کو ٹھیک قرار دیا۔ بس اس کے بعد سے میں نے اس کا نفسیاتی علاج چھوڑ دیا تھا۔'' ڈیوڈ نے بتایا۔

''تم فکر نہ کرو، ہم اس کے لئے کوئی اچھا ڈاکٹر ڈھونڈ لیں گے۔'' جیکسن نے تسلی دی۔

☆......☆......☆

ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ اس دوران جیکسن، ڈیوڈ کے گھر کے قریب ہی ایک چھوٹے سے فلیٹ میں منتقل ہو چکا تھا۔ یہ فلیٹ اس نے کرائے پر حاصل کیا تھا۔ ڈیوڈ کی خواہش تھی کہ جیکسن اس کے ساتھ رہے لیکن جیکسن کا کہنا تھا کہ اسے اپنے عملیات وغیرہ کی وجہ سے علیحدہ گھر کی ضرورت ہے۔

اس وقت رات کے 11 بج رہے تھے۔ موسم سرد تھا۔ باہر برف باری ہو رہی تھی۔ جیکسن ایک کمرے میں بیٹھا عملیات کر رہا تھا۔ روم ہیٹر جلنے کی وجہ سے کمرہ گرم تھا۔ جیکسن ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے موجود میز پر ایک انسانی کھوپڑی رکھی ہوئی تھی۔ دیگر کچھ چیزیں بھی وہاں رکھی تھیں۔ یہ تمام چیزیں اس نے یہیں لندن سے ہی اکٹھی کی تھیں اور ان کے بغیر وہ عملیات نہیں کر سکتا تھا۔ آتے ہوئے وہ افریقہ سے یہ چیزیں نہیں لا سکتا تھا کیونکہ ایئرپورٹ کا عملہ اسے یہ چیزیں نہ لانے دیتا اور وہ مشکوک بھی ہو جاتا۔ اب لندن میں پہلی مرتبہ وہ عملیات کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں نینسی تو تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈیوڈ نے اس کے بارے میں کسی کالی بلی کا تذکرہ کیا تھا۔ جیکسن کو یہ معاملہ کچھ پراسرار محسوس ہوا تھا اور اس نے اسی وقت تہیہ کر لیا تھا کہ وہ عملیات کے ذریعے اس حوالے سے معلومات حاصل کرے گا لیکن اپنے اس ارادے کا اظہار اس نے ڈیوڈ سے نہیں کیا تھا کیونکہ وہ ڈیوڈ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس بات کا خیال بھی تھا کہ اگر وہ نینسی سے یہ بات کہہ دیتا تو وہ مزید پریشان ہو سکتی تھی۔

جیکسن نے ایک منتر پڑھ کر کھوپڑی پر پھونک ماری تو چند لمحے بعد ہی کھوپڑی کی رنگت بدلنا شروع ہو گئی۔ پھر وہ انگارے کی طرح سرخ ہو گئی۔ یہ عمل صرف بیس پچیس سیکنڈ میں ہو گیا تھا۔

اس نے ایک بار پھر ایک منتر پڑھ کر کھوپڑی پر پھونک ماری۔

"میں تمہارے سوالوں کا جواب دینے کے لئے حاضر ہوں۔" کھوپڑی میں سے آواز آئی جو کہ ایک بدروح کی تھی جسے جیکسن نے منتر پڑھ کر حاضر کیا تھا۔ وہ بدروح جیکسن کو نظر نہیں آرہی تھی لیکن اگر کسی وجہ سے وہ چاہتا تو وہ اسے حاضر بھی کر سکتا تھا مگر ابھی اس کی ضرورت نہیں تھی۔

"یہ بتاؤ کہ میرے دوست ڈیوڈ کی بیوی نینسی کیوں مسلسل بیمار ہے؟" جیکسن نے سوال کیا۔

"اس پر ایک ویمپائر کی نظر ہے جو آہستہ آہستہ اس کا خون پی رہا ہے۔" بدروح نے جواب دیا۔

"وہ ویمپائر کہاں رہتا ہے؟" جیکسن نے پوچھا۔

"لندن کے باہر سنسان علاقے میں اس کا ٹھکانہ ہے۔" بدروح بولی۔

"اس کی مکمل تفصیل بتاؤ؟" جیکسن نے بے چینی سے کہا۔

"دراصل وہ ایک آدمی ہے، کاؤنٹ ڈریکولا کا پیروکار ہے، عملیات بھی جانتا ہے اس لئے آسانی کے ساتھ لوگوں کو اپنا شکار بنا لیتا ہے۔" بدروح نے بتایا۔

"کیا نام ہے اس کا؟" جیکسن نے کھوپڑی کی طرف ذرا جھکتے ہوئے سوال کیا۔

"ڈاکٹر مارٹن!" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے.....تم مجھے اس کا سارا نقشہ دکھاؤ۔" جیکسن بولا۔

"بہتر ہے۔" بدروح نے کہا اور پھر کھوپڑی پر ایک منظر نمودار ہوا۔ یہ جیکسن کا فلیٹ تھا۔ منظر بدلنے لگا لیکن اب لگتا تھا جیسے کوئی فلم چل رہی ہو۔ فلیٹ کے باہر سڑک نظر آیا۔ کافی دیر تک سڑک نظر آتی رہی اور پھر شہر سے باہر کا علاقہ آگیا۔ حالانکہ اس وقت حقیقت میں اس علاقے میں اندھیرا تھا لیکن بدروح اپنی طاقت سے جیکسن کو سارا منظر روشنی میں دکھا رہی تھی۔

بڑی سڑک کے بعد ایک طرف ایک چھوٹی سڑک کا منظر شروع ہوگیا۔

کچھ دور آگے کھیت آئے۔ اور پھر کھیتوں کے درمیان ایک بڑی عمارت نظر آئی۔

"یہ ڈاکٹر مارٹن کی رہائش گاہ ہے۔" بدروح نے بتایا۔ جیکسن خاموش رہا۔ اب اس عمارت کے اندر کا منظر نظر آنے لگا۔ بہت بڑا خوبصورت لان تھا، اس سے آگے برآمدے میں ایک بلیک کار کھڑی تھی۔

ذرا دیر بعد تمام حصوں کو دکھانے کے بعد بدروح نے ڈاکٹر مارٹن کی خواب گاہ دکھائی۔ وہاں ڈاکٹر مارٹن سو رہا تھا۔ وہ جیکسن کا ہم عمر ہی تھا لیکن جیکسن ذرا بھاری جسم کا تھا جبکہ ڈاکٹر مارٹن پتلا دبلا تھا۔

"یہ ڈاکٹر مارٹن ہے۔" بدروح نے بتایا۔

"ٹھیک ہے.....کیا تم اسے مار سکتی ہو؟" جیکسن نے پوچھا۔

"میرے لئے مشکل ہوگا کیونکہ اس کے پاس بڑی طاقت ہے۔ اگر میں نے اس کے خلاف کچھ کیا تو ممکن ہے کہ وہ مجھے ہی قید کرلے۔" بدروح نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" جیکسن نے منتر پڑھا اور کھوپڑی پر پھونک ماری۔ وہ بدروح غائب ہوگئی۔ جیکسن نے کھوپڑی پر بھی منتر پھونکا اس کی رنگت بدلنے لگی۔ اب اسے واپس اپنے رنگ میں آنا تھا۔

جیکسن پیچھے ہونے کے بعد کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور ڈاکٹر مارٹن کے بارے میں سوچنے لگا۔ بدروح نے اس سے مقابلے سے انکار کیا تھا جس سے یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ ڈاکٹر مارٹن بے حد طاقتور عامل ہے وہ بدروح ایسے لوگوں سے مقابلہ کرنے سے انکار کرتی تھی جو بہت طاقتور عامل ہوتے تھے جیکسن چاہتا تو ایک اور عمل کر کے اس بدروح کو ڈاکٹر مارٹن کے مقابلے پر بھیج سکتا تھا لیکن اسے بھی ڈر تھا کہ کہیں ڈاکٹر مارٹن کا پلہ بھاری ہو جائے۔ وہ ڈاکٹر مارٹن کے خلاف بہت سوچ سمجھ کر

قدم اٹھانا چاہتا تھا۔

کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ڈاکٹر مارٹن سے ایک عام آدمی بن کر ملاقات کرے گا اور وہاں اسے گرفت میں لینے کی کوشش کرے گا۔

اس نے بدروح کو ایک بار پھر حاضر کر کے ڈاکٹر مارٹن کے متعلق عام ضروری معلومات حاصل کرلیں اور پھر اگلے روز وہ اس ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا جہاں ڈاکٹر مارٹن شام میں کچھ دیر بیٹھتا تھا اور اپنے متعلقہ لوگوں سے ملاقات کرتا تھا۔

جیکسن نے ریسٹورنٹ میں داخل ہونے کے بعد ڈاکٹر مارٹن کو دیکھ لیا اور غیر محسوس انداز میں وہ ڈاکٹر مارٹن کے قریب ہی ایک ٹیبل پر بیٹھ گیا۔

ڈاکٹر مارٹن اس وقت ایک میگزین کا مطالعہ کر رہا تھا اور اس کے پاس کوئی بھی نہیں تھا۔

جیکسن نے ویٹر کو کافی لانے کا کہہ دیا اور جیب سے ایک سگار نکال کر سلگایا۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر مارٹن کے پاس ایک خوش پوش نوجوان آکر بیٹھ گیا۔ بات چیت تو انہوں نے مناسب آواز میں ہی کی لیکن پھر وہ آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔

ذرا دیر بعد ایک بوڑھی عورت بھی ان دونوں کے پاس آکر بیٹھ گئی اور باتوں میں مشغول ہوگئی۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ایک ادھیڑ عمر آدمی بھی ان کے پاس آکر شامل گفتگو ہوگیا۔

"ایکسکیوزمی!.....کیا میں یہ میگزین دیکھ سکتا ہوں؟" جیکسن نے بات بڑھانے کے لئے ڈاکٹر مارٹن کے میگزین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ڈاکٹر مارٹن نے میگزین اپنے سامنے میز پر رکھ لیا تھا۔

"جی ضرور۔" ڈاکٹر مارٹن نے خوش اخلاقی سے کہتے ہوئے میگزین اٹھا کر اسے دے دیا اور جیکسن نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

ذرا دیر بعد ڈاکٹر مارٹن کے ساتھ بیٹھے ہوئے تینوں افراد وہاں سے چلے گئے۔

"اس میگزین میں جادو وغیرہ کے بارے میں بھی کچھ مواد شائع ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جادو وغیرہ کی تو کوئی حقیقت نہیں ہے، یہ مواد میگزین والوں نے صرف میگزین بیچنے کے لئے شائع کیا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟" جیکسن نے مسکرا کر ڈاکٹر مارٹن سے کہا۔

"جادو حقیقت میں ہے تو سہی لیکن آپ کا یہ خیال درست ہے کہ یہ مواد میگزین والوں نے میگزین بیچنے کے لئے ہی شائع کیا ہے کیونکہ انہوں نے انڈیا، بنگلہ دیش اور دیگر ممالک کے کچھ ایسے حوالے دیئے ہیں جو سراسر جھوٹ پر مبنی ہیں۔" ڈاکٹر مارٹن نے کہا۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ کے قریب بیٹھ کر بات چیت کر سکتا ہوں؟" جیکسن نے اجازت چاہی۔

"ہاں بالکل ضرور آئیں۔" وہ خوش اخلاقی سے بولا۔ جیکسن اٹھ کر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "دراصل دور سے گفتگو مناسب نہیں لگ رہی تھی۔"

"ہاں تو اب بتایئے آپ کیا کہنا چاہ رہے تھے؟"

"میں نے جادو وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہے اس لئے میں یہ جان لیتا ہوں کہ اس حوالے سے کون سی بات درست ہے اور کون سی غلط ہے۔" ڈاکٹر مارٹن نے بتایا۔

"تو کیا آپ ایسے معاملات میں دلچسپی بھی رکھتے ہیں؟" جیکسن نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"ہاں..... میں اس حوالے سے کچھ دلچسپی رکھتا ہوں۔ کیا آپ کو بھی ایسے معاملات سے دلچسپی ہے؟" ڈاکٹر مارٹن نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"نہیں کچھ خاص نہیں، بس بڑی خواہش رہی ہے کہ میں اس بارے میں کچھ کرتا، میرا مطلب ہے کہ

میں کچھ عملیات حاصل کرتا یا کچھ سیکھتا لیکن افسوس کے بس کبھی کوئی ایسا موقع نہیں مل سکا کہ جو کہ حقیقتاً اس بارے میں کچھ جانتے ہوں لیکن آپ کی باتوں سے ایسا لگتا ہے کہ آپ ضرور اس حوالے سے بہت کچھ جانتے ہیں؟'' جیکسن بولا۔

''جی ہاں...... آپ کا اندازہ درست ہے، مجھے کافی معلومات ہیں اس بارے میں۔'' ڈاکٹر مارٹن بولا۔

''تو آپ مجھے کچھ بتائیں ناں؟'' جیکسن نے اشتیاق کا اظہار کیا۔

''آپ کیا کرتے ہیں؟'' ڈاکٹر مارٹن نے پوچھا۔

''یوں سمجھ لیں کہ میں آج کل ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہوں لیکن اپنی گزر اوقات کے لئے میں ہیرے فروخت کرنے کا کاروبار کرتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''او...... یہ تو بڑا مہنگا کاروبار ہے۔'' ڈاکٹر مارٹن نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں ہے تو سہی۔'' جیکسن بھی مسکرایا۔ ''لیکن بات یہ ہے کہ میرا سال دو سال میں ایک سودا ہوتا ہے اور میری اتنی آمدنی ہو جاتی ہے کہ میں آسانی سے اپنی گزر اوقات کرلوں۔ میرے کئی کلائنٹس ہیں جن کے پاس ہیرے ہیں جب دوسرے کلائنٹس کو ہیروں کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ مجھ سے رابطہ کر لیتے ہیں۔ میں ہیرے والے کلائنٹس سے ہیرے لاکر ان لوگوں کو دکھاتا ہوں۔''

''ویری گڈ!'' ڈاکٹر مارٹن مسکرایا۔ ''یہ تو اچھا کاروبار ہے، اس میں اپنا سرمایہ بھی نہیں لگتا۔''

''ہاں بالکل۔'' جیکسن بولا۔ پھر ذرا توقف کے لہجہ میں اس نے کہا۔ ''ہم جادو کے موضوع پر بات کر رہے تھے تو کیا آپ اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟''

''میں یہی جاننا چاہ رہا تھا کہ اگر آپ کے پاس وقت ہے تو میرے ساتھ میری رہائش گاہ پر چلیں۔ وہاں آرام سے بیٹھ کر بات ہوگی۔ میں کچھ جادو وغیرہ جانتا بھی ہوں، اس کے بارے میں بھی آپ کو بتاؤں گا۔'' ڈاکٹر مارٹن بولا۔

''ٹھیک ہے یہ تو میرے لئے خوشی کی بات ہے۔'' جیکسن قدرے جوش سے بولا۔

''تو پھر آئیں چلتے ہیں۔'' ڈاکٹر مارٹن نے کہا اور وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''کیا آپ کے پاس گاڑی ہے؟'' ڈاکٹر مارٹن نے ریسٹورنٹ سے باہر آکر پوچھا۔

''جی ہاں......'' جیکسن نے جواب دیا۔

''بس تو پھر آپ میری گاڑی کے پیچھے آجایئے۔''

''جی بہتر ہے۔''

''ویسے آپ فکر نہ کریں میں گاڑی آہستہ ہی چلاتا ہوں اس لئے آپ کو پریشانی نہیں ہوگی۔'' ڈاکٹر نے ٹرن موڑ کر جیکسن کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔

''یہ اچھی بات ہے، ویسے میں بھی تیز ڈرائیونگ نہیں کرسکتا ہوں۔'' جیکسن بھی مسکرا کر بولا۔

ذرا دیر بعد وہ اپنی اپنی گاڑیوں میں روانہ ہو گئے اور پھر وہ ڈاکٹر مارٹن کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے تو مارٹن نے نہایت خوفناک مسکراہٹ کے ساتھ جیکسن سے کہا۔ ''کیا تم نے مجھے بے وقوف سمجھا ہوا ہے؟''

''کیا مطلب؟'' جیکسن نے حیرت سے کہا۔

''اگر تم نے میرے بارے میں معلومات کی ہے تو میں بھی تمہارے بارے میں جانتا ہوں۔'' ڈاکٹر مارٹن نے کہا تو جیکسن سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ بولا۔

''اوہ...... تو تم مجھے اس لئے یہاں لے آئے ہو؟''

''ہاں تمہیں یہاں لانے کا یہ آسان طریقہ تھا۔'' دراصل تم خود ہی میرے جال میں پھنس رہے تھے اس لئے مجھے تمہیں یہاں لانے کے لئے محنت کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ بہر حال اب یہ بتاؤ کہ کیا

چاہتے ہو؟'' اس نے جیکسن کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم نینسی کا پیچھا چھوڑ دو۔'' جیکسن نے مطالبہ کی بات کی۔

''تم اپنے دوست ڈیوڈ کی دوستی نبھا رہے ہو؟'' ڈاکٹر مارٹن بولا۔

''ہاں بالکل۔''

''کیا تم اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟''

''کیا مطلب؟''

''اس کی سرگرمیوں کے بارے میں؟''

''میں کچھ سمجھا نہیں؟''

''کاش !...... تم اس کے بارے میں کچھ معلومات لے لیتے۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''دراصل...... وہ خود ہی اپنی بیوی کا خون پی رہا ہے۔'' ڈاکٹر مارٹن بولا۔

''نہیں...... یہ جھوٹ ہے، میں نے اپنی بدروح سے معلومات لی تھی، اس نے بتایا تھا کہ تم نینسی کا خون پیتے ہو۔'' جیکسن نے بتایا۔

''اس نے جھوٹ بولا تھا۔'' ڈاکٹر مارٹن نے کہا تو جیکسن حیرت زدہ ہو کر بولا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟...... یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ بدروح جھوٹ بولے؟''

''ایسا ہوا ہے۔''

''ناممکن...... ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔''

''ہوسکتا ہے ہوسکتا ہے۔'' ڈاکٹر مارٹن زور سے بولا۔ ''جب تم نے اسے میری معلومات لینے کے لئے بھیجا تھا تو میں نے اس پر عمل کردیا تھا۔'' ڈاکٹر مارٹن بولا۔

''نہیں...... یہ جھوٹ ہے۔'' جیکسن اب بھی اس کی بات ماننے پر تیار نہ تھا۔

''اچھا تو پھر تم خود ہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ ڈیوڈ کیا کرتا ہے۔'' وہ بولا۔

''کیا کرتا ہے وہ؟'' جیکسن جلدی سے بولا۔

''کچھ دیر بعد ہی تم دیکھ سکو گے۔'' ڈاکٹر مارٹن کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

''تم بتاؤ تو سہی کہ وہ کیا کرے گا؟'' جیکسن نے اصرار کیا۔

''تم اپنی آنکھوں سے دیکھنا۔'' ڈاکٹر مارٹن کے چہرے پر اب بھی پہلے جیسی مسکراہٹ تھی۔ ''اور ہاں میرے دوست...... میں امید کروں گا کہ تم کسی قسم کی حرکت نہیں کروگے کیونکہ اس طرح تمہیں بہت نقصان ہوسکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم میرے ہاتھوں مارے جاؤ۔''

''تم بے فکر رہو، میں کچھ نہیں کروں گا۔ بس تم مجھے یہ بتاؤ کہ ڈیوڈ کیا کرتا ہے؟'' جیکسن بے چینی سے بولا۔

''اوکے اوکے۔'' ڈاکٹر مارٹن ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''تم تھوڑا انتظار کرو۔ تم یہیں بیٹھو، میں ابھی تھوڑی دیر بعد آتا ہوں۔'' وہ چل پڑا اور جیکسن بے بسی سے ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

ڈاکٹر مارٹن اٹھا اور روم سے باہر چلا گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ڈاکٹر مارٹن کی واپسی ہوئی۔ اس نے جیکسن کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''آؤ میرے دوست!...... میں تمہیں ایک نظارہ کرواتا ہوں۔''

جیکسن جلدی سے اٹھ کر چل دیا۔

ذرا دیر بعد وہ دونوں ایک کمرے میں آئے۔ یہاں دیوار میں کھڑکی کی طرف ایک کالا شیشہ نصب تھا۔ ڈاکٹر مارٹن نے اس کی طرف اشارہ کرکے جیکسن سے کہا۔ ''تم یہاں سے دوسرے کمرے کا منظر دیکھ سکو گے۔ وہاں دیکھنا کہ ڈیوڈ کیا کرتا ہے۔''

''اوکے۔'' جیکسن بولا۔

وہ کالا شیشہ اس طرح کا تھا کہ اس جانب سے تو ڈاکٹر مارٹن اور جیکسن دیکھ سکتے تھے جبکہ دوسرے کمرے سے یہاں کچھ نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔

کچھ دیر بعد دوسرے کمرے میں ڈیوڈ داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بلی تھی جو رسی سے بندھی ہوئی

تھی۔

"اب تم دیکھنا کہ وہ کیا کرتا ہے۔" ڈاکٹر مارٹن نے جیکسن سے کہا۔ یہ ساؤنڈ پروف کمرہ تھا اس لئے دوسری طرف آواز جانے کا احتمال بھی نہیں تھا۔

ڈیوڈ نے اس بلی کو ٹیبل پر ڈال دیا اور پھر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے ایک چاقو نکال کر کھول لیا اور اس نے بلی کو ایک ہاتھ سے اٹھالیا پھر اس کی گردن کاٹ دی۔

بلی کا خون ایک گلاس میں ڈال لیا اور مزے سے وہ خون پینے لگا۔

"دیکھا تم نے؟" ڈاکٹر مارٹن نے جیکسن سے کہا۔

"یہ کیا کررہا ہے؟" جیکسن حیرانگی کی کیفیت میں تھا۔

"خون پی رہا ہے بلی کا اور کیا کررہا ہے۔" ڈاکٹر مارٹن طنزیہ انداز میں دھیرے سے ہنس کر بولا۔

"لیکن...... کیوں؟" جیکسن بے یقینی سے بولا۔

"اس لئے کہ...... وہ بھی خون آشام ہے۔" ڈاکٹر مارٹن نے انکشاف کیا تو جیکسن کو حیرت کا جھٹکا لگا اور اس نے گردن موڑ کر حیرت بھری نظروں سے ڈاکٹر مارٹن کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟...... کیا...... کیا وہ واقعی خون آشام ہے؟"

"کیا تمہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہے؟" ڈاکٹر مارٹن طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

جیکسن بے بسی سے ایک گہرا سانس خارج کرکے گویا اپنے آپ سے بولا۔ "بھلا...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہی حقیقت ہے میرے دوست......" ڈاکٹر مارٹن بولا۔

"او مائی گاڈ۔" جیکسن نے ایک گہرا سانس خارج کرتے ہوئے اپنا سر پکڑ لیا۔

"ہاں تو میرے دوست!...... اب یقین آیا کہ تمہارا دوست خون کا کتنا شوقین ہے؟" ڈاکٹر مارٹن نے کہا۔

جیکسن نے کوئی جواب نہ دیا۔ ڈاکٹر مارٹن بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "دراصل تمہارے دوست ڈیوڈ کو اس وقت جادو سیکھنے کا شوق ہوا تھا جب تم افریقہ میں تھے۔ وہ کسی طرح مجھ تک پہنچ گیا تھا۔ میں تو ڈریکولا کا چاہنے والا اور اس کا ہر چاہنے والا انسانوں کا خون پیتا ہے میں چونکہ ایک ڈاکٹر اور سائنس دان بھی ہوں لہٰذا میں نے اپنے اس شعبے سے بہت فوائد حاصل کئے۔ اب میں نے ایسے طریقے نکال لئے ہیں کہ جن کے ذریعے اگر ہم خون پیتے ہیں تو جس کی خون پیا جاتا ہے وہ زندہ رہتا ہے اور اس کی گردن پر پڑنے والے سوراخ ہیں ہم اپنی ایک دوا اور کچھ ادویات سے غائب کردیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ نینسی کے گلے پر کبھی بھی ڈیوڈ کے دانتوں کے نشان نظر نہیں آتے۔ جب وہ اس کا خون پیتا ہے تو ایک منتر کے ذریعے اس کے چاروں دانت بڑے ہوجاتے ہیں جنہیں وہ اپنے شکار کی گردن میں پیوست کردیتا ہے...... ہاہاہا......" ڈاکٹر مارٹن نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "میرے پاس جو بھی جادو سیکھنے آتا ہے میں اسے اپنا چیلا بنالیتا ہوں تاکہ کاؤنٹ ڈریکولا کے مشن کو جاری رکھ سکوں۔"

"تم یہ سب کچھ اچھا نہیں کررہے ہو۔" جیکسن نے نفرت سے کہا۔

"میں نے کب کہا ہے کہ میں اچھا کررہا ہوں؟" وہ شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "لیکن...... میں سمجھتا ہوں کہ میں بہت اچھا کررہا ہوں...... میں کاؤنٹ ڈریکولا کا چاہنے والا ہوں اور اس کی روح کو خوش کرنے کے لئے میں ساری دنیا میں خون آشام لوگوں کا جال بچھا دینا چاہتا ہوں تاکہ کاؤنٹ ڈریکولا کا نام قائم رہے۔" وہ بات کرتے کرتے کہیں خیالوں میں کھو گیا تھا۔

"تم بہت قابل نفرت انسان ہو۔" جیکسن نے نفرت سے منہ بنا کر کہا۔

"تم کچھ بھی کہتے رہو مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے ویسے بھی آج تمہارا آخری دن ہے۔ میں رات میں خود تمہارا خون پیوں گا۔ مجھے اپنے دشمنوں کا خون پی کر بڑا مزہ آتا ہے۔" ڈاکٹر مارٹن نے مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، میرے پاس بھی بڑی جادوئی طاقت ہے۔" جیکسن بولا۔

"وہ میں نے معطل کردی ہے۔" وہ پھر مسکرایا۔

"کیا؟" جیکسن حیرت اور غصے سے بولا۔

"تم آزما کر دیکھ لو۔" ڈاکٹر مارٹن نے کہا۔

جیکسن نے اپنی جادو کی طاقتوں کو آزمایا لیکن ناکام رہا ڈاکٹر مارٹن نے اس کی صلاحیتوں کو ناکارہ کردیا تھا۔

"چلو...... اب شرافت سے میرے ساتھ چلو۔" ڈاکٹر مارٹن تحکمانہ انداز میں اس سے بولا۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گا۔" جیکسن غصے سے بولا۔

"جانا تو پڑے گا۔" ڈاکٹر مارٹن نے کہا اور دائیں طرف فضاء میں دیکھ کر وہاں موجود ایک بدروح سے کہا جو صرف اس کو نظر آرہی تھی۔ "تم اسے پکڑ لو اور تہہ خانے میں باندھ کر آجاؤ۔"

بدروح نے جیکسن کو پکڑ کر اٹھالیا اور چل پڑی۔

جیکسن ہاتھ پیر مارتا ہی رہ گیا۔

بدروح جیکسن کو تہہ خانے میں لے آئی اور اسے رسیوں سے باندھ کر واپس چلی گئی۔

جیکسن بے بسی سے چیخنے لگا کہ اب تو وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا۔

رات کے دو بجے ڈاکٹر مارٹن اور ڈیوڈ آگئے۔ جیکسن نے ڈیوڈ کی طرف نفرت سے دیکھا اور بولا۔ "مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔"

"کیسی امید؟" ڈیوڈ ڈھٹائی سے مسکرایا۔

"افسوس کہ تم اپنی ہی بیوی کے دشمن بن گئے۔" جیکسن بولا۔

"میرے لئے کاؤنٹ ڈریکولا کا نام اور اس کا مشن زیادہ اہم ہے، اپنی بیوی جیسی ہزاروں عورتیں میں اس پر قربان کرسکتا ہوں۔" وہ بولا۔ اس کے لہجے میں بڑی عقیدت تھی۔

"لعنت ہو تم پر اور تمہارے کاؤنٹ ڈریکولا پر۔" جیکسن نے کہا۔

"اے۔ یو شٹ اپ!" ڈیوڈ غصے سے دھاڑا۔

ڈاکٹر مارٹن کے چہرے پر بھی ناگواری کے تاثرات آگئے تھے۔

"مسٹر!...... کاؤنٹ ڈریکولا کے بارے میں زبان سنبھال کر بات کرو۔" ڈاکٹر مارٹن نے کہا۔

جیکسن کے دماغ میں بجلی سی کوندی۔ اس کے پاس ایک عمل تھا کہ وہ اگر ڈاکٹر مارٹن کے سر پر ہاتھ رکھ کر ایک خاص منتر پڑھتا تو وہ اپنی جادوئی صلاحیتوں کو بحال کرسکتا تھا۔ اس نے اندازہ کرلیا تھا کہ ڈیوڈ اور ڈاکٹر مارٹن کاؤنٹ ڈریکولا کے حوالے سے بڑی جلدی مشتعل ہوجاتے ہیں۔ اس نے ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہونے کے لئے جیکسن کو زیادہ راستے نظر نہیں آرہے تھے لیکن وہی کچھ کرسکتا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں اس جیسے ہزاروں کاؤنٹ ڈریکولاؤں پر لعنت بھیجتا ہوں۔ وہ ذلیل انسان تھا جو۔"

"اے...... اے...... میں تمہارے دانت توڑ دوں گا۔" ڈیوڈ اشتعال میں آکر اس کی طرف بڑھا۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر مارٹن نے بھی قدم بڑھایا۔

ان دونوں نے جیکسن کو زدوکوب کرنا شروع کردیا۔

"تم دونوں مل کر مجھے مار رہے ہو، اگر اتنی ہمت ہے تو مجھے بھی آزاد کرو پھر میں تم سے مقابلہ کرتا ہوں۔" جیکسن نے ان سے کہا۔

ان دونوں نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا اور اسے مارتے رہے۔ اس وقت نینسی تہہ خانے میں داخل ہوئی اسے دیکھ کر وہ تینوں حیران رہ گئے۔

"اوہ...... تم...... یہاں...... مگر کیسے؟" ڈیوڈ

نے بے یقینی سے کہا۔

’’تم کیا سمجھ رہے تھے کہ میں خواہ مخواہ تمہیں اپنا خون پلا رہی تھی!......نہیں ڈیوڈ ایسی بات نہیں تھی دراصل مجھے معلوم تھا کہ تم میرا خون پی رہے ہو۔ دراصل میں نے اپنی بیماری کے سلسلے میں انڈیا کے ایک عامل رگوناتھ سے ملاقات کی تھی۔ وہ ہمارے شہر میں ہی رہتا ہے۔ بظاہر تو وہ اپنا کاروبار کرتا ہے لیکن حقیقت میں وہ عملیات کی دنیا کا بادشاہ ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ کیا حالات ہیں اور تب اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر میں چاہوں تو تمہیں موت کے گھاٹ اتار سکتی ہوں لیکن ڈیوڈ میں تم سے محبت کرتی ہوں اس لئے میں کبھی یہ نہیں چاہتی تھی کہ تم مارے جاؤ۔ رگوناتھ نے دوسری صورت یہ بتائی کہ وہ اپنے عملیات کے ذریعے ڈاکٹر مارٹن کو مار ڈالے گا۔ رگوناتھ نے مجھ سے کہا تھا کہ کچھ عرصہ یہ سلسلہ چلے گا لیکن جیکسن کے غائب ہو جانے پر میں نے اس سے بات کی اور اسے بتایا کہ جیکسن بھی عامل ہے۔ تب اسے شک ہوا کہ کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے۔ پھر اس نے اسے عملیات کے ذریعے پتہ لگا لیا کہ عامل کہاں ہے اور یوں ہم یہاں آ پہنچے۔

’’کون ہے رگوناتھ؟‘‘ جیکسن نے اس سے پوچھا۔

’’یہیں ہے......اپنا کام کر رہا ہے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

اس وقت ڈاکٹر مارٹن نے اپنے منتر پڑھنا شروع کر دیئے لیکن اسے پتہ چل گیا کہ جس طرح اس نے جیکسن کی جادوئی طاقتوں کو ناکارہ بنا دیا تھا اسی طرح اس کی طاقتیں ناکارہ بنا دی گئی ہیں۔ وہ پریشان ہو گیا اور تیزی سے نینسی کی طرف بڑھا۔ اس نے نینسی کو اپنے قابو میں کر لیا لیکن اس وقت ڈیوڈ نے اس پر چھلانگ لگائی۔ وہ تینوں گر گئے ڈیوڈ کے اس پر گرنے سے ڈاکٹر مارٹن کے جادوئی منتر ختم ہو چکے تھے۔

ڈیوڈ نے ذرا سی کوشش کے بعد ڈاکٹر مارٹن کو قابو کر لیا کیونکہ ڈیوڈ اس سے زیادہ طاقتور تھا۔ اس وقت رگوناتھ اندر داخل ہوا۔ اس کی عمر پچاس سال تھی لیکن اس کی صحت قابل رشک تھی۔ اس نے عام سی پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا قد لمبا تھا۔

’’تم کون ہو؟‘‘ ڈاکٹر مارٹن نے اس سے پوچھا۔

’’مجھے رگوناتھ کہتے ہیں۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔‘‘ ڈاکٹر مارٹن نے اس سے غصیلے لہجے میں کہا۔

’’اب ایسی باتوں کو بھول جاؤ۔‘‘ رگوناتھ ہاتھ اٹھا کر بولا اور پھر اس نے ڈیوڈ کی طرف دیکھا۔ ’’ڈیوڈ!......اسے اچھی طرح پکڑے رکھ۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ ڈیوڈ بولا۔

رگوناتھ نے بڑبڑانے کے بعد فضا میں ہاتھ گھمایا تو ایک رسی اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ وہ ڈاکٹر مارٹن کی طرف بڑھا جیسے ہی وہ اس کے قریب پہنچا اس نے رگوناتھ کو لات مارنے کی کوشش کی لیکن رگوناتھ فوراً ایک طرف ہو گیا۔

ڈیوڈ نے ڈاکٹر مارٹن پر اپنی گرفت مضبوط کر دی اور پھر ذرا ہی دیر میں رگوناتھ نے ڈاکٹر مارٹن کو رسیوں سے باندھ کر ایک طرف ڈال دیا۔

ڈیوڈ، جیکسن کو کھولنے لگا۔

رگوناتھ نے کچھ پڑھ کر ڈاکٹر مارٹن پر پھونک ماری تو اسے آگ لگ گئی۔ اس کی فلک شگاف چیخیں فضاء میں بکھرنے لگیں۔

ذرا دیر میں وہ جل کر راکھ ہو گیا۔ فضاء میں اس کا جسم جلنے کی بو پھیل چکی تھی۔

’’چلو......اب اس کے سارے چیلوں پر سے اس کے جادوئی اثرات ختم ہو چکے ہیں اور وہ ڈیوڈ کی طرح ٹھیک ہو چکے ہیں۔ آؤ اب ہم چلیں۔‘‘

وہ سب چل پڑے۔ نینسی اور ڈیوڈ ایک دوسرے کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

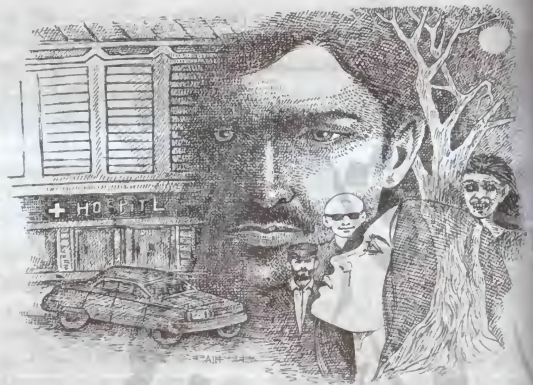

☠

انوکھی کہانی

عدنان علی-کراچی

ایک نوجوان لنگڑاتا ہوا سڑک پر جارہا تھا کہ ایک مست فقیر نے اسے آواز دی اور تربوز کھانے کی خواہش ظاہر کی نوجوان تربوز خرید کر لایا تو فقیر تربوز کھاتے کھاتے اس نوجوان کے زخم پر تربوز دے مارا تو......

اللہ والوں کے قدردان آفات وبلیات سے محفوظ رہتے ہیں جس کا ثبوت کہانی میں ہے

زندگی ایک پہیلی ہے اور اس پہیلی کو دنیا کے ہزاروں لاکھوں انسانوں نے حل کرنے کی کوشش کی اور کرتے کرتے دنیا سے چلے گئے۔

زندگی حادثات اور واقعات سے بھری ہوئی ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ اگلے لمحہ کیا ہونے والا ہے، ایک بہت معمولی ٹھوکر انسان کو موت کی وادی میں پہنچا دیتی ہے۔

ایک بے وقعت نظر آنے والی شے انسان پر خوش قسمتی کے دروازے کھول دیتی ہے۔

ایک بے کار نظر آنے والا آدمی توانائیاں دیتا ہے اور بڑے بڑے ڈاکٹر حکیم ناکام ہو جاتے ہیں، یہ زندگی ہے اس میں سب کچھ وہ نہیں ہوتا۔ جو نظر آتا ہے، کچھ نہ کچھ وہ ضرور ہوتا ہے جو کہ نظر نہیں آتا۔ یہ سارا کھیل نرالا ہے، یہ ہر کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔

نام تو اس کا گوہر تھا اور کام وہ ایک نہیں کرتا تھا،

راج مستری سے لے کر موٹر مکینک تک ہر کام کرلیا کرتا تھا، مگر وہ کہتے ہیں نا کہ ہر کام کا ماہر کسی کام کا ماہر نہیں ہوتا، بس کرلیتا ہے، تو گوہر بھی ایسے ہی تھا۔ جو کام ملا کرنے لگا، بجلی کی فیٹنگ کا کام ہوا تو کرنے لگا۔ دو چار دن کیا، کوئی مکان دوکان پر رنگ کرانے آ گیا تو وہ کرنے لگا، آج کل اس کے پاس بجلی کا کام تھا۔ اس کا م کے دوران اس کے پیر میں ایک کیل گھس گئی مگر وہ تو ازلی لاپرواہ آدمی تھا، اس نے اس کی ذرا پرواہ نہ کی اور کام کرتا رہا۔ پیر کا زخم ٹھیک نہ ہوا بلکہ روز بروز تکلیف میں اضافہ ہونے لگا چلنا پھرنا مشکل ہوگیا تو اس نے سوچا۔ ''اب تو ڈاکٹر کے پاس جانا ہی پڑے گا۔''

ڈاکٹر نے بتایا۔ ''میاں زخم بہت خراب ہوگیا ہے، کیل میں ضرور زنگ لگ گیا ہوگا اور اس نے تمہارے اندر کے گوشت کو گلا دیا ہے، اس کا پوری طرح علاج کراؤ، روز پٹی کراؤ، گولیاں کھاؤ اور چلنا پھرنا کم کرو، دس پندرہ دن ڈاکٹر کا علاج ہوتا رہا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔

اب تو یہ حالت ہوگئی کہ درد کے مارے رات بھر نیند نہ آتی، آخر تنگ آ کر جناح اسپتال میں داخل ہوگیا۔ جہاں پر بڑے بڑے ڈاکٹروں نے اس کے پیر کا معائنہ کیا اور اس کو بتایا کہ ''اگر زندگی پیاری ہے تو ٹانگ سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔''

گوہر، اس کی ماں اور بھائی پریشان ہوگئے، خود گوہر کی حالت بری ہوگئی اور ایک رات خاموشی سے وہ جناح اسپتال سے بھاگ آیا۔ گھر آ کر تو اس کی رات اور دن کی نیند اور چین اڑ گئے۔

مگر علاج تو کرنا تھا، جناح اسپتال کا ایک ڈاکٹر لانڈھی ٹوبی ایریا میں بیٹھتا تھا۔ گوہر نے اس سے پٹی کرانا شروع کردی اور روزانہ اس کے پاس جانے لگا۔ اس ڈاکٹر کا بھی یہ خیال تھا کہ ''پیر کا زخم اتنا بگڑ چکا ہے کہ اس کو ٹھیک ہونا مشکل ہے اگر پیر نہ کاٹا گیا تو پورا جسم اس زہر کے لپیٹ میں آجائے گا اور زندگی کے لالے پڑ جائیں گے۔''

مگر گوہر پیر کے کٹنے کے تصور سے کانپ جاتا تھا۔ وہ مرنا تو چاہتا تھا مگر لنگڑا ہونا نہیں چاہتا تھا۔

آج پھر ڈاکٹر نے اس کو کہا تھا کہ ''زندگی سے زیادہ پیاری ٹانگ نہیں ہوتی، زندگی بچاؤ۔'' مگر اس کا ذہن اس بات کو قبول نہیں کررہا تھا۔ وہ سخت مایوسی کی حالت میں اکیلا نڈھال قدموں سے لنگڑا لنگڑا کر سڑک پر چل رہا تھا۔

سڑک پر اکادکا لوگ چل رہے تھے۔ ایک پیڑ کے کنارے ایک کالا موٹا سا فقیر صرف ایک لنگوٹی باندھے بیٹھا تھا۔

فقیر نے آواز دی۔ ''میرے پاس آ! وہاں کھڑا کیا کررہا ہے؟''

گوہر آہستہ آہستہ اس کے قریب چلا گیا۔

فقیر بولا۔ ''تربوز کھاؤں گا، کھلائے گا بول۔''

گوہر نے کہا۔ ''تمہیں تربوز کی پڑی ہے، میں ایک قدم چل نہیں سکتا کہاں سے لاؤں تربوز؟''

''دیکھ وہ سامنے تربوز والا کھڑا ہے۔'' فقیر بولا۔

''تمہارا کہا تو ماننا پڑے گا۔'' گوہر بولا اور تربوز والے کی طرف چل پڑا۔

گوہر بہت لاپرواہ تھا کسی بات کو سنجیدہ نہیں لیتا تھا اس میں اس کے نقصانات بھی ہوتے تھے۔ مگر اس کی عادت ہی یہ تھی مگر فقیروں کو وہ بڑی اہمیت دیتا تھا، کسی کو دھتکارتا نہیں تھا۔

تربوز والے کے پاس وہ بڑی مشکل سے پہنچ پایا، اس نے ایک تربوز خریدا اور واپس آ گیا، تربوز فقیر کو دے کر کہا۔ ''لو تربوز۔''

فقیر مسکرایا اور بولا۔ ''اس کو دو کردے اور بیٹھ جا، دیکھ تربوز کیسے کھاتے ہیں؟''

گوہر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور زمین پر مار کر تربوز کے دو ٹکڑے کردیئے۔

فقیر نے تربوز کھانا شروع کردیا ایک ٹکڑا فقیر نے اٹھایا اور منہ اس کے اندر کر کے کھانے لگا۔

کھاتے کھاتے بولا۔ ''تیری ٹانگ میں پٹی کیوں بندھی ہے ذرا کھول کر دکھا۔؟''

''ارے بابا ابھی ڈاکٹر سے بندھوا کر آیا ہوں۔'' گوہر بولا۔

''کھول کر دکھا تو۔'' فقیر بولا۔

گوہر بولا۔ ''اچھا تم بھی دیکھ لو۔'' اس نے پٹی کھول دی زخم نظر آنے لگا۔

فقیر تربوز کھاتا رہا اور زخم کو دیکھتا رہا پھر اچانک اس نے ایک حرکت کی، جو تربوز وہ کھا رہا تھا وہ زور سے اس کے زخم پر دے مارا۔ گوہر کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے، مارے تکلیف کے اس کے آنسو نکل آئے، بڑی دیر کے بعد اس کے منہ سے نکلا۔ ''تم نے یہ کیا کردیا۔''

فقیر بولا۔ ''اب تو گھر جا، میں نے تربوز کھالیا، میں بھی جاتا ہوں۔'' فقیر اٹھا اور ایک طرف چل دیا۔

گوہر کو بھی گھر آنا ہی تھا اٹھ کر ایک رکشہ پکڑا اور گھر آ گیا۔ اب اس کے پیر میں درد کی وہ حالت نہیں تھی جیسی کہ ہوا کرتی تھی۔

ماں نے پوچھا۔ ''پٹی کرالی''

''ہاں کرالی۔'' گوہر نے ماں کو ٹالنے کو کہا اگر پوری بات بتاتا تو ماں اور سوالات کرتی۔

''اچھا روٹی کھالے۔'' ماں بولی۔

گوہر نے روٹی کھائی اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

پیر میں تکلیف کم تھی، اس کو نیند آ گئی، ہفتوں سے روٹھی نیند اس پر مہربان ہوگئی اور وہ بڑے سکون سے رات بھر سوتا رہا، سویرے بھائی نے ماں سے پوچھا۔

''آج گوہر کی آواز نہیں آ رہی، کیا سو رہا ہے؟''

''ہاں سو رہا ہے، آج سے پہلے رات کو جب بھی میری آنکھ کھلتی تھی اس کے کراہنے کی آواز آتی تھی، آج رات نہیں آئی۔''

''ذرا دیکھ تو کیا بات ہے؟''

شاکر اس کے بڑے بھائی نے یہ غیر متوقع بات سنی تو دوڑ کر گوہر کے کمرے میں گیا مگر گوہر بڑے سکون سے سو رہا تھا وہ دیکھ کر واپس آ گیا اور بولا۔

''اماں! وہ تو بڑے سکون سے سو رہا ہے، شاید اس کا زخم ٹھیک ہو رہا ہے۔''

اماں خوش ہو کر بولیں۔ ''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔''

''گیارہ بجے گوہر کی آنکھ کھل گئی۔ نیند پوری ہوئی تو اس کی پرانی تھکن بھی دور ہوگئی۔ اس نے زخم پر نظر ڈالی تو اوپر کھرنٹ آ گیا تھا مگر سرخی تھی، کسی قسم کی تکلیف کا احساس نہیں تھا۔ وہ کھڑا ہوگیا تب بھی اس کو درد نہیں ہوا، وہ ڈرتے ڈرتے چلا، پھر وہ تیز چلا، پیر بالکل ٹھیک تھا۔

وہ تیز چلتا ہوا اماں کے پاس گیا اور بولا۔ ''اماں میرا پیر ٹھیک ہوگیا دیکھو۔ میں چل پھر سکتا ہوں درد بھی نہیں ہو رہا، اور وہ آنگن میں دوڑنے لگا جیسے کوئی بچہ پہلی دفعہ بغیر سہارے چل رہا ہو اور خوش ہو رہا ہو۔''

ماں کا چہرہ بھی مارے خوشی کے دمک رہا تھا۔ ''میں ہمیشہ کہتی تھی مگر تو لاپرواہی کرتا تھا۔ ذرا سی تیری لاپرواہی نے تجھے کتنی تکلیف پہنچائی ہے، اب نہ کرنا ایسی لاپرواہی۔'' ماں بولی۔

''ہاں! اماں! اب نہیں کروں گا لاپرواہی۔'' وہ خوشی سے بولا۔

اس نے آج بہت دن کے بعد پیٹ بھر کر ناشتہ کیا اور شام کو ڈاکٹر کے پاس پیدل ہی چلا گیا۔

ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''اب کیا حال ہے؟''

''اب ٹھیک ہے۔'' گوہر بولا۔

''وقتی طور پر یہ سب ہے، تمہارے مرض کا آخری علاج وہی ہے جو جناح اسپتال والوں نے بتایا ہے۔'' ڈاکٹر بولا تو گوہر بات کاٹ کر بولا۔ ''یعنی میری ٹانگ کاٹ دی جائے۔''

''زندگی بچانے کو یہ سب کرنا پڑتا ہے، زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔'' ڈاکٹر بولا۔

''اور زندگی میں بہت کچھ صرف ایک بار ہوتا ہے۔'' گوہر نے کہا۔

''تم فلسفہ بول رہے، لاؤ ٹانگ دکھاؤ پٹی کردوں۔'' ڈاکٹر بولا۔

گوہر نے ٹانگ آگے کردی، ٹانگ پر پٹی نہیں تھی اور زخم کی جگہ صرف ایک سرخ دھبہ تھا۔

ڈاکٹر نے اپنا چشمہ پکڑ کر اس کا زاویہ درست کیا مگر جو وہ دیکھ رہا تھا، بات وہی حقیقت تھی۔

ڈاکٹر نے حیرت سے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے! کیا یہ سچ ہے جو میں دیکھ رہا ہوں؟“

گوہر بولا۔ ”ہاں یہی حقیقت ہے، ڈاکٹر صاحب کل تک میں ایک قدم نہیں چل سکتا تھا اور آج میں دوڑتا ہوا آیا ہوں۔“

”تعجب ہے! میری میڈیکل کی زندگی کا یہ انوکھا کیس ہے، تمہارے پیر میں ناسور تھا، اور اس کی جڑیں بہت گہری تھیں، آج اس کا نام نہیں ہے اور تم دوڑ رہے ہو۔“ ڈاکٹر حیرت سے بولا۔ ”میں نے کہا تھا ڈاکٹر صاحب کہ زندگی میں بہت سی چیزیں صرف ایک بار ملتی ہیں۔“ گوہر بولا۔

”مگر یہ حیرت انگیز واقعہ ہوا کس طرح یہ تو بتاؤ؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”میں زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں ہوں ڈاکٹر صاحب مگر میں نے زندگی کے اسکول میں جو، اب تک پڑھا ہے وہ یہ ہے کہ عقیدہ اور سائنس دو الگ الگ چیزیں ہیں اور دونوں کو الگ الگ ہی رہنا چاہئے۔ میں سخت لاابالی اور لاپرواہ قسم کا آدمی ہوں، بڑے بڑے معاملے کو بھی سنجیدہ پیرائے میں نہیں لیتا، جو کماتا ہوں خرچ کردیتا ہوں ایک کام نہیں کرتا، ایک جگہ ٹک کر کام نہیں کرتا، اگر بچ گیا تو ماں کو دے دیا، اسی لاابالی اور لاپرواہی کی سزا مجھے یہ زخم کی صورت میں ملی تھی، میں آپ سے پٹی کروا کر جا رہا تھا کہ مجھے ایک فقیر بیٹھا ملا اس نے مجھ سے تربوز کھانے کی فرمائش کی، میں ایک قدم نہیں چل پا رہا تھا مگر میں نے اس کے لئے تربوز خریدا اور اس کے پاس لے گیا۔ اور وہ تربوز کھانے لگا، کھاتے کھاتے اس نے زخم کے بارے میں پوچھا اور پھر اس نے زخم دکھانے کو کہا۔ میں نے پٹی اتار دی، اس کے بعد اس نے اپنے منہ کا کھایا ہوا تربوز میرے زخم پر زور سے دے مارا، میری تو جان ہی نکل گئی مگر حیرت کی بات یہ ہوئی کہ تکلیف میں افاقہ لگا۔ گھر آکر میں پرسکون نیند سو گیا جبکہ مدت سے میں سو نہیں پایا تھا۔“

ڈاکٹر یہ سن کر حیرت سے بولا۔

”جدید سائنس کے اس دور میں، میں بھی مادہ پرست انسان ہوں۔ مگر روحانیت اور رہبانیت کے اصولوں کو نہ ماننے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میں بھی جدید سائنس اور روحانیت کو الگ الگ رکھتا ہوں اس لئے تم مجھے بتاؤ کہ وہ بندۂ خدا کون تھا اور تم کو کہاں ملا تھا؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”آیئے میں آپ کو بتا دیتا ہوں مگر وہ وہاں پر ہوگا نہیں اس کا مجھے پورا یقین ہے۔“ گوہر بولا۔

ڈاکٹر نے کمپونڈر سے کہا۔ ”میں آدھے گھنٹے کو جا رہا ہوں۔“

اور گاڑی میں چند منٹ کے بعد دونوں اس درخت کے پاس کھڑے تھے۔

”وہ اس درخت کی جڑ کے پاس بیٹھا تھا اور یہاں بیٹھ کر اس نے تربوز کھایا تھا۔“

جو جگہ گوہر نے بتائی وہاں پر کچھ نشانات ایسے تھے کہ کوئی یہاں بیٹھا تھا۔

ڈاکٹر جڑ کے پاس بیٹھ گیا اور بولا۔ ”تم کتنے نصیب دار تھے کہ تم ایک اللہ کے نیک بندے سے مل لئے، میرے نصیب میں تو صرف یہ مٹی ہے۔“ اور ڈاکٹر نے وہ مٹی اٹھا کر اپنے رومال میں بھرنا شروع کردی۔

گوہر حیرت سے بولا۔ ”ڈاکٹر صاحب آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟“

”اس مرد کامل کا جسم اس مٹی سے ضرور لگا ہوگا۔ میرے لئے یہ بڑی کام کی چیز ہے، نہ معلوم کتنوں کا اس سے فائدہ ہوگا۔“ ڈاکٹر بولا۔

ڈاکٹر نے پیڑ کے پاس پڑی پوری مٹی سمیٹ لی اور پھر بولا۔

”مجھے دیکھ کر کون یقین کرے گا کہ میں جدید دور کا ایک سرجن ہوں مگر میرا عقیدہ مجھ سے یہ سب کروا رہا ہے۔ کاش! میں اس شخص سے مل پاتا اس سے ہزاروں انسانوں کو فائدہ ہوتا۔“ ڈاکٹر بولا۔

”اب آپ اس مٹی کا کیا کریں گے؟“ گوہر نے پوچھا۔

”میں اپنے عقیدے کے مطابق اس سے لوگوں کا علاج کروں گا۔“ ڈاکٹر بولا۔

”آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس سے فائدہ ہوگا؟“

”فائدہ یا نقصان دوا نہیں کرتی انسان کا یقین اور اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے، ڈاکٹر حکیم مریض کو یقین ہی دلاتے ہیں کہ تم یہ دوا استعمال کرو ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ ڈاکٹر بولا۔

”پھر دوا دینے کا کیا فائدہ صرف مشورہ دیا کریں؟“ گوہر بولا۔

”یقین دلانے کو بھی ایک ذریعہ درکار ہوتا ہے۔“ ڈاکٹر بولا۔

کچھ دن کے بعد گوہر مکمل تندرست ہو گیا، اس کو یاد بھی نہیں رہا کہ کبھی اس کی ٹانگ میں کچھ ہوا تھا، وہ پھر کام کرنے لگا مگر اس میں اتنی تبدیلی ضرور آگئی کہ وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

کے پی ٹی کے قریب اس نے ایک کیبن رکھ لیا اور لانچوں کے انجن مرمت کرنے لگا۔ روزانہ وقت پر وہ جاتا تھا، آہستہ آہستہ کیماڑی میں اس کا کام بڑھنے لگا، اس نے ایک بلوچ لڑکے کو ملازم رکھ لیا اور دونوں کام کرنے لگے۔

بیٹا کمانے لگا تو ماں کو بہو لانے کا خیال آنا لازمی تھا۔

ماں نے بہو دیکھنا شروع کردی، کئی لڑکیاں اس نے دیکھیں آخر ایک لڑکی پسند آگئی۔

بات آگے چلی بڑے بھائی نے اور ماں نے سارے معاملات طے کرلئے اور بات منگنی کرنے کی ہوگئی، مگر عین وقت پر لڑکی والوں کی طرف سے انکار ہو گیا۔ ماں اور بھائی کے ساتھ وہ بھی بڑا حیران ہوا اور بھائی پتہ کرنے لڑکی والوں کے گھر گیا تو اس کو پتہ چلا کہ گوہر کو انہوں نے ناپسند نہیں کیا ہے بلکہ بات مسلک کی ہے، وہ لوگ جس مسلک کے ہیں گوہر اور اس کے گھر والے اس کے خلاف ہیں اس لئے انہوں نے منگنی توڑ دی ہے، دونوں پارٹیاں اپنے اپنے مسلک پر سختی سے قائم تھیں۔

گوہر کو منگنی ٹوٹنے کا بہت صدمہ تھا، وہ آج کام پر بھی نہیں گیا۔ دوپہر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی، وہ دروازے پر گیا تو ایک ایک سفید داڑھی والا شخص کھڑا ملا، فقیر معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس نے پوچھا۔

”فرمایئے کیسے آنا ہوا؟“

بزرگ نے پوچھا۔ ”تمہارا نام گوہر ہے۔“

”ہاں میں ہی گوہر ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”تو پھر تم مجھے ایک گلاس پانی پلاؤ۔“ بزرگ نے فرمائش کی۔

گوہر اندر گیا اور پانی کی بجائے ایک گلاس شربت بنا کر لے آیا۔

بزرگ نے گلاس لیا اور ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر کے کہا۔ ”ایک گلاس اور پلا دو۔“

گوہر پھر اندر گیا اور ایک گلاس اور لے آیا۔

بزرگ نے وہ گلاس بھی خالی کردیا اور بولے۔

”پریشان ہے بتا کیا پریشانی ہے؟“

”میری منگنی ہوگئی تھی مگر پھر ٹوٹ گئی۔“

”تو وہیں شادی کرنا چاہتا ہے؟“ بزرگ نے پوچھا۔

”ہاں وہیں کرنا چاہتا ہوں۔“ گوہر نے جواب دیا۔

”ہو جائے گی۔“ بزرگ نے کہا اور چل دیئے۔

شام کو گوہر حیرت زدہ رہ گیا اس نے دیکھا کہ اس کے ہونے والے سسر آئے ہیں اور انہوں نے اپنے سابقہ رویہ کی معافی مانگی اور شادی کی تاریخ دے دی۔ یہ اتنا اچانک ہوا کہ سب ہی حیران رہ گئے اور پھر وقت مقررہ پر شادی ہوگئی۔

جن لوگوں کی رائے اور عقائد کمزور ہوتے ہیں وہ لوگ انکار کی پالیسی اختیار کرتے ہیں چنانچہ کسی کی عقل اور دماغ کی کمزوری کی علامت یہ ہے کہ فوراً انکار کردیا جائے مگر گوہر ہزار کمزوریوں کے باوجود عقائد کا بڑا مضبوط آدمی تھا۔ پیر فقیر کی قدر کرتا تھا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کی زندگی میں کچھ واقعات ایسے ہوئے جن کا تعلق فقیروں سے بنتا تھا۔ شادی کے بعد اس کی زندگی ایک لائن پر آ گئی تھی وہ اپنی دوکان پر جارہا تھا اور کام بھی آرہا تھا۔ دو آدمیوں کی روزی اس دوکان سے مل رہی تھی۔

کچھ لوگ دنیا میں ایسے ہوتے ہیں جو کہ ایک سیدھی راہ پر چلتے ہوئے زندگی گزار دیتے ہیں ان کی زندگی میں بہت کم موڑ آتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ جن کو ہر ہر قدم پر ایک نیا موڑ ملتا ہے، شاید انہی لوگوں میں گوہر کا شمار ہوتا ہے، شادی کے تین ماہ نہیں گزرے تھے کہ وہی بزرگ پھر آ گئے جن کو گوہر نے شربت پلایا تھا پہلے انہوں نے شربت پیا اور پھر بولے۔

"اب تو اپنے کیبن پر کام نہیں کرے گا، وہاں پر تیرا کام ختم ہوا۔"

"کیوں اور کیسے کی گنجائش نہیں تھی؟" گوہر نے جواب بھی نہیں دے پایا اور بزرگ چلے گئے۔

گوہر نے سوچا کیا دنیا میں میرا جیسا کوئی اور ہے جو اپنے احساسات اور اپنی سرگرمیوں میں بھی خود مختار نہیں، میں کوئی کام اپنی مرضی سے نہیں کرسکتا کیا؟ لگی روزی کو خود لات ماردوں، میں اکیلا تو نہیں، میں اس کام کو چھوڑنے کی وجہ کیا بتاؤں گا، بھائی اور ماں پھر سوچیں گے کہ میں پچھلی حرکتیں کرنے لگا ہوں، اب بھی مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں ہوا۔" اس نے ترازو کے ایک پلڑے میں ان مشکلات کو رکھ دیا اور دوسرے پلڑے میں بزرگ کے حکم کو رکھ دیا اور خود دور کھڑے ہو کر ترازو پر نظریں گاڑ دیں اور پھر اس نے دیکھا کہ بزرگ کے حکم پر پلڑا جھک گیا ہے۔

وہ اپنے کیبن پر گیا اور اپنے بلوچ نوکر سے کہا۔ "میں یہ کام بند کررہا ہوں آج کے بعد میں نہیں آؤں گا۔ میرا انتظار نہ کرنا اگر تو خود کرسکتا ہے تو کرتے رہنا۔"

ملازم یہ سن کر حیران ہوا اور بولا۔ "استاد پورا بات بتاؤ، کوئی تم کو منع کیا ہے تو بتاؤ ادھر کیماڑی میں ہمارا پورا خاندان ہے سب تمہارا ساتھ دیں گے۔"

"نہیں کچھ نہیں ہوا بس تم سمجھ لو کہ انسان جو پروگرام بناتا ہے اپنی زندگی کے لئے مگر وقت بھی کچھ پروگرام اس کے لئے بناتا ہے، انسان کے بنائے پروگرام دیرپا نہیں ہوتے مگر وقت کے بنائے پروگرام بڑے پکے ہوتے ہیں، میرے پاس اس ذریعہ آمدنی کے سوا کچھ نہیں ہے مگر میں اس کو چھوڑ رہا ہوں، اب یہ دیکھنا ہے کہ وقت نے میرے لئے کیا پروگرام بنایا ہے۔" گوہر نے کہا۔

"استاد تمہارا بات ہمارے سر پر زن سے گزر گیا کچھ سمجھ نہیں آیا۔" بلوچ بولا

"سمجھ میں تو میرے بھی نہیں آیا مگر مجھے خود ہی کرنا ہے جو حکم ہوا ہے۔" گوہر نے کہا۔

گوہر نے ملازمت حاصل کرنے کی کوششیں شروع کردیں اور کئی جگہ درخواستیں دے ڈالیں۔

آمدنی کے بند ہوتے ہی اس کی بھرپور ازدواجی زندگی کے تالاب میں لہریں اٹھنے لگیں، اس کو اندازہ تو پہلے ہی تھا کہ یہ سب ہوگا۔ "کیا سب لوگ اتنے ہی پابند ہیں کیا ان کی حرکات وسکنات کسی کے طابع ہیں؟" اس نے سوچا۔

وقت گزرتا رہا اس کی پریشانیاں بڑھتی رہیں بھائی اور بھابی کے ساتھ ماں کے طرز عمل میں بھی فرق آتا رہا وہ اسی پریشانی میں کلفٹن چلا گیا۔ مزار پر حاضری کے بعد سمندر کے کنارے دیوار پر بیٹھ گیا۔ اچانک اس کے سامنے وہی بزرگ آئے اور بولے۔

"پریشان ہے۔" گوہر نے ان کو دیکھا اور کہا۔ "میں نے حکم کی پابندی کی تھی۔"

"یہ زندگی کے انوکھے کھیل ہیں انسان کے دل میں ہزاروں خواہشات ہوتی ہیں یہ خواہشات اصل میں

انسان میں پیدائشی ہوتی ہیں، ان سے انسان جان نہیں چھڑا سکتا۔ خواہشات اگر پاک ہوں اور اتنی متبرک اور مقدس ہوں تو وہ ضرور پوری ہوتی ہیں۔" بزرگ نے کہا۔

"مگر میں دنیا میں ہوں۔ ازدواجی زندگی گزار رہا ہوں، میں دنیا میں رہ کر اس سے دوری کس طرح کرسکتا ہوں کچھ ذمہ داریاں مجھ پر ہیں۔" گوہر نے کہا۔

"درست کہا تم نے مگر تم یاد رکھو تمہارے دوست باضمیر ہیں تم پر ان کی نظر ہے، تم کو اگر کسی کام سے روکا گیا تو اس کی ضرور کوئی وجہ ہوگی اور اگر کرنے کو کہا گیا تو اس کی بھی وجہ ہے۔" بزرگ نے کہا۔

"میری ضروریات زندگی ہے، میں بھائی پر کب تک بوجھ بنارہوں گا۔" گوہر نے پوچھا۔

"تو کیا کرنا چاہتا ہے بتا؟" بزرگ نے پوچھا۔

"میں نے بہت درخواستیں دی ہیں کہیں سے جواب نہیں آیا۔"

"تو یہ بتا کہاں ملازمت کرنا چاہتا ہے؟" بزرگ نے پوچھا۔

"میں نے ریفائنری میں درخواست دی ہے۔" گوہر بولا۔

بزرگ نے زمین سے ایک پتھر اٹھایا اور کہا۔ "کل تو ریفائنری جائے گا اور یہ پتھر اس کے مین گیٹ پر دے مارے گا بس تیرا اتنا ہی کام ہے۔" اور بزرگ چلے گئے۔

گوہر دوسرے دن ریفائنری گیا اور اس نے بزرگ کا دیا ہوا پتھر دروازے پر زور سے مار دیا۔ پتھر لگتے ہی دو تین سیکورٹی کے بندے دروازے کے باہر آ گئے اور بولے۔ "یہ پتھر تم نے مارا ہے۔"

گوہر بولا۔ "ہاں میں نے ہی مارا ہے۔"

"آجاؤ اندر تمہارا نام گوہر علی ہے۔" سیکورٹی گارڈ نے پوچھا۔

"ہاں میرا یہی نام ہے۔" گوہر بولا۔

"اندر جاؤ منیجر صاحب نے تم کو بلایا ہے۔" گارڈ بولا۔

اور گوہر کی ملازمت اس کے انتظار میں تھی وہ ملازم ہوگیا۔

گاڑی پھر پٹری پر آ گئی۔ وہ روزانہ ڈیوٹی پر جانے لگا۔

ایک سال گزر گیا اب اس کی بیوی کو زچگی ہونے والی تھی۔ بیوی کی حالت نارمل نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے جواب دے دیا تھا کیونکہ بچہ الٹا تھا اور بڑا آپریشن ضروری تھا۔

گوہر کی آپریشن کروانے کی مرضی نہیں تھی۔

ڈاکٹرنی نے کہا۔ "اس فارم پر دستخط کردو تو میں آپریشن کردوں، تمہاری بیوی کی زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔"

گوہر اسپتال سے گھر نہیں آیا اور نہ اس نے فارم پر دستخط کیے وہ سیدھا کلفٹن چلا گیا۔ اور وہیں پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر میں وہی بزرگ آ گئے اور بولے۔

"کیوں پریشان ہوتا ہے؟ جا بیوی کے پاس اور سن مجھے مٹھائی نہیں کھلائے گا؟"

گوہر خوشی سے بولا۔ "ضرور کھلاؤں گا، میں یہی خوش خبری لینے یہاں آیا تھا۔"

"اس کا مطلب تھا تجھے پتہ تھا کہ تجھے یہاں خوش خبری ملے گی۔" بزرگ نے کہا۔

"میں الفاظ میں کیا بیان کروں مگر میرے اندر سے مجھے کوئی یہی کہہ رہا تھا۔" گوہر نے کہا۔

"انسان کسی بھی حقیقت کو اس وقت ہی تسلیم کرتا ہے جب حواس خمسہ کی تمام قوتیں اس کی گواہ ہو جائیں یہ یقین کی آخری منزل ہوتی ہے تم کو یقین تھا اور تم یہاں چلے آئے تمہارے یقین نے مجھے بتادیا کہ تم کیوں آئے ہو اور کیا سننا چاہتے ہو؟" بزرگ نے کہا۔

گوہر سیدھا اسپتال چلا گیا۔ لیڈی ڈاکٹر اس کو دیکھ کر خود اس کے پاس آ گئی اور غصے سے بولی۔

"تم نے فارم پر دستخط نہیں کیے اور چلے گئے، تمہاری بیوی زندگی اور موت کی کشمکش میں تھی، تم نے ذرا خیال نہیں کیا۔"

"مجھے پتہ تھا ڈاکٹر صاحبہ کہ ڈیلیوری نارمل ہوگی، کیا ایسا نہیں ہوا؟" گوہر نے کہا۔

"ہاں نارمل ڈیلیوری ہوئی، میری زندگی کا یہ پہلا کیس ہے کہ بچہ الٹا پیٹ میں ہو اور پیدا سیدھا ہو، تم کو کس طرح پتہ تھا کہ ایسا ہوگا؟"

"ڈاکٹر صاحبہ میڈیکل سائنس بہت کچھ جان گئی ہے، سرجری میں بہت آگے چلی گئی ہے، ہر قسم کی مشین آگئی ہیں، جسم کے اندر کی ہر چیز ڈاکٹر اسکرین پر دیکھ سکتا ہے مگر ڈاکٹر صاحبہ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی آپ حیران ہیں اس لئے ابھی بہت کچھ باقی ہے جو آپ کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ ابھی بہت کچھ آپ کو سیکھنا ہے مگر میرا یقین ہے کہ پھر بھی پورا علم آپ کو نہیں آئے گا۔" گوہر نے کہا۔

ڈاکٹرنی نے گردن ہلا کر اس کی بات کو تسلیم کرلیا اور بولی۔

"تمہاری کچھ باتیں سمجھ میں آتی ہیں اور کچھ میں نہیں سمجھ پائی۔"

"مادیت کے اس دور میں آپ ہی نہیں بہت لوگ نہیں سمجھ پاتے، انسان عقل کی ترقی پر پہنچ کر وحدانیت سے غافل ہو جاتا ہے، عقل انسان کو بہت کچھ سکھاتی ہے اگر میں یہ کہوں کہ عقل ہی انسان کو بھٹکاتی بھی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ عقل دوست بھی اور انسان کی دشمن بھی ہے۔

انسان عقل سے خود کو پہچانتا ہے تو اسی کے بل پر وجود سے انکار بھی کرتا ہے، وہ مادہ کی حقیقت کو تلاش کرتے کرتے خود مادہ پرست بن گیا ہے۔" گوہر نے کہا۔

ڈاکٹرنی نے پوچھا۔ "تم کون ہو، تم کو یہ باتیں کون بتاتا ہے؟"

"مجھے نہیں پتہ میرے اندر کچھ نہ کچھ ضرور ہے جو مجھے یہ باتیں بتاتا ہے۔" گوہر نے کہا۔

"تم نے مجھے زندگی اور موت دونوں کی کچھ باتیں بتائی ہیں، میں تم سے پھر بھی ملنا چاہوں گی۔" ڈاکٹرنی نے کہا۔

"مگر میرا ملنا بہت مشکل ہے، میں بڑا مشکل آدمی ہوں۔" گوہر بولا۔

"تم مشکل سے تو لگتے ہو اور خود بھی مشکلات میں نظر آتے ہو۔" ڈاکٹرنی نے کہا۔

"ہر شخص یوں تو کسی نہ کسی مشکل میں ہوتا ہے، سمندر اگر اوپری سطح سے پرسکون نظر آئے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے اندر طلاطم نہیں ہے، اس طرح انسان خود کو پرسکون سمجھتا ہے مگر اندر تو وہ بھی بڑے چھوٹے طوفان رکھتا ہے، کچھ نظر آجاتے ہیں اور کچھ نظر اس وقت آتے جب انسانی برداشت جواب دے جاتی ہے، بعض دفعہ ہمدردی کے چند الفاظ پورے طوفان کو باہر دھکیل دیتے ہیں۔" گوہر نے کہا۔

"تم نے زندگی کے اتنے سے دور میں زندگی کو خوب پڑھ لیا ہے۔" ڈاکٹرنی نے کہا۔

"ہر شخص زندگی کو پڑھتا ہے مگر سب کے مضامین الگ الگ ہوتے ہیں۔" گوہر نے جواب دیا۔

"تمہاری باتیں بہت گہری اور بہت سوں سے الگ ہیں۔" ڈاکٹرنی نے کہا۔

"میں دنیا کی نظر میں ایک ناکام اور بے کار آدمی ہوں مگر قدرتی طور پر مجھے کچھ رہبر ضرور ملے ہیں۔ ان کو پانے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔" گوہر نے جواب دیا۔

"کیا تم کسی ایسے ہی رہبر سے مجھے ملوا سکتے ہو؟" ڈاکٹرنی نے پوچھا۔

"میں نے بتایا ناں کہ کسی کو پانے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔" گوہر بولا۔

"مگر تم میرے لئے تو کچھ کر سکتے ہو۔" ڈاکٹرنی نے کہا۔

"شاید کچھ کرسکوں مگر یہ صرف نصیب کی بات ہوتی ہے۔ مگر آپ کو اس کی ضرورت کیوں ہے؟ آپ تو ایک کامیاب زندگی گزار رہی ہیں۔" گوہر نے کہا۔

"تم نے ابھی کہا ہے کہ سمندر کی اوپری سطح پر سکون ہو تو اندر بھی اس میں طوفان چھپا ہوتا ہے۔ مجھے

رہبر کی ضرورت کیوں ہے؟ میں کسی کو اس کے بارے میں بتلا نہیں سکتی مگر مجھے ضرورت ہے، تم میں کوئی نئی انوکھی بات نظر آئی تو میں نے تم سے کہا ہے۔" ڈاکٹرنی نے کہا۔

"میں وعدہ نہیں کرتا اگر کبھی زندگی میں ایسا موقع آیا تو میں تمہاری بات یاد رکھونگا۔" گوہر نے جواب دیا۔

زندگی ایک پٹری پر چلتی رہی۔ دس سال گزر گئے، اس دس سال میں اس پٹری پر کوئی موڑ نہیں آیا، کوئی برانچ لائن نہیں آئی مگر گوہر کے باغ میں کوئی پھول اور نہیں کھلا، آخر بیوی کے اصرار پر وہ پھر ڈاکٹرنی کے پاس گیا۔ ڈاکٹرنی نے بیوی کا اچھی طرح چیک اپ کیا اور بولی۔

"تمہاری بیوی نارمل ہے اولاد پیدا کرنے کے قابل ہے، اب تم کو اپنا بھی چیک اپ کرانا چاہئے، اولاد کے لئے دونوں فریقوں کا حصہ ہوتا ہے، تم کہو گے کے "میں پہلے اولاد پیدا کرنے کے قابل تھا، اب کیوں نہیں؟" تمہارا جواب ہوگا۔

"میں انسانی جسم کی وضع میں تبدیلی کو محسوس کرسکتی ہوں مگر اس تبدیلی کو روک نہیں سکتی اور اس تبدیلی کا تجزیہ بھی کرنا آسان نہیں ہے اگر تم میں کسی تبدیلی کا پتہ چلتا ہے تو تم کو صبر کرنا ہوگا اور اللہ کی رضا سمجھ کر اس کو قبول کرنا ہوگا حرف آخر یہ ہے کہ "قدرت کے معاملات میں کون دخل اندازی کرسکتا ہے۔" ڈاکٹرنی نے جواب دیا۔

"میں پھر اپنا چیک اپ نہیں کراؤں گا۔" گوہر نے کہا۔

"کم از کم تم کو یہ ضرور کرانا چاہئے۔" ڈاکٹرنی نے کہا۔

"اس سے میرا اعتماد چور چور ہو جائے گا۔" گوہر بولا۔

"مگر اس سے یہ بھی تو ہوگا کہ ایک عورت شک و شبہ سے دور ہو جائے۔" ڈاکٹرنی نے کہا۔

"مجھے اب اولاد کی ضرورت بھی نہیں، بیوی کے اصرار پر آگیا تھا۔" گوہر بولا۔

"تم مرد ہو عورت کے جذبات کو نہیں سمجھتے اولاد کے معاملے میں عورت دماغ سے کم اور دل سے زیادہ سوچتی ہے اس کی مامتا اس کے دماغ پر حاوی ہو جاتی ہے۔" ڈاکٹرنی نے کہا۔

"اللہ کی رضا سمجھ کر وہ اپنی ابلتی مامتا کو دبا نہیں سکتی۔ گوہر نے پوچھا۔"

"عورت بہت گہرا سمندر ہوتی ہے اس سمندر میں بہت کچھ ڈوب جاتا ہے اور سمندر کی اوپری سطح پر سکون رہتی ہے، اندازہ نہیں ہوتا کہ اندر کیا کچھ ہے مگر یاد رکھو بھولتی وہ کچھ نہیں، تم کو تمہاری بیوی جتنا جانتی ہے تم بھی شاید اپنے بارے میں اتنا نہ جانتے ہو گے۔" ڈاکٹرنی نے کہا۔ ڈاکٹر صاحبہ آپ کی کچھ باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔" گوہر نے کہا۔

"اچھا تم یہ بتاؤ میرا کام ہونے کے آثار کچھ ہیں۔" ڈاکٹرنی نے پوچھا۔

"کچھ کہا نہیں جاسکتا، میں نے بتایا تھا کہ میں خود سے کسی کو طلب نہیں کرتا اور نہ کرسکتا ہوں۔ آپ جو کچھ ہوتا ہے خود بخود ہوتا ہے مگر مجھے یہ یقین ضرور ہے کہ میری ملاقات پھر ہوگی، میں آپ کو یاد رکھوں گا۔"

گوہر کی اس کے بعد کوئی اولاد نہ ہوئی۔

وقت گزرتا گیا ایک ایک کر کے اس کے بال چاندی ہوتے گئے، چہرے پر عمر کی لکیریں گہری ہوتی گئیں، ماں کا انتقال ہوگیا۔

بھائی نے الگ اپنا گھر بنا لیا۔ اس کی ملازمت چلتی رہی دماغ ایک ٹھکانے پر آگیا۔ عمر نے اس میں تبدیلی پیدا کردی، اس کے چہرے پر عمر کے تجربے کے ساتھ بڑی سی داڑھی نظر آنے لگی۔ اس کا وقت ملازمت کے علاوہ کہیں گزرتا تھا تو وہ مسجد تھی۔ وہ نماز کے بعد بھی مسجد میں رہتا اور نہ جانے کون کون سی دعائیں پڑھتا رہتا۔

ایک دن وہ مسجد سے نکلا تو اس کے ساتھ ہی

ایک صاحب اور نکلے، مسجد سے باہر آ کر وہ اس کے سامنے کھڑے ہو گئے اور بولے۔ ”پہچانا نہیں۔“

گوہر نے غور سے دیکھا صبح کا اجالا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا گوہر ان کے قریب چلا گیا اور غور سے ان کو دیکھا اور ان کے گلے لگ گیا۔ جذبات اتنے امنڈ آئے کہ آواز بھر گئی اور الفاظ روانہ ہوئے۔ ان صاحب نے اس کی پیٹھ تھپکائی اور سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے۔

”اپنا فرض ادا کردے تیری لڑکی شادی کے قابل ہے، وقت کم ہے۔ میں شاید اب تیرے پاس نہ آسکوں۔ جب تو اس نیک کام کی طرف بڑھے گا تو اللہ برکت دے گا۔“ اور وہ ایک طرف چل دیئے۔

گوہر بت بنا کھڑا رہا اس کی آواز نہ نکلی کہ ان کو روک سکے قدموں نے ساتھ نہیں دیا کہ دوڑ کر پکڑے۔ وہ ان کو جاتا دیکھتا رہا۔

موذن صاحب نے مسجد کو تالا ڈالا اور گوہر کے قریب آ گئے۔ ”کیوں اکیلے کھڑے ہو گوہر صاحب؟“

”اکیلا کہاں ایک صاحب سے بات کر رہا تھا۔“ گوہر بولا۔

”آپ تو اکیلے کھڑے تھے آپ کے قریب تو کوئی نہیں تھا۔“ موذن اختر نے کہا۔

”آپ نے نہیں دیکھا ہوگا۔“ گوہر نے جواب دیا۔

”شاید ایسا ہی ہوا ہوگا۔ بعض اوقات انسان کو سامنے کی چیز نظر نہیں آتی اور بعض دفعہ بہت دور تک دیکھ لیتا ہے۔“ موذن نے کہا۔

”آپ نے درست کہا۔“ اور گوہر گھر کی طرف چل دیا۔

ناشتے کے بعد اس نے بیوی سے کہا۔

”بلقیس تم نے کسی لڑکے کا ذکر کیا تھا۔“

”شکورن آپا کئی بار آ چکی ہیں، لڑکا دیکھا بھالا ہے کسی فعل میں نہیں ہے، موٹر میکنک ہے اچھے پیسے کماتا ہے، تم ہاں کرو تو بات آگے چلے۔“ بیوی بولی۔

”تم نے دیکھ لیا تمہاری بہن کا بیٹا ہے میری طرف سے ہاں ہے مگر میں بات لمبی نہیں کروں گا اور منگنی کے چکر میں نہیں پھنسوں گا زیادہ سے زیادہ ایک دو ماہ میں شادی کرنا ہوگی۔“

”لو کہاں تو خاموش تھے اور کہاں اتنی جلدی ہو گئی۔ ارے تیاری کرنا ہوگی۔“ بیوی بولی۔

”تم فکر نہ کرو اللہ سب کردے گا میرے پاس وقت زیادہ نہیں ہے۔“

”کہیں جا رہے ہو کیا جو اتنی جلدی ہے۔“ بیوی بولی۔

”ہاں سب کو جانا پڑتا ہے جاتے سب ہی ہیں۔“ گوہر بولا۔

”پتہ نہیں کیا کہہ رہے ہو، میں شکورن آپا کو ہاں کردوں گی اور جو تم نے کہا ہے کہہ دوں گی۔“

دوسرے ہی دن لڑکی کی بارات کا دن مقرر ہو گیا۔

شکورن حیران تھی کہ گوہر کو آخر اتنی جلدی کیا پڑ گئی۔ مگر وہ تو پہلے سے ہی تیار تھی۔ اور زیادہ کچھ تیاری کی اس کو ضرورت نہیں تھی اس لئے اس نے اعتراض نہیں کیا۔ ایک مہینہ پورا نہیں گزرا تھا کہ گوہر کی لڑکی رخصت ہو گئی۔

گوہر نے بیوی سے کہا۔ ”اب میرا وقت پورا ہو رہا ہے، میرے بعد اپنا خیال رکھنا اور جو کچھ تیرے پاس ہے اور جو تجھے میری ملازمت کا فنڈ ملے اس کو دیکھ بھال کر استعمال کرنا۔“

اور بہت کچھ اس نے کہا مگر بیوی اس کی بات نہ سمجھی۔

ایک رات وہی آدمی پھر اس کے پاس آ گیا اور بولا۔

”بس اب تجھے جانا ہی ہے، میں بھی جا رہا ہوں۔ تو بھی جا۔“

اور سویرے اذان کے وقت گوہر کا انتقال ہو گیا۔ اور ایک انوکھی کہانی ختم ہو گئی۔ وہ بزرگ کون تھے گوہر پر کیوں مہربان تھے یہ راز راز ہی رہا۔

درندگی

ساجدہ راجا۔ ہنڈواں سرگودھا

اچانک درندہ صفت ظالم وحشی نے لڑکی کے پورے چہرے کی کھال چاروں طرف سے کاٹ ڈالی اور پھر پوری طاقت سے چہرے کی کھال چہرے پر سے ادھیڑ ڈالی، لڑکی کی درد ناک چیخوں نے پورے علاقے کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔

رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی ذہن پر خوف کی چادر ڈالتی لرزہ براندام کہانی

فون کی مسلسل بجتی گھنٹی نے مجھے اٹھنے پر مجبور کردیا۔ میں نے نیم وا آنکھوں سے وال کلاک کی طرف دیکھا لیکن سوائے اندھیرے کے کچھ نظر نہ آیا۔ آخر کار آنکھوں کو رگڑتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ فون مسلسل بج رہا تھا، وہ جو کوئی بھی تھا بہت ہی ڈھیٹ تھا ورنہ اب تک جواب نہ ملنے کی صورت میں ہمت ہار چکا ہوتا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا فون تک پہنچا اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

”ہیلو...... جی کون!“ میری آواز اب بھی نیند سے بوجھل تھی۔

دوسری طرف سے امی کی آواز سن کر میں نے حتی الامکان نیند کو دور بھگانے کی کوشش کی۔

”خیر تو ہے، امی! آپ نے صبح ہی صبح فون کیا؟“ میں نے لہجے میں تشویش سمونے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ امی ہر چھٹی والے دن لازمی فون کرتی ہیں اور میری صبح ان کے نزدیک دوپہر ہوتی ہے۔

”یہ صبح ہے؟ ٹائم دیکھا ہے تم نے؟ پورے گیارہ بج چکے ہیں اور تم اسے صبح کہہ رہے ہو، لوگ اپنی آدھی

دیہاڑی لگا چکے ہیں اور جناب کی صبح اب ہوئی ہے......" امی کی تیز آواز نے میرے سوئے ہوئے اعصاب کو ایک دم الرٹ کردیا۔

"سوری امی...... آپ تو جانتی ہیں کہ آج چھٹی ہے آفس کے لئے تو ہر روز اتنا جلدی اٹھنا پڑتا ہے، اب اگر میں چھٹی والے دن بھی جی بھر کے نہ سوؤں تو میں بیمار پڑ جاؤں گا اور اگر میں بیمار پڑ گیا تو پھر آپ کو پریشانی ہوگی۔" میں نے نان اسٹاپ بولتے ہوئے کہا۔

"توبہ ہے! ایک تو تم بغیر دیکھے شروع ہو جاتے ہو، میں نے تمہیں کچھ بتانے کے لئے فون کیا تھا اور تم نے وہ بات بھی ذہن سے نکال دی۔" امی نے یقیناً بولتے ہوئے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا ہوگا کیونکہ یہ امی کی بلکہ اکثر خواتین کی عادت ہوتی ہے۔ میں نے خیالوں میں امی کو دیکھا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"جی امی بتائیں کیا بات ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"بیٹا ہم نے سرمد کی تاریخ طے کردی ہے، انشاء اللہ! اگلے جمعہ کو بارات ہے، تم اب جلدی سے چھٹی لے کر آجاؤ......" امی نے مجھے اپنی بات سے آگاہ کیا جسے سن کر میں بہت خوش ہوگیا۔

"ٹھیک ہے امی! میں کل ہی چھٹی کے لئے درخواست دے دوں گا۔" میرے لہجے سے بھرپور خوشی جھلک رہی تھی جسے سن کر امی بھی خوش ہوگئیں۔ میں نے مزید چند ایک باتیں کرنے کے بعد فون بند کردیا۔ میرا ارادہ مزید سونے کے بجائے شاور لے کر ناشتہ تیار کرنے کا تھا اس لئے میں واش روم کی طرف بڑھ گیا......

میں ایک سرکاری جاب کرتا تھا اور میرا ٹرانسفر لاہور ہوگیا تھا۔ مری کی دلکش اور ٹھنڈی فضاؤں سے نکل کر لاہور کی گرمی میں آنا میرے لئے بہت بڑا مسئلہ تھا۔ میں کہاں اتنی گرمی برداشت کرسکتا تھا لیکن ہائے یہ نوکری......! کسی نہ کسی طرح میں نے خود کو ایڈجسٹ کر ہی لیا۔ اور بڑے بھائی کی شادی کی خبر نے لاہور کی گرمی میں خوشگوار سی ٹھنڈک پیدا کردی۔

دوسرے دن میں نے آفس پہنچتے ہی باس کو چھٹی کی درخواست بھجوادی تو حسب توقع فوراً میرا بلاوہ آگیا۔ میں دل میں "جل جلال تو" کا ورد کرتے ہوئے باس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ان کے غصے سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ میرے آفس کولیگز کے چہروں پر بکھری مسکراہٹ میرے حوصلے کو مزید پست کررہی تھی۔ آفس میں قدم رکھتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ باس واقعی غصے میں تھے لیکن ان کا غصہ بھی ایک غبارے کی مانند تھا کہ جیسے ہی اس میں کانٹا چبھویا جائے ساری ہوا خارج ہو جاتی تھی......

ایک اور بات بھی تھی کہ باس کو رنگ گورا کرنے کا بہت شوق تھا جہاں کوئی نسخہ ہاتھ لگا کسی کریم لوشن کا اشتہار پڑھا فوراً خریدنے پر آمادہ...... بھانت بھانت کی کریمیں استعمال کرنے کی وجہ سے ان کے چہرے پر دانے سے نکل آئے تھے اور مجھے معتبر ذرائع سے پتہ چلا کہ باس آج کل ان دانوں کی وجہ سے بہت پریشان ہیں، سو میرے ذہن نے فوراً ایک ترکیب سوچ لی، آخر ان کا غصہ بھی تو کم کرنا تھا، میں نے دروازے میں کھڑے ہوکر اندر آنے کی اجازت مانگی......

اجازت ملنے پر میں مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا میز کے نزدیک پہنچا اور سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ نہ جانے باس اب کیا کہتے ہیں؟

"سنا ہے روحان صاحب کو چھٹی چاہیے۔" باس کے لہجے کا طنز مجھے صاف محسوس ہوا......

"جی...... جی سر...... وہ دراصل...... میرے بھائی کی شادی ہے تو اس سلسلے میں......" میرے لہجے کی ہکلاہٹ صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

"ہوں...... شادی آپ کے بھائی کی ہے اور چھٹی کی جلدی آپ کو ہے ابھی تو بہت سے دن پڑے ہیں اور آپ کو آفس جوائن کئے زیادہ سے زیادہ ایک ماہ ہوا ہے اگر ابھی سے آپ نے اتنی چھٹیاں کرنی شروع کردیں تو آپ آگے کیا خاک کارکردگی دکھائیں گے......!!" باس باتیں بنانے میں ماہر تھے۔

"وہ دراصل...... بھائی کے ساتھ ایک مسئلہ ہے اس وجہ سے مجھے پہلے جانا پڑ رہا ہے......" میں نے ذہن میں فوراً سارا منصوبہ سوچ لیا تھا اور اس پر فوری عمل بھی ضروری تھا۔ باس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ چھٹی ہی نہ دیتے......

"کیا آپ اس مسئلے کی وضاحت کرنا پسند کریں گے؟" طنز میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا......

"سر! انہوں نے کچھ عرصہ پہلے ایک کریم استعمال کی تھی رنگ گورا کرنے کی۔" میں نے کن انکھیوں سے باس کے تاثرات کا جائزہ لینا چاہا اور حسب توقع وہ فوراً متوجہ ہوگئے۔

"لیکن اس کریم کے کچھ سائیڈ ایفیکٹس تھے جونہی انہوں نے وہ کریم استعمال کی ان کے چہرے پر سرخ سرخ دانے نکل آئے۔" باس تقریباً اپنی کرسی پر سے اچھل پڑے......

"تو...... تو پھر کیا ہوا؟" انہوں نے اپنی آواز کو نارمل رکھنے کی بھرپور کوشش کی لیکن بے چینی ظاہر ہو ہی گئی...... مجھے ہنسی آنے لگی لیکن میں نے بڑی مشکل سے کنٹرول کیا......

"اب چونکہ بھائی کی شادی بہت قریب ہے اور دانے ابھی تک ختم نہیں ہوئے تو امی بہت پریشان ہیں، انہوں نے کہا ہے کہ میں فوراً چھٹی لے کر آجاؤں تاکہ بھائی کو کسی اچھے سے جلدی امراض کے ڈاکٹر کو دکھاؤں تاکہ شادی کے وقت وہ ان دانوں کی وجہ سے عجیب نہ لگیں......"

میں نے چہرے پر زمانے بھر کی مسکینی طاری کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے روحان تم جاسکتے ہو لیکن میری ایک شرط ہے؟" باس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا سر؟" میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھا حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ ان کی شرط کیا ہوگی......!

"اگر تمہارے بھائی کا چہرہ ٹھیک ہوگیا تو تم مجھے ضرور بتاؤ گے تاکہ میں بھی اپنا علاج کرسکوں...... تم جانتے ہو کہ میرے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔" باس کا غصہ اڑن چھو ہو چکا تھا۔

"جی سر! ضرور" اتنا کہنے کے بعد میں فوراً کمرے سے نکل آیا، کہیں باس کا ارادہ بدل نہ جائے۔ اپنی نشست پر پہنچتے ہی میرا کنٹرول ختم ہوگیا اور میں زور سے ہنسنے لگا۔

دوسرے دن میں نے جلدی جلدی تیاری شروع کردی اور سامان اٹھا کر بس اسٹاپ کی طرف چل پڑا۔ میری خوش قسمتی جو بعد میں بدقسمتی میں تبدیل ہوگئی کہ مجھے ایسی بس میں جگہ مل گئی جو جانے کے لئے بالکل تیار تھی۔ بس ایئرکنڈیشنڈ تھی بس کے اندر پہنچتے ہی مجھے لگا جیسے میں تپتے صحرا سے جنت میں آگیا ہوں۔ میں نے خالی سیٹ دیکھ کر اپنا بیگ اس پر پھینکا اور خود بھی بیٹھ گیا ابھی مجھے بیٹھے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ مجھے ایک مترنم سی آواز سنائی دی۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں اگر آپ کو سامان اٹھانے کی زحمت نہ ہو تو؟" میں فوراً الرٹ ہوگیا وہ جو بھی تھی بہت خوب صورت تھی میری نظریں اس کے چہرے پر پڑیں تو واپس آنا بھول گئیں۔

"ہوں......" اس نے کھنکھارتے ہوئے مجھے متوجہ کیا تو میں جیسے ہوش کی دنیا میں واپس آگیا۔ میں نے جلدی سے بیگ اٹھا کر گود میں رکھا تو وہ جلدی سے بیٹھ گئی، میں مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ تھا اور مجھے اردگرد کا کوئی ہوش نہیں تھا......

کب گاڑی روانہ ہوئی مجھے کچھ خبر نہ ہوسکی۔ اس نے میری نظروں کا ارتکاز محسوس کیا اور ناگواری سے بولی!

"مسٹر آپ کو اور کوئی کام نہیں جو یوں دیدے پھاڑ کر میری طرف دیکھ رہے ہیں؟"

"خاصی منہ پھٹ ہے" میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا لیکن اس کی سماعت بھی بہت تیز تھی، بولی "آپ نے کیا کہا......"

"جی...... جی کچھ نہیں، میں تو بس اتنا ہی بول پایا تھا......؟ اور میرا جملہ مکمل ہوا تھا کہ وہ اچانک پھٹ پڑی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ میں بھلا کیوں مرنے

لگی اور یہ دوسروں سے آپ کی کیا مراد ہے؟ میں آپکو جانتی تک نہیں اور آپ میرے مرنے کی باتیں کرنے لگے...... ابھی تو میں نے زندگی میں کچھ بھی نہیں دیکھا...... اللہ نہ کرے کہ ابھی میں مروں......" وہ بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی اور میں اس وقت کو کوس رہا تھا جب میں نے یہ سوال پوچھا تھا......

"دیکھئے محترمہ! میں اس مرنے کی بات نہیں کر رہا میں تو مری شہر جانے کی بات کر رہا ہوں......" میں نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"تو یوں بولیں نا، میں واقعی مری جا رہی ہوں اور میرا نام محترمہ نہیں بلکہ عزہ ہے...... عزہ خان......" اس نے یوں گردن اکڑائی جیسے اس ملک کی پرائم منسٹر ہو......

"اور میرا نام روحان ہے۔ روحان خان......" جواباً میں نے بھی اسی کی طرح گردن اکڑائی، کچھ دیر وہ مجھے غور سے دیکھتی رہی اور پھر قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ "بہت خوب روحان صاحب! آپ واقعی دل چسپ آدمی ہیں اور پھر میری طرح خان بھی ہیں تو کیوں نہ دوستی کر لیں؟ میں بھی کسی کا ادھار رکھنے کا قائل نہیں ہوں......" اس نے مسکراتے ہوئے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا تو میں گڑبڑا گیا۔ دراصل اس کی ہنسی اتنی پیاری تھی کہ میں اس کے سحر میں ڈوب گیا تھا۔

"بالکل جناب! یہ تو ہماری خوش قسمتی ہوگی کہ اتنی حسین خاتون ہمیں دوستی کی آفر کر رہی ہیں......" میرا ازلی اعتماد لوٹ آیا تھا اور وہ دل چسپ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کے بعد باتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا اس کے بقول......

وہ تعلیم کے سلسلے میں لاہور میں مقیم ہے اور اس کی رہائش گرلز ہوسٹل میں ہے اس کا خاندان روایتی پٹھان نہیں بلکہ بہت روشن خیال لوگ ہیں اور لڑکیوں کی تعلیم کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ پھر میں نے بھی مختصر لفظوں میں اسے اپنی جاب اور خاندان کے بارے میں بتا دیا۔

بس سے باہر رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا لیکن ہم باتوں میں اس قدر مگن تھے کہ ہمیں اردگرد کا کوئی ہوش نہیں رہا۔ پتہ تو اس وقت چلا جب بس ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ہم نے حیران نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کیونکہ مری تو ابھی بہت دور تھا اور بس راستے میں کہیں بھی نہیں رکی تھی۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو چاند کی روشنی میں بس اتنا ہی نظر آسکا کہ وہ کوئی بہت ویران سا علاقہ تھا، اونچے نیچے درخت بھوتوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے اور جا بجا پھیلی جھاڑیاں عجیب وحشت سی پیدا کر رہی تھیں۔ میں نے ادھر سے نگاہ ہٹا کر بس میں دیکھا تو سب لوگ یہی جاننے کی جستجو میں تھے کہ بس کے رکنے کی کیا وجہ ہے؟

"روحان کیا ہوا؟ یہ بس کیوں رک گئی؟ کیا کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے؟" عزہ کی آواز پر میں نے اس کی جانب دیکھا تو وہ سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھ رہی تھی......

"مجھے کیا پتہ؟ ویسے لگتا تو ہے کہ کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے ورنہ اس ویران علاقے میں رکنے کا کوئی جواز نہیں ہے......" میں نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر نظریں جما دیں...... کنڈیکٹر اور ڈرائیور دونوں نیچے اتر گئے تھے شاید خرابی چیک کرنے کے لئے، بہت دیر ہو گئی لیکن وہ دونوں واپس نہیں آئے۔ بہت سے لوگوں نے نیچے جانے کا ارادہ کیا تو میں بھی اپنی سیٹ سے اٹھ گیا۔ ہم سب مل کر باہر آگئے لیکن باہر آکر ایک بہت ہی پریشان کن صورتحال ہماری منتظر تھی...... ڈرائیور اور کنڈیکٹر دونوں غائب تھے۔ ہم نے انہیں بہت تلاش کیا لیکن وہ کہیں نہ ملے...... پہلے ہم نے سمجھا کہ شاید رفع حاجت کے لئے جھاڑیوں کی طرف گئے ہونگے لیکن ہر جگہ تلاش کرنے کے باوجود وہ کہیں نہ ملے...... ہم تو بہت پریشان ہو گئے اس ویران علاقے میں بس کی خرابی اور پھر ان دونوں کا غائب ہونا...... ہمیں کسی اور ہی طرف سوچنے پر مجبور کر رہے تھے لیکن اپنے شک کا اظہار ہم نے ایک دوسرے سے نہیں کیا، سب ہی ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔ خواتین کو ہم نے باہر نہیں آنے دیا اور نہ ہی انہیں کچھ بتایا کیونکہ خواتین ویسے ہی کم زور مخلوق ہوتی ہیں وقت سے پہلے واویلا شروع کر دیتی ہیں...... ابھی ہم اسی مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ

اچانک بس زور زور سے ہلنا شروع ہو گئی لیکن وہ زلزلہ ہرگز نہیں تھا کیونکہ ہمارے قدموں کے نیچے کی زمین بالکل ساکت تھی۔

خواتین چیخ و پکار کرتی ہوئی بس سے باہر آگئیں۔ عزہ سیدھی میری طرف آئی اس کے چہرے پر بھی پریشانی کے تاثرات تھے میں نے اسے حوصلہ دیا کہ فکر کی کوئی بات نہیں...... بس اب ساکت ہو چکی تھی ہم نے خواتین کو حوصلہ دیا اور انہیں دوبارہ بس میں بھیج دیا اور اس وقت ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی......

خواتین نے بس کے اندر قدم رکھا تو وہ پھر ہلنا شروع ہو گئی، خواتین نے اندر جانے سے انکار کر دیا، ہم نے اندر جا کر اپنے بیگوں کو اٹھایا اور باہر آگئے۔

حیرت انگیز طور پر جیسے ہی ہم سب باہر آتے بس ساکت ہو جاتی، نہ جانے کیسا طلسم تھا؟ بس کا خراب ہونا، پھر ڈرائیور اور کنڈیکٹر کا غائب ہونا اور پھر بس کا ہلنا، ہمیں یقین دلا چکا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہے ضرور...... عزہ تو میرے بازو سے چمٹی ہوئی تھی، دوسری خواتین کا بھی بدحواسی والا حال تھا......

میں نے گھڑی میں ٹائم دیکھا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے یعنی پوری رات گزارنے کے لئے ہمیں کوئی محفوظ ٹھکانہ چاہیے تھا۔ سڑک پر تو رات نہیں گزاری جا سکتی تھی...... اور ویسے بھی آسمان بادلوں سے بھرا پڑا تھا کیا پتہ کب برس پڑے۔ سب مردوں نے فیصلہ کیا کہ خواتین یہیں ٹھہریں اور وہ کوئی ٹھکانہ تلاش کرتے ہیں لیکن عورتوں میں سے کوئی بھی اکیلی رہنے پر رضامند نہ ہوئی مجبوراً انہیں بھی ساتھ لے جانا پڑا...... ہمارا رخ سڑک سے دائیں جانب تھا وہاں بظاہر تو کوئی پناہ گاہ نظر نہیں آرہی تھی لیکن امید تھی کہ شاید آگے جا کر کوئی جگہ مل جائے۔ جھاڑیوں سے الجھتے اور اونچے نیچے درختوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہم آگے کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ چاند کبھی بادلوں کی اوٹ میں ہو جاتا اور کبھی اپنی پراسراری روشنی بکھیرنے لگتا۔ سب لوگ ایسے خاموشی سے چل رہے تھے جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ عزہ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور ہم جھاڑیوں میں احتیاط سے چلتے جا رہے تھے۔

چلتے چلتے اچانک میرا پاؤں کسی چکنی سی چیز پر سے پھسلا، میں نے فوراً اپنے موبائل کی لائٹ اس پر ماری تو میرے ہوش اڑ گئے جب کہ عزہ کی چیخ نے سب کے دلوں کو سہا دیا تھا۔

بات ہی کچھ ایسی تھی وہ چیز جس پر سے میرا پاؤں پھسلا، وہ کچھ اور نہیں بلکہ ہماری بس کے ڈرائیور کا چہرہ تھا...... یعنی چہرے کی کھال سے مبرا کھوپڑی تھی۔ پاس ہی چہرے کا اوپر والا حصہ پڑا تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے نہایت مہارت سے ماتھے، کانوں اور ٹھوڑی کے پاس تک کا حصہ کاٹ ڈالا تھا۔ عام لفظوں میں اسے چمڑے کا ماسک بھی کہہ سکتے ہیں۔ تمام لوگوں کے جسموں میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ ہم اس ڈرائیور کی اذیت کا اندازہ بخوبی کر سکتے تھے، اس کا بے جان جسم ایک طرف پڑا تھا اس کے مسخ شدہ چہرے کی طرف دیکھنا ممکن نہیں تھا، نہ جانے کس سوچ کے تحت میں نے وہ ماسک اٹھا لیا......

مجھے شدید کراہیت محسوس ہوئی لیکن میں نے پھر بھی اسے پھینکا نہیں...... "خدا کے لئے روحان اسے پھینک دو، مجھے وحشت ہو رہی ہے......" عزہ میرے کندھے سے لگی تھر تھر کانپ رہی تھی، لیکن میں نے اس کی بات نہیں مانی، تھوڑی دور جا کر ہمیں کنڈیکٹر کی بھی لاش مل گئی لیکن اس کی حالت بھی پہلے والی سے مختلف نہیں تھی، اس کے چہرے کا چمڑا بھی غائب تھا...... سب لوگ بہت ہراساں تھے اور آنے والے وقتوں سے لرزیدہ...... "نہ جانے آگے ہمارے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔"

وہ کون تھے جنہوں نے ان دونوں کی یہ حالت کی تھی؟ اور حیرت کی بات تو یہ تھی کہ ہمیں ان کی چیخ بھی سنائی نہیں دی تھی۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ ہم ضرور کسی بہت بڑی مصیبت میں پھنس چکے ہیں۔

بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ واپس گاڑی کی طرف چلنا چاہیے حالانکہ خطرہ تو وہاں بھی موجود تھا۔ ابھی ہم کچھ طے نہ کر پائے تھے کہ ہمیں چاند کی مدھم روشنی میں ایک عمارت نظر آئی۔ ہم نے اسی طرف جانے کا ارادہ کیا،

کچھ دیر بعد ہم اس عمارت کے بالکل سامنے تھے۔ وہ عمارت اسی ماحول کی طرح نہایت پراسراری لگ رہی تھی بہت بدنما کسی کھنڈر کی مانند...... لیکن بہر حال کچھ تو ٹھکانہ کرنا تھا اس لئے ہم نے اندر جانے کا فیصلہ کرلیا۔

میں نے احتیاطاً اپنے بیگ سے خنجر نکال لیا تھا، اس کو بیگ میں رکھتے وقت مجھے قطعاً اندازہ نہ تھا کہ مجھے اس کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے لیکن اب ایک ہتھیار کے طور پر یہ میرے پاس تھا، میں نے اس کو مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا، مجھے اپنے ساتھ ساتھ عزہ کی بھی حفاظت کرنی تھی۔ میں سب سے آگے آگے تھا اور باقی لوگ میری پیروی میں چل رہے تھے۔

عمارت میں جا بجا گندگی کے ڈھیر لگے پڑے تھے۔ کچھ لوگوں کے پاس ٹارچیں بھی تھیں جنہیں وہ روشن کر چکے تھے۔ عموماً ہم دیکھتے ہیں کہ اس طرح کی ویران عمارتوں میں چمگادڑوں کا بسیرا ہوتا ہے لیکن اس عمارت میں کوئی چمگادڑ نہیں تھی اور سب سے عجیب بات کہ جب سے ہم اس ویران علاقے میں بھٹک رہے تھے ہم نے کوئی جاندار حتیٰ کہ حشرات الارض تک کی آواز تک نہیں سنی تھی، یہ بہت پراسراری بات تھی...... میں سارے کمروں کو کھول کر دیکھنے لگا کہ کہاں رات گزارنا بہتر ہوگا لیکن سارے کمرے ایک ہی طرح تھے گندگی سے بھرے ہوئے اور ان میں عجب سی وحشت تھی لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا اس لئے ہم نے ایک کمرے کی صفائی کر کے اس میں اپنا سامان رکھا اور خود بھی بیٹھ گئے میرے دماغ میں بہت سی باتیں چلنے لگیں لیکن ان میں سے کسی کا جواب میرے پاس نہیں تھا......

پیدل چل چل کر بہت تھکن محسوس ہو رہی تھی لیکن ہم میں سے کوئی بھی سونا نہیں چاہتا تھا اور سب سے اہم بات جو میں نے محسوس کر کے سکون کا سانس لیا کہ ہمارے درمیان کوئی بھی چھوٹا بچہ نہیں تھا ورنہ بہت پریشانی ہو جاتی۔

عزہ بہت خوف زدہ تھی لیکن زبان سے وہ کچھ کہہ نہیں رہی تھی میں نے اس سے کہا کہ وہ آرام لے میں تمہارے پاس بیٹھا ہوں پہلے تو وہ نہ مانی لیکن پھر سونے کے لئے لیٹ گئی...... لیکن سونے سے پہلے اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا جیسے کہیں میں اس کی بے خبری میں بھاگ نہ جاؤں...... وہ سو چکی تھی اور میں اس کی اس حرکت پر مسکرانے لگا...... خنجر ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ باقی لوگ بھی اونگھ رہے تھے۔ اچانک مجھے باہر سے آہٹ کی آواز آئی میں نے عزہ کا ہاتھ آہستہ سے نیچے رکھا اور آہستگی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا میں نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور جو کچھ میں نے دیکھا اس نے میرے ہوش اڑا دیئے۔ وہ تعداد میں سات، آٹھ تھے ان کے چہرے بہت بھیانک لگ رہے تھے ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے چہرے پر کھال نہ ہو بلکہ سوکھا ہوا گوشت جو ہڈیوں کے ساتھ چپک گیا ہوا اور آنکھوں کی جگہ بڑے بڑے گڑھے تھے لباس ان کے جسم پر جھول رہے تھے وہ آہستہ آہستہ اسی کمرے کی طرف آرہے تھے جہاں ہم نے پناہ لی ہوئی تھی۔

میرے دماغ میں فوراً یہ بات آگئی کہ یہ وہی ہوں گے جنہوں نے ہماری گاڑی کے ڈرائیور اور کنڈیکٹر کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور وہ بھی نہایت وحشیانہ طریقے سے...... میں نے فوراً سے پیشتر اس بوسیدہ کمرے کے دروازے کو بند کر دیا اور سب کو اشارے سے خاموش رہنے کی تلقین کی...... کمرے میں سوئے ہوئے سارے لوگ اب بیدار ہو چکے تھے اور سمجھ چکے تھے کہ باہر یقیناً کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہے...... عورتوں کی حالت خاص کر بہت بری تھی میں نے آنکھوں آنکھوں میں عزہ کو حوصلہ دیا۔

آہٹیں اب بہت قریب محسوس ہو رہی تھیں اور پھر بالکل دروازے کے پاس آکر رک گئیں۔

میں نے سب کو خاموش رہنے کے لئے کہا اور خود دروازہ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا ایک دو آدمی اور بھی آگئے اور دروازے کے آگے جم کر کھڑے ہو گئے۔ بہت دیر تک وہ زور لگاتے رہے لیکن دروازہ نہیں کھلا اور پھر اچانک خاموشی چھا گئی، اتنی خاموشی کہ ہمیں اپنے دل کی دھڑکن تک سنائی دینے لگی نہ جانے مجھے کیوں لگنے لگا کہ اس خاموشی کے بعد کوئی بہت بڑا طوفان آنے والا ہے اور میرا خدشہ درست ثابت ہوا۔

وہ کمرہ جس میں ہم موجود تھے زور زور سے ہلنے لگا بالکل اسی طرح جس طرح وہ بس ہلنے لگی تھی، ہمیں اپنی موت سامنے دکھائی دینے لگی اگر ہم اندر رہتے تو یقیناً اس کمرے میں دفن ہو جاتے اور اگر باہر نکلتے تو ان بھیانک آدمیوں کے ہتھے چڑھ جاتے جو ہمارا چہرہ مسخ کر کے موت سے دوچار کر دیتے...... کمرے کے ہلنے میں شدت پیدا ہو چکی تھی اور پھر چھت اور دیواروں میں دراڑیں پڑنا شروع ہو گئیں...... اور سیمنٹ اکھڑ، اکھڑ کر ہم پر گرنے لگا قریب تھا کہ کمرے کی چھت گر پڑتی ہمارے لئے دروازہ کھول کر باہر نکلنا ضروری ہو گیا میں نے عزہ کا ہاتھ پکڑا اور اللہ کا نام لے کر دروازہ کھول دیا...... سب جلدی سے باہر نکل آئے وہ باہر موجود نہیں تھے لیکن تھے اسی عمارت میں، سب جلدی جلدی اور آس پاس دیکھتے ہوئے چل رہے تھے۔

میں اور عزہ سب سے آگے تھے اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ سب سے آخر میں موجود لوگوں کی نہایت دل خراش چیخیں ہمیں سنائی دیں...... یقیناً وہ بے چارے ان کے ہتھے چڑھ گئے تھے اور ان کا حشر بھی ڈرائیور لوگوں کی طرح ہونے والا تھا۔ میں دل میں ان کی اذیت کو محسوس کر کے لرز گیا۔ سب لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی ہر کوئی اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا مجھے افسوس تھا کہ میں ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا ہم سب بھاگ کر بیرونی گیٹ سے باہر نکل آئے تھے...... وہ وحشی اب ہمارے پیچھے نہیں آرہے تھے ان کو ان کا شکار مل چکا تھا اور باقی کے بارے میں وہ فکر مند نہیں تھے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ ان کا شکار کہیں بچ کر نہیں جا سکتا ہم سب بھاگ رہے تھے جس کا جدھر منہ لگا وہ ادھر ہی بھاگ گیا میں بھی عزہ کو ساتھ لیتا ہوا ایک طرف بھاگتا جا رہا تھا وہ ماسک نما کھال اب بھی میرے پاس تھی جسے نہ جانے کیوں میں نے اب تک نہیں پھینکا تھا۔

بھاگتے بھاگتے ہم اچانک ٹھٹھک کر رک گئے۔

کیونکہ ہمارے سامنے ایک وحشی ہاتھ میں خنجر لئے کھڑا تھا، اس کا چہرہ عجیب سفاک سا تھا ہمارے جسم میں سردی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ عزہ خوف کے مارے مجھ سے چمٹ گئی اس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میری اپنی حالت بھی بہت بری ہو رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ میں نے عزہ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور ایک طرف کو دوڑ لگا دی۔ ہم کسی نہ کسی طرح جھاڑیوں سے الجھتے اور بچتے بھاگے جا رہے تھے کہ اچانک عزہ کو بری طرح ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑی اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں اپنی ہی دھن میں بھاگا جا رہا تھا اس لئے جیسے ہی وہ گری میں فوراً رک نہیں سکا اور جب رکا تو اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی......

عزہ اس وحشی کے ہتھے چڑھ چکی تھی وہ مجھے زور زور سے پکارنے لگی میں نے جیسے ہی عزہ کو اس وحشی کے شکنجے سے چھڑانے کی کوشش کی تو اس دوران ایک، اور وحشی نمودار ہوا۔ اس نے مجھے پکڑ لیا اور میرے ہاتھ سے وہی ماسک جو ڈرائیور کا چہرہ تھا، چھیننے کی کوشش کی میں نے ماسک والا ہاتھ پیچھے کر لیا اور خنجر کو اس کی طرف بڑھایا وہ بدک کر پیچھے ہٹ گیا۔

ادھر عزہ کی دردناک چیخ میرے کان سے ٹکرائی تو میں نے فوراً مڑ کر دیکھا تو دکھ اور اذیت نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

وہ وحشی عزہ کے اوپر سوار تھا اور خنجر کو اس کی کنپٹی سے آگے رکھ کر کاٹنا شروع کر دیا، جوں جوں وہ خنجر سے چیرا لگاتا جا رہا تھا عزہ کی اذیت ناک چیخیں بلند ہو رہی تھیں شاید وہ عزہ کا حشر بھی اس ڈرائیور اور کنڈیکٹر جیسا کرنا چاہتا تھا...... نہ جانے وہ کون تھے اور چہرے کی کھال اتارنے کا کیا مقصد تھا۔

میں فوراً آگے بڑھا عزہ کو بچانے کے لئے لیکن پہلے کی طرح اب بھی وہی وحشی میرے پیچھے آگیا اس کا ارادہ مجھ سے وہ ماسک چھین کر اور میرا حشر بھی پہلے والے لوگوں کی طرح کرنے کا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جب تک وہ ماسک نما کھال میرے پاس رہے گا وہ مجھے نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ عزہ کی چیخیں مجھے وحشت میں مبتلا کر رہی تھیں کہ اچانک پورے کا پورا خنجر پوری قوت سے اس وحشی کے پیٹ میں پیوست کر دیا اور وہ ایک ہولناک آواز نکال کر گر گیا......

میں فوراً عزہ کی طرف متوجہ ہوا لیکن بہت دیر ہو چکی تھی اس سے پہلے کہ میں عزہ کو اس وحشی سے چھڑانے کی کوشش کرتا وہ اپنا کام کر چکا تھا۔ عزہ کے چہرے کی کھال آس پاس سے کٹ چکی تھی اب صرف ماتھے والی جگہ بچی تھی۔ اس وحشی نے اپنے دونوں ہاتھ عزہ کے ماتھے پر رکھے اور اس کے چہرے سے پوری کھال الگ کردی۔

عزہ کی آخری چیخ نہایت ہولناک تھی اس کے بعد اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا...... میں نے اذیت سے آنکھیں بند کرلیں میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں ان وحشیوں کا کیا حشر کروں...... اچانک مجھے دوسرے لوگوں کا خیال آیا، وہ لوگ پتہ نہیں کہاں اور کس حال میں ہوں گے؟

"مجھے ان کو ہر حال میں بچانا ہے......" یہ سوچتے ہی میں آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف ہٹنے لگا۔ وہ وحشی عزہ کو مارنے کے بعد اس کے چہرے کی کھال کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ اس کی توجہ میری جانب نہیں تھی۔ جیسے ہی میں اس سے ذرا دور ہوا میں نے دوڑ لگادی اس وقت میں نے اس بات پر توجہ ہی نہیں دی کہ میں نے جس وحشی کو خنجر مارا تھا وہ کہاں غائب ہو گیا تھا؟

میں بھاگتے بھاگتے اس جگہ پر پہنچا جہاں ان وحشیوں کے ہاتھوں بچنے والے لوگ موجود تھے وہ بہت خوف زدہ تھے۔ میں نے ان کو حوصلہ دیا اور کہا کہ جیسے بھی ممکن ہو بس کی طرف پہنچنے کی کوشش کرو......! وہ سب میری پیروی میں بس کی طرف بڑھنے لگے۔ میں چلتے ہوئے اردگرد سے بھی محتاط تھا۔ ماسک بدستور میرے ہاتھ میں موجود تھا اور اس کی وجہ سے مجھے یقین تھا کہ وہ وحشی مجھے کچھ نہیں کہیں گے بلکہ مجھ سے وہ ماسک چھیننے کی کوشش کریں گے لیکن دوسرے لوگوں کی مجھے فکر تھی میرے ذہن میں ایک منصوبہ تھا اس لئے میں نے سب کو بس کی طرف جانے کو کہا......

ہم جیسے ہی گاڑی کے پاس پہنچے وہ وحشی نہ جانے کہاں سے نمودار ہو گئے۔ سب لوگوں کی چیخیں نکل گئیں وہ وہاں سے بھاگنا چاہتے تھے لیکن میں نے چیخ کر سب کو بس کے اندر جانے کو کہا، وہ سب ڈرتے ڈرتے بس کی طرف بڑھنے لگے۔ میں نے ان وحشیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے وہ ہاتھ بلند کرلیا جس میں چہرے کا وہ ماسک تھا۔

وہ سب چوکنا ہو کر میری طرف دیکھنے لگے ان کی توجہ بس میں جاتے لوگوں سے ہٹ گئی تھی اس سے فائدہ اٹھا کر سارے لوگ بس میں داخل ہو گئے تھے۔

میں نے بلند آواز سے ان وحشیوں کو کہا اگر انہوں نے میری طرف بڑھنے کی کوشش کی تو میں اس ماسک کو ضائع کردوں گا، اپنی بات کا ردعمل جاننے کے لئے میں نے بھی اپنے قدم سب کی طرف بڑھا دیئے لیکن ان وحشیوں میں کوئی حرکت نہیں ہوئی شاید وہ واقعی اس ماسک کو ضائع نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ میں جلدی سے بس میں داخل ہو گیا اور بس کو اسٹارٹ کرنے لگا حیرت انگیز طور پر بس فوراً اسٹارٹ ہو گئی۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو وہ وحشی تیزی سے بس کی طرف بڑھ رہے تھے اگر وہ بس کے نزدیک آجاتے تو پھر ہمارا بچ نکلنا ناممکن ہو جاتا میں نے فوراً ماسک والا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکالا اور ماسک کو ان وحشیوں کی طرف پھینک دیا۔

وہ ٹھٹھک کر رک گئے اور پھر تیزی سے ماسک کی طرف بڑھے میں نے اس مہلت سے فائدہ اٹھایا اور بس کو تیزی سے بھگا کر لے گیا......

میں نہیں جانتا تھا کہ انہوں نے ہماری بس کا پیچھا کیا تھا یا نہیں؟ لیکن میں بہت سے لوگوں کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا...... جہاں مجھے اس بات کی خوشی ہے وہاں عزہ کے کھو جانے کا بھی غم ہے کیونکہ چند گھنٹوں کے دوران ہی وہ میرے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ اور اسے میں نے اپنی زندگی کا ہم سفر بنانے کا سوچ لیا تھا، میری عزہ مجھ سے چھن گئی تھی، یہ غم میرے لئے ناقابل برداشت تھا، ایک طویل عرصہ تک میں دل میں کسک محسوس کرتا رہا، مگر پھر آہستہ آہستہ میں نارمل ہو گیا، لیکن آج بھی جب عزہ کا خیال آتا ہے تو دل مسوس کر رہ جاتا ہے اور آنکھوں میں نمی تیرنے لگتی ہے۔

پراسرار حویلی

خلیل جبار۔حیدرآباد

ظالم تو نے جان بوجھ کر مجھ بے قصور کو کتوں کی خوراک بنادیا ھے لیکن مرنے کے بعد بھی میری روح تجھ سے انتقام لے گی اور جن لوگوں نے بھی آگے بڑھ کر تیرے ظلم کو نہیں روکا ان سے بھی میری روح انتقام لے گی۔

خونی لبادے میں لپٹی ہوئی ظلم وستم کی دردناک ناقابل فہم دل فگار خونچکاں تحریر

میرا تعلق ایک پرائیوٹ چینل سے ہے۔ میرے سپرد چینل کے لئے ڈراؤنی اسٹوری اور مختلف پراسرار عمارتوں کے بارے میں فیچر رپورٹ تیار کرنا ہے۔ کام کرنے کا میرا انداز دوسروں سے ذرا مختلف ہے۔ میں اپنی تحقیقی رپورٹ میں معمولی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ کام کے دوران اکثر مجھے عجیب وغریب واقعات سے بھی دوچار ہونا پڑا ہے، بعض اوقات موت میرے بہت قریب سے گزری ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے اپنے کیریئر کی پہلی تحقیقی رپورٹ بنائی تھی جو ایک پراسرار عمارت کے بارے مین تھی۔ اس وقت میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا تھا۔ کیمرہ مین میرے ساتھ تھا۔ میں بالکونی میں کھڑا باہر کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی جانور میرے پاؤں پر اپنی زبان

پھیر رہا ہے۔ میں حیرت سے اپنے پاؤں کو دیکھنے لگا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا اس وقت میرا ڈر جانا فطری تھا۔

"کیا ہوا آپ گھبرا کیوں رہے ہیں۔" کیمرا مین ندیم نے پوچھا۔

"یہاں تمہیں کچھ نظر آ رہا ہے۔" میں نے اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"نہیں ...... یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔" ندیم نے کہا۔

"لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے یہاں کچھ ہے۔" میں نے گھبراہٹ سے کہا۔

اچانک میرا جسم ہوا میں جھولتا ہوا محسوس ہوا اور میں بالکونی سے اڑتا ہوا فضا میں اوپر جاتا چلا گیا۔ ندیم بھی یہ منظر دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے اپنے خوف پر قابو رکھتے ہوئے یہ منظر کیمرے میں فلم بند کر لیا پھر مجھے ایک جھٹکا لگا اور میں قلابازی کھاتا ہوا تیزی سے زمین کی طرف گرنے لگا۔ موت لمحہ بہ لمحہ میرے قریب آ رہی تھی کہ اچانک زمین پر گرنے سے پہلے میرے ہاتھ میں بالکونی کی گرل کا پائپ آ گیا۔ میں نے اس گرل کو مضبوطی سے تھام لیا اور میری جان بچ گئی۔ ندیم یہ منظر دیکھ کر کر بہت خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس نے میرے گرنے کا شاٹ مکمل کیا اور پھر پھرتی سے نیچے آ گیا۔

میرے بالکونی سے فضا میں معلق ہونے اور زمین پر گرنے کا منظر جب آن ائیر گیا تو مجھے خوب داد ملی۔ اپنی تعریف لوگوں کے منہ سے سن کر میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا تھا اور دل میں کچھ مزید کر دکھانے کی خواہش ہلچل مچانے لگی تھی۔

ایک بار کسی گاؤں میں ہم پراسرار حویلی کی تحقیقی رپورٹ تیار کر کے آ رہے تھے کہ ہماری گاڑی چلتے چلتے رک گئی۔ انجن گرم ہو گیا تھا۔ ریڈی ایٹر میں پانی نہیں تھا اور ہمارے پاس پانی کا انتظام بھی نہیں تھا۔ میں نے بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے خالی گیلن اٹھایا۔ اور پانی کے لئے قریب کے جنگل میں نکل گیا۔ رات کا وقت تھا۔ میں بے خوفی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک جگہ تالاب نظر آیا۔ جیسے ہی میں تالاب کے قریب گیا تو مجھے لگا جیسے وہاں کوئی ہے۔ سوکھے پتوں پر کسی کے چلنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

"ندیم تم مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو لیکن میں ڈرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔

ندیم نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مسلسل سوکھے پتوں پر کسی کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے گیلن پانی سے بھر لیا تھا میں اس طرف چلنے لگا جہاں سے آواز آ رہی تھی۔ اس وقت جو منظر میرے سامنے تھا اسے دیکھ کر میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ایک عجیب قسم کی مخلوق وہاں کھڑی تھی جس کا جسم کالے ریچھ جیسا اور منہ کسی کتے کا سا تھا۔ اس کی جیسے ہی مجھ پر نظر پڑی تو وہ مجھ پر حملہ کرنے کو دوڑی۔ ہم دونوں کے درمیان فاصلہ زیادہ تھا اس لئے مجھے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ کچھ دور تک اس مخلوق نے میرا پیچھا کیا لیکن پھر وہ واپس لوٹ گئی۔ اس کے جانے پر میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ جان بچ گئی ورنہ اس مخلوق کے چنگل میں پھنس جاتا تو آج یہ کہانی سنانے کے لئے زندہ نہ ہوتا۔ جب میں نے گاڑی میں آ کر اپنے ساتھیوں کو اس مخلوق کے بارے میں بتایا تو وہ میرا مذاق اڑانے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ میں مذاق کر رہا ہوں لیکن انہیں کیسے بتاتا کہ یہ حقیقت ہے۔

بچپن میں بھی میں خود کو بہت بہادر سمجھتا تھا جب کہ ہم کرائے کے نئے مکان میں منتقل ہوئے تو وہ مکان پہلے والے مکان سے بہت بڑا تھا اس میں کئی کمرے تھے، چھت بھی بہت بڑی تھی۔ گرمی کے دنوں میں چھت پر سویا جا سکتا تھا۔ اس گھر کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ گھر آسیبی ہے، جو کوئی بھی کرائے دار آتا ہے تو ایک ماہ سے زیادہ اس میں نہیں ٹکتا۔ اس گھر میں واقعی آسیب تھا۔ وہ کسی کو پریشان نہیں کرتا تھا۔ اکثر گھر والوں کو بالکونی، باورچی خانہ اور چھت پر ایک کالا سایہ نظر آتا تھا جس کا سر نہیں تھا۔ میرے بھائی بہن اس کا ذکر کرتے

ہوئے خوف زدہ ہوتے تو مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ ایک دن میں غصے میں آ گیا اور ان سے بولا۔

"کسی دن مجھے وہ سر کٹا نظر آنے دو پھر میں اس کو بتاتا ہوں۔"

"تم...... تم اس کو...... کیا بتاؤ گے؟" میری بہن ایلا نے کہا۔

"میں اس کو ایسا سبق سکھاؤں گا کہ وہ یہاں آنا ہی بھول جائے گا۔" میں نے خود کو بہادر سمجھتے ہوئے کہا۔

"نعمان ایسی بات نہیں کرتے کہیں وہ سر کٹا نہ سن لے۔" مقصود نے کہا۔

"میں اس کو سنانے کے لئے ایسی بات کر رہا ہوں، سالا سب کو نظر آتا ہے ہمت ہے تو میرے سامنے آ کر دکھائے...... میں جوش میں بولتا چلا گیا پھر ایلا اور مقصود کے سمجھانے پر میں وقتی طور پر خاموش ہو گیا تھا لیکن میں دل میں تہیہ کر چکا تھا کہ مجھے جیسے ہی سر کٹا نظر آیا تو میں آیت الکرسی پڑھ کر اس پر پھونک دوں گا۔ اس طرح ہو سکتا ہے ہماری اس سر کٹے سے جان چھوٹ جائے۔

اسی رات جب میں اپنے کمرے میں سویا تو سوتے میں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے میرا گلہ پکڑ کر دبانا شروع کر دیا ہے میرا سانس گھٹتا محسوس ہوا میں سمجھا کہ شاید مقصود یہ حرکت کر رہا ہے۔ وہ اکثر ایسی حرکتیں کرتا رہتا تھا۔ آج بھی وہ مجھے ڈرانے کے لئے ایسی حرکت کر رہا ہو۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا کمرے میں کوئی نہیں تھا جب کہ میرے گلے پر مسلسل دباؤ بڑھ رہا تھا جس سے سانس لینے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ سر کٹے نے میری آج کی گفتگو سن لی تھی اس لئے انتقامی کارروائی کرنے کے لئے آ گیا تھا۔ سوتے میں اس نے میرا گلہ اس لئے دبایا تھا کہ میں جواب میں قرآنی آیت نہ پڑھ سکوں، موت کے خوف سے میرا چہرہ پسینے سے تر ہو گیا تھا۔ اگر تھوڑی دیر اور گزر جاتی تو میری موت ہو سکتی تھی۔ بڑی مشکل سے میری آواز نکلی میں نے آیت الکرسی پڑھنا شروع کی جیسے جیسے میں آیت الکرسی پڑھتا جا رہا تھا۔ میرے گلے پر سے دباؤ کم ہوتا جا رہا تھا اور پھر اچانک ختم ہو گیا۔ میں نے فوراً بیڈ سے اٹھ کر پانی پیا۔ سانس بحال ہونے پر سکون کا سانس لیتے ہوئے چند قرآنی آیات پڑھ کر سینے پر دم کیا اور سو گیا۔

صبح جب میں نے گھر والوں کو رات کا واقعہ سنایا تو وہ سب خوف زدہ ہو گئے ویسے بھی ہم جب سے یہاں آئے تھے۔ عجیب و غریب واقعات ہو رہے تھے کبھی صبح پنجرے میں طوطا مردہ حالت میں ملتا کبھی خرگوش، کبھی ہماری پالتو بلی کے بچوں میں سے کوئی ایک مردہ حالت میں ملتا تھا۔ ان باتوں نے گھر والوں کو اس قدر خوف زدہ کیا کہ وہ گھر ہم نے ایک مہینے کے اندر ہی اندر چھوڑ دیا۔

بچپن ہی سے میری طبیعت میں شامل تھا کہ مجھے عجیب و غریب واقعات سے دلچسپی تھی اسی شوق کے باعث میں نے صحافتی کیریئر میں ایسے پروگرام کرنا پسند کیا تھا۔ ہر ہفتے میری تحقیقی رپورٹس پر مبنی چیزیں چینل سے ٹیلی کاسٹ ہوتی تھی۔ میرا گھریلو ملازم شفیع محمد مجھے ایک عرصے سے کہہ رہا تھا کہ میں ان کے گاؤں میں واقع بڑی سی پراسرار حویلی کے بارے میں فیچر رپورٹ تیار کروں۔ میں اس کا مذاق اڑانے کو کہتا تھا کہ "جب تمہاری بہت بڑی حویلی ہے تو پھر زمینیں بھی ہوں گی۔"

"ہاں، ہاں نہیں۔" وہ کہتا۔

"وہ تمہاری جب اتنی بڑی جائیداد ہے پھر میرے پاس نوکری کیوں کر رہے ہو۔ گاؤں میں جا کر اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کرو۔"

"صاحب میرا دل بہت کرتا ہے کہ زمینوں کی دیکھ بھال کروں لیکن میرے والد نور محمد نے مرتے وقت سخت الفاظ میں کہا تھا کہ "زندگی میں کبھی بھول کر بھی گاؤں کا رخ نہ کروں۔" پتا نہیں ان کے دل میں گاؤں کا کیا خوف بیٹھ گیا تھا۔ میری ماں بھی مجھے گاؤں جانے نہیں دیتی۔"

''پھر میں کس طرح تمہاری پراسرار حویلی کے بارے میں فیچر رپورٹ تیار کرسکوں گا۔'' میں کہتا ہوں صاحب جب پراسرار حویلی کے بارے میں فیچر رپورٹ تیار کرنا ہو تو مجھے بتا دینا میں اپنی ماں کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ کس گاؤں جارہے ہیں بلکہ کہہ دوں گا کہ صاحب مجھے شوٹنگ کے لئے کہیں لے کر جارہے ہیں۔''

''تمہارے والد اور والدہ نہیں چاہتے کہ تم گاؤں جاؤ۔'' میں نے پوچھا۔

''میں وہ راز جاننا چاہتا ہوں کہ جس کی بنا پر مجھے وہاں جانے سے منع کیا جاتا ہے۔'' اس نے کہا۔

شفیع محمد کا اصرار جب بہت بڑھا تو میں بھی اس کے گاؤں جاکر فیچر رپورٹس بنانے کو تیار ہوگیا۔ جب ہم گاؤں روانہ ہوئے تو شفیع بہت خوش تھا ایسا لگتا تھا کہ اس کی دلی مراد پوری ہونے والی ہے۔ میں نے شفیع کو سختی سے منع کیا تھا کہ گاؤں میں وہ اپنے بارے میں کسی کو نہ بتائے کہ وہ اسی پراسرار حویلی والوں کے خاندان کا ایک فرد ہے، اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کسی کو اپنے بارے میں نہیں بتائے گا۔

جب ہم گاؤں پہنچے تو دوپہر ہوچکی تھی۔ گاؤں والوں نے ہمیں دیکھ کر ایسا گھیرا ڈال لیا تھا کہ جیسے ہم کسی اور سیارے کی مخلوق ہوں۔ دراصل ہمارا چینل بہت دیکھا اور پسند کیا جاتا تھا۔ میرا پروگرام لوگوں میں بہت مقبول تھا۔ اس لئے مجھے اور کیمرہ مین کو دیکھ کر وہ سمجھ گئے تھے کہ ہم یہاں کسی خاص مقصد کے تحت آئے ہیں۔ گاؤں کے کئی لوگ ہمیں پراسرار حویلی لے گئے ہم نے دن کی روشنی میں حویلی کے باہر اور اندر سے مختلف مناظر فلم بند کئے۔ حویلی واقعی بہت پراسرار تھی اب تک میں نے جتنی بھی حویلیاں دیکھی تھیں ان میں یہ سب سے خوب صورت حویلی تھی۔ شفیع محمد حویلی دیکھ کر ایسے دیوانہ ہوا جارہا تھا کہ جیسے اسے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ وہ حویلی کی ایک، ایک چیز کو بڑے غور سے دیکھ رہا، اور خوش ہورہا تھا۔ میں نے اس کے کان کے پاس جاکر ہلکے سے کہا۔

''شفیع محمد اپنے وعدے کا پاس رکھنا۔''

''جج......جج...... جی صاحب۔'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم اس پراسرا حویلی کے بارے میں کتنی ہی تفصیلی رپورٹ تیار کرلو لیکن وہ ادھوری ہی رہے گی۔'' ایک بزرگ نے میرے قریب آتے ہوئے کہا۔

''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تمہارا پروگرام ہر ہفتے بہت شوق سے دیکھتا ہوں اس لئے میرے ذہن میں یہ بات ہے کہ اس حویلی میں رہنے والا کوئی بھی شخص اب اس دنیا میں نہیں رہا لیکن ایک شخص ایسا ہے جو تمہیں راز کی بات بتادے اگر تم اس سے وہ راز اگلوا سکو جس کے سبب یہ حویلی آسیبی حویلی میں تبدیل ہوگئی ہے۔'' اس نے کہا۔

اس کی بات پر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ کیونکہ واقعی وہ درست کہہ رہا تھا ہمارے پاس کوئی بھی شخص ایسا نہیں تھا۔ شفیع محمد خود وہ راز جاننے کے لئے ہمارے ساتھ یہاں تک چلا آیا تھا۔

''وہ کون ہے؟'' میں نے بزرگ سے پوچھا۔

''وہ دینو بابا ہے جو یہاں سے دور ایک جھونپڑی میں رہتا ہے۔ اس حویلی کا سب سے پرانا اور وفادار نوکر۔ لیکن ان دنوں کسمپرسی کی زندگی گزار رہا ہے دن میں بھیک مانگنے کے لئے دور تک چلا جاتا ہے۔'' اس کا ایک دن اچھا گزر جائے۔'' بزرگ نے کہا۔

بزرگ کی بات نے میرے تجسس کی حس کو جگا دیا تھا اور میں یہ جاننے کے لئے بے چین ہوگیا تھا کہ اس راز سے پردہ اٹھاؤں جس کے سبب یہ حویلی ویران و آسیبی ہوئی تھی، یہ راز واقعی دینو بابا سے زیادہ بہتر کون جان سکتا تھا۔

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ان سے ابھی ملاقات ہوجائے۔'' میں نے کہا۔

''ابھی وہ بھیک مانگنے! پتا نہیں کہاں گیا ہوگا ویسے بھی آپ رات کے وقت حویلی کی فلم بندی کریں گے اس لئے اس کا انتظار کرلیں۔'' بزرگ نے کہا۔

''بابا مجھے واقعی آپ پر یقین ہوگیا ہے کہ آپ ...وگرام شوق سے دیکھتے ہیں جو کام مجھے کرنا ہے وہ ...کے علم میں ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

میرے ہنسنے پر وہ بزرگ بھی ہنس دیئے۔

شام ہونے تک ہم اس حویلی میں اپنا سامان ...آرام کرتے رہے جب شام ہوئی۔ ہم دینو بابا کی ...نپڑی جانے کو تیار ہوئے شفیع نے ہمارے ساتھ ...نے سے انکار کردیا اور ہمارے آنے تک اس نے ...ی میں بیٹھے رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے ہمارے ...ہ نہ جانے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ اس لئے ...ے وہیں چھوڑ کر دینو بابا کے پاس چل دیئے۔

وہ انتہائی خستہ حال جھونپڑی تھی جس میں ایک ...ما آدمی بری طرح کھانس رہا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر ...پریشان ہوگیا پھر جب ہم نے اپنی آمد کا مقصد بتایا ...وہ خوف زدہ سا ہوگیا۔

''بابا کیوں گڑے مردے اکھاڑتے ہو، چھوڑو ...ہوگیا سو ہوگیا۔'' دینو نے کہا۔

''ندیم میرے کہنے سے پہلے ہی کیمرہ آن کر ...اتھا۔''

''بابا ہم چاہتے ہیں کہ لوگوں کو ٹی وی چینل کے ...یعے پتا چلے کہ یہ حویلی پراسرار کیوں ہے؟ اس کے ...ہنے والوں کے ساتھ کیا بیتی؟'' میں نے کہا۔

''ایک تو یہ مجھے سمجھ نہیں آتا کہ ٹی وی چینل کو کیا ...گیا ہے جو کام کرنا ہے وہ نہیں کرتے بلکہ چھوٹی باتوں ...لئے محلوں اور گلیوں میں گھومتے پھرتے ہیں چھوڑو ...تم کوئی ڈھنگ کا کام کرو تاکہ تمہارا افسر تم کو شاباش ...ے یہ کیا پرانی بات پوچھنے آگئے۔ جو بات گزر گئی وہ ...گزر گئی۔'' دینو نے افسردہ ہوتے ہوئے کہا۔

''بابا ہم بڑی امید سے آپ کے پاس آئے ...ایک آپ ہی ہیں جو ہمیں اس راز کے بارے میں ...علومات دے سکتے ہیں۔''

''میں کیا کروں تم اتنی دور سے آئے ہو مسافر ...ہم گاؤں والے مسافر کو اپنا مہمان سمجھ کر ان کا بہت خیال کرتے ہیں، میں کوشش کرتا ہوں کہ پرانی یادوں کو ایک بار پھر ذہن میں جمع کرکے تمہیں بتادوں کہ اس حویلی والوں کے ساتھ کیا بیتی تھی، حویلی کیوں پراسرار ہوئی؟'' دینو نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ہاں بابا آپ ذہن پر زور ڈال کر بتائیں اگر آپ نے ہماری حوصلہ افزائی نہ کی تو ہمارا دل ٹوٹ جائے گا۔'' میں نے بات بنتی دیکھ کر کہا۔

''یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں خوبرو جوان تھا۔'' دینو بابا خلاؤں میں گھورتے ہوئے میری طرف دیکھ کر گویا ہوئے......

وڈیرا جان محمد کے چار لڑکے شیر محمد، پیر محمد، نیاز محمد، اور نور محمد تھے ایک لڑکی فیروزہ بھی تھی۔ اس نے اپنے چاروں لڑکوں کی شادی کردی تھی۔ فیروزہ یونی ورسٹی میں پڑھتی تھی۔ وڈیرا جان محمد کی خواہش تھی کہ فیروزہ اپنی تعلیم مکمل کرلے تاکہ وہ اس کی بھی شادی کسی اچھے خاندان میں کردے اسے یہ پسند نہیں تھا کہ اس کی بیٹی یونیورسٹی کے ہاسٹل میں رہے لیکن فیروزہ کی ضد اور یہ جان کر کے ہاسٹل میں صرف لڑکیاں ہی ہوتی ہیں اسے رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ قاسم بھی فیروزہ کے ساتھ پڑھتا تھا۔ خوب صورت نوجوان تھا۔ اس میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ لڑکیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ بس ہر وقت پڑھائی میں مگن رہنے والا نوجوان تھا۔ فیروزہ کی بات چیت بھی قاسم سے اسی بنا پر ہوئی تھی کہ وہ لیکچر بڑی توجہ سے سنتا تھا۔ اور پھر گھر جاکر نوٹس تیار کرلیتا تھا۔ فیروزہ نوٹس بنانے میں سست تھی اس لئے وہ قاسم کے تیار کئے ہوئے نوٹس کی فوٹو کاپی کرالیتی تھی اس طرح وہ نوٹس بنانے سے بچ جاتی تھی۔

آہستہ آہستہ یہ دوستی محبت میں تبدیل ہوتی چلی گئی فیروزہ قاسم کو ٹوٹ کر چاہنے لگی تھی۔ قاسم بھی فیروزہ کو پسند ضرور کرتا تھا لیکن ڈرتا بھی تھا کہ کہیں وڈیرا کو پتا نہ چل جائے ورنہ وہ اپنے آدمیوں سے اسے ہلاک بھی کراسکتا تھا۔ قاسم کا تعلق غریب گھرانے سے تھا۔ ان

دونوں خاندان کا جوڑ ممکن نہیں تھا۔

قاسم اکثر فیروزہ کو سمجھاتا کہ ''ہم دونوں اچھے دوست ہی رہ سکتے ہیں اس لئے آگے بڑھنے میں ہم دونوں کی جان کو خطرہ ہے۔''

فیروزہ ضدی قسم کی لڑکی تھی بچپن سے وہ اپنی ہر بات منواتی آئی تھی اور اس کے ذہن میں یہی بات تھی وہ اپنے باپ سے ضد کر کے قاسم سے شادی رچالے گی۔ میں وڈیرہ جان محمد کے حکم پر یونیورسٹی جا کر فیروزہ سے ملاقات کر کے خرچے کے لئے رقم اور جو چیزیں وہ منگواتی دے کر چلا آتا تھا۔ اکثر میری ملاقات فیروزہ سے ہوتی تو قاسم بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ فیروزہ جیسے ہی کسی سہیلی کے پاس جاتی قاسم اس کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر مجھے کہتا کہ ''فیروزہ آگ اور پانی کا کھیل کھیل رہی ہے تم اس کو سمجھاؤ کہ مجھے حاصل کرنے کا خیال دل سے نکال دے، وڈیرہ جان محمد بھی اس رشتے پر تیار نہیں ہوگا۔ ممکن ہے کہ میری جان کا دشمن ہو جائے۔''

میں اس کو سمجھاتا کہ ''تم فکر نہ کرو ایسی نوبت نہیں آئے گی۔''

میرے ذہن میں یہ بات ہے کہ فیروزہ وڈیرا جان محمد کی کمزوری ہے اگر اس نے قاسم سے شادی کرنے کی ضد کی تو وہ ہرگز انکار نہیں کرے گا۔ اور اس رشتے پر تیار ہو جائے گا۔'' قاسم ایک خوب صورت نوجوان تھا۔ تعلیم حاصل کر کے ایک دن اسے ڈاکٹر بن جانا تھا اس کا مستقبل روشن تھا۔

دن گزرتے رہے اور فیروزہ کی محبت میں شدت بڑھتی رہی قاسم بھی خوش تھا۔ اس کے والدین نے جو خواب دیکھا تھا اس کی تکمیل جلد ہونے والی تھی پھر ایک دن فیروزہ اور قاسم دونوں ڈاکٹر بن گئے۔ ڈاکٹر بننے پر وہ دونوں ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔ قاسم شہر میں اور فیروزہ گاؤں میں تھی۔ قاسم کے بغیر فیروزہ کا گاؤں میں دل نہیں لگتا تھا۔ اس نے وڈیرہ جان محمد سے شہر میں کلینک کھولنے کی اجازت مانگی تو اس نے صاف انکار کرتے ہوئے اسے بتایا کہ ''اس نے وڈیرے رحیم بخش کے بیٹے مولا بخش سے اس کی شادی کرنے کی بات پکی کر دی ہے جلد ہی وہ باقاعدہ منگنی کی رسم ادا کرنے آنے والے ہیں۔''

فیروزہ کو مولا بخش بالکل بھی پسند نہیں تھا۔ اس لئے اس کا احتجاج کرنا فطری ردعمل تھا۔ فیروزہ نے اس رشتے پر اعتراض کرتے ہوئے قاسم سے شادی کی خواہش ظاہر کر دی۔

وڈیرا جان محمد اپنی بیٹی سے اپنی پسند کی شادی پر بھڑک اٹھا اور اس کے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی اور اس نے وڈیرہ رحیم کو منگنی کی رسم جلد ادا کرنے کو کہا۔ وڈیرا رحیم بخش بھی یہی چاہتا تھا کہ جلد سے جلد منگنی کی رسم ادا ہو جائے۔ دونوں طرف منگنی کی رسم کی تیاریاں زور و شور سے ہونے لگیں تھیں۔'' یہ کہتے ہوئے دینو بابا کچھ دیر کو خاموش ہو گیا۔

میں اور میرے ساتھی غور سے دینو بابا کو دیکھ رہے تھے۔ وہ مسکرایا اور پھر پانی کا ایک گلاس پی کر ہم سے مخاطب ہوا۔

ہم دلچسپی سے بابا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''اس روز میں کسی کام سے حویلی کے ایک کمرے میں گیا تھا مجھے ایسا محسوس ہوا فیروزہ کسی سے بات کر رہی ہے کمرے کی کھڑکی کھلی ہونے کی بنا پر برابر کے کمرے سے فیروزہ کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی وہ کہہ رہی تھی۔

''قاسم تمہیں ہر حالت میں آنا ہے ورنہ میں زہر کھا کر خودکشی کر لوں گی اور اس کی ساری ذمہ داری تم پر ہوگی۔ میں کچھ نہیں جانتی تمہیں کار لے کر آنا ہے میں اپنے سامان کا بیگ تیار رکھوں گی۔ ایک بار ہماری شادی ہو جائے پھر بابا خود ہی مان جائیں گے اس رشتے پر۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا۔ فون کر کے وہ جیسے ہی اس کمرے سے باہر جانے لگی۔ کھڑکی سے اس کی نظر مجھ پر پڑی وہ بری طرح چونکی اور پھر کھڑکی میں منہ کر کے بولی......

''دینو تم نے کچھ نہیں سنا ہے یہ دماغ میں رکھ لو۔''

مجھے خاموش دیکھ کر وہ پھر بولی ''اگر سن بھی لیا ہے تو یہی سمجھو کہ تم نے کچھ نہیں سنا میرا خیال ہے تم نے میری بات سمجھ لی ہے۔ کوئی بھی پوچھے تو تم نے یہ کہنا ہے کہ تم نے کچھ نہیں سنا۔'' فیروزہ بولی۔

''بی بی آپ قاسم کو گاؤں نہیں بلائیں، وڈیرا سائیں کو اس کے آنے کا پتا چل گیا تو وہ کچھ ہو جائے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔'' میں نے فیروزہ کو سمجھانا چاہا۔

فیروزہ اس وقت کچھ سمجھنے کو تیار نہیں تھی اس کی ضد یہی تھی کہ میں اپنی زبان کو بند رکھوں میں نے ہامی بھری جس پر وہ مطمئن ہو گئی۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ تین دن بعد رات کی تاریکی میں فیروزہ اپنا سفری بیگ لئے حویلی سے نکلی۔ وڈیرا جان محمد کی اتفاق سے آنکھ کھل گئی۔ اس نے بستر سے اٹھ کر ایسے ہی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ فیروزہ حویلی کا باہر کا گیٹ کھول کر جا رہی تھی وڈیرا جان محمد کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ لیکن اس کے ذہن میں اور ہی بات تھی اس لئے کوئی شور شرابہ نہ کیا وہ خاموشی سے کمرے سے نکلا۔ حویلی کے پہرے داروں کو جگا کر اپنے ساتھ لیا اور خاموشی سے فیروزہ کا پیچھا کرنے لگا۔ وہ پیچھا اس خاموشی سے کر رہے تھے کہ فیروزہ کو ذرا بھی شک نہ ہوا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھتے ہی جا رہی تھی۔ قاسم اس کو کچھ فاصلے پر نظر آیا۔ وہ لپک کر اس کے پاس پہنچی۔

''کیا کار نہیں لائے، اب ہم کیسے شہر جائیں گے؟'' فیروزہ نے کہا۔

''کار میں لے کر آیا ہوں لیکن احتیاط کے طور پر اسے کچھ فاصلے پر کھڑی کی ہے کہ کسی کو شک نہ ہو۔'' قاسم نے کہا۔

''کسے شک ہوگا۔ پوری بستی کے لوگ سو رہے ہیں کسی کو کانوں کان پتا بھی نہیں چلے گا اور ہم گاؤں سے فرار ہو جائیں گے۔'' فیروزہ نے کہا۔

''فیروزہ ایک بار پھر سوچ لو کل کہیں تمہیں پچھتانا نہ پڑے۔ ہمارے اس اقدام سے تم اپنے خاندان سے ہمیشہ کے لئے کٹ جاؤ گی۔'' قاسم نے کہا۔

''میں نے خوب سوچ لیا ہے، تم جلدی چلو کہیں حویلی میں میری گمشدگی کی کسی کو خبر نہ ہو جائے اور پکڑ لئے جائیں۔'' فیروزہ نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

جواب میں قاسم نے بھی قدم آگے بڑھائے لیکن ان کے قدم رک گئے وہ چاروں طرف سے گھیر لئے گئے تھے۔ ان پر بندوقیں تنی ہوئی تھیں۔ خوف سے دونوں کے چہرے فق ہو گئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس طرح پکڑے جائیں گے۔ فیروزہ کو وڈیرا جان محمد پکڑ کر حویلی کے اندر لے گیا جب کہ قاسم کو حویلی کے ستون سے باندھ دیا گیا۔ صبح ہونے پر وڈیرا جان محمد کو قاسم نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ اس کا ارادہ فیروزہ کو لے جانے کا نہیں تھا اور وہ فیروزہ کو اپنی جان دینے کی دھمکی پر مجبور ہو کر گاؤں سے لینے آیا تھا۔ وڈیرا کو بہت غصہ تھا۔ اسے اپنی بیٹی فیروزہ سے اس طرح کی حرکت کی بالکل توقع نہ تھی۔ قاسم بے قصور تھا لیکن وہ حویلی کی دوسری لڑکیوں کو ایسا سبق سکھانا چاہتا تھا کہ وہ بھی مستقبل میں ایسا کوئی قدم نہ اٹھا سکیں۔ اس واقعہ سے نصیحت پکڑیں۔ ایک دن وڈیرے جان محمد نے حویلی کے میدان میں قاسم کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ کر ڈال دیا۔ حویلی کے مرد اور عورتوں کو بھی میدان سے کچھ فاصلے پر کرسیاں ڈال کر بٹھایا گیا سب حیرت زدہ تھے کہ دیکھیں وڈیرا کیا کرتا ہے۔ وڈیرا نے جیسے ہی اپنے ہاتھ کے اشارے سے ملازم کو حکم دیا۔ تو اس نے دو دن کے بھوکے کتے قاسم پر چھوڑ دیئے۔ وہ قاسم پر ایسے لپکے جیسے شکار پر لپکتے ہیں۔ کتوں نے قاسم کے جسم میں اپنے خونخوار دانت پیوست کر دیئے قاسم کتوں کے حملے سے بوکھلا گیا وہ چیخ و پکار کر رہا تھا لیکن اس کی چیخ و پکار

سننے کو کوئی بھی تیار نہ تھا۔ چیختے چلاتے وہ بے دم سا ہونے لگا۔ اس کے جسم سے گوشت نوچ نوچ کر کتے کھا رہے تھے۔ حویلی کے سب ہی لوگ ایک انسان کو کتوں کی خوراک بنتا دیکھ رہے تھے۔ لیکن کسی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ کتوں سے قاسم کی جان بخشی کرا سکے وہ سب سکتے کی حالت میں تھے۔ کسی کو بھی وڈیرے سے اس قسم کی امید نہیں تھی۔

''وڈیرا تو نے جان بوجھ کر مجھ بے قصور کو کتوں کی خوراک بنا دیا ہے لیکن مرنے کے بعد بھی میری روح تجھ سے انتقام لے گی۔ اس حویلی کے ایک ایک فرد سے انتقام لے گی کیوں کہ سب نے مجھ کو کتوں کی خوراک بنتے دیکھا ہے لیکن کسی نے بھی مجھے ان سے چھڑایا نہیں۔'' قاسم نے چلاتے ہوئے کہا۔

وڈیرا نے زوردار قہقہہ لگایا اور اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا......

''تو انتقام لے گا تو اپنی جان بچا نہیں سکا۔ ہم سے کیا خاک انتقام لے گا۔''

''میں نہیں بلکہ میری روح تجھ سے انتقام لے گی۔'' قاسم نے کہا۔

''سب بکواس باتیں ہیں مرنے والے اس بے جان پتھر کی مانند ہوتے ہیں جو اپنی مرضی سے حرکت نہیں کر سکتے ہاں ہوا ضرور انہیں ادھر ادھر لڑھکا دیتی ہے۔'' وڈیرا جان محمد نے کہا۔

''یہ وقت بتائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے قاسم نے اپنی جان دے دی۔

وڈیرا اپنی کرسی سے اٹھ کر حویلی کے اندر چلا گیا۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

اس واقعے سے اس نے حویلی کی خواتین کو سبق سکھا دیا تھا کہ'' آئندہ کسی نے فیروزہ جیسی حرکت کی تو اس کا انجام بھی بھیانک ہوگا۔''

قاسم کے مرنے کے بعد ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ حویلی میں رات کے وقت پراسرار قسم کی آوازیں آنے لگیں تھیں، رات کے سناٹے میں وہ آوازیں کمزور دل کے مالک کو ڈرا دینے کے لیے کا[فی] تھیں۔ ایک رات وڈیرے جان محمد کا بڑا بیٹا اچھا [بھلا] سویا تھا کہ صبح ہونے پر بستر پر مردہ حالت میں پایا گیا ابھی اس کا انتقال ہوئے تین دن ہی ہوئے تھے کہ چوتھے روز دوسرا بیٹا پیر محمد بھی بستر پر مردہ حالت میں [پایا] گیا اور دو اموات نے گھر بھر کے افراد کو ہلا کر رکھ [دیا] تھا۔ ایک ہفتہ سکون سے گزرا تھا کہ وڈیرے کا تیسرا [بیٹا] نیاز محمد بھی اپنے بستر پر صبح مردہ حالت میں پایا گیا۔ وڈ[یرا] جان محمد اس واقعہ پر بل کر رہ گیا تھا۔ چوتھا بیٹا نور محمد [پر] ایسا خوف طاری ہوا کہ وہ اپنی بیوی اور بچے سمیت حو[یلی] سے کسی کو بتائے بغیر غائب ہوگیا۔

وڈیرا جان محمد کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ [کیا] کرے۔ سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں یہی بات آئی کہ کسی عامل سے اس کا سہارا لینا چاہیے۔ زندگی بھر وہ جادو ٹونے سے دور رہا تھا لیکن اب جادو ٹونے کا سہا[را] لینا اس کی مجبوری بن گیا تھا۔

صبح کے وقت وڈیرا نے مجھے بلا کر کہا۔

''دینو تم نے عامل نوید شاہ کا آستانہ دیکھا [ہے] نا۔''

''ہاں، ہاں وہ گاؤں سے کچھ فاصلے پر [ہے]۔'' میں نے کہا۔

''پھر تم جلدی سے میرے ساتھ چلو ہمیں ا[بھی] اور اسی وقت عامل نوید شاہ کے پاس چلنا ہے۔'' وڈ[یرا] گھوڑے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''سائیں ادی فیروزہ کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے درد سے بری طرح چلا رہی ہے۔'' اللہ بچائی نے آ[کر] بتایا۔

وڈیرا الٹے قدموں حویلی میں دوڑا۔ وا[قعی] فیروزہ بے آب مچھلی کی طرح زمین پر اچھل رہی [تھی] تکلیف اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ فیروزہ [کو] فوری طور پر شہر کے اسپتال لے جانے کی تیاریاں جا رہی تھیں کہ اس نے دم توڑ دیا۔

فیروزہ سے وڈیرا کو بہت محبت تھی فیروزہ [کی]

اس کی موت پر وڈیرا کی حالت پاگلوں کی سی ہوگئی تھی سوئم والے دن جب حویلی کے میدان میں گاؤں کے لوگ بیٹھے تھے۔

اچانک حویلی کے ایک کمرے کی گیلری سے وڈیرے جان محمد کی بیوی دھڑام سے نیچے گری اور اس وقت اس نے دم توڑ دیا وہ ابھی بیٹی کا صدمہ نہیں بھول پایا تھا بیوی بھی ساتھ چھوڑ گئی تھی۔

وڈیرا نے کئی بار عامل نوید شاہ سے مدد لینا چاہی لیکن کوئی نہ کوئی ایسا مسئلہ آجاتا کہ وہ اس کے پاس نہیں جا پاتا۔

الغرض وڈیرے کی تینوں بیٹوں کی بیویاں اور ان کے بچے ایک، ایک کر کے وڈیرے جان محمد کے سامنے دم توڑ گئے وہ انہیں بالکل بھی بچا نہ سکا۔ لگاتار صدمے ملنے پر وڈیرا جان محمد اپنے حواس کھو بیٹھا اور گاؤں میں پاگلوں جیسی حرکتیں کرتا پھرتا تھا۔ دن بھر پھٹے پرانے کپڑے پہنے مٹی اور دھول سے کھیلتا رہتا۔ بچوں کو اچھی تفریح مل گئی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ پاگل پاگل کے نعرے لگاتے جواب میں وڈیرا جان محمد زور، زور سے ہنستا ہوا انہیں پتھر مارنے کو دوڑتا اپنے پیچھے آتا دیکھ کر بچے رفو چکر ہو جاتے۔

ایک دن وڈیرا جان محمد کی لاش حویلی کے مین گیٹ کے پاس سے ملی تھی ایسا لگتا تھا کہ جیسے کسی خونخوار جانور نے اس پر حملہ کر کے ہلاک کیا ہے۔ وڈیرے جان محمد کی ہلاکت کے بعد سے وہ حویلی ویران ہے کوئی رات تو دور دن میں بھی اس میں جانے سے کتراتے ہیں۔'' دینو بابا یہ کہتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

حویلی کے بارے میں اتنے سنسنی خیز انکشافات سن کر مجھے تشویش پیدا ہوگئی تھی کہ کہیں واقعی شفیع محمد کا تعلق بھی وڈیرا جان محمد کے خاندان سے نہ ہو، ایسا ہونے کی صورت میں ہمیں اسے بچانا تھا۔ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ حویلی پہنچا۔ ہماری کار حویلی کے باہر موجود تھی۔ شفیع کار میں نہیں تھا۔ کار میں اس کا نہ ہونے کا مطلب یہی تھا کہ وہ ضرور حویلی کے اندر ہی ہوگا۔ مجھے بدحواسی کی حالت میں حویلی میں داخل ہوتا دیکھ کر ندیم چونکا۔

''کیا ہوا؟''

''تم سب میرے پیچھے آؤ۔'' میں نے کہا۔

مجھے گھبرایا ہوا دیکھ کر وہ بھی میرے پیچھے لپکے۔

شفیع محمد کی وہاں غیر موجودگی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ حویلی کے کس کمرے میں گیا ہے ۔ میں نے اسے آواز دی لیکن جواب میں میری آواز ہ پلٹ کر آگئی۔ شفیع محمد کے جواب میں آواز سنائی نہ دینے سے مجھے سخت تشویش ہو رہی تھی۔ گھبراہٹ سے میرے چہرے پر پسینے آگئے تھے۔ میں بھاگتا ہوا حویلی کے اندر مختلف کمروں میں شفیع محمد کو تلاش کر رہا تھا۔

اچانک ایک کمرے میں شفیع محمد نظر آگیا وہ اطمینان سے ایک پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ مجھے بڑا غصہ آیا ہم اس کے لئے پریشان ہو رہے ہیں اور وہ دیکھو کتنے مزے سے پلنگ پر سو رہا ہے۔''

''شفیع محمد یہ کیا حرکت ہے؟'' میں زور سے چیخا۔

میرے چیخنے پر بھی اسے کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔ میں غصے میں بھر کر جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا۔ میری نظر فرش پر پڑی، فرش پر خون ہی خون پڑا تھا۔ وہ منظر دیکھ کر میں نے جب غور سے شفیع محمد کی طرف دیکھا تو لرز گیا۔ شفیع محمد کے دل کے مقام پر ایک تیز دھار خنجر گھسا ہوا تھا۔ جو خون بہہ رہا تھا۔ وہ شفیع محمد کے جسم سے نکل کر فرش پر بہہ رہا تھا۔ قاسم کی روح نے آج بھی شفیع محمد کو موت کی نیند سلا کر ثابت کر دیا تھا کہ اس نے وڈیرا جان محمد کو بدلہ لینے کا چیلنج دیا تھا اسے پورا کر دیا تھا۔

میں ہمیشہ شفیع محمد کی بات کو جھوٹ ہی سمجھتا تھا لیکن آج ثابت ہو گیا تھا کہ شفیع محمد کا تعلق وڈیرا جان محمد کے خاندان سے تھا۔ افسوس کہ پراسرار حویلی کا راز مجھے معلوم ہوا، جب قاسم کی روح شفیع محمد کو اپنے انتقام کا نشانہ بنا چکی تھی۔

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

دوست کیا خوب چاہتوں کا صلہ دیتے ہیں
ہر ایک گام پہ پھر زخم نیا دیتے ہیں
آپ سے تو چند دنوں کی دوستی ہوئی
لوگ برسوں کی محبت کو بھلا دیتے ہیں
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

میری حسرتوں کا قتل کرنے والے
میرے جذبوں کا کچھ تو خیال کیا ہوتا
میرے آنسوؤں کی کچھ تو قیمت لگائی ہوتی
میرے حال پر کچھ تو ملال کیا ہوتا
(محمد بشیر احمد پرواز......جنڈانوالہ)

بے وفا نہیں ہیں تم کو کہا تھا ہم نے
مجھ کو بہت درد دیا ہے میرے صنم نے
آج تیری یاد آئی تو یاد آیا (ایم)
بے وفائی ہم نے نہیں کی بے وفائی کی تھی تم نے
(ایم مجاہد لیاقت......ملتان)

تیری بے نیام آنکھیں میرا مقدر چھین رہی ہیں
میرا دل چھین رہی ہیں میرا اندر چھین رہی ہیں
میں تو ابر کے ہواؤں کے حسین تخت پہ تھا
تخت چھین رہی ہیں میرا سکندر چھین رہی ہیں
(دلکش امیر پوری......لودھراں)

عشق کا ازل سے یہی دستور ہے
جو اس کو جان لیتا ہے یہ اس کی جان لیتا ہے
(آسیہ شاہین......ضلع وہاڑی کرم پور)

شمع پہ مقدمہ چلا پروانے کے خون کا
پوچھا گیا کیوں کیا خون معصوم کا؟
شمع بولی! پروانہ جوانی کے نشے میں جھوم رہا تھا
میرے ارد گرد گھوم رہا تھا
(شعیب شیرازی......جوہر آباد)

بہت تم سے محبت ہے مگر اظہار نہیں کرتی
تم مانو یا نہ مانو میں اقرار نہیں کرتی
جو نہ ہو بہتر میرے لئے اس پہ دل ٹھہرتا نہیں میرا
جو حاصل ہونی ہوتی ہے وہ حاصل ہو کر رہتی ہے
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈو الہ یار)

پلٹ کر آنکھ نم کرنا مجھے ہرگز نہیں آتا
گئے لمحوں کو یاد کرنا مجھے ہرگز نہیں آتا
محبت ہو تو بے حد ہو نفرت ہو تو بے پایاں
کوئی بھی کام کم کرنا مجھے ہرگز نہیں آتا!!
(نوشین......بدین)

اس نے بے وفائی کے خنجر سے ہمارے دل پہ کئے وار
جب کیا وار مسکرائی وہ ہر بار
جب وہ ملتی ہم سے تو کرتی محبت کا اظہار
ہم بھی بڑے دل والے ہر دفع کرلیتے اعتبار
(منور حسین......رحیم یار خان)

اشک بن کر وہ میری چشم تر میں رہتا ہے
کیسا عجب شخص ہے کہ پانی کے گھر میں رہتا
(محمد ندیم راج......نوشہرہ)

مجھے غموں کی سوغات دے کر چلا گیا اک شخص
میرے ہنستے مسکراتے دل کو برباد کرگیا اک شخص
میں اس کا یہ احسان بھلا نہ پاؤں گا ساری زندگی
میرے دامن کو کانٹوں سے بھرگیا اک شخص
(مختار علی کیانی......گاؤں تلی، بلوچستان)

بہتے پانی میں دیکھ کر چاند
اس میں تیرا عکس دیکھیں گے
پھر ذرا سا ہلا کے پانی کو
ساری رات تیرا رقص دیکھیں گے
(عامر......کراچی)

دل کو تو میرے پاس رہنے دو
گزرے ہوئے راتوں کو تو جانے دو
کہتا ہوں کہ پیار ہے تم سے
دو پیار کی باتیں تو کہنے دو
(خلیل دیوانہ......مندسورولین بازار)

ہم جہاں ہیں وہاں ان دنوں عشق کا سلسلہ مختلف ہے
کاروبار جنون عام تو ہے مگر اک ذرا مختلف ہے
سب کے سب اپنے کاندھوں سے غیروں کا سر جوڑنے میں لگے ہیں
ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہاں کا خدا مختلف ہے
(جسیم الدین......حیدر آباد)

غزل

زندگی تو زندگی قوت حسین ہوجائے
کسی کے ساتھ ہونے کا اگر احساس ہوجائے
محبت، وفا، چاہتیں سب تیری امانت ہیں
تو ایک روز آئے اپنی امانت ساتھ لے جائے
ملنا، ملانا ہو یا بچھڑنا بھول جانا
وہ جانے کون سا سانحہ ہمارے ساتھ ہوجائے
جدائی کے کسی موڑ پر اگر تو مجھ کو مل جائے
میری خشک آنکھوں سے اچانک برسات ہوجائے
نہ کوئی دل غمزدہ ہو واجد نہ کوئی آنکھ بھر آئے
ہمیں ایک دوسرے کے درد کا اگر احساس ہوجائے
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی..........کراچی)

جب کیا یاد تجھے یاد نہ آئی تیری
مار ہی دے گی کسی روز جدائی تیری
ظلم پر ظلم سہے جاتے ہیں سب لوگ مرے
کتنی مجبور ہے یارب! یہ خدائی تیری
بھولتے جاتے ہیں احباب مرے دل سے مجھے
پھیلتی جاتی ہے اب آگ لگائی تیری
مجھ سے کرتی ہے وہ باتیں شب تنہائی میں
دل کے کمرے میں جو تصویر سجائی تیری
سامنے تیرے مجھے کھینچا گیا سولی پر
وائے افسوس! ذرا آنکھ نہ بھر آئی تیری
اپنی دولت پہ تو کرتا ہے تکبر کتنا
حشر میں تجھ کو رلائے گی کمائی تیری
بزم مبہوت ہوئی تیرے تکلم سے حکیم
یاد رکھیں گے غزل لوگ سنائی تیری
(حکیم خان حکیم..........کامل پور موسیٰ)

بال بکھرائے وہ گم صم یوں کھڑا ہے جیسے
ہجر سے واسطہ اس کو بھی پڑا ہے جیسے
اس کی آنکھوں میں لہو اترا نظر آتا ہے
رات بھر نیند سے لگتا ہے لڑا ہے جیسے
باخبر اچھی طرح آندھی کی فطرت سے ہے یہ
پھر بھی گل خود ہی بکھرنے پہ اڑا ہے جیسے
تیری پیشانی میرے ہونٹوں کے دم سے روشن
چاند ماتھے پہ تیرے میں نے جڑا ہے جیسے
میرے اپنوں نے دیا زخم مجھے یوں راغب
ساری دنیا میں میرا دل ہی بڑا ہے جیسے
(راغب عثمان کیانی..........راولپنڈی)

دولت نہ ملک و مال نہ عزو وقار دے
میں تیرا بن سکوں، مجھے یہ افتخار دے
تم سے کوئی سوال نہیں، حاکمان وقت!
جو کچھ میں چاہوں وہ مجھے پروردگار دے
خاموش رہ کے میں نے گزاری تمام رات
میرے لبوں کو نغمہ، صبح بہار دے
ہے بے قرار جس کے لئے روح شاعری
یارب! وہ شعر تو میرے دل میں اتار دے
عمر عزیز جیسی کٹی، کٹ گئی امتیاز
باقی ہے جو وہ اس کی طلب میں گزار دے
(ایس امتیاز احمد..........کراچی)

جب تو پیدا ہوا کتنا مجبور تھا
یہ جہاں تیری سوچوں سے بھی دور تھا
ہاتھ پاؤں بھی تیرے اپنے نہ تھے
تیری آنکھوں میں دنیا کے سپنے نہ تھے
تجھ کو آتا تھا جو صرف رونا ہی تھا
دودھ پی کے تیرا کام صرف سونا ہی تھا
تجھ کو چلنا سکھایا تھا ماں نے تیری
تجھ کو دل میں بسایا تھا ماں نے تیری
ماں کے سائے میں پروان چڑھنے لگا
وقت کے ساتھ ساتھ قد تیرا بڑھنے لگا
دھیرے دھیرے تو کڑیل جوان ہوگیا
تجھ پہ سارا جہاں مہربان ہوگیا

بازو زور پر تو بات۔ کرنے لگا
خود ہی سجنے لگا خود سنورنے لگا
ایک دن ایک حسینہ تجھے بھاگئی
بن کے دلہن وہ پھر تیرے گھر آگئی
فرض اپنے سے تو دور ہونے لگا
بیج نفرت کا خود ہی بونے لگا
پھر تو ماں باپ کو بھلانے لگا
تیر باتوں کے پھر تو چلانے لگا
بات بے بات ان سے تو لڑنے لگا
قاعدہ اک نیا پھر تو پڑھنے لگا
یاد کر تجھ سے ماں نے کہا ایک دن
اب ہمارا گزارہ نہیں تیرے بن
سن کے یہ بات تو طیش میں آگیا
تیرا غصہ تیری عقل کو کھا گیا
جوش میں آکے تو نے ماں سے کہا
میں تھا خاموش سب دیکھتا ہی رہا
آج کہتا ہوں پیچھا میرا چھوڑ دو
جو ہے رشتہ میرا تم سے وہ توڑ دو
جاؤ جا کے کہیں کام دھندا کرو
لوگ مرتے ہیں تم بھی کہیں جاؤ
بیٹھ کر آہیں بھرتے تھے وہ رات بھر
ان کی آہوں کا تجھ پر ہوا نہ اثر
ایک دن باپ تیرا چلا روٹھ کر
کیسے بکھری تھی پھر تیری ماں ٹوٹ کر
پھر وہ بے بس اجل کو بلاتی رہی
زندگی اس کو ہر پل ستاتی رہی
ایک دن موت کو بھی ترس آگیا
اس کا رونا بھی تقدیر کو بھا گیا
اشک آنکھوں میں تھے وہ روانہ ہوئی
موت کا ایک ہچکی بہانہ ہوئی
اک سکوں اس کے چہرے پہ چھانے لگا
پھر تو میت کو اس کی سجانے لگا
مدتیں ہوگئیں آج بوڑھا ہے تو
جو پڑا ٹوٹی کھٹیا پہ کوڑا ہے تو
تیرے بچے بھی اب تجھ سے ڈرتے نہیں
نفرتیں ہیں محبت وہ کرتے نہیں
درد میں تو پکارے کہ او میری ماں
تیرے دم سے ہی روشن تھے دونوں جہاں
وقت چلتا رہا وقت رکتا نہیں
ٹوٹ جاتا ہے وہ جو کے جھکتا نہیں
بن کے عبرت کا اب تو نشان رہ گیا
ڈھونڈ لے زور تیرا کہاں رہ گیا
تو احکام ربی کو بھلاتا رہا
اپنے ماں باپ کو تو ستاتا رہا
کاٹ لے تو وہی تو نے بویا تھا جو
تجھ کو کیسے ملے تو نے کھویا تھا جو
یاد کرکے گیا دور رونے لگا
کل جو تو نے کیا آج ہونے لگا
موت مانگے تجھے موت آتی نہیں
ماں کی صورت نگاہوں سے جاتی نہیں
تو جو کھانسے تو اولاد ڈانٹے تجھے
تو ہے ناسور سکھ کون بانٹے تجھے
موت آئے گی تجھ کو مگر وقت پر
بن ہی جائے گی تیری قبر وقت پر
قدر ماں باپ کی گر کوئی پہچان لے
اپنی جنت کو دنیا میں پہچان لے
اور لیتا رہے وہ بڑوں کی دعا
اس کے دونوں جہاں اس کا ماضی خدا
یاد رکھنا تو میری اس بات کو
بھول جانا نہ رحمت کی اس برسات کو
(انتخاب: شبانہ ملک.........فیصل آباد)

جو دل پہ لکھی رہ گئی وہ تحریر کس کی تھی
ٹوٹ کر بھی جو پیر سے لپٹی وہ زنجیر کس کی تھی
زمانوں کے زخم کردیئے محو زمانے میں الجھا کر
سوچتا ہوں اس قدر بر وقت تدبیر کس کی تھی
بس ایک ہی چہرہ رہا حاوی بصیرت کے پردوں پر لیکن
بس آئینہ اگر میں تھا تو تصویر کس کی تھی

جو زندگی کے سفر میں بچھڑے وہ مل جائیں پھر کسی موڑ پر
خواہش تو بہت شدید تھی لیکن ایسی تقدیر کس کی تھی
ٹوٹ ٹوٹ کر گرتا رہا لیکن بکھرا نہیں ذیشان
اس قدر گہری میری دعاؤں میں تاثیر کس کی تھی
(ذیشان اقبال عظمی.........کراچی)

تازہ تازہ درد ہے ابھی اسے بھرنے دو
عشق کی فضا گرم ہے ابھی اسے سرکنے دو
درد کا روگ تو مجھے لگ گیا
اب درد کی چادر مجھے اوڑھنے دو
چاہت کسی چیز کی نہیں رہی اب
درد میں مجھے رہنے دو درد مجھے پینے دو
تازہ تازہ درد ہے ابھی اسے بھرنے دو
ویراں دنیا بھی جنت لگی تھی تب
اب تو چین کھو گیا اور درد بڑھ گیا
زخمی دل مجھے مرنے دو اور مت جینے دو
تازہ تازہ درد ہے ابھی اسے بھرنے دو
عشق کی فضا گرم ہے ابھی اسے سرکنے دو
(محمد عثمان علی.........میاں چنوں)

زندگی کی راہوں میں ایک تمنا لئے بیٹھے ہیں
زبان پہ پیار کا اقرار لئے بیٹھے ہیں
کبھی آئے تو کہہ دیں گے ہم بھی اس کو
کہ ہر وقت اس کا انتظار کئے بیٹھے ہیں
بہار کے پھولوں کی مہک اچھی نہیں لگتی
اس کے بالوں کی مہک کی آس لئے بیٹھے ہیں
وہ تو خوش ہے اس کو تو کچھ غم ہی نہیں
ہم تو دل میں جدائی کا درد لئے بیٹھے ہیں
کتنا حسین اس کا چہرہ ہے حسن
کہ ایک ہی نظر میں اپنا دل دیئے بیٹھے ہیں
(محمود الحسن.........چارسدہ)

تمہارا ساتھ مل جائے تو سب دکھ بھول جاؤں گی
وہ کہتی تھی کہ ہر صورت تمہیں اپنا بناؤں گی
نچھاور خواب کردوں گی تمہارے ہر اشارے پر
کبھی پیپل کی چھاؤں میں کبھی ندیا کنارے پر
تمہیں ٹھنڈک عطا کردوں گی اک برسات کی مانند
بکھرتے چاند جھرنوں میں اجلتی رات کی مانند
مجھے تم سے محبت ہے میں لوگوں کو بتاؤں گی
وہ کہتی تھی کہ ہر صورت تمہیں اپنا بناؤں گی
میں چاہوں گی تمہیں جاناں امنگوں سے اجالوں تک
خودی کے دشت سے لے کر نئے جنموں کے سالوں تک
میری ٹھنڈی سی تنہائی سلگتی رات جیسی ہو
مجھے بس ساتھ لے جاؤ بھلے بارات جیسی ہو
تمہارے سرخ جوڑے میں ہی دلہن بن کے آؤں گی
وہ کہتی تھی کہ ہر صورت تمہیں اپنا بناؤں گی
مجھے تم سے محبت ہے میں لوگوں کو بتاؤں گی
وہ کہتی تھی کہ ہر صورت تمہیں اپنا بناؤں گی
(رانا ظفر اقبال.........جنڈانوالہ)

محبت اس طرح جیسے گلابی تتلیوں کے پر
محبت زندگی کی جبین ناز کا جھومر
محبت آرزو کی سیپ کا انمول سا گوہر
محبت آس کی دھوپ میں امید کی چادر
محبت ہیں تیرے گیسو، تیری پلکیں، تیری آنکھیں
محبت ہیں باتیں، محبت تیری سوغاتیں
محبت ہیں تمہارے ہجر اور وصال کی راتیں
محبت ہے تیری دھڑکن، محبت ہیں تیری سانسیں
محبت تیری خاموشی، تمہاری بات جیسی ہے
محبت کو اگر سمجھو، تمہاری ذات جیسی ہے
(شعیب شیرازی.........جوہر آباد)

یہ حسن کی بلائیں کہاں سے آئی ہیں
یہ کاغذی ادائیں کہاں سے آئی ہیں
جہاں دیکھتی ہیں وہاں ہول سناٹا ہے
یہ جادوئی نگاہیں کہاں سے آئی ہیں
جدھر سے گزرتی ہیں دل غائب کرتی ہیں
یہ کم بخت جفائیں کہاں سے آئی ہیں

یہ امبر چمکتا ہوا مثل روز صاف و عیاں ہے
زلفوں کی گھٹائیں کہاں سے آئی ہیں
نہ زندان نہ ہاتھ کڑیاں نہ بیڑیاں دلکش
مگر میری سزائیں کہاں سے آئی ہیں
(دلکش امیر پوری..........لودھراں)

تمہارا یوں روٹھ جانا مجھے اچھا لگتا ہے
پھر میرا وہ تم کو منانا مجھے اچھا لگتا ہے
لوگ اس کو پیار نہیں کہتے لیکن تمہارا
وہ کسی بات پر آزمانا مجھے اچھا لگتا ہے
میرا تجھ سے ملنا اور پیار بھری باتیں کرنا
تمہارا کسی بات پر شرمانا مجھے اچھا لگتا ہے
پہلے نظریں ملا کر تمہارا پھر وہ ایم
مسکرا کر نظریں چرانا مجھے اچھا لگتا ہے
تمہارا وہ چھوٹی سی بات پر غصہ کرنا
پھر میری طرف دیکھ کر مسکرانا مجھے اچھا لگتا ہے
(ایم مجاہد لیاقت..........ملتان)

کبھی ہم سا کوئی باوقار ملے تو کہنا
ہم سخن ہم سا ہمنوا ملے تو کہنا
جس کے لفظوں میں ہو وفا کی خوشبو
جس کی غزلوں میں دعا ملے تو کہنا
جو لگا دے کنارے پر کشتی تیری
کوئی طوفانوں میں ایسا ملا تو. کہنا
جو خواب بیچ کر خوشیاں لا دے تجھ کو
کوئی ایسا سوداگر تجھے آ ملے تو کہنا
جو بچھڑ کر تجھ سے ایک پل جی سکے
کوئی عاشق ایسا باوفا ملے تو کہنا
(محمد بشیر احمد پرواز..........جنڈانوالہ)

میری خاطر اپنی آنکھوں کو سوگوار مت کرنا
میں اک خشک پیڑ ہوں میرا انتظار مت کرنا
اس سے آگے فتووں کی بات چلتی ہے
اس سے آگے کا تم سفر اختیار مت کرنا
خدا تو خدا ہے بھوکا نہیں وہ عبادتوں کا
خطیب کچھ بھی کہیں تم اعتبار مت کرنا
خیال خاطر یاراں رہے مگر......
کسی کا دامن تار تار مت کرنا
اپنے حصے کی بھی خوشیاں بانٹ دینا لوگوں میں
پر جو اپنے زخم دل کے ہیں انہیں شمار مت کرنا
(محمد آصف شہزادالہ آبادی..........تھینگ موڑ ضلع قصور)

صبح سویرے جو میری آنکھ کھلی
تھی پاس میرے میری جنت بیٹھی
بولی اٹھ جا نماز فجر ادا کر
کچھ راضی رب رسولؐ کو بھی کیا کر
میں نے کہا تو راضی تو سب راضی
میری جنت نے کہا نہیں وہ راضی تو میں راضی
میں ہنس کے اٹھ گیا پانی سے خود کو کرنے لگا پاک
دیکھا وہ ہستی تھی سجدے میں گری
کہہ رہی تھی مولا اے میرے مولا
میرے جگر کے ٹکڑے کو جہاں بھر کی خوشیاں دو
غموں سے کبھی میرے لال کا واسطہ نہ پڑے
دکھوں سے زندگی بھر پالا نہ پڑے
بس اتنا کہا تھا میری ماں نے
پھر دعائیں مانگنے والی مجھے تنہا کر گئی
(مبشر علی حیدر..........شمس آباد حضرو۔اٹک)

یہ تو بتا میرے دل کو سکون کب ہوگا
دیوانے ہیں جو دن رات پھرتے ہیں ہم
شام کے گہرے سائے اب تو ڈھلنے لگے ہیں
لوٹ کر اب شہر وفا میں آتے ہیں ہم
تپش تیرے ہجر میں سورج سے بھی زیادہ
ٹوٹے ہوئے دل سے اکثر فریاد کرتے ہیں ہم
ہر پل زمانہ نگاہیں بدلتا ہی رہا ہے
قدم قدم زندگی میں یوں دھوکا کھاتے ہیں ہم
دل سمندر دیکھا نہیں کسی کا ہم نے جاوید
شہر ظلمت میں جی کو لگاتے ہیں ہم
(محمد اسلم جاوید..........فیصل آباد)
☆☆

انداز بدل ڈالا
ہمراز بدل ڈالا
انجام کا خطرہ تھا
آغاز بدل ڈالا
موسم کے بدلتے ہی
یہ ساز بدل ڈالا
جو راز نہ رکھ پایا
ہمراز بدل ڈالا
رانا یہ بتا کس نے
دمساز بدل ڈالا
(قدیر رانا.....راولپنڈی)

تشنگی کے عذاب سہتا ہے
یہ سمندر بھی کتنا پیاسا ہے
مجھ سے ملنے تمہاری یاد کے ساتھ
چاند ہر روز چھت پہ آتا ہے
خواہشوں کے اندھیرے جنگل میں
اک ستارہ سا ٹمٹماتا ہے
اپنا ہر رنج ڈال دو اس میں
دل ہمارا کنوئیں سے گہرا ہے
کتنا خود سر دیا ہے خواہش کا
آندھیوں میں بھی جلتا رہتا ہے
اک تعلق ہے، عشق ہے کہ لگاؤ
جانے ہم تم میں کیسا رشتہ ہے
میرے وہم اور ترے گمان کے بیچ
اک مکمل یقین رہتا ہے
(حمیرا راحت.....کراچی)

تنہا اداس لمحوں میں
سرد گہری خاموش راتوں میں
رہنے والے غمزدہ لوگ
ڈھونڈتے ہیں خوشیوں کو
قہقہوں کی بارش میں
ان کہی باتوں میں
سب سراب لگتا ہے
کچھ نہیں ملتا
سب خواب لگتا ہے
اچھا لگتا ہے
شام ڈھلے
تیز بارشوں میں
تمہیں سوچنا
تیرے سنگ چلنا
کبھی نہ رکنا کبھی نہ تھکنا
تپتی دوپہروں میں
گھنے پیڑوں کے سائے میں
دسمبر کی گلابی سردیوں کی
دھوپ میں
بیٹھے رہنا اور تمہیں سوچنا
اچھا لگتا ہے
(نگہت اکرم......لاہور)

وہ خلش رہی معذوری ہے صنم
یہی اس عشق کی مزدوری ہے صنم
اک ملاقات ضروری ہے صنم
وہی ہاتھ میں وہی جام ہے
وہی شراب انگوری ہے صنم
اک ملاقات ضروری ہے صنم
منیر رہ میں بھی گیا ہوں آدھا
رہی تو بھی ادھوری ہے صنم
اک ملاقات ضروری ہے صنم
وہی فاصلہ ہے دل سے دل کا
وہی تڑپ وہی دوری ہے صنم
اک ملاقات ضروری ہے صنم
میں نے مانا کہ تو ہے مجبور بہت
مگر میری بھی مجبوری ہے صنم
اک ملاقات ضروری ہے صنم
وہی داغ ہیں دل میں میرے
وہی سب زخم ناسوری ہیں صنم
اک ملاقات ضروری ہے صنم
میں ہوں رانجھا وہی ہیر ہے تو
وہی بیلا وہی چوری ہے صنم
اک ملاقات ضروری ہے صنم
تیری اک نشانی تھی پاس میرے
وہی ٹوٹی ہوئی چوڑی ہے صنم
اک ملاقات ضروری ہے صنم
(منیر احمد ساغر......میاں چنوں)

آج پھر ایک دھوم سی مچادے
خوش ہو کر ہمیں وہ ایک گیت سنادے
وہ گیت جسے سنکر ہمیں سرور پیدا ہوتا ہے
آ آج ہمیں تھوڑا سا ہنسادے
یوں تیرے ہنسنے سے ہمیں چین نہیں آتا
آج تو وہ سارے گیت ہمیں سنادے
ہمیں تو ایسا گیت سنا کہ ہم تیرے ہی ہو جائیں
آ آج تو کوئی نیا جادو تو جگادے
ہم خود بھاگتے ہیں کسی اور کی جانب واجد
آ آج تو ہمیں اپنا دیوانہ بنالے
ہم وہ ٹھنڈک چاہتے ہیں جو تجھ میں ہے واجد
آ آج تو ہمیں اپنے سینے سے لگالے
جیسے کوئی تجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے واجد
آ آج تو بھی ہمیں ایسا ہنسادے
وہ راہیں واجد جن پر ہم چل کر آئیں خوشی خوشی
انہیں راہوں پہ تو اپنی پلکیں بچھادے
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی......کراچی)

ظالم کے آگے سر کو جھکایا نہ جائے گا
کشمیر پہ یہ جبر بھلایا نہ جائے گا
فرعونیت کے حامیو اک وقت آئے گا
تم سے تمہارا درد دکھایا نہ جائے گا
بچ جائیں برائی سے بھلائی کا ساتھ دیں
اٹھو یہ قول پھر تو سنایا نہ جائے گا
کشمیر کے بیٹوں نے جسے خوں سے جلایا
"دشمن سے وہ چراغ بجھایا نہ جائے گا"
گزرا ہے بڑا عرصہ غلامی میں ہمارا
رضوان اب تو ہم کو دبایا نہ جائے گا
(انتخاب: انیس احمد......راولپنڈی)

نہ مجھ کو یاد کرنا نہ مجھ کو یاد آنا
ہو سکے تو مجھ کو بھول جانا
نہ رونا سینے سے لگا کر میری نشانیاں
مجھ کو بہت مجبوریاں ہیں میرے دل جانیاں
جو بنوائے تھے ہم نے اکٹھے فوٹو وہ نہ کسی کو دکھانا
ہو سکے تو میرے دلبر جانی مجھ کو بھول جانا
جو لکھی تھی مقدر کی وہ پڑی ہے جھولی
معاف کردینا اگر کوئی بری بات ہو منہ سے بولی
نہ پیار والی باتیں کسی کو بتانا
نہ مجھ کو یاد کرنا نہ مجھ کو یاد آنا
ہو سکے تو میرے دلبر جانی مجھ کو بھول جانا
(مہر غلام مصطفیٰ شاہین......ساہوکا)

کیا کیا غم اٹھائے ہیں تیری خاطر
اشکوں کے دریا بہائے ہیں تیری خاطر
ٹھکرادیا اپنوں کو بے دردی سے
الجھ پڑا عظیم رشتوں سے تیری خاطر
اک حسرت لئے دل میں پروان چڑھی تھی
مسل دیا معصوم کلی کو تیری خاطر
پوچھتے ہیں لوگ میری اداسی کا مطلب
چپ رہا تیری رسوائی کے ڈر سے تیری خاطر
برگ آوارہ کی طرح مقام بدلتا رہا
کھو بیٹھا ہوں منزل اپنی تیری خاطر
آج اس شہر کی بہت یاد آئی عظیم
چھوڑ دیئے ہیں در و دیوار تیری خاطر
(عظیم خان سیلاچی......کادس تلی، بلوچستان)

ہر چند کہ پژمردہ گل ہوں
زباں سے خموش بے تاب دل ہوں
وائے نادانی! میں زباں سے خاموش ہوگیا
کبھی، داغ سینے میں رکھنے والا گل ہوں
اے خدایا! مجھے بھی لب گفتگو دے
آج میں صدا دینے سے مضمحل ہوں
نکل رہی ہے صدا ہر چاک سے مرے
نالہ تھاموں کیسے چاک صد گل ہوں

گلزار ہستی میں مجھے جوئے نغمہ خواں کردے
تاثیر نالہ سے چمن کے ہر چشمے کو چشمہ حیواں کردے
تو بھی نغمہ خواں ہو بلبل کہ مغرور زباں نہیں
آتا تو ہے نالہ ترے لب پہ مگر درد زباں نہیں
بھول جا تو چند ساعت کی بوئے گل کو
اے ناداں! یہ شاخ نازک ترا آشیاں نہیں
فراق گل میں تو ہوتی ہیں چشم تر تریں
روٹھے گر باغباں تجھ سے تو دل ترا نالاں نہیں
تو کیوں پریشان ہے اے شرمندہ گل
چمن کی کلی بے حجاب، حسن ذرا نہاں نہیں
(ساجد پرویز آنس......سلانوالی)

میں تیرے بغیر ادھورا ہوں
جیسے مچھلی بنا تالاب کے
جیسے آکاش بنا ماہتاب کے
جیسے گلشن بنا گلاب کے
جیسے مدرسہ بنا کتاب کے
میں تیرے بغیر ادھورا ہوں
جیسے سمندر بنا پانی کے
جیسے دریا بنا روانی کے
جیسے انساں بنا جوانی کے
جیسے بچہ بنا نادانی کے
میں تیرے بغیر ادھورا ہوں
جیسے بلبل بنا چمن کے
جیسے روح بنا بدن کے
جیسے چاند بنا کرن کے
جیسے شاعر بنا سخن کے
میں تیرے بغیر ادھورا ہوں
جیسے عابد بنا عبادت کے
جیسے سخی بنا سخاوت کے
جیسے زندگی بنا چاہت کے
جیسے قاضی بنا عدالت کے
میں تیرے بغیر ادھورا ہوں
جیسے کائنات بنا انساں کے
جیسے دل بنا ارماں کے
جیسے مسلمان بنا ایماں کے
جیسے مسجد بنا اذان کے
میں تیرے بغیر ادھورا ہوں
جیسے آنکھ بنا بینائی کے
جیسے سلطان بنا دانائی کے
جیسے عشق بنا جدائی کے
جیسے نیکی بنا بھلائی کے
میں تیرے بغیر ادھورا ہوں
جیسے پھول بنا خوشبو کے
جیسے منزل بنا جستجو کے
جیسے زباں بنا گفتگو کے
جیسے نماز بنا وضو کے
میں تیرے بغیر ادھورا ہوں
جیسے عادل بنا منصفی کے
جیسے زیست بنا بندگی کے
جیسے سورج بنا روشنی کے
جیسے امام بنا مقتدی کے
میں تیرے بغیر ادھورا ہوں
جیسے راگنی بنا راگ کے
جیسے شعلہ بنا آگ کے
جیسے دلہن بنا سہاگ کے
جیسے ناگن بنا ناگ کے
میں تیرے بغیر ادھورا ہوں
جیسے صابر بنا صبر کے
جیسے شاکر بنا شکر کے
جیسے درویش بنا فقر کے
جیسے اجالا بنا سحر کے
میں تیرے بغیر ادھورا ہوں
جیسے نیام بنا شمشیر کے
جیسے کمان بنا تیر کے
جیسے قفس بنا اسیر کے
جیسے جماعت بنا تکبیر کے
میں تیرے بغیر ادھورا ہوں
(انتخاب: انتظار خان بلوچ......خوشاب)
☆☆

شکست

شائستہ سحر-راولپنڈی

نوجوان کی آواز سنائی دی۔ "میں نے بچے کو دل و جان سے بڑھ کر چاہا، اس کو سگے باپ سے بڑھ کر پیار دیا، مگر قدرت کے کھیل دیکھو کہ اچانک ایک باپ نے اپنے بیٹے کو مار دیا، تم ہار چکے ہو! تم شکست کھاچکے ہو۔"

خودغرضی انسان کی زندگی کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیتی ہے، کہانی پڑھ کر پتہ چلے گا "کیا یہ حقیقت ہے؟"

انسپکٹر شاہد اپنے ایک ماتحت آفیسر کے ساتھ کسی کیس پر بحث کر رہا تھا کہ اس دوران ایک پریشان حال شخص کمرے میں داخل ہوا، وہ پینتیس برس کا خوش شکل جوان تھا مگر اس وقت اس کے چہرے پر جو غم و ملال کی کیفیت تھی وہ ان دونوں پولیس آفیسروں کو چونکائے بغیر نہ رہ سکی۔

"مجھے آپ کے سامنے ایک اقرار کرنا ہے۔" وہ شخص تھکے ہوئے لہجے میں بولا......

انسپکٹر شاہد نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ شخص کرسی پر کسی خستہ حال عمارت کی طرح گر سا گیا۔

"ہاں اب بولو" انسپکٹر شاہد نے بڑے غور سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا......

وہ شخص دکھ سے بولا "میری کہانی بہت لمبی ہے۔ انسپکٹر صاحب! میں نے دو قتل کئے ہیں! آپ

مجھے سزا دیں!"

"قتل" کے اقرار نے ان دونوں کو ایک بار پھر چونکا دیا، تاہم انسپکٹر شاہد نے تحمل مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "قانون ایسے کسی کو سزا نہیں دیتا، تمام حقائق کو جاننا چاہتا ہے، تم تفصیل سے بتاؤ کہ اصل بات کیا ہے؟"

وہ شخص ماضی کی پرتیں کھولتے ہوئے گویا ہوا "میرا نام سلیم ہے، آج سے تقریباً گیارہ سال پہلے میری نفیسہ نامی عورت سے شادی ہوئی تھی، میرے جرم کا تعلق اس عورت سے بہت گہرا ہے۔ میرے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا، یہ رشتہ بھی ایک رشتے کروانے والی عورت نے کروایا تھا، نفیسہ شروع دن سے مجھ سے خوش نہیں تھی حالانکہ وہ خود بھی کچھ خاص شکل کی نہ تھی...... میں اس کے مقابلے میں کہیں بہتر تھا مگر میں خدا کی رضا میں صابر و شاکر رہنے والا بندہ تھا...... ہماری شادی کو ایک سال ہوگیا اور میں ایک پیارے سے بچے کا باپ بھی بن گیا...... میری نظر میں یوں نفیسہ کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی تھی...... میں پہلے سے زیادہ اس کا خیال رکھنے لگا تھا، مجھے اپنی بیوی اور بچے پر محیط چھوٹی سی دنیا کسی جنت سے کم نہ لگتی تھی کیونکہ میں برسوں سے اکیلا تھا اور قلبی رشتوں کے لئے ترسا ہوا تھا......

بچے کا نام میں نے کاشف رکھا تھا...... نفیسہ نے اس ایک سال کے عرصے کے دوران کافی حد تک حالات سے سمجھوتہ کرلیا تھا اور میرے آرام و سکون کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھی مگر اس کے ساتھ ہی اس کی مہنگے اور قیمتی ملبوسات اور زیورات کی فرمائش کبھی کبھی مجھے چکرا کر رکھ دیتی تھیں...... میرا شوروم تھا شادی سے پہلے میں جتنی آمدنی اس شوروم سے حاصل کرتا تھا اب وہ میرے لئے کچھ نہ رہی تھی کیونکہ اب نفیسہ کی فرمائشیں پوری کرتے ہوئے نصف سے زیادہ حصہ خرچ ہو جاتا تھا مگر میں نے نفیسہ کی خوشی کے لئے کبھی ماتھے پر بیزاری سے بل نہیں ڈالا تھا۔ میں تو یہی چاہتا تھا کہ وہ ہر طرح سے مجھ سے خوش رہے مگر وہ مطمئن نہیں تھی شاید میری آمدنی کی وجہ سے! میں نے یہی سوچ کر ملک سے باہر جا کر کام کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے شوروم کو بیچ کر اپنے ایک دوست کے پاس سعودی عرب چلا گیا۔ وہاں میرے دوست کا اپنا شوروم تھا اور وہ ایک عرصے سے اس کاروبار سے وابستہ تھا۔ تجربہ تو میرا بھی زیادہ تھا اس لئے میں نے اس کے ساتھ ہی کام کرنا شروع کردیا اور ہر ماہ ہونے والی آمدنی کا ایک معقول حصہ نفیسہ کو بھجوا دیا کرتا تھا اور یوں مجھے سعودی عرب گئے ابھی چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ نفیسہ کی طرف سے طلاق کا مطالبہ آگیا......

میں سخت حیران و پریشان تھا کہ "وہ یہ سب کیوں کررہی ہے؟"

جب اس سے میری فون پر بات ہوئی تو اس نے انتہائی ڈھٹائی سے کہہ دیا "میں تمہارے ساتھ اب ایک پل بھی نہیں رہ سکتی مجھے طلاق دے دو"

میں اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ "اللہ کی بندی تمہیں مجھ سے کیا تکلیف پہنچی ہے؟ جو تم مجھ سے طلاق چاہتی ہو مجھے بتاؤ، میں نے کون سی تمہاری ضرورت کو پورا نہیں کیا؟"

وہ غصے سے بولی۔ "میں بتا چکی ہوں کہ میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی، میں تمہارے ساتھ خوش نہیں ہوں بس یہی وجہ ہے"

میں جواباً قدرے غصیلے لہجے میں بولا...... "میری ایک بات تم بھی کان کھول کر سن لو، میں تمہیں طلاق ہرگز نہیں دوں گا......"

"تم مجھے واقعی طلاق نہیں دو گے؟" نفیسہ عجیب سے لہجے میں بولی......

"ہاں کسی قیمت پر نہیں دوں گا" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"تم مجھے طلاق دو گے ورنہ!" نفیسہ نے دھمکی آمیز لہجے میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ورنہ کیا؟ کیا کرو گی تم؟" میں بلند آواز میں جیسے تقریباً چیخ پڑا......

"مار دوں گی تمہارے بچے کو، گلا دبا دوں گی اس

کا" وہ سفاکی سے چلائی اور میں اس کی بات سن کر سناٹے میں آگیا...... "کیا کوئی ماں اپنے بچے کے بارے میں ایسا کہہ سکتی ہے؟"

میں حیران و پریشان دھیمے لہجے میں اس کو ملامت کرتے ہوئے بولا "نفیسہ کیا وہ تمہارا بچہ نہیں ہے؟"

نفیسہ کی سخت مگر لرزتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی...... "ہاں وہ میرا بچہ ہے، میرا خون ہے مگر میری خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ بھی ہے اور میں اپنی خوشی کی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو ملیامیٹ کردوں گی سنا تم نے! اب میں تمہیں سوچنے کے لئے دو دن دے رہی ہوں، اس کے بعد نتائج کے ذمہ دار تم خود ہو گے" وہ چپ ہوگئی......

میں مزید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر دوسری طرف سے رابطہ منقطع کیا جا چکا تھا۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ نفیسہ سے دوبارہ رابطہ کرسکوں گا مگر اس نے فون نہیں اٹھایا۔ نفیسہ کی کہی ہوئی ایک ایک بات کسی تیز دھار تلوار کی مانند میرے دل و دماغ پر گھاؤ لگاتی جارہی تھی...... اس نے مجھے بچے کو مار دینے کی دھمکی تک دے ڈالی تھی مگر میں جانتا تھا کوئی ماں ایسا ہرگز نہیں کرسکتی۔ میں نے یہی سوچتے ہوئے ایک بار بھی اپنے فیصلے پر نظر ثانی نہیں کی۔ ٹھیک دو دن بعد نفیسہ کی کال آئی......

"تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" وہ سخت لہجے میں بولی......

میں جواباً قدرے خشک لہجے میں بولا "مجھے کوئی اور فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب ایک بار کہہ دیا کہ طلاق نہیں دوں گا تو بس پھر نہیں دوں گا، تم بے شک چیختی چلاتی رہو۔"

"بہت پچھتاؤ گے تم" نفیسہ نے غصے سے جیسے چنگھاڑتے ہوئے لہجے میں کہا اور رابطہ منقطع کردیا...... میں نے نفیسہ کی ہر بات کو نظر انداز کردیا اگر بچے کا معاملہ نہ ہوتا تو شاید میں اس پر طلاق نہ دینے کا جبر نہ کرتا کیونکہ میں جانتا تھا وہ میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی یہ میری مجبوری تھی، میں ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کررہا تھا تاہم میں حیران تھا...... "آخر نفیسہ یوں اچانک ایک دم طلاق کا مطالبہ کیوں کررہی ہے؟"

یہ تو مجھے نفیسہ کے ساتھ شادی کے بعد ہی پتہ چل چکا تھا وہ مجھ سے خوش نہیں، میری والہانہ محبتوں کے باوجود وہ مجھ سے کبھی خوش نہیں رہی تھی...... میرے نزدیک کسی مرد کی بڑی بدنصیبی یہی ہوتی ہے جب وہ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اپنی بیوی کے دل کا مالک نہ بن سکے......

میں حقیقت میں وہ بدنصیب تھا جو نفیسہ کو حاصل کرکے بھی حاصل نہ کر پایا تھا...... میں نے اس کی محبت اور توجہ حاصل کرنے کے لئے کیا، کیا نہ کیا تھا، اپنا سکھ چین سب اس پر نچھاور کردیا تھا، اس کی ضروریات پوری کرنے کے لئے مشین بن گیا تھا کیونکہ دن رات کام میں جتا رہتا تھا مگر پھر بھی ناکام رہا تھا وہ مجھ سے طلاق مانگ رہی تھی......

میری نوازشوں کو ٹھکرا کر مجھے دھتکار رہی تھی اور میں پھر بھی اس کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا، صرف اپنے معصوم بچے کے لئے......!

میں وہ منحوس دن کبھی نہیں بھول سکتا...... اس دن صبح سے میری طبیعت بوجھل تھی کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا...... شام کے وقت میرے دوست امتیاز کی کال آئی۔ امتیاز میرا پڑوسی بھی تھا اور اس کو وطن سے رخصتی سے قبل میں تاکید کرکے آیا تھا کہ وہ نفیسہ کا خصوصی خیال رکھے۔ امتیاز نے ہی مجھے دل دہلا دینے والی اطلاع دی......

"سلیم غضب ہوگیا، تمہارا بیٹا راتوں کو آگ میں جل کر مر گیا ہے اور بھابھی بھی لاپتہ ہیں"

"کک...... کیا!" ریسیور میرے ہاتھ سے تقریباً چھوٹتے ہوئے بچا تھا "تو کیا نفیسہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا چکی ہے" منتشر سوچوں کے ایک طوفان نے میرے دل و دماغ کو گویا روند ڈالا......

"سلیم! امتیاز کی غم میں ڈوبی آواز پھر ابھری پلیز! حوصلہ رکھو! جس کمرے میں تمہارا بیٹا موجود تھا

آگ نے بری طرح سے اس کمرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا...... کاش! ہمیں پہلے پتہ چل جاتا...... آگ جب پھیلی تو ہمیں پتہ چلا......

تم بس جلد از جلد یہاں آنے کی کوشش کرو" ایناز مجھے تسلیاں دیتا رہا تھا۔ میں سب کچھ سن رہا تھا مگر سمجھ نہیں پا رہا تھا، دماغ صدمے کی وجہ سے شل ہو چکا تھا میں تہی دامن ہو کر رہ گیا تھا، مجھے یقین تھا کہ نفیسہ نے ہی میرے معصوم بچے کو بے دردی سے جلا ڈالا تھا۔ وہ کتنی ظالم درندہ صفت ماں تھی اسے اپنے ہی جگر کے ٹکڑے کو آگ میں جلاتے ہوئے رحم نہیں آیا تھا......؟

کاش! جب اس نے مجھ سے طلاق مانگی تھی، میں اس کی بات مان لیتا مگر اب پچھتانے سے کیا فائدہ تھا...... پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا میرا سب کچھ ڈوب گیا تھا، میں نے کوشش کی کہ جلد از جلد ملک واپس آسکوں مگر پھر بھی واپسی میں دو دن لگ گئے...... میں پاکستان پہنچا تو میرے معصوم لخت جگر کو مٹی کے سپرد کیا جا چکا تھا۔ میں اس کی ننھی سی قبر سے لپٹ کر اپنی بربادی کا خوب ماتم کرتا رہا تھا......

نفیسہ کے میکے والے بھی میرے گھر پہنچ گئے۔ جس کمرے میں معصوم بچے کو جلایا گیا تھا، وہ کمرہ مکمل طور پر، آگ کے بدترین اثرات سے متاثر ہوا تھا۔ کمرے میں موجود ہر چیز جل کر بھسم ہو چکی تھی......

نفیسہ کے والد یعنی میرے سسر بڑے دکھ سے ایک ایک چیز کا جائزہ لے رہے تھے پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے علیحدہ کمرے میں لے گئے...... ہم دونوں کچھ دیر چپ بیٹھے رہے پھر میرے سسر شرمندگی سے بولے "بیٹا ہم نہیں جانتے یہاں کیا ہوا اور کیوں ہو......؟ جیسے تم ایک پرائے دیس میں رہ کر نفیسہ کی حرکتوں سے لاعلم رہے بالکل اسی طرح ہم بھی لاعلم تھے، ہمیں اعتراف ہے کہ غلطی ہماری ہے، تم جیسے شریف اور باکردار شخص کے قابل نفیسہ نہیں تھی...... کاش! تم ملک چھوڑ کر نہ جاتے......

میں تمہیں کچھ حقائق سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں جو کہ نفیسہ کا ماضی ہے تاہم مجھے یقین ہے اس تمام حادثے سے ان حقائق کا گہرا تعلق ہے" وہ کچھ دیر کے لئے چپ ہو گئے...... "کس قسم کے حقائق؟" میں حیرت سے ان کو گھورتے ہوئے بولا......

وہ دکھی لہجے میں بولے...... "نفیسہ شادی سے قبل ایک لڑکے کو پسند کرتی تھی جو کہ ہمارے پڑوس میں ہی رہتا تھا، کسی بھی باپ کو اپنی بیٹی کے متعلق ایسی باتیں بتاتے وقت شرم سے ڈوب کر مر جانا چاہیے مگر میں تم سے اب کچھ پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔ وہ لڑکا نفیسہ کو ہرگز پسند نہیں کرتا تھا، مجھے جب اس بات کا پتہ چلا تو میں نے نفیسہ کو بہت مارا، اس پر سختی کی اور اس کا گھر سے نکلنا بند کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نفیسہ نے جنون کی حالت میں خودکشی کی کوشش کی اور اپنے دونوں ہاتھوں کی رگیں بلیڈ سے کاٹ ڈالیں......

بڑی مشکل سے نفیسہ کی جان بچائی گئی۔ نفیسہ کی خودکشی کی کوشش کی خبر پورے محلے میں پھیل گئی تھی اور اکثر لوگ اس خودکشی کی وجہ بھی جانتے تھے۔ وہ لڑکا جس کا نام الیاس تھا، اپنا سامان لے کر وہ کمرہ خالی کر گیا جو اس نے کرائے پر لیا تھا پھر وہ کہاں گیا کچھ پتہ نہ چل سکا، تاہم میں نے نفیسہ سے بات کرنا چھوڑ دی تھی گھر کا کوئی فرد اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا، اس کی وجہ سے جس پریشانی اور بدنامی کا سامنا مجھ سمیت میرے بیوی بچوں کو کرنا پڑ رہا تھا وہ ہم جانتے تھے......

نفیسہ پر بھی اچھا خاصا اثر ہوا تھا، بدنامی کا نہیں بلکہ اس لڑکے کے یوں اچانک چلے جانے کا ...... وہ گم صم رہنے لگی تھی، میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس کی شادی کر دی جائے، یہ خوش قسمتی تھی کہ تم جیسا شریف سعادت مند انسان ہمیں ملا مگر افسوس نفیسہ نے تمہاری قدر نہیں کی......"

میرے سسر کچھ دیر کے لئے چپ ہوئے۔ تھے پھر کچھ توقف کے بعد وہ بڑی مشکل سے بولے "مگر وہ لڑکا ایک ماہ پہلے ہی واپس آ گیا اور اس نے مجھ سے مل کر بڑی ڈھٹائی سے نفیسہ کا رشتہ مانگا تھا...... میں نے اس کو بہت بے عزت کیا اور یہ بھی بتا دیا کہ "نفیسہ نا صرف شادی شدہ ہو چکی ہے بلکہ اس کا ایک بچہ بھی ہے، یہ بات سن کر اس کو دھچکا لگا تھا وہ مزید کچھ کہے بغیر چلا گیا...... مجھے اس وقت یہی خدشہ تھا کہ وہ نفیسہ تک نہ پہنچ جائے...... مجھے شک ہے اس سارے معاملے سے اس لڑکے کا گہرا تعلق ہے۔ کاش! مجھے نفیسہ مل جائے تو میں ایسی بے حیا بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے گولی مار دوں" اتنا کہہ کر وہ تڑپ کر رو دیئے...... میں بھی سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میرے سسرال والے واپس چلے گئے تھے......

میں بیان نہیں کر سکتا کہ ان دنوں میری کیا حالت تھی سب کچھ لٹ جانے کا غم کس طرح سے مجھے اندر ہی اندر بھسم کر رہا تھا۔ میرے دوست امتیاز نے ہی مجھے بتایا کہ میری غیر موجودگی میں کوئی شخص نفیسہ سے ملنے آتا تھا اور کئی کئی گھنٹے وہ میرے گھر میں گزارتا تھا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ وہ شخص الیاس ہی ہوگا جس کو نفیسہ پسند کرتی تھی۔ امتیاز نے میری گھریلوں زندگی میں ہونے والی پیچیدگیوں کے پیش نظر مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ امتیاز کا یہ بھی کہنا تھا کہ اس نے اپنے طور پر نفیسہ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی اور اسے دھمکی بھی دی تھی کہ "وہ مجھے یہ سب کچھ بتا دے گا وہ جو کرتی پھر رہی ہے......"

جس کے جواب میں نفیسہ نے اسے بری طرح جھڑکا تھا اور بے عزت بھی کیا تھا۔ میں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ ان دونوں کو کتے کی موت ماروں گا...... اس دن کے بعد میری تلاش شروع ہو گئی۔ تقریباً ایک ماہ تک میں ان دونوں کی تلاش میں خوار ہوتا رہا تھا ان دونوں کو میں نے نا صرف اپنے شہر بلکہ آس پاس کے علاقوں میں بھی تلاش کیا۔ میں یہ بات جانتا تھا ان دونوں کا اتنی جلد ملنا ناممکن ہے کیونکہ وہ روپوش ہوں گے، یہ بھی ممکن تھا کہ وہ پاکستان کے کسی دور دراز کے علاقے میں جا چھپے ہوں اور میرے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ میں ان کو پورے ملک کا چپہ چپہ چھان کر تلاش کرتا......

میرے ایک ہمدرد دوست نے یہی مشورہ دیا کہ میں واپس سعودی عرب چلا جاؤں "مقدر میں ہوا تو وہ

خونی تابوت

وحشت اور دہشت کی کربناک چیخوں سے اچانک ماحول کو تھرا دینے والی سحر انگیز اور حیرت انگیز ساعت میں رواں دواں دلوں پر ڈر وخوف مسلط کرتی ماورائی مخلوق کی خونی کارستانیاں جو کہ دل و دماغ کو مبہوت کر دیں گی۔ قیمت =/300

کامیاب بک ڈپو نوید اسکوئر اردو بازار کراچی

دونوں خود بخود سامنے آجائیں گے ورنہ اللہ بدلہ لینے والا ہے" میں اس وقت مجبور تھا، اس مشورے کو ماننے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا سوائے دل پر پتھر رکھ کر میں دوبارہ سعودی عرب چلا گیا، وہاں میں تقریباً دس سال رہا، اس دوران میں نے اپنا غم غلط کرنے کے لئے خود کو کام میں مصروف کردیا۔ بہت کامیاب رہا بہت پیسہ کمایا اور آخر دس سال بعد میں نے اپنی سرزمین پر قدم رکھا۔ وطن واپس آنے کے بعد میں نے سب سے پہلے یہی کام کیا، اپنا گھر فروخت کردیا کیونکہ اس گھر میں میرا دم گھٹتا تھا، میرے معصوم بچے کی چیخیں بار بار مجھے لاشعوری طور پر ملامت کرتی تھیں کہ "میں کیسا باپ ہوں جو دس سال گزرنے کے باوجود اس کے سنگ دل قاتلوں کو سزا نہ دے پایا......"

مکان فروخت کرکے میں نے لاہور میں رہائش اختیار کرلی۔ میں نے اپنا گھر لیا اور اسی شہر میں اپنا شوروم کھول لیا۔ اور پوری لگن سے اپنے کام میں مگن ہوگیا۔ شب و روز اسی طرح تیزی سے گزرتے رہے۔ میں نے پھر کبھی شادی کے متعلق سوچا بھی نہیں کیونکہ عورت ذات سے میرا اعتماد اٹھ چکا تھا، سو میں نے تنہا ہی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا......

روزانہ صبح چہل قدمی کرنا میرا معمول تھا۔ ایک دن میں یونہی چہل قدمی کرنے نکلا تو ایک بہت ہی معصوم اور پیارے بچے کو دیکھ کر رک گیا...... وہ بچہ اسکول یونیفارم میں بیگ کندھے پر لٹکائے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے جارہا تھا اگر میرا بیٹا زندہ ہوتا تو اس جتنا یا اس سے بڑا ہوتا کیونکہ اس بچے کے دبلے پتلے وجود سے میں اس کی عمر کا ٹھیک طرح اندازہ نہ کرپایا تھا...... وہ بچہ میرے قریب سے گزرا اور اچانک بھاگ کر روڈ کے درمیان آگیا۔ ایک وین اسی لمحے سنسناتی ہوئی بڑی تیزی سے اس کی طرف آئی، اس سے پہلے کہ وہ اس کو کچلتی ہوئی گزر جاتی میں نے جست لگائی اور دونوں بازوؤں میں اس بچے کو سمیٹتا ہوا سڑک کی دوسری جانب جا گرا......

وہ بچہ میرے بازوؤں میں تھا اس لئے چوٹ سے محفوظ رہا تھا تاہم میرے جسم پر کئی خراشیں آئی تھیں اور بازو پر بھی چوٹ لگی تھی، وہ بچہ ڈر کے مارے مجھ سے لپٹ گیا تھا...... میں اسے پیار کرتے ہوئے محبت سے بولا "بیٹا روڈ پر دیکھ کر چلتے ہیں......"

اس بچے نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور اپنا ئیت سے بولا "انکل آپ نے تو مجھے بچا لیا ورنہ وہ گاڑی تو مجھے کچل دیتی آپ بہت اچھے ہیں۔"

میں سنبھل کر کھڑا ہوگیا اور اس کا یونیفارم جھاڑتے ہوئے بولا "بیٹا تم اسکول جارہے ہو، جلدی سے اسکول جاؤ ورنہ دیر ہوجائے گی......"

وہ مسکرایا "کیا آپ مجھے چھوڑنے اسکول جائیں گے؟"

میں جواباً مسکرایا "کیوں نہیں......" میں ویسے بھی واک کے لئے نکلا تھا...... "چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں......"

اس روز کے بعد تقریباً ہر صبح میں اس بچے سے ملتا تھا، میں صبح جب چہل قدمی کے لئے نکلتا تو وہ بچہ مجھے اپنا منتظر ملتا، میری اس ننھے سے بچے سے بہت زیادہ دوستی ہوگئی تھی اس بچے نے مجھے اپنا نام طلال بتایا تھا...... بقول طلال کے وہ نزدیک ہی کسی گھر میں رہتا تھا، اس کے ساتھ اس کے پاپا اور ایک بوڑھا ملازم رہتے ہیں اور اس کی ماما کی ڈیتھ ہوچکی ہے۔" طلال نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس نے اپنے پاپا سے اس حادثے کا بھی ذکر کیا جس سے میں نے اس کی جان بچائی تھی لیکن اس کے پاپا نے الٹا اس کو ڈانٹا تھا کہ وہ راستے میں دیکھ کر کیوں نہیں چلتا، اس لئے طلال نے میرا ذکر اپنے پاپا سے دوبارہ نہیں کیا کہ کہیں وہ اسے مجھ سے ملنے سے منع نہ کردیں......

وہ اکثر اپنے پاپا کی باتیں مجھ سے کیا کرتا تھا، اس کی باتیں سن کر میں غم و ملال کی کیفیت سے باہر آجاتا تھا......

ایک دن طلال نے مجھ سے کہا "میں آپ کو اپنے پاپا سے ملاؤں گا، آج شام آپ اسی جگہ آجانا، پلیز! میں نے کل رات آپ کا پاپا سے ذکر کیا تھا، وہ بھی

آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

میں نے مسکرا کر اس کے گال پر چٹکی بھری "کیا ضروری ہے آج ملوں پھر کبھی کیونکہ میں مصروف ہوتا ہوں"

وہ روٹھتے ہوئے بولا۔ "دیکھو دوست! اگر آپ شام کو یہاں نہ آئے تو میں آپ سے ہمیشہ کے لئے ناراض ہوجاؤں گا"

بچوں کی یہی معصوم باتیں تو دل کو اچھی لگتی ہیں۔ میں بھی اس کی خوشی کے لئے مان گیا پھر شام کو مجھے طلال اسی جگہ ملا، وہ شاید کافی دیر سے وہاں میرا انتظار کررہا تھا...... اس کے ہمراہ میں ایک بہت خوب صورت گھر کے مرکزی گیٹ میں داخل ہوا......

وہ میرا ہاتھ تھامے مجھے ڈرائنگ روم میں لے آیا اور خود اپنے پاپا کو بلانے چلا گیا۔ ڈرائنگ روم بڑی نفاست سے سجایا گیا تھا...... میں بڑے غور سے ڈرائنگ روم کی ایک ایک چیز کا جائزہ لیتے ہوئے بری طرح اچھل پڑا......

میرے سامنے ایک فریم میں جو تصویر آویزاں تھی ۔وہ نفیسہ کی تھی...... وہ تصویر میں ایک خوبرو نوجوان کا بازو تھامے کھڑی تھی اور ان دونوں کے سامنے ایک بچہ موجود تھا گو کہ تصویر میں اس کی عمر چار پانچ سال سے زیادہ نہ تھی مگر چہرے کے نقوش سے میں طلال کو فوراً پہچان گیا تھا......

میرے دماغ میں غصے و اشتعال سے ہلچل مچ گئی تھی۔ انتقام کا لاوا ایک بار پھر میرے اندر ابلنے لگا تھا، میں غصے سے اس تصویر کو گھور رہا تھا جس میں نفیسہ میری ہی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی اس کے چہرے پر بڑی زہریلی مسکراہٹ تھی۔ جو میری بربادی کا مذاق اڑا رہی تھی......

میرا ہاتھ غیر ارادی طور پر تصویر کی طرف بڑھا تاکہ میں اسے اٹھا کر زمین پر پٹخ دوں، دفعتاً ایک ننھے سے ہاتھ نے میرے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا......

"کیا ہوا انکل......؟" طلال کی معصوم آواز میرے کانوں میں گونجی تو میں جیسے ہوش میں آگیا......

"کک...... کچھ نہیں" میں اپنی اضطرابی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے ہکلایا۔

"آپ کی تو پیشانی پر پسینہ آیا ہے حالانکہ اے سی آن ہے" طلال بڑے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا......

میں نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا تو وہ واقعی پسینے سے تر ہورہی تھی۔ یکدم طلال کی توجہ تصویر کی طرف گئی تو وہ تیزی سے بولا...... "انکل! یہ میری ممی ہیں، یہ میرے پاپا اور یہ ننھا سا، میں ہوں!!" اپنی آخری بات پر وہ خود ہی ہنس پڑا......

میرا دھیان اس وقت طلال کی کسی بات پر نہیں تھا، میں نے فوراً پوچھا "بیٹا! تمہارے پاپا اس وقت کہاں ہیں؟......"

طلال جواباً بولا "وہ نہا رہے ہیں! ابھی آتے ہیں......"

میں اس وقت الیاس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں نفیسہ نے الیاس کو میری تصویر نہ دکھائی ہو اگر وہ مجھے پہچان جاتا تو پھر وہ اپنے بیٹے کو لے کر روپوش ہوجاتا...... اس لئے میں نے جلدی سے طلال سے کہا "بیٹا مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے، میں نے ابھی جانا ہے پھر کبھی تمہارے پاپا سے مل لوں گا"

طلال مجھے روکنا چاہتا تھا مگر میں تیزی سے اسے نظر انداز کرکے وہاں سے نکل آیا۔ ایک مدت بعد میری بربادیوں کے ذمہ دار سامنے آئے تھے مگر افسوس نفیسہ اب اس دنیا میں نہیں رہی تھی اس کی طبعی موت اس کو میرے انتقام سے بچا گئی تھی میرے دل میں اس کے لئے نفرت کا لاوا ابل رہا تھا...... میں نے نفیسہ کو طلاق نہیں دی تھی، وہ شرعی طور پر میری بیوی تھی اس کے باوجود وہ ایک نامحرم مرد کے ساتھ رہ رہی تھی اس کے بچے کی ماں بنی تھی اس کے بچے کی ماں بنی تھی "بے شرم بے حیا عورت......!" میرے منہ سے حقارت سے نکلا......

میرا خون کھول رہا تھا، دل چاہتا تھا کہ میں الیاس کے گھر کو آگ لگادوں، اسے بھی اس کے بیٹے سمیت اسی طرح ماروں جیسے میرا معصوم بیٹا مرا تھا مگر میں جوش میں اپنے حواس کو قائم رکھنا چاہتا تھا اور کوئی

ایسی بھیانک سزا الیاس کو دینا چاہتا تھا جس کے ذریعے "وہ جیتے جی موت جیسی اذیت محسوس کرے اور نفیسہ کی روح بھی تڑپ کر رہ جائے......"

میں رات دیر تک الیاس سے انتقام لینے کا منصوبہ بناتا رہا تھا......

صبح میں حسب معمول چہل قدمی کے لئے نکلا تو طلال کو اپنا منتظر پایا اس بار اس کے ساتھ ایک بوڑھا شخص بھی تھا جسے دیکھتے ہی میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اس کا ملازم تھا، طلال کے باپ نے ہی اس کو بھیجا تھا یقیناً یہ دیکھنے کے لئے کہ میں کس طرح کا شخص ہوں...... مجھے یقین تھا میرے یوں اس سے ملے بغیر چلے جانے پر اس نے میرے متعلق ضرور غلط سوچا ہوگا۔ میں نے آتے ہی طلال کو پیار کیا، وہ مجھ سے خفا تھا...... مجھ سے ٹھیک طرح سے بات بھی نہیں کر رہا تھا...... میں نے کچھ دیر طلال کے ملازم سے گپ شپ کی پھر وہ طلال کو لے کر اسکول چلا گیا......

شام کے وقت اتفاقاً طلال مجھے ایک دکان کے پاس مل گیا۔ اس وقت میں اپنی گاڑی میں کسی ضروری کام کے لئے جا رہا تھا، طلال کو دیکھتے ہی میں نے گاڑی روک کر اس کو پاس آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک لمحے کے لئے مجھے دیکھ کر کھل سا گیا تھا تاہم اپنی ناراضگی نہیں بھولا تھا اس لئے منہ پھلائے آہستہ آہستہ چلتا ہوا گاڑی کے پاس آ گیا...... میں اس وقت گاڑی سے باہر نکل چکا تھا۔ اس کے قریب آتے ہی میں نے محبت سے اسے گلے سے لگا لیا، میں نہیں جانتا تھا یہ بے اختیار جذبہ کیسا تھا۔ مجھے بار بار طلال سے محبت کا احساس ہوتا تھا دل اس کی طرف کھنچا چلا جاتا تھا مگر جیسے ہی مجھے وہ خوفناک احساس ہوتا کہ وہ میرے دشمن کا بیٹا ہے تو عجیب سی وحشت میرے اندر بھر جاتی تھی......

میں نے جھٹکے سے طلال کو خود سے الگ کیا "کیا ہوا انکل......؟" طلال حیرت سے میرے چہرے کو گھورتے ہوئے بولا......

"کچھ بھی نہیں۔" میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"کیا اب بھی مجھ سے خفا ہو؟"

"آپ نے کچھ اچھا نہیں کیا، پاپا آپ کے نہ ملنے پر بہت ناراض ہوئے تھے، کہہ رہے تھے میں آپ سے دوبارہ نہ ملوں مگر میں پھر بھی دوسری بار آپ سے مل رہا ہوں" طلال نے پریشانی سے کہا......

"اوہ! یہ تو بہت برا ہوا مجھے اس دن ضروری کام نہ ہوتا تو میں تمہارے پاپا سے ضرور مل لیتا، خیر میں دوبارہ ملوں گا تمہارے پاپا سے، تو ان کے سارے گلے شکوے ختم ہو جائیں گے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا......

"کب انکل......؟" طلال نے فوراً میرے ہاتھوں کو پکڑ لیا......

"بہت جلد ملوں گا، تم بتاؤ کل اتوار ہے تمہاری چھٹی ہے، میرے ساتھ چلو گے؟"

"کہاں انکل؟" اس نے فوراً پوچھا۔

میں سوچتے ہوئے بولا "آئس کریم کھانے اگر تمہارے پاپا اجازت دیں تو!" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا "وہ کبھی اجازت نہیں دیں گے"

"تو پھر تم بتاؤ کیا کریں؟" میں سوالیہ نگاہوں سے اس کے معصوم چہرے کو گھورتے ہوئے کہا......

تو خوشی سے وہ بولا "کیوں ناں انکل، میں پاپا کو بتائے بغیر آپ کے ساتھ چلا جاؤں اتوار کو وہ ویسے بھی کہیں نا کہیں چلے جاتے ہیں، انہیں کیا پتہ چلے گا، ہم ان کے آنے سے پہلے واپس آ جائیں گے۔"

"او کے پھر ڈن ہو گیا، ہم کل دوپہر کو آئس کریم کھانے چلیں گے، کل اسی جگہ تم آ جانا، میں گاڑی لے کر آؤں گا۔"

طلال خوشی سے تقریباً جھومتے ہوئے بولا ......"میں کل ضرور آؤں گا۔"

وہ شام میرے بنائے ہوئے منصوبے کا آغاز تھی۔ میں بہت خوش تھا کیونکہ اب میں اپنے دشمنوں کو باآسانی نشانہ بنا سکتا تھا...... اتوار کا دن میرے لئے بڑا اہم تھا۔ میں بے چینی سے ساری رات سو نہ سکا مجھے بے تابی سے اس لمحے کا انتظار تھا جب میں الیاس کو ناقابل

اشت اذیت میں مبتلا کرنے والا تھا۔

خدا خدا کر کے اتوار کو دن کا آغاز ہوا، میں اپنے منصوبے کے تحت دوپہر کے وقت طلال کو لینے گیا۔ وہ ہمراہی منتظر تھا۔ اس کو گاڑی میں بیٹھا کر، میں نے اس کو راستے میں اس کی پسندیدہ آئس کریم کھلائی پھر باتوں ہی باتوں میں اس سے الیاس کا نمبر بھی لے کر موبائل میں سیو کر لیا وہ بہت خوش تھا اور اپنی خوشی میں وہ اس قدر گم تھا کہ اسے اندازہ ہی نہ ہو سکا اور میں اسے ایک ویران جگہ پر لے گیا۔ جہاں آبادی کا نام و نشان دور دور تک نہیں تھا۔ چاروں طرف گھنے درخت تھے......

طلال مجھ پر بے حد اعتماد کرتا تھا اس لئے اسے خطرے کا احساس نہ ہو پایا۔ اس وقت مجھ پر وحشت سوار تھی میری نظر میں وہ ایک معصوم بچہ نہیں بلکہ میرے بدترین دشمن کا بیٹا جسے میں ہر حال میں اذیت ناک موت مارنا چاہتا تھا......

اس ویران جگہ پر جیسے ہی میں نے گاڑی روکی تو وہ حیرت سے مجھے گھورتے ہوئے بولا "انکل یہ ہم کہاں آ گئے ہیں؟" میں نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے پہلی بار اس کو سفاکی سے گھورا تو وہ میری آنکھوں میں نظر آنے والی بیگانگی اور وحشت کو دیکھ کر سہم گیا......

"آ...... آپ کو کیا ہو گیا ہے انکل......؟" وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا پھر میں نے دوسری طرف آ کر اس کی نشست والا دروازہ کھولا اور تقریباً بے دردی سے کھینچتے ہوئے اس کو باہر نکالا میرے اس فعل سے اس کی چیخ نکل گئی، وہ شاید آنے والے سنگین حالات سے آگاہ ہو گیا تھا، وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے گڑگڑایا "انکل پلیز! مجھے معاف کر دیں، مجھے چھوڑ دیں، مجھے یہاں ڈر لگ رہا ہے" مگر میں اس وقت ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا، مجھ پر اس معصوم کی آہ و بکا کا کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے جیب سے ریوالور نکالا اور طلال کی پیشانی پر اس کی نال رکھ دی......

وہ غیر یقینی انداز سے مجھے گھورتے ہوئے سراسیمگی سے بولا "انکل آپ مجھے نہیں ماریں، پلیز......!"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور ٹریگر دبا دیا۔ اس لمحے میرا ہاتھ کانپ کر رہ گیا تھا۔ اس سناٹے میں اس کی اور فائر کی آوازیں ایک ساتھ ابھریں پورا علاقہ لرز گیا۔ طلال کسی کٹے ہوئے شہتیر کی مانند پیچھے کی طرف گرا اور ایک لمحے میں ساکت ہو گیا......

یہ عجیب ہولناک منظر تھا، درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے تڑپ کر اڑے اور میرے سر کے اوپر منڈلانے لگے جیسے میرے اس سفاکانہ فعل پر احتجاج کر رہے ہوں......

طلال کی روشن پیشانی میں سوراخ دیکھ کر میرا دل لرز سا گیا مگر میں خود کو کمزور نہیں کرنا چاہتا تھا میں نے فوراً منہ پھیر لیا اور موبائل نکال کر الیاس کے نمبر پر کال کی، چند منٹس بعد کال ریسیو کی گئی......

"ہیلو" دوسری طرف سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔

"طلال آپ کا بیٹا ہے؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا......

"جی ہاں وہ میرا ہی بیٹا ہے مگر بات کیا ہے؟" اس بار الیاس کے لہجے میں پریشانی تھی......

"آپ کو فوراً اس جگہ پہنچنا ہے، آپ کے بیٹے کی حالت بہت خراب ہے۔"

"کیا ہوا میرے بیٹے کو؟" الیاس بے چینی سے بولا......

میں نے فوراً کہا "آپ کا بیٹا مجھے اس جنگل سے ملا ہے وہ بہت زخمی حالت میں ہے، اسی نے مجھے آپ کا نمبر بتایا ہے، میری گاڑی اتفاقاً اس جنگل میں گزرتے ہوئے خراب ہو گئی ہے ورنہ میں ضرور آپ کے بچے کو اسپتال لے کر چلا جاتا۔"

الیاس گھبرا کر بولا "آپ مجھے علاقے کی لوکیشن بتائیں، میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔"

میں نے الیاس کو اس جگہ کے متعلق بتایا اور رابطہ منقطع کرنے کے بعد فوراً درخت کی آڑ میں ہو گیا......

ممکن تھا وہ اکیلا ہی آتا اور یہ بھی امکان تھا کہ اپنے ساتھ کسی کو لے آتا...... بہر حال مجھے آنے والے وقت کا بے چینی سے انتظار تھا۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد الیاس نے گاڑی کچھ فاصلے پر کھڑی کی، وہ شاید میری گاڑی دیکھ چکا تھا، اس لئے گاڑی سے نکلتے ہی اس جانب بھاگتا ہوا آیا مگر گاڑی کی دائیں جانب نگاہ پڑتے ہی اس کو دھچکا لگا......

وہ طلال کے مردہ وجود کو دیکھ کر فوراً اس کی طرف بڑھا اور تقریباً چیختے ہوئے وہ طلال کے خون آلود وجود سے لپٹ گیا۔ بیٹے کی موت کا احساس ہوتے ہی وہ اردگرد کے ماحول سے بے نیاز ہو گیا۔ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا...... میں درخت کی آڑ سے جھانکتے ہوئے اس کو تڑپتے اور بلکتے ہوئے دیکھ کر لطف اٹھا رہا تھا، کبھی میں بھی اپنے بیٹے کے لئے اسی طرح رویا تھا چند لمحوں کے بعد میں خود ہی اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا......

"تم نے مجھے پہچانا الیاس؟"

برسوں بعد میرے منہ سے اپنا نام سن کر وہ صدمے کی حالت میں بھی چونکے بغیر نہ رہ سکا......

"کون ہو تم؟" اس نے اشک بار آنکھوں سے مجھے حیرت سے دیکھ کر پوچھا......

"اپنے بیٹے کی موت کو نہیں پہچانو گے؟"

"تم نے میرے بیٹے کو مارا ہے مگر کیوں؟" وہ غم سے پھٹی ہوئی آواز میں چیخا......

میں غصے سے کھولتے لہجے میں بولا...... "کیوں مارا ہے؟ اس کا جواب تو تمہارے پاس موجود ہے الیاس! مجھے غور سے دیکھو اور پہچانو...... میں وہی بدنصیب ہوں جس کی بیوی کو تم بھگا کر اپنے ساتھ لے گئے اور اس کے بچے کو بے دردی سے آگ میں جلا کر مار دیا"

"تت...... تم سلیم ہو؟ وہ غیر یقینی لہجے میں مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو......

"ہاں میں سلیم ہوں، تم کیا سمجھتے تھے کہ تم مجھ سے چھپ جاؤ گے، کئی برسوں بعد سہی مگر آخر میں نے تمہیں ڈھونڈ ہی لیا۔" میں نے نفرت سے اسے گھورتے ہوئے کہا......

وہ اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے آنسو پونچھتے ہوئے شکستگی سے بولا "ہاں تم نے مجھے ڈھونڈ لیا مگر نفیسہ......"

"مر چکی ہے۔" میں نے اس کی بات کو تلخی سے مکمل کیا "وہ بے وفا، بے شرم عورت مر چکی ہے بے شک وہ سخت سے سخت سلوک کی حق دار تھی مگر اب تم کو میں ہرگز نہیں چھوڑوں گا تم کیا سمجھتے تھے زندگی کی بساط پر صرف تمہاری ہی جیت ہو گی؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "تم ٹھیک کہتے ہو سلیم! بے شک زندگی کی بساط میں ہمیشہ انسان جیت کر سب کچھ حاصل نہیں کر پاتا مگر تم مانو نہ مانو شکست تمہارا مقدر بن چکی ہے، تم مجھے قتل کر کے بھی سکون حاصل نہ کر پاؤ گے کیونکہ تم ہار چکے ہو......"

"کیا بکواس کرتے ہو۔" میں غصے سے بلند آواز میں بولا......

وہ تمسخر سے بولا "یہ بکواس نہیں ہے سلیم! جس بچے کو تم نے قتل کیا ہے، یہ میرا نہیں تمہارا اپنا بیٹا تھا۔"

"کیا!!" حیرت کا ایک پہاڑ مجھ پر ٹوٹ پڑا، اور میں تقریباً بھاگتا ہوا اس کی طرف لپکا اور اسے گریبان سے جھنجھوڑتے ہوئے چیخا "تم جھوٹ بول رہے ہو میرا بیٹا، تم دس سال پہلے آگ میں جلا کر مار چکے ہو، اب پھر مجھے دھوکا دینا چاہتے ہو۔"

اس نے حقارت سے میرے ہاتھوں کی گرفت سے اپنا گریبان چھڑایا اور طنزیہ لہجے میں بولا...... "یہ تمہارا بیٹا ہے، تم اپنے خون کو بھی نہیں پہچان سکتے؟ جس بچے کو آگ میں جلایا گیا تھا وہ صرف دنیا کو دکھانے کے لئے ایک ڈرامہ تھا۔ نفیسہ تمہیں ہر حال میں ذہنی اذیت دینا چاہتی تھی۔ کیونکہ تم نے اس کو طلاق نہیں دی تھی،

اس لئے میں نے اس کی خواہش پر کسی نہ کسی طرح ایک بچے کی نعش حاصل کی، تم تو جانتے ہو اگر پیسہ ہو تو زندہ انسانوں کو بھی خریدا جا سکتا ہے، سو مجھے بچے کی نعش حاصل کرنے میں زیادہ وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میں نے وہ نعش نفیسہ کے حوالے کر دی۔ نفیسہ نے منصوبے کے تحت آدھی رات کو اس بچے کی نعش پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی اور خود میرے ساتھ تمہارے بچے سمیت فرار ہو گئی۔ میں نفیسہ کو لے کر لاہور آ گیا اور یوں نفیسہ نے نکاح پر نکاح کر لیا، شرعی لحاظ سے یہ جائز نہیں تھا مگر معاشرے میں رہنے کے لئے یہ ضروری تھا۔ ہم دونوں نے تمہارے بیٹے کا نیا نام طلال رکھا......

شروع میں تو مجھے طلال کا وجود کھٹکتا تھا کیونکہ...... وہ میرے رقیب کا بیٹا تھا مگر پھر قدرت کی طرف سے شاید مجھے اس نفرت کی سزا ملی اور میں باپ نہ بن سکا، سو میں نے اس محرومی کا ازالہ کرنے کے لئے طلال کو ہی اپنی اولاد سمجھ لیا۔ نفیسہ اور میرا ساتھ پانچ سال رہا پھر نفیسہ کو نمونیا کی بیماری سے موت واقع ہو گئی۔ مجھے نفیسہ کی موت کا شدید رنج تھا۔ نفیسہ کی آخری نشانی طلال میرے پاس تھا۔ طلال کو میں دل و جان سے بڑھ کر چاہنے لگا، اس کو سگے باپ سے بڑھ کر پیار دیا مگر قدرت کے کھیل دیکھو! ایک باپ نے اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو مار دیا، تم ہار چکے ہو سلیم! شکست کھا چکے ہو۔" وہ صدمے سے تقریباً حواس باختہ ہو چکا تھا اور مجھ پر پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگا......

میں جو سکتے کے عالم میں اس کی روداد سن رہا تھا غم و غصے کی زیادتی سے پاگل ہو گیا۔ قدرت مجھے ہی ہر بار تماشا بنا رہی تھی اور تماش بین ہر بار ایک ہی شخص تھا الیاس!

میں غصے سے اس پر ٹوٹ پڑا، اس کو لاتوں اور گھونسوں سے زدوکوب کرنے لگا۔ الیاس مجھ سے زیادہ توانا اور ورزشی جسم کا مالک تھا مگر اس نے مزاحمت نہ کی، وہ جیسے پاگل ہو چکا تھا......

کبھی ہنس رہا تھا کبھی رو رہا تھا۔ میں مشتعل تھا اس لئے ہر قسم کا لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے مسلسل مار رہا تھا۔ آخر ہانپتے ہوئے میں خود ہی تھک گیا۔ الیاس نیم جاں ہو کر زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ میں نے جیب سے ریوالور نکالا اور بے دھڑک اس پر فائر کر دیئے۔ الیاس کا وجود چند لمحوں کے لئے تڑپا اور پھر ہمیشہ کے لئے ساکت ہو گیا۔

میں نے ریوالور وہیں پھینک دیا اور طلال کی طرف بڑھا، طلال کا مردہ وجود اٹھاتے ہوئے میں بے اختیار اسے چومنے لگا، یہ میں نے کیا کر دیا تھا میرے ہاتھوں سے میرا بچہ مر گیا، کتنا ظالم باپ ہوں میں! کیا تاریخ میں اس کی مثال ملتی ہے، اپنے ہاتھوں سے اپنے لخت جگر کا خون کر ڈالا۔ انسپکٹر صاحب میں مر جانا چاہتا ہوں پلیز! مجھے پھانسی دے دیں۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور بلک بلک کر رونے لگا......

انسپکٹر شاہد سکتے کے عالم میں سلیم کی روداد سن رہا تھا پھر اس نے اپنے ماتحت اہل کاروں کو سلیم کی بتائی ہوئی جگہ پر بھیجا جہاں سلیم کے کہنے کے مطابق طلال اور الیاس کی لاشیں آلۂ قتل سمیت برآمد ہو گئی تھیں......

سلیم کو جیل بھیج دیا گیا۔ عدالت میں مقدمہ چلا اور سلیم کو پھانسی کی سزا سنائی گئی...... سلیم سے انسپکٹر دلی ہمدردی رکھتا تھا لیکن سلیم، بہر حال ایک مجرم تھا اس نے دو قتل کئے تھے اس لئے اس کے لئے وہ چاہنے کے باوجود بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا......

جس صبح سلیم کو پھانسی دی جا رہی تھی، اس وقت انسپکٹر شاہد نے اس کے چہرے پر عجیب سا اطمینان محسوس کیا تھا۔ وہ بے چینی سے پولیس اہل کاروں کے ساتھ پھانسی کے پھندے کی طرف بڑھ رہا تھا جیسے جلد از جلد زندگی کی قید سے آزاد ہو جانا چاہتا ہو۔

سلیم کی پھانسی دیئے جانے کے بعد انسپکٹر شاہد نے ہی سلیم کی نعش وصول کی تھی۔ اس کے کفن دفن کے بندوبست کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی مغفرت کے لئے دعائیں بھی کی گئیں۔

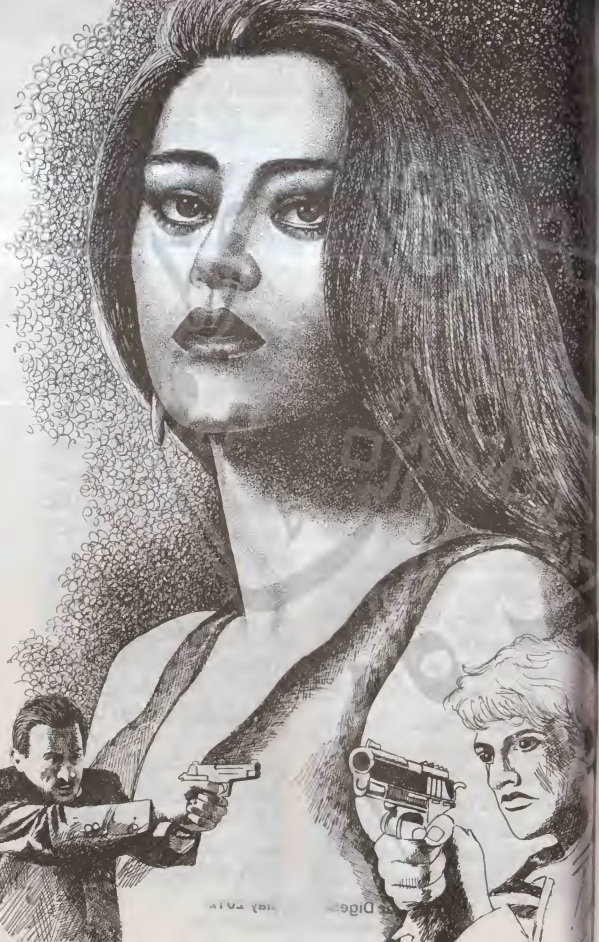

خونخوار

ایس امتیاز احمد۔کراچی

اچانک کمرے میں بلا کی آواز گونجی۔ "میں تمہارا پیچھا چھوڑنے والی نہیں، میں ہر روز آئوں گی اور تم سے نزدیک تر ہوتی جائوں گی...... پھر ایک رات تم اپنے مکان کے پاس میری غراہٹ سنو گے اور پھر تمہارے چیخنے سے پہلے میں تمہیں دبوچ لوں گی۔

دل ودماغ پر سکتہ طاری کرتی اور سطر سطر رونگٹے کھڑے کرتی دہشت ناک کہانی

رات کا نجانے کون سا پہر تھا، چار سالہ ٹیڈ بستر سے اٹھا اور پیشاب کیلئے باتھ روم میں گھس گیا۔ واپس آ کر ابھی وہ بستر پر دراز ہوا ہی تھا کہ اسے خوابگاہ میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور یہی وہ وقت تھا۔ جب پہلی بار اس نے خوابگاہ کی الماری میں ایک پراسرار بلا کا چہرہ دیکھا۔ الماری کے پٹ نیم وا تھے۔ ایک نہایت خوفناک شے اس میں سے جھانک رہی تھی۔ اوپر اٹھے ہوئے بڑے بڑے کندھے بڑا سا سر اور چمکتی ہوئی سرخ آنکھیں۔ ٹیڈ کے حلق سے ایک چیخ بلند ہوئی۔ ساتھ والے کمرے میں محو خواب اس کے ممی ڈیڈی بھاگتے ہوئے پہنچے۔ ننھا ٹیڈ یک ٹک الماری کو گھور رہا تھا۔ اس کا چہرہ برف کی طرح سفید تھا۔ ممی نے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ ڈیڈی نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے چلانے کی وجہ پوچھی۔ ٹیڈ نے انگلی سے الماری کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ''وہاں ایک...... بلا ہے۔''

ڈیڈی کے ہونٹوں پر دھیمی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ممی اسے پچکارنے لگیں۔

ڈیڈی نے آگے بڑھ کر روشنی کر دی۔ الماری کے قریب رکھی کرسی پر دو کمبل اونچے نیچے پڑے تھے۔ کمبلوں کے اوپر ایک کھلونا رکھا تھا۔ یہ چمکتی ہوئی آنکھوں والا سیاہ رنگ کا ریچھ تھا۔ اب ٹیڈ کی سمجھ میں آیا کہ جسے وہ ''بلا'' کے بڑے بڑے کندھے سمجھ رہا تھا وہ کمبلوں کا ڈھیر تھا۔ ٹانگیں درحقیقت کرسی کی ٹانگیں تھیں اور چمکدار آنکھیں کھلونے کی تھیں۔ ڈیڈی نے بھی اسے یہی بات تفصیل سے سمجھائی۔ ممی نے کہا کہ ''بھوت اور بلائیں صرف کہانیوں اور کتابوں میں ہوتی ہیں۔ حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا...... اس گھر میں ایسی کوئی شے نہیں جو انہیں نقصان پہنچا سکے۔''

ننھے ٹیڈ کو تسلی دینے کے بعد ممی ڈیڈی واپس اپنی خوابگاہ کی طرف چلے گئے۔ ٹیڈ کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ جائیں لیکن آخر تو انہیں جانا ہی تھا۔ اور ان کے جاتے ہی الماری کا بند دروازہ پھر کھل گیا۔ وہ پراسرار شے دوبارہ کرسی پر نظر آنے لگی۔ ٹیڈ نے آنکھوں کی درز سے دیکھا دو چمکدار خونی آنکھیں اس پر مرکوز تھیں۔

اس کے گھر سے باہر قصبے کی کسی تاریک گلی میں کوئی بلی کریہہ آواز میں رو رہی تھی اور ٹیڈ کا سارا جسم پسینے میں نہا رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے کرسی پر براجمان خوفناک بلا کی آنکھیں اس سے ہمکلام تھیں۔ وہ سرگوشی کے انداز میں کہہ رہی تھی۔ ''ٹیڈ! میں تمہارا پیچھا چھوڑنے والی نہیں، میں روز آؤں گی اور ہر دفعہ تمہارے سے

نزدیک تر ہوتی جاؤں گی...... پھر ایک رات جب تم ممی ڈیڈی کو پکارنے کے لئے منہ کھولو گے تو اپنے کان کے بالکل قریب ایک غراہٹ سنو گے۔ ہاں یہ میں ہی ہوں گی۔ تمہارے چیخنے سے پہلے میں تمہیں دبوچ لوں گی...... پھر میں تمہیں کھا جاؤں گی...... اور تم میرے اندر چلے جاؤ گے...... یہ میرا وعدہ ہے۔"

اب پتہ نہیں یہ آواز ٹیڈ کے اپنے سانسوں کی تھی یا اس ہوا کی تھی جو قصبے کے گلی کوچوں کے چکر لگا رہی تھی یا یہ صرف اس کا وہم تھا۔ بہر حال ٹیڈ نے خوابگاہ میں گونجتے ہوئے الفاظ صاف سنے تھے۔ اس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا اور بستر کی چادر کو منہ پر کھینچ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس نے خواب میں سفید چمکدار دانتوں والے ایک بدشکل جانور کو دیکھا جو اونچی نیچی گھاٹیوں اور گھنے درختوں میں مسلسل اس کا تعاقب کررہا تھا۔

صبح جب ڈونا ٹرینون اور وک ٹرینون اپنے بیٹے کی خوابگاہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ الماری کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ کمبل جو اس کے اندر رکھ دیے گئے تھے پھر کرسی پر پڑے ہیں اور ریچھ کمبلوں کے ڈھیر پر رکھا ہوا ہے۔ انہوں نے سمجھا کہ یہ سب کچھ ٹیڈ نے کیا ہوگا لیکن کچھ دیر کے بعد جب وک دفتر چلا گیا اور ڈونا کو ٹیڈ نے صاف انکار کردیا کہ اس نے کمبل کرسی پر نہیں رکھے تھے۔ ڈونا نے کہا۔

"عجیب بچے ہو تم۔ اگر کمبل میں نے نہیں رکھے، تمہارے ڈیڈی نے نہیں رکھے اور تم نے نہیں رکھے تو پھر الماری سے کرسی پر کیسے پہنچ گئے؟"

ٹیڈ نے بڑی معصومیت لیکن یقین سے جواب دیا۔ "یہ بلا کا کام ہے۔"

ڈونا چند لمحے بیٹے کو گھورتی رہی پھر اسے سینے سے لگا کر بولی۔ "ٹیڈ! تم سمجھتے کیوں نہیں، تمہاری خواب گاہ میں کوئی بلا ولا نہیں۔"

سہ پہر کے وقت وک دفتر سے واپس گھر روانہ ہوا۔ مئی کے اوائل ہی میں گرمی اپنا زور دکھانے لگی تھی۔ اس قصبے یعنی، کاسٹل واک، کی سب سے عمر رسیدہ شخصیت چچی ایوی نے پیشن گوئی کی تھی کہ اس دفعہ غیر معمولی گرمی پڑے گی اور قصبے کے لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ موسم کے بارے میں چچی ایوی کا اندازہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوتا، چچی ایوی نے اس بار پڑنے والی گرمی کو شدید بلکہ خطرناک قرار دیا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ "بستی کے کئی عمر رسیدہ افراد ان گرمیوں میں دار فانی سے کوچ کر جائیں گے۔"

سیاہ سیدھی سڑک پر گاڑی چلاتے ہوئے وک کی نگاہ جنوب کی طرف اٹھ گئی۔ اسے یاد آیا کہ پچھلے سال انہی دنوں اس نے ڈونا اور ٹیڈ کے ساتھ ایک لمبی ڈرائیو کی تھی۔ دراصل اس کی کمشارہ جیگوار کے پچھلے پہیے سے آواز آنے لگی تھی۔ اس نے قصبے کے ایک دو مستریوں کو دکھایا تھا لیکن وہ نقص دور کرنے میں ناکام رہے تھے۔ پھر اس کے دوست روجر نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ گاڑی کو جوکیمبر کے گیراج میں لے جائے۔ جوکیمبر کی ورکشاپ قصبے کے مضافات میں واقع تھی اور گردونواح میں اس کی کاریگری کی بڑی شہرت تھی۔ اب کی نسبت پچھلے سال گرمی کافی کم تھی۔ وہ بڑے خوشگوار موڈ میں سفر کرتے جوکیمبر کے گیراج میں پہنچے تھے۔ یہ ایک کم آباد اور دور افتادہ مضافاتی علاقہ تھا۔ وہ ورکشاپ کے احاطے میں داخل ہوئے تو ایک سات آٹھ سالہ لڑکا تنہا بیس بال کھیلتا نظر آیا۔ وہ جوکیمبر کا بیٹا تھا۔ وک نے اسے کیمبر کو بلانے کا کہا۔ وہ کیمبر کو بلانے گیا تو ایک جانب سے ایک بہت بڑا کتا نمودار ہوا، وک اور ڈونا کتے کی غیر معمولی جسامت دیکھ کر سکتے میں رہ گئے۔ ایک لمحے کیلئے تو انہیں یقین ہی نہیں آیا کہ یہ کتا ہے۔ ڈونا نے غیر ارادی طور پر ٹیڈ کو ٹانگوں سے لپٹا لیا۔ کتا اپنی طویل دم کو حرکت دیتا ان کی طرف بڑھنے لگا۔ ڈونا نے خوفزدہ نگاہوں سے وک کی طرف دیکھا۔ اس وقت کیمبر کا بیٹا ورکشاپ کے دروازے سے نمودار ہوا۔ اس نے کتے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور اسے لیتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔ ٹیڈ بڑی

دلچسپی سے کتے کو دیکھ رہا تھا۔

"ممی! میں ڈوگی سے کھیلوں گا،، میں ڈوگی کو پیار کرونگا۔" وک نے لڑکے سے پوچھا کہ یہ کتا خطرناک تو نہیں۔ لڑکے نے یقین دلایا کہ یہ بڑا بھلا مانس جانور ہے اور خاص طور پر بچوں سے بہت پیار کرتا ہے۔ ٹیڈ، ماں سے جدا ہو کر کتے کے قریب پہنچ گیا۔ کتے کے مقابلے میں وہ کچھ زیادہ ہی ننھا منا لگ رہا تھا۔ وک نے سوچا کہ یہ دیوہیکل کتا ٹیڈ کو ایک نوالے میں ہڑپ کرسکتا ہے۔ لڑکے نے ٹیڈ کو بتایا کہ اس کا نام "کوجو" ہے۔

ٹیڈ نے کوجو کہہ کر پکارا تو کتا آگے بڑھا اور اس کے کندھے سے اپنا منہ رگڑنے لگا۔ ٹیڈ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا، وہ بے تکلفی سے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا، پھر وہ اپنی معصوم خوشی میں ممی کو شریک کرنے کیلئے اس کی طرف بڑھا لیکن اس کا پاؤں پھسلا اور وہ اوندھے منہ گر گیا۔ کوجو تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے گردن کے قریب سے ٹیڈ کی قمیض منہ میں دبالی۔ ڈونا اور وک کا دل دھک سے رہ گیا۔ وک اضطراری کیفیت میں آگے بڑھا لیکن اس وقت اس نے دیکھا کہ کوجو نے ٹیڈ کو ہوا میں اٹھا لیا ہے، ٹیڈ کی عمر اس وقت تقریباً تین سال تھی۔ اور وہ خاصا ننھا منا تھا۔ کوجو نے اسے اٹھا کر پھر پاؤں پر کھڑا کردیا۔ کتے کی اس ادا پر تو ٹیڈ جیسے فدا ہو گیا۔ وہ بے تکلفی سے کوجو کے ساتھ لپٹ گیا اور کھیلنے لگا۔ اس دوران ایک مرتبہ وک کی نظر کوجو کی نظر سے ٹکرائی، نجانے کیوں وک کے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ اسے لگا جیسے...... کتا مسکرا رہا ہے، بلکہ وہ پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ کتا مسکرا رہا ہے۔

ان ہی خیالوں میں گم وک اپنی جیگوار چلاتا ہوا گھر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ گرمی بہت زیادہ تھی وہ جلد از جلد ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں گھسنا چاہتا تھا۔

کوجو ایک خرگوش کا پیچھا کررہا تھا۔ خرگوش نہایت پھرتیلا اور لمبی گھاس میں بار بار اسے چکمہ دے جاتا تھا لیکن کوجو بھی ایک کائیاں تھا۔ آخر وہ خرگوش کے بالکل نزدیک پہنچ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا پنجہ آزماتا خرگوش اچانک نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ دراصل ایک گہرے سوراخ میں گر گیا تھا۔ یہ سوراخ بڑے عرصے سے یہاں موجود تھا۔

جوکیمبر کا بیٹا برٹ اکثر جھاڑیوں میں گھومتا رہتا تھا لیکن یہ سوراخ لمبی لمبی گھاس میں چھپا ہونے کی وجہ سے اس کی نظروں سے بھی اوجھل رہا۔ سوراخ نیچے سے کم و بیش ایک غار کی شکل اختیار کر گیا تھا اور اس میں گر کر کسی جانور کا زندہ باہر نکل آنا ناممکن تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس تقریباً ۲۰ فٹ گہرے شگاف کی تہہ میں بہت سے ننھے منھے جانوروں کی ہڈیاں پڑی تھیں۔ کیمبر کی پالتو بلی جو دو سال قبل گم ہو گئی تھی اس کا پنجر بھی تہہ میں موجود تھا۔ اس کے علاوہ اس چوہے کی ہڈیاں بھی تھیں جس کا تعاقب بلی کررہی تھی اور بھی کئی پنجر یہاں وہاں بکھرے ہوئے تھے، جب جنگلی خرگوش شگاف کے اندر گرا تو کوجو نے بھی بلا توقف اپنی تھوتھنی اس میں گھسیڑ دی۔ یہ تھوتھنی شگاف کے منہ میں فٹ بیٹھ گئی۔ کوجو زور زور سے بھونک رہا تھا اور اس کی آواز غار کے اندر گونج رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے بیسیوں کتے ایک ساتھ بھونک رہے ہیں۔ وہ غار چمگادڑوں کی پناہ گاہ بھی تھا۔ دن کی روشنی میں کچھ چمگادڑیں غار کے اندر پڑی رہتی تھیں۔

کوجو کی زوردار آواز نے چمگادڑوں کو جگا دیا۔ انہوں نے سراسیمگی کے عالم میں غار کا چکر لگایا اور پھر نکاسی کے راستے کی طرف بڑھیں لیکن راستہ تو کوجو کی تھوتھنی نے بند کر رکھا تھا۔ چمگادڑیں اس کے منہ پر پھڑپھڑانے لگیں۔ چمگادڑیں باؤلے پن کا شکار تھیں۔

کوجو کو ان بدبودار پرندوں کی مداخلت پر سخت غصہ آرہا تھا۔ پھر جونہی ایک چمگادڑ اس کے چہرے سے ٹکرائی اس نے جبڑا کھولا اور چمگادڑ کو پکڑ لیا۔ چمگادڑ کی باریک ہڈیاں اس کے دانتوں تلے کڑکڑائیں۔ وہ پھڑپھڑا کر پلٹی اور اس نے کوجو کی حساس تھوتھنی پر کاٹ کھایا۔ کوجو نے زخمی چمگادڑ کو چھوڑ دیا وہ چکر کاٹتی ہوئی غار کی تہہ میں گری اور جان کنی کے عالم میں تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئی۔

چمگادڑ مرگئی لیکن مرتے مرے کوجو کو کاری زخم لگا گئی اس کی تھوتھنی پر سوالیہ نشان کی شکل کا ایک گہرا کٹاؤ نظر آرہا تھا۔ کوجو نے خرگوش تک پہنچنے کی کوشش ترک کردی اور زور لگا کر اپنا منہ سوراخ سے نکال لیا۔ راستہ ملتے ہی چمگادڑیں تیزی سے باہر نکلیں اور جون کی تیز دھوپ میں ایک چھوٹا سا چکر لگا کر گھبرائی ہوئی دوبارہ سوراخ میں گھس گئیں۔ کوجو کے زخم سے خون ٹپک رہا تھا۔ منہ میں عجیب سا ذائقہ گھل گیا تھا۔ وہ ست قدموں سے گھر کی جانب روانہ ہوگیا...... تقریباً دوسو پونڈ وزنی پانچ سالہ کتا کوجو 12 جون 1980ء کی سہ پہر کو باؤ لاہو چکا تھا۔

ٹیڈ کو نرسری میں چھوڑ کر ڈونا نے کچھ خرید و فروخت کی اور گھر لوٹ آئی۔ دروازے کے سامنے اس نے اسٹیو کیمپ کی ویگن کھڑی دیکھی اور اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اسٹیو ایک خوش شکل اور تنومند نوجوان تھا۔ ٹینس کھیلتا تھا اور خاصا رنگین مزاج واقع ہوا تھا۔ ڈونا کی غلطی تھی کہ وہ اس سے بے تکلف ہو بیٹھی تھی۔ اب وہ اس کے شوہر کی غیر موجودگی میں اکثر ان کے گھر آتا رہتا تھا۔ ان کے تعلقات اس حد تک آگے بڑھ چکے تھے کہ ڈونا واپسی کا راستہ سوچتے سوچتے تنگ آگئی تھی۔ وہ سخت غصے کے عالم میں اندر داخل ہوئی۔ اسٹیو، ٹیڈ کے کمرے میں بے تکلفی سے بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ سامنے بیئر کا گلاس تھا اور ٹی وی پر فلم چل رہی تھی۔ ڈونا نے سامان باورچی خانے میں رکھا اور وہیں سے نہایت خشک لہجے میں بولی۔

”اسٹیو! بہت ہوچکی۔ میں نے تمہیں پچھلی دفعہ بھی کہا تھا کہ اب یہاں قدم نہ رکھنا۔ کوئی افسوسناک واقعہ پیش آنے سے پہلے تم یہاں سے چلے جاؤ۔“

اسٹیو اس کے غصے کو بالکل نظر انداز کررہا تھا۔ وہ جھومتا ہوا باورچی خانے میں چلا آیا اور ڈونا کو کندھوں سے تھام لیا۔ ڈونا نے ایک جھٹکے سے اپنے کندھے چھڑائے۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں غصے کی سرخی دوڑ رہی تھی۔ اس شخص کی خاطر وہ اپنے خاوند کو بہت دھوکہ دے چکی تھی لیکن اب اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ مزید اس کے ہاتھوں کھلونا نہیں بنے گی۔ وہ چلا کر بولی۔

اسٹیو! اپنا یہ منحوس چہرہ لے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“

اسٹیو ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ ”ورنہ کیا کروگی۔ شیرف کو اپنی کارستانیوں سے آگاہ کروگی...... نہیں تم یہ نہیں کرسکوگی۔“

”میں سب کچھ کر جاؤں گی ذلیل انسان، دھوکے میں نہ رہنا۔ ضرورت پڑی تو میں تمہاری آنکھیں بھی پھوڑ دوں گی۔“ وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اسٹیو کے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہ کچھ دیر اسے خطرناک نظروں سے دیکھتا رہا پھر دھمکی آمیز انداز میں سر ہلاتا دروازے سے باہر نکل گیا۔ ڈونا وہیں باورچی خانے کے فرش پر سر جھکا کر بیٹھ گئی اور سسکنے لگی۔ نجانے وہ کب تک یونہی بیٹھی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کیا اسٹیو اس کے شوہر کو بھڑکانے کی کوشش کرے گا۔ اگر ایسا ہوا تو وہ کیا کرے گی؟ وک کا رویہ کیا ہوگا؟

دوسری طرف اسٹیو کیمپ، ڈونا سے جھگڑ کر واپس اپنی دکان پر پہنچا تو غصے میں بھرا ہوا تھا۔ زندگی میں بہت کم مواقع ایسے آئے تھے جب کسی لڑکی نے اسے ٹھکرایا ہو۔ وہ خوبصورت اور مضبوط نوجوان تھا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی میں اس کا چہرہ خاصا دلکش دکھائی دیتا تھا۔ ٹینس کھیلنے کے علاوہ اسے لکھنے لکھانے کا بھی شوق تھا۔ اس کی نظمیں اور ڈرامے مختلف رسائل میں چھپتے رہتے تھے۔ وہ فرنیچر پر رنگ اور پالش وغیرہ کا کام کرتا تھا۔ دکان سے ملحق اس کا چھوٹا سا گھر تھا۔ جہاں وہ عرصے سے تنہا رہ رہا تھا لیکن اس کی یہ تنہائی بھی رنگینیوں سے عبارت تھی۔ اس وقت اسے ڈونا کی بے رخی پر سخت طیش آرہا تھا۔ وہ کچھ دیر بے چینی سے ٹہلتا رہا پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور تھوڑی سی کوشش سے وک ٹرینٹون کا تعارفی کارڈ ڈھونڈ نے میں کامیاب ہوگیا۔ تب اس نے ٹائپ رائٹر کے سامنے کرسی سنبھالی اور ڈونا کے شوہر کو ایک خط لکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں سفاکانہ چمک نظر آرہی تھی۔

وہ خط کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ یہ کاغذ کا پرزہ ڈونا اور وک کی ازدواجی زندگی کو تہہ و بالا کرنے کے لئے بہت کافی تھا اس نے ڈونا سے اپنے علقات کا بھانڈا اس طرح پھوڑا تھا کہ شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس نے خط ایک لفافے میں بند کیا اور قریبی لیٹر بکس میں ڈالنے کے لئے چل پڑا۔

چیری کیمبر ورکشاپ سے ملحقہ گھر کے ایک کمرے میں بیٹھی تھی۔ اس کا شوہر اور بیٹا کسی گاڑی کی مرمت میں مصروف تھے پچھلے دس منٹ سے ہتھوڑے کی ٹن ٹن اس کے کانوں میں گونج رہی تھی لیکن اب وہ ان آوازوں کی عادی ہوچکی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ اپنے شوہر کی ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ کی عادی ہوچکی تھی۔ کیمبر ایک سخت گیر شرابی تھا لیکن ازدواجی زندگی اور خاص طور پر اپنے بیٹے برٹ کی خاطر چیری حالات سے سمجھوتہ کئے ہوئے تھی۔ کبھی کبھی وہ برٹ کا سوچ کر پریشان ہو جاتی تھی۔ برٹ باپ سے بہت محبت کرتا تھا لیکن کیمبر کا رویہ بیٹے سے رحمدلانہ نہیں تھا۔ چیری سوچتی تھی کیا وہ مستقبل میں باپ کی سخت طبیعت سے مزاحمت کرسکے گا۔ پچھلے کئی روز سے چیری اپنی بہن سے ملاقات کا سوچ رہی تھی۔ بہن سے اس کی آخری ملاقات کوئی چھ برس پیشتر ہوئی تھی۔ وہ جو کیمبر سے جانے کی اجازت لینا چاہتی تھی لیکن اسے ڈر لگ رہا تھا۔ آخری بار کوئی پانچ ماہ پہلے اس نے یہ بات چھیڑی تھی۔ جو کیمبر آگ بگولا ہوگیا تھا۔ اس نے کہا تھا ورکشاپ میں بہت کام ہے وہ برٹ کو اس کے ساتھ جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ چیری محسوس کررہی تھی کہ دن بدن کیمبر کی سخت گیری میں اضافہ ہورہا ہے۔ وہ شراب بھی پہلے سے زیادہ پینے لگا تھا۔ نجانے کیوں چیری کو احساس ہوتا تھا کہ اس کا بیٹا یہاں محفوظ نہیں کسی دن اسے ضرور نقصان پہنچے گا۔ ہوسکتا ہے وہ اپنے باپ اور اس کے دوستوں کے ساتھ شکار پر جائے اور پھر واپس نہ آئے۔ ممکن ہے کیمبر غصے میں اسے اتنی مار مارے کہ اسے جان کے لالے پڑ جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی روز ورکشاپ میں شرابی توسیمہ کا چلایا ہوا ہتھوڑا لوہے پر پڑنے کی بجائے برٹ کے سر پر پڑے درحقیقت وہ فیصلہ کرچکی تھی کہ ایک بار یہاں سے جانے کے بعد واپس نہیں آئے گی۔ اور اس کا بیٹا اپنی علیحدہ زندگی شروع کریں گے۔

وہ دیر تک سوچتی رہی۔ اس کے ہاتھوں میں لاٹری کا ایک ٹکٹ تھا۔ انگلیاں بے خیالی میں مسلسل اس ٹکٹ کو الٹ پلٹ رہی تھیں۔ اس ٹکٹ پر جو نمبر لکھا تھا وہ لکی نمبر تھا۔

وک گاڑی کا بونٹ اٹھائے انجن پر جھکا ہوا تھا شام ہونے والی تھی۔ قریب ہی ٹیڈ اپنی ڈنکی سے دل بہلانے میں مصروف تھا۔ ڈونا گرمیوں کے ہلکے پھلکے لباس میں معمول سے زیادہ خوبصورت نظر آرہی تھی۔ اس کی سڈول بانہوں کی دلکشی قابل دید تھی۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے بڑے انداز سے کھڑی تھی۔ آج گرمی بہت زیادہ تھی۔ وک کا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ یہ اس کی بیوی کی گاڑی تھی ورنہ اتنی گرمی میں کبھی اسے ہاتھ نہ لگاتا۔ بہرحال کافی کوشس کے بادجود وہ گاڑی کا کاربوریٹر ٹھیک کرنے میں ناکام رہا تھا اس نے کاربوریٹر تو کھول لیا تھا لیکن اب اس کے حصے بخرے کرنے کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔ بالآخر اس نے ہتھیار ڈال دیے اور کاربوریٹر مستری کو دکھانے کا فیصلہ کیا۔ ڈونا مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بولی!”میں نے تو پہلے ہی کہا تھا اسے مستری کے پاس لے جاؤ۔“

”وک نے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔“ محترمہ آدھے سے زیادہ کام ہوچکا ہے۔ آپ مجھے طعنے دینے سے گریز کریں۔“

”محترمہ کون ہے؟“ ننھے ٹیڈ نے حیرانی سے پوچھا۔ دونوں کھلکھلا کر ہنس دیے۔ کھانے کی میز پر وک نے وہ بات کی جسے کرنے کے لئے وہ پچھلے دو دن سے پر تول رہا تھا۔ دراصل اسے ایک ضروری کاروباری دورے پر جانا تھا۔ کوئی دس روز کا چکر تھا۔ ایک طویل عرصے بعد یہ صورتحال پیش آئی تھی۔ اب وک سوچ رہا تھا ٹیڈ اس کی غیر حاضری کو کس طرح محسوس کرے گا۔ ڈونا کا پریشان

ہونا بھی قدرتی بات تھی اور واقعی جب اسے پتہ چلا کہ وہ دس روز کے لئے قصبے سے باہر جا رہا ہے تو ڈونا کے چہرے پر وہی تاثرات دکھائی دیے جن کی وہ توقع کر رہا تھا۔ وہ ایکا ایکی پریشان نظر آنے لگی۔ اتنے بڑے گھر میں تنہا بچے کے ساتھ دس دن گزارنا دشوار امر تھا۔ ٹیڈ کی پریشانی زیادہ نمایاں تھی۔ وہ بیچارہ پچھلے کئی روز سے ڈراؤنے خوابوں کا شکار تھا۔ رات کسی پہر جب وہ چلاتا ہوا اٹھتا تھا تو باپ کی موجودگی اس کی ڈھارس بندھانے میں بڑی معاون ثابت ہوتی تھی۔ وہ منہ بسورتے ہوئے بولا۔ ''ڈیڈ آپ نہ جائیں نا۔''

''وک بولا۔'' بیٹے تم سمجھنے کی کوشش کرو، یہ بہت ضروری ہے۔ تم اکیلے تو نہیں۔ تمہاری بہادر ممی تمہارے پاس ہے۔

''لیکن......لیکن''

''ڈیڈی آپ کے جانے کے بعد جب میری الماری میں بلا آئے گی تو اسے کون بھگائے گا۔ بلا کو بھگانے والے الفاظ تو آپ ہی کو آتے ہیں۔'' ٹیڈ کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے۔

وک کو اس کی معصومیت پر بے تحاشا پیار آیا۔ دراصل جب سے ٹیڈ نے کمرے کی الماری سے ڈرنا شروع کیا تھا اس نے بہت سوچ بچار کے بعد چند الفاظ تخلیق کئے تھے۔ رات سونے سے بیشتر وہ بلا ناغہ ٹیڈ کے سرہانے بیٹھ کر یہ الفاظ دوہراتا تھا۔ ٹیڈ پر ان الفاظ کا خاطر خواہ اثر ہوتا تھا۔ یہ الفاظ اس کیلئے لوری کا کام دینے لگے تھے۔ دونوں میاں بیوی اکثر ٹیڈ خوف کے متعلق تبادلہ خیال کرتے تھے۔ وک کا خیال تھا کہ انہضام کی خرابی کی وجہ سے ہے، ہوسکتا ہے کوئی نفسیاتی مسئلہ ہو لیکن جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ ڈونا بھی اس رائے سے متفق تھی لیکن ایک دفعہ اس نے ہنسی ہنسی میں کہا تھا کہ ٹیڈ کے ساتھ ساتھ اب اسے بھی خوف محسوس ہونے لگا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ جب کبھی ٹیڈ رات کو ڈرتا ہے، صبح اس کی الماری میں سے عجیب طرح کی بو آتی ہے۔ جیسے رات بھر وہاں کوئی غلط جانور بیٹھا رہا ہو۔ ڈونا کی اس بات پر وک نے خود الماری میں گھس کر دیکھا تھا۔ یہ ایک کافی بڑی اور کھلی الماری تھی۔ وک کو بھی اندر سے عجیب طرح کی باس آتی تھی لیکن اس نے اس کا سبب یہ ڈھونڈا تھا کہ ممکن ہے ٹیڈ نیند میں چلتا ہوا الماری تک پہنچ جاتا ہو اور جیسا کہ عموماً اس قسم کے مریض کرتے ہیں۔ الماری میں پیشاب کر دیتا ہو۔

ٹیڈ مسلسل آنسو بہا رہا تھا۔ وک نے اسے گود میں اٹھا کر پیار کیا اور بولا۔ گھبراؤ مت جوان میں جانے سے پہلے بلا کو بھگانے والے الفاظ ایک کاغذ پر لکھ کر تمہارے پلنگ کے سامنے دیوار پر لٹکا جاؤں گا۔''

''کیا بلا پر اس کا اثر ہوگا؟'' ٹیڈ نے معصومیت سے پوچھا۔

''کیوں نہیں ہوگا۔'' وک نے کہا۔

''تو پھر ڈیڈ کہیں بھول نہ جانا۔''

اس رات جب ٹیڈ سو گیا تو وک چپکے سے اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ہاتھ میں ایک کاغذ پکڑا ہوا تھا۔ پش پن کے ساتھ اس نے یہ کاغذ ٹیڈ کی خوابگاہ میں ایسی جگہ لگا دیا جہاں اس کی نظر بآسانی پڑ سکے۔ کاغذ پر بڑے بڑے اور صاف حروف میں لکھا تھا۔

''بلا! اس کمرے سے دور رہو۔ تمہارا یہاں کوئی کام نہیں ٹیڈ کے بستر کے نیچے گھسنے کی کوشش فضول ہے کیونکہ وہ بہت نیچا ہے۔ ٹیڈ کی الماری میں گھسنے کی کوشش بھی فضول ہے کیونکہ وہ بہت تنگ ہے۔ ٹیڈ کی کھڑکی سے باہر کھڑے ہونے کی کوشش میں بھی کچھ حاصل نہیں۔ تم کب تک وہاں کھڑی رہو گی۔ کسی بھوت کسی جانور، کاٹ کھانے والی کسی شے کا یہاں کوئی کام نہیں۔ آج کی تمام رات کوئی چیز ٹیڈ کو چھوئے گی اور نہ کاٹے گی۔''

اس دوران ڈونا بھی ٹیڈ کی خوابگاہ میں چلی آئی تھی۔ وک نے یہ الفاظ اسے بھی دکھائے اور تاکید کی کہ اس کے جانے کے بعد ہر رات ٹیڈ کے سامنے یہ تحریر ضرور پڑھے۔

ٹیڈ کے کمرے سے نکلتے وقت اس نے دیکھا کہ الماری کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا ہے۔ اس نے دروازے کو مضبوطی سے بند کر دیا۔ لیکن رات کسی وقت دروازہ پھر کھل گیا۔ جلتی ہوئی سرخ آنکھیں اس میں سے جھانکنے لگیں اور ایک عجیب سا سایہ متحرک ہو گیا...... ٹیڈ بے خبر سو رہا تھا۔

چیرئی نے برٹ سے پوچھا اگر اس کے ڈیڈی اسے جانے کی اجازت دے دے تو اس کی اپنی مرضی کیا ہوگی۔ برٹ کچھ متذبذب تھا۔ شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ باپ اسے جانے کی اجازت دے دے گا لیکن لمبے سفر کا شوق اس کے دل میں بھی چٹکیاں لے رہا تھا۔ اس کی خالہ کنکٹی کٹ میں رہتی تھی اور یہ جگہ کم از کم ساڑھے تین سو میل کے فاصلے پر تھی۔ بس کا طویل سفر کئے ہوئے اسے ایک عرصہ ہو چکا تھا۔ اگر ڈیڈی اسے جانے کی اجازت دے دیتے تو وہ ایک لمحے کی بھی دیر نہ کرتا۔ اس کی ماں چیرئی کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ پھر اس نے سر اٹھا کر برٹ کی آنکھوں میں دیکھا اور بولی برٹ! کیوں نہ تمہارے ڈیڈ کو میں کوئی تحفہ دوں۔ اس طرح ہوسکتا ہے اس کا دل پسیج جائے۔ تمہارے خیال میں اسے آج کل کس چیز کی ضرورت ہے۔'' برٹ نے ایک دو چیزوں کے نام گنوائے پھر بولا۔

''ممی اس وقت ڈیڈی کی سب سے اہم ضرورت تو چین مشین ہے۔ لیکن وہ تم خرید نہیں سکو گی۔ اس کی قیمت کم از کم...... ڈالر ہے'' چیرئی بولی۔

''اگر واقعی یہ تمہارے ڈیڈی کی ضرورت ہے تو ہم اسے خرید لیں گے''

''لیکن کیسے ممی؟'' برٹ جو گھر کی مالی حالت سے بخوبی آگاہ تھا۔ حیرت سے بولا۔

چیرئی نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور لاٹری کا ایک ٹکٹ نکال کر برٹ کے سامنے کر دیا۔ ایک عرصے سے وہ ہر ہفتے پچاس سینٹ کا ''لاٹری ٹکٹ'' خریدا کرتی تھی اور اس ہفتے کا ٹکٹ اس کے لئے پانچ ہزار ڈالر کا انعام لایا تھا۔

گیراج خالی تھا۔ کوجو تاریکی میں فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ پچھلے چند روز اس پر بہت بھاری گزرے تھے۔ اس کا سارا جسم جیسے آگ میں جل رہا تھا۔ تھوتھنی کے زخم میں ہونے والی جلن دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ اب تو کچھ کھانے پینے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا...... اچانک کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے مالک کی گاڑی کا شور پہچانتا تھا۔ یقیناً یہ کوئی اور تھا۔ وہ بھاری قدموں سے چلتا ہوا گیراج کے دروازے تک آیا۔ باہر بہت تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے کبھی اتنا چمکدار دن نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں دکھنے لگیں۔ گیراج کے سامنے ایک ٹرک کھڑا تھا اور اس میں سے دو غیر مانوس چہرے جھانک رہے تھے۔ کوجو دن کی چکاچوند سے گھبرا کر دوبارہ گیراج کی تاریکی کی طرف بڑھ گیا۔

یہ ٹرک پورٹ لینڈ مشین کمپنی کا تھا۔ ابھی تین گھنٹے پہلے چیرئی اور برٹ اس کمپنی کے مرکزی دفتر واقع روٹ 14 پر گئے تھے اور انہوں نے یہ مشین خرید کر گھر بھجوائی تھی۔ کمپنی کے دونوں ملازموں نے وزنی چین فال مشین ٹرک سے بمشکل اتاری۔ کچھ دیر ٹرک کے سائے میں کھڑے پسینہ پونچھتے رہے پھر مشین اٹھا کر گیراج کی طرف بڑھے۔ گیراج (ورکشاپ) بالکل خالی تھا۔ گھر میں بھی کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ چیرئی اور برٹ تو مشین بھجوا کر کچھ خرید و فروخت کے لئے چلے گئے تھے جب کہ کیمبر صبح کا کہیں نکلا ہوا تھا برٹ کا خیال تھا کہ وہ کاسٹ راک، کے کباڑیے کے پاس گیا ہوا ہے۔ دونوں ملازم گیراج میں داخل ہوئے تو چند لمحے تاریکی کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پھر ایک گاڑی کا ہیولا نظر آیا۔ قریب ہی کچھ اوزار بکھرے ہوئے تھے۔ ابھی وہ ورکشاپ کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ گاڑی کے عقب سے ایک دھیمی غراہٹ بلند ہوئی۔ دونوں آدمی ٹھٹھک کر رک گئے۔ دونوں اچھے خاصے صحتمند نوجوان تھے لیکن غراہٹ میں کوئی ایسی بات تھی کہ ایکا ایکی ان کے چہرے خوف سے سفید ہو گئے۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ غراہٹ کسی بہت بڑے کتے کے حلق سے برآمد ہوئی ہے...... اور اگر یہ کتا بندھا ہوا نہیں تھا تو وہ سخت خطرے میں تھے۔ جونہی ان کی آنکھیں اندھیرے میں اچھی

طرح دیکھنے کے قابل ہوئیں۔ انہوں نے اپنے سامنے بھیانک شکل کا ایک نہایت جسیم کتا دیکھا۔ وہ ان سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تیزی سے دم ہلا رہا تھا۔ اور وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ کتے کے گلے میں زنجیر نہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دہشت زدہ نگاہوں سے دیکھا اور دھیمے قدموں سے پیچھے ہٹنے لگے۔ انہیں پیچھے ہٹتا دیکھ کر کتا آگے بڑھنے لگا۔ ان کے ہر قدم کے بدلے وہ ایک قدم اٹھا رہا تھا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی مسلسل غراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ کسی بھی لمحے ان پر چھلانگ لگا سکتا ہے۔ وہ الٹے قدموں چلتے گیراج سے نکلے اور اپنے ٹرک کے پاس پہنچ گئے۔ ڈرائیور نے کپکپاتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔ پھر دونوں اس طرح اندر داخل ہوئے جیسے موت ان کا تعاقب کر رہی ہے۔ دروازہ بند کرنے کے بعد دونوں نے پشیمان نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کھسیانی ہنسی ہنسنے لگے۔ کتا چند گز کے فاصلے پر کھڑا انہیں غضبناک نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ غراہٹ مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ ڈرائیور نے ٹرک اسٹارٹ کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں تیزی سے واپس جا رہے تھے۔

وہ دونوں جانتے تھے کہ جو کیمبر کا کتا ٹھیک نہیں شاید وہ بیمار ہے یا بیمار ہو رہا ہے۔ ڈرائیور نے سوچا انہیں واپس دکان پر جا کر جو کیمبر کو ٹیلیفون پر اس کے کتے کی حالت سے آگاہ کرنا چاہئے۔ یہ نہ ہو، وہ یا اس کے اہل خانہ میں سے کوئی نقصان اٹھا بیٹھے لیکن دکان پر جا کر وہ سب کچھ بھول گئے۔ کتے کا خیال دوبارہ ان کے ذہن میں اس وقت آیا جب چند دن بعد انہوں نے کتے کے متعلق اخبار میں پڑھا...... لیکن اس وقت ان کے کرنے کا کوئی کام باقی نہیں رہا تھا۔

☆......☆......☆

ان کے دورے کی تمام تفصیلات طے ہو چکی تھیں۔ وک کے ساتھ اس کا کاروباری شریک اور نہایت عزیز دوست روجر جا رہا تھا۔ پورٹ لینڈ سے بوسٹن جانے کے لئے دونوں کی نشستیں جہاز پر مخصوص ہو چکی تھیں۔ اس شام وک گھر جانے کے لئے دفتر سے جلدی اٹھ کھڑا ہوا۔ اٹھنے سے پہلے اس نے لیٹر بکس میں جھانکا ایک لفافہ نظر آیا۔ اوپر موٹے حروف میں ذاتی لکھا تھا۔ نجانے کیوں وک کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے وہیں میز پر بیٹھے بیٹھے لفافہ چاک کیا۔ تحریر پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں جل اٹھیں۔ جوں جوں وہ خط پڑھتا گیا اس کا چہرہ خون سے خالی ہوتا گیا۔ کمرہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ...... اس کی بیوی ایسی بھی ہو سکتی ہے لیکن شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ لکھنے والے نے ڈونا کے لئے فرار کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا۔ خط اس کے ہاتھوں میں لرز رہا تھا۔ ذہن لمحوں میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔ بیوی سے جدائی، ٹیڈ کا مستقبل، گھر کی بربادی، اس کی سوچ بہت دور تک پہنچ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں سرخ ہوتی چلی گئیں۔ پھر اس نے سر میز پر ٹکایا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ جب آنسوؤں کا تند ریلا گزر گیا تو دل و دماغ میں دکھ کی جگہ غصے نے لے لی۔ وہ دفتر سے نکلا اور دھیمے قدموں سے چلتا ہوا ایک پارک میں آ بیٹھا۔ اس کے اندر ایک طوفان برپا تھا ...... وہ اس طوفان کے ساتھ گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ یہ حالت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی ڈونا کے لئے، ٹیڈ کے لئے اور اس کے اپنے لئے بھی۔

☆......☆......☆

جو کیمبر نے گیراج کے بیرونی دروازے کے پاس چین فال مشین، پڑی دیکھی تو حیران رہ گیا۔ اتنی مہنگی مشین کی ادائیگی کون کرے گا؟ اس نے سوچا اور پیر پٹختا ہوا چیری کے پاس جا پہنچا۔ جب اسے چیری نے بتایا کہ یہ مشین وہ اسے تحفے میں دے رہی ہے تو اس کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ چیری کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے۔ بالآخر چیری نے اسے بتایا کہ اس کی لاٹری نکلی ہے اس نے یہ بھی بتایا کہ اپنے اس تحفے کے عوض وہ اس سے کیا رعایت حاصل کرنا چاہتی ہے۔ جب جو کیمبر کو

ہلا کہ وہ برٹ کو ساتھ لے کر اپنی بہن کے ہاں جانا تی ہے تو اس کی ساری خوشی کافور ہوگئی اور وہ ایک ہر سخت غصے میں دکھائی دینے لگا۔ اس نے چیری کو نے کے لئے اپنی پتلون کی پیٹی کھولی لیکن چیری ال معمول خوفزدہ ہوئی اور نہ چیخی چلائی۔ وہ آج کوئی انی کمزوری دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ فیصلے کے موڈ ں تھی۔ اس نے تن کر شوہر سے کہا کہ وہ اسے مار پیٹ تا ہے لیکن اس کا ارادہ نہیں بدل سکتا۔ وہ برٹ کو ضرور اتھ لے جائے گی۔ اس کے لئے وہ برٹ کے اساتذہ ور قصبے کے شیرف سے مدد کی درخواست کرے گی۔ ری کا عزم دیکھ کر کیمبر کچھ نرم پڑ گیا۔ کچھ سوچ بچار کے عد اس نے ماں بیٹے کو اکٹھے جانے کی اجازت دے دی بہت عرصے بعد اس نے بیوی کو رحم کی نظروں سے یکھا تھا۔ یہ عجیب نفسیاتی مسئلہ تھا۔ جو کیمبر جانتا تھا اگر ری حسب معمول اس کی مار سے بچنے کے لئے روتی ہلاتی تو وہ اسے بری طرح پیٹ ڈالتا۔

تھوڑی دیر بیوی سے باتیں کرنے کے بعد وہ ہر نکل گیا تقریباً ایک فرلانگ دور سڑک کے کنارے یلے کی دوسری جانب گرے کا مکان تھا۔ گرے ایک دھیڑ عمر شخص تھا اور تنہا رہتا تھا۔ اس کا سبزیوں کا چھوٹا سا ارم تھا۔ جو اور گرے کئی سالوں سے گہرے دوست تھے اس محفل کے شرکاء عموماً وہ دونوں ہی ہوتے تھے۔ اس روز بھی گرے گھر سے باہر گھاس پر کھڑا جو کا انتظار کر رہا تھا۔ جو کو دیکھتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں۔ شام ہو گئی تھی آسمان پر اکا دکا تارے چمکنے لگے تھے۔ دونوں دوست کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد تاش کھیلنے میں مصرو ف ہو گئے۔ کوجو جو اکثر ٹہلتا ہوا اس جانب نکل آتا تھا اس وقت بھی ان کے قریب بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا سر اگلے پنجوں پر جھکا رکھا تھا۔ دونوں سمجھ رہے تھے کہ وہ سو رہا ہے لیکن وہ جاگ رہا تھا۔ اس کی حالت دن بدن بتر ہوتی جا رہی تھی۔ تھوتھنی کی جلن مزید بڑھ گئی تھی۔ آنکھوں میں درد کی مسلسل لہریں اٹھتی رہتی تھیں اور ہڈیوں میں عجیب طرح کی اینٹھن اتر گئی تھی اسے اکثر سخت پیاس لگی رہتی تھی لیکن پانی سے اسے خوف آتا تھا۔ پچھلے دو روز سے تو اس نے اپنے پانی کے برتن کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ جو اور گرے کھیل کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہے تھے۔ جو اسے بتا رہا تھا کہ اس کی بیوی کی لاٹری نکلی ہے اور اب وہ برٹ کے ساتھ اپنی بہن سے ملنے جا رہی ہے اس نے گرے سے کہا کہ بیوی کے جانے کے بعد وہ بھی تفریح کی غرض سے کچھ دن شہر میں گزارنا چاہتا ہے۔ گرے نے کہا اگر ایسا پروگرام ہے تو وہ بھی اس کے ساتھ جائے گا۔

☆......☆......☆

جب وک گھر میں داخل ہوا تو ننھا ٹیڈ دیر ہوئی سو چکا تھا اور ڈونا آرام کرسی پر نیم دراز اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جب وک باتھ روم سے منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلا۔ اس نے کہا۔ ڈونا میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ فقرہ تین گھنٹے پر مشتمل اس طویل گفتگو کی تمہید ثابت ہوا۔ جو ان کی ازدواجی زندگی کی سب سے نازک گفتگو تھی۔ وک نے اس خط کا تذکرہ کیا جو آج کی ڈاک سے اسے ملا تھا ڈونا نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا۔ اس نے وک کو زار و قطار روتے ہوئے بتایا کہ تنہائی کے احساس نے اسے گناہ کی دلدل میں پھنسا دیا تھا۔ ٹیڈ کے اسکول اور وک کے دفتر جانے کے بعد وہ اتنے بڑے گھر میں تنہا رہ جاتی تھی۔ ایسے میں جب وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی تو اسے ہر آن اپنی ڈھلتی ہوئی عمر کا احساس ہوتا۔ وہ سوچتی، زندگی کتنی یکسانیت اور تیزی سے گزر رہی ہے۔ ایسے میں قصبے کا سیٹو نامی خوبرو نوجوان اس کی زندگی میں آیا، وہ اس سے فلرٹ کرنے لگی۔ اب وہ اپنے کئے پر بہت پشیمان تھی اور کچھ عرصے سے اس نے سیٹو سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ ڈونا نے بتایا کہ یہی قطع تعلق اس گمنام خط کا سبب بنی ہے۔ وک نے بیوی کی تمام باتیں بڑے تحمل سے سنیں اس نے اپنی صفائی میں جو کچھ کہا وہ کافی متاثر کن تھا۔ اس نے اپنی غلطی تسلیم کی تھی اور اس غلطی کو آئندہ کبھی نہ دہرانے کا غیر مشروط عہد بھی کیا تھا۔ ڈونا کی صاف سیدھی باتوں نے وک کے طیش میں کسی حد

تک کی کردی تھی۔ لیکن کوئی بھی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے وہ بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا۔

برٹ علی الصبح اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ممی ڈیڈی بالائی منزل پر واقع خواب گاہ میں سو رہے تھے۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ گہری دھند پھیلی ہوئی تھی۔ آج برٹ بہت خوش تھا شاید اس وجہ سے صبح زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ آج وہ اپنی ممی کے ساتھ کنکٹی کٹ جارہا تھا۔ اس نے جوگر پہنے اور دبے قدموں چلتا گھر سے باہر آ گیا۔ بہت عرصے بعد وہ اتنی جلدی نیند سے بیدار ہوا تھا۔ باہر کا نظارہ واقعی خوبصورت تھا۔ ہر شے، دھند کی سفید چادر میں چھپی ہوئی تھی۔ وہ ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ اچانک ایک غراہٹ سنائی دی۔ وہ سرتا پاؤں لرز گیا۔ ایک لمحے کے لئے تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے دھند میں چند قدموں کے فاصلے پر کوئی بھیڑیا کھڑا ہے۔ پھر اس نے حواس بحال کئے اور مدھم آواز میں پکارا۔ ”کو جو...... مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔ دھند سے باہر آؤ“

لیکن غراہٹ بتا رہی تھی کہ کو جو نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ زندگی میں پہلی بار برٹ کو اپنے پالتو کتے کی غراہٹ اجنبی محسوس ہوئی تھی۔ وہ چند قدم آگے بڑھا اور پھر اسے کو جو کا ہیولا نظر آیا۔ وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ تقریباً 200 پونڈ وزنی کو جو کی بڑی بڑی آنکھوں سے عجیب طرح کی سرخی جھلک رہی تھی۔ اس کے بال کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے لگتا تھا کسی جوہڑ کی تہہ میں لوٹنیاں لگا تا رہا ہے۔ اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی اور شکل ایسی ڈراؤنی ہوگئی تھی کہ برٹ لرز کر رہ گیا۔ وہ اپنے چار پیروں پر کھڑا ایک ٹک برٹ کو گھور رہا تھا جیسے پہچاننے کی کوشش کررہا ہو۔ ایک لمحے کے لئے تو برٹ کو محسوس ہوا جیسے وہ اس پر چھلانگ لگانے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن پھر اس نے رخ پھیرا اور آہستہ قدموں سے چلتا ہوا دھند میں غائب ہوگیا۔ برٹ دیر تک اس جگہ کھڑا رہا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کا پیارا کو جو ٹھیک نہیں وہ بیمار تھا لیکن اسے ہوا کیا تھا۔ شاید اس نے کسی پرندے کی زہریلی بیٹ کھالی تھی۔ وہ باؤلے پن کے متعلق جانتا تھا اور اس نے کچھ جانوروں پر اس خوفناک بیماری کے اثرات بھی دیکھے تھے لیکن اس وقت اس کے ذہن میں بالکل نہیں آیا کہ کو جو اعصابی نظام کی اس بدنام زمانہ بیماری کا شکار ہو چکا ہے۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ کتے نے کوئی زہریلی چیز کھالی ہے اس نے سوچا اور فوراً ڈیڈی کو آگاہ کرنا چاہیے۔ ایک دفعہ پہلے بھی کو جو بیمار ہوا تھا تو ڈیڈی اسے قصبے کے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ یہ سوچ کر وہ واپس مڑا لیکن پھر ٹھٹھک کر رک گیا...... مگر ان کے پروگرام کا کیا بنے گا؟ وہ جانتا تھا کہ ممی نے بدقت تمام ڈیڈی سے کنکٹی کٹ جانے کی اجازت حاصل کی ہے۔ اب بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کہ وہ واقعی جا پائیں گے۔ درحقیقت بس پر چڑھنے کے بعد ہی ان کا پروگرام ڈیڈی کی دست برد سے محفوظ ہوسکتا تھا۔ اس غیر یقینی حالت میں اگر وہ کو جو کی بیماری کا ذکر کر دیتا تو عین ممکن تھا ڈیڈی انہیں جانے سے روک دیتے...... کچھ سوچ کر وہ آگے بڑھا اور جھاڑیوں میں کو جو کو تلاش کرنے لگا۔ اس نے دھیمی آواز میں اسے کئی بار پکارا لیکن کو جو باہر نہیں آیا...... اسے کیا کرنا چاہئے؟ وہ کچھ دیر سخت شش و پنج کے عالم میں کھڑا سوچتا رہا پھر ممی سے مشورہ کرنے گھر کی طرف چل دیا۔

☆......☆......☆

وک روانہ ہونے کے لئے تیار تھا۔ ٹیڈ بھی بیدار ہو کر ناشتے کی میز پر چلا آیا۔ ڈونا نے پوچھا کہ وہ اتنی جلدی کیوں بیدار ہوگیا ہے۔ اس نے بتایا کہ اسے معلوم تھا۔ ڈیڈی جارہے ہیں اس لئے انہیں خدا حافظ کہنے چلا آیا۔ وہ وک کی گود میں بیٹھ کر کھلونے کا تقاضہ کرنے لگا۔ وک نے وعدہ کیا کہ واپسی پر وہ اس کے لئے ایک خوبصورت تحفہ لائے گا۔ ٹیڈ نے کہا۔

ڈیڈ! میں نے کلینڈر پر آپ کی واپسی کی تاریخ پر نشان لگا دیا ہے۔ میں روز آپ کا انتظار کرونگا۔“

”وک نے کہا“ میں ہر دوسرے روز تمہیں ٹیلیفون کال کیا کرونگا اور ممی روز رات کو تمہیں وہ الفاظ سنایا کریں گی جو میں نے بلا کو بھگانے کیلئے تمہارے

...ے کی دیوار پر لگا دی ہے، تم کوئی فکر نہ کرنا۔ اس ...ن وک کو یاد آیا کہ وہ ڈونا کی خراب کار کے بارے ...ں، جو کیمبر“ کی ورکشاپ ٹیلیفون کرنا بھول گیا ہے۔ ...نے بیوی کو ہدایت کی کہ دس گیارہ بجے ٹیلیفون کرکے ...ے اس بارے میں کہہ دے۔

جس وقت وک گھر سے روانہ ہو رہا تھا، تقریباً اسی ...ت کاسٹل راک سے چند میل کے فاصلے پر چیرٹی اور ...ٹ بھی روانگی کی تیاری کررہے تھے۔ برٹ اندر داخل ...ا تو اس نے ماں کو آئینے کے سامنے کھڑے دیکھا، وہ ...پنے بال سنوار رہی تھی۔ آج وہ کافی نکھری نکھری دکھائی ...ے رہی تھی۔ اس کا باپ جو کیمبر ساتھ والے کمرے میں ...ز پر نیم دراز تھا۔

”ممی“ برٹ نے آہستہ سے پکارا۔

”چیرٹی نے جلدی سے گھوم کر دیکھا۔ وہ بری ...رح چونک گئی تھی۔“ کیا بات ہے برٹ، اس نے جھک ...ر سرگوشی کی۔ اس کے چہرے پر خدشات کے سائے ...نڈلا رہے تھے۔ ”کیا تمہارے ڈیڈی نے کچھ کہہ دیا ...ہے؟“ حقیقت یہ تھی کہ پچھلے چوبیس گھنٹے دونوں ماں بیٹے ...نے سخت اضطراب میں گزارے تھے۔ ہر لمحے یہی دھڑکا ...ا رہا کہ ابھی ان کا پروگرام درہم برہم ہو جائیگا۔ اب ...پہلے آدھے گھنٹے سے جو کیمبر ریڈیو سننے میں مصروف تھا ...اس نے کوئی بات نہیں کی تھی پھر بھی چیرٹی کو ڈر لگ رہا ...ا کہ کہیں اس کی یہ خاموشی کسی اچانک تبدیلی کا باعث نہ ...ن جائے۔ یہی وجہ تھی جو وہ برٹ کی آواز پر بری طرح ...ٹھک گئی تھی۔ برٹ نے کہا۔

”نہیں ممی۔ ڈیڈی نے تو کچھ نہیں کہا لیکن مجھے ...لگتا ہے...... کو جو ٹھیک نہیں، مجھے ڈیڈی کو اس کے بارے ...میں بتا دینا چاہئے۔

چیرٹی نے ایک لمحہ برٹ کی آنکھوں میں دیکھا ...پھر جھک کر اس کے کندھوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اس ...کی گرفت اتنی سخت تھی کہ برٹ حیران رہ گیا۔ وہ تیز سر...گوشی میں بولی ”برٹ! باپ سے ایک لفظ نہ کہنا ورنہ ہم ...کبھی روانہ نہیں ہوسکیں گے...... سمجھے تم؟“ پھر چند لمحے اس کے چہرے پر نظریں جمائے رکھنے کے بعد بولی۔ ”اب مجھے بتاؤ کہ کو جو کو کیا ہوا ہے۔“

برٹ نے مختصر الفاظ میں اسے تھوڑی دیر پہلے پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتادیا۔ ساری بات سن کر چیرٹی بولی۔ دیکھو برٹ تم نے جو کچھ بھی دیکھا گہری دھند میں دیکھا۔ عین ممکن ہے کہ تمہیں کو جو کی خراب حالت کا دھوکا ہوا ہو لیکن اگر ایسا ہے بھی تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ضرور اس نے کوئی زہریلی چیز کھالی ہے۔ اب اگر تم اپنے ڈیڈی سے بات کروگے تو وہ سب سے پہلے بات یہی کہے گا کہ کتا تمہارا ہے میرا نہیں، مجھے ورکشاپ میں بہت کام ہے۔ اپنے کتے کا دھیان رکھنے کیلئے تم یہیں رہو لیکن اگر ہم چلے جائیں اور بعد میں تمہارے ڈیڈی کو کتے کی بیماری کا پتہ چلے تو وہ خود ہی اس کا علاج کریگا۔ اگر کوئی تشویشناک بات ہوئی جیسا کہ مجھے امید ہے نہیں ہوگی تو وہ اسے قصبے کے ڈاکٹر کے پاس بھی لے جاسکتا ہے۔ آج شام تم ٹیلیفون کرکے اپنے ڈیڈی سے پوچھ سکتے ہو۔ کہ کو جو کو کھانا وغیرہ دیا ہے یا نہیں اس سے تمہیں کو جو کی حالت کا صحیح علم ہو جائیگا۔“

ماں کی باتوں سے برٹ کی تشویش آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔ بالآخر وہ اسے اس بات پر قائل کرنے میں کامیاب ہوگئی کہ وہ اپنے ڈیڈی کو کچھ نہیں بتائے۔

صبح دس بجے کے قریب جو کیمبر نے بیوی اور بچے کا سامان کار میں رکھا اور انہیں لے کر بڑی سڑک کی طرف روانہ ہوگیا۔ آخری وقت تک چیرٹی اور برٹ کو دھڑکا لگا رہا کہ کہیں کو جو گھومتا ہوا اس کی طرف نہ آ نکلے لیکن خیریت گزری۔ کار انہیں لے کر روانہ ہوگئی۔ پانچ منٹ بعد وہ بڑی سڑک کے کنارے اتر رہے تھے۔ بس آنے میں ابھی کچھ دیر تھی جو کیمبر، برٹ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ایک جانب لے گیا۔ دونوں باپ بیٹا سڑک کے کنارے ٹہلنے لگ۔ جو کی سخت گیری آج قدرے ماند دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ایک نظر بنچ پر بیٹھی چیرٹی کو دیکھا پھر برٹ سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ آخر میں اس نے ہدایت کی کہ وہ اپنی ماں کا

خیال رکھے پھر اس نے بیئر کی ملی جلی بو برٹ کے نتھنوں سے ٹکرائی ......اور اس لمحے برٹ کو احساس ہوا کہ اپنے باپ کی تمام تر سخت گیری کے باوجود اس سے محبت کرتا ہے۔ ”بس سڑک پر پہنچ چکی تھی۔ جو اور برٹ نے اپنا سامان بس پر رکھا۔ چیری نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے شوہر کو دیکھا۔ برٹ نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ ڈیڈی نے بھی ہاتھ ہلا کر جواب دیا۔ پھر بس کا دروازہ بند ہوگیا......اس کے بعد برٹ نے اپنے باپ کو کبھی زندہ نہیں دیکھا۔

گرے اپنے گھر سے باہر بیٹھا تھا۔ حسب معمول میز پر تاش کے پتے دھرے تھے۔ وہ ووڈ کا پینے کا ساتھ ساتھ اکیلا ہی تاش سے دل بہلا رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر پہلے جو کیمبر کو اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ بڑی سڑک کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جو انہیں بس پر بٹھانے جارہا ہے۔ آج نجانے کیوں اس کے سر میں سخت درد ہورہا تھا۔ اس نے سوچا ووڈ کا سے کام نہیں چلے گا اسے اسپرین کی ایک دو گولیاں لے لینی چاہئیں۔ یہی سوچ کر وہ اندر جانے کے لئے اٹھا تھا، جب اسے کوجو کی غراہٹ سنائی دی۔ غراہٹ میں کچھ ایسی بات تھی کہ وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ ذرا دیر بعد سامنے جھاڑیوں میں حرکت پیدا ہوئی اور کوجو کا سراپا دکھائی دیا۔ گرے نے کوجو کی صرف ایک جھلک دیکھی اور وہ سمجھ گیا کہ کتا پاگل ہو چکا ہے۔ اس کی آنکھوں میں وہ منظر گھومنے لگا جب چند سال پہلے اس نے بستی کے دوسرے مکینوں کے ساتھ مل کر ایک پاگل کتے کو ہلاک کیا تھا۔ اس کتے کی شکل اب گرے کی نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ وہ کتا نسبتاً چھوٹا تھا لیکن اس کی آنکھیں بھی کوجو ہی کی طرف سرخ نظر آرہی تھیں۔ منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی اور تھوتھنی عجیب انداز میں مڑی ہوئی تھی۔ کوجو کو دیکھ کر گرے کا دھیان سب سے پہلے اپنی بندوق کی طرف گیا۔ وہ آہستہ آہستہ الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ کوجو کو پچکارتا بھی جارہا تھا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ کوجو اس پر چھلانگ لگانے والا ہے وہ مڑا اور تیزی سے بھاگنے لگا۔ اس کا رخ پورچ کی طرف تھا۔ اس نے سوچا اگر کسی طرح وہ گھر کے اندر پہنچ جائے اور بندوق حاصل کرلے تو اس خونی جانور سے بچ سکتا ہے۔ وہ جانتا تھا کتا باؤلا ہے اور اس کے لگائے ہوئے ایک چھوٹے سے زخم کا مطلب ہے دردناک موت۔ وہ ٹانگوں کی پوری قوت سے دوڑ رہا تھا اور عقب میں کوجو کے بھاگنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ لحہ بہ لحہ اس کے قریب ہورہا تھا۔ پھر ایک لحہ ایسا آیا جب اسے عقب میں کوئی آواز سنائی نہیں دی وہ جان گیا کہ کوجو نے اس پر چھلانگ لگادی ہے......تب 200 پونڈ وزنی کوجو کا جسم اس سے ٹکرایا اور گرے اوندھے منہ فرش پر گرا۔ پھر وہ تیزی سے سیدھا ہوا کتا اس کے اوپر تھا۔ اس کا بالوں سے بھرا ہوا پیٹ اس کے منہ پر دھرا تھا۔ گرے کو محسوس ہوا جیسے اس بدبودار بوجھ کے نیچے اس کا دم گھٹ جائے گا۔ اس نے چیختے ہوئے دونوں ہاتھوں سے کتے کو پیچھے ہٹانا چاہا اور اس وقت کتے نے اس کے کندھے پر کاٹا۔ ایک زوردار جھٹکے سے کندھے کی کھال ادھڑتی چلی گئی۔ گرے کو زبردست جلن کا احساس ہوا۔ گرم گرم خون اس کی کہنی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے کتے کو ٹانگوں کی پوری قوت سے دھکیلا اور وہ پیچھے ہٹ گیا۔ گرے اٹھ کر کمرے کی طرف بھاگا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں کندھے پر جیسے انگارے رکھے ہوئے تھے۔ دروازے کا ہینڈل گھما کر وہ حتی المقدور تیزی سے اندر گھس گیا۔ اس کی رائفل دیوار پر لٹک رہی تھی۔ اس نے رائفل اتاری اور انتہائی طیش اور خوف کے عالم میں شیشے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ کوجو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے شاٹ گن کا حفاظتی کھٹکا ہٹایا اور محتاط نگاہوں سے باہر جھانکنے لگا۔ وہ محسوس کررہا تھا کہ اس کے حواس بتدریج معطل ہورہے ہیں۔ وہ بے ہوش ہورہا تھا ”نہیں...... یہ وقت بے ہوش ہونے کا نہیں اس نے خوف سے کہا۔“ مجھے اس پاگل کتے کو مارنے تک ہوش میں رہنا چاہئے۔” اس نے زبان کو دانتوں سے کاٹ کر خود کو ہوش میں رکھنے کی کوشش کی۔ کندھے کا زخم بری طرح جل رہا تھا۔ کیا اس پر بھی پاگل پن کا اثر ہوجائے گا۔ اس نے نہایت

تشویش کے عالم میں سوچا۔ پھر اس کی گرفت بندوق پر اور مضبوط ہوگئی۔ مجھے اس وقت صرف اس کتے کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی ......اور اس وقت ایک زوردار چھناکا ہوا۔ گرے نے جلدی سے مڑ کر دیکھا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ کوجو بغلی دروازے کا شیشہ چکنا چور کرتا ہوا اندر گھس آیا تھا۔ اس کے دانت مڑی ہوئی تھوتنی کے نیچے سے جھانک رہے تھے۔ آنکھیں مزید سرخ ہوگئی تھیں۔ پھر وہ گرے پر جھپٹا۔ چند لمحے کے لئے دونوں زور آزمائی کرتے رہے۔ پھر گرے جو کتے سے تقریباً 50 پونڈ کم وزن رکھتا تھا لڑکھڑا کر گرا۔ کتا ایک خوفناک غراہٹ سے اس پر سوار ہوگیا۔ گرتے ہوئے گرے کا سر پرشور آواز سے ایک الماری سے ٹکرایا تھا لیکن اسے کسی تکلیف کا احساس نہیں تھا۔ وہ صرف ایک ہی لمس محسوس کررہا تھا اور وہ لمس تھا کتے کا۔ اس بدبودار کھال کا اسکے منہ سے بہتی ہوئی جھاگ کا اور اس کی گرم گرم تھوتنی کا کتے کی تھوتنی بار بار اس کی ٹھوڑی کے نیچے ٹکرا رہی تھی گرے نے سوچا اسے اپنے ہاتھوں کے انگوٹھے استعمال کرکے کتے کی آنکھیں پھوڑ دینی چاہئیں لیکن اس سے پیشتر کہ وہ اپنے ہاتھوں کو استعمال کرتا۔ کتے کے نوکیلے دانت اس کے حلق میں پیوست ہوگئے اور اس کا نرخرہ ادھڑتا چلا گیا۔ اس کی زخمی گردن سے خون کا فوارہ ابلا اور اس کے سینے پر پھیل گیا۔ سانس اکھڑ گئی متحرک ہاتھوں کی مزاحمت کمزور پڑ گئی۔ گرے سمجھ گیا کہ وہ مر رہا ہے۔ جو کیمبر گھر میں داخل ہوا۔ کوجو کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ عموماً گھر کے پچھلے صحن میں بیٹھا رہتا تھا اور اس وقت آتا جب اسے بلایا جاتا تھا۔ دراصل گھر کے سامنے والے صحن میں درختوں کے درمیان گلہریوں کی بہتات تھی۔ یہاں پہنچتے ہی کوجو کی حس شامہ اسے بھاگ دوڑ پر مجبور کردیتی تھی۔ جو نے برآمدے میں کھڑے ہوکر کوجو کو کئی آوازیں دیں لیکن وہ نہیں آیا۔ ”جو“ حیران ہورہا تھا کہ اتنی گرمی میں کتا کہاں چلا گیا۔ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا وہ یہی سوچتا ہوا کمرے میں پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ ایک صوفے کا کشن ادھڑا پڑا ہے۔ ایسا لگ رہا تھا یہ کوجو کا کام ہے کوجو کے معمولات پچھلے چند روز سے بدلے بدلے تھے اور ”جو“ نے غور کیا تو اسے اندازہ ہوا کہ دو تین دن سے اس نے کوجو کو بالکل نہیں دیکھا۔ اس وقت بھی شاید وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ وہ وہیں کمرے میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک اس کے دماغ میں آیا کہ وہ تو گرے کے ساتھ بوسٹن جارہا ہے اس کے بعد کتے کو خوراک کون دے گا۔ ایک صورت یہ ہوسکتی تھی کہ وہ خوراک کی ٹرے بھر کر اس کے پاس چھوڑ جائے لیکن کوجو کی بسیار خوری کے سامنے یہ خوراک زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ وہ دو دن میں اسے ختم کردے گا اس کا مطلب ہے اسے کم از کم دو روز بھوکا رہنا پڑے گا۔ وہ اس مسئلے پر سوچتا ہوا ٹیلیفون کے قریب چلا آیا۔ نوٹ بک میں اس کے بہت سے مستقل گاہکوں کے نام درج تھے وہ باری باری انہیں فون کرکے بتانے لگا کہ وہ کہیں جارہا ہے اور چار پانچ روز تک واپسی ہوگی۔ اگر کسی کو زیادہ ضرورت ہے تو وہ آج شام تک اسے گاڑی دکھا سکتا ہے۔ اس کام سے فارغ ہوکر وہ ورکشاپ میں چلا آیا۔ برٹ، چیری اور کوجو کی غیر موجودگی میں ہر طرف اداسی چھائی ہوئی تھی۔ خود کو مصروف رکھنے کے لئے وہ ایک گاڑی کا رنگ پسٹن بدلنے لگا۔ گھر میں کوئی تیرہ چودہ دفعہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی لیکن ”جو“ تک آواز نہیں پہنچی۔

”جو“ نے آخری گاڑی سہ پہر کوئی پانچ بجے ٹھیک کی اور پھر ورکشاپ بند کرکے بڑے خوشگوار موڈ میں گرے کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ کوجو کی خوراک کا مسئلہ ابھی تک حل طلب تھا۔ اس نے سوچا اس سلسلے میں گرے سے مشورہ لے گا۔ گراؤنڈ سے ہوتا ہوا وہ پورچ میں پہنچا اور وہاں شیشے کے دروازے کے پاس اس نے زمین پر خون کا دھبہ دیکھا جو جھک کر غور کرنے لگا یہ خون ہی تھا۔ پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی آیا کہ گرے نشے کی حالت میں گر گیا ہوگا ہوسکتا ہے ہاتھ میں پکڑے گلاس نے اس کی ہتھیلی زخمی کردی ہو۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ تب اس کی

نگاہ بغلی دروازے پر پڑی۔ اس کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ ''جو'' کو کسی خطرے کا احساس ہوا اور اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ اس ٹوٹے ہوئے دروازے میں سے جھک کر اندر داخل ہوا۔ سامنے ایک کرسی الٹی پڑی تھی اور اس کے عقب میں ...... ہاں عقب میں اس کے عزیز ترین دوست گرے کی لاش پڑی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اسے اپنی بصارت پر یقین نہیں آیا۔ گرے چت لیٹا ہوا تھا اس کا نرخرہ بے رحمی سے ادھیڑ دیا گیا تھا۔ فرش پر خون کا ایک تالاب دکھائی دے رہا تھا۔ گرے کی شارٹ گن قریب ہی پڑی تھی۔ لیکن بدحواسی میں ''جو'' کو دکھائی نہیں دی۔ وہ گرے کی گن لینے کے لئے تیزی سے اس کی خوابگاہ کی طرف گیا لیکن گن وہاں دکھائی نہیں دی۔ جب وہ خوابگاہ سے باہر نکل رہا تھا اس کی نگاہ برآمدے کے گرد آلود فرش پر پڑی۔ وہ کسی کتے کے پنجے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک لمحے میں وہ نہ صرف سمجھ گیا کہ یہ کوجو کے پنجے ہیں بلکہ یہ بھی جان گیا کہ ان کا دیو ہیکل کتا پاگل ہو چکا ہے۔ گرے کا قاتل کوجو تھا۔ وہی کوجو جو سارا دن ورکشاپ میں بیٹھا اسے کام کرتے دیکھتا رہتا تھا۔ اس کی باتیں سنتا تھا۔ اس کی ٹانگوں سے اپنی تھوتھنی رگڑتا تھا ...... پھر ایک سرد لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ وہ یہ سوچ کر لرز اٹھا کیا پاگل کوجو اس کے اردگرد کہیں موجود ہے، وہ جلدی سے اٹھا اور احتیاط سے ادھر ادھر جھانکنے لگا۔ پھر اس نے مکان کی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کر دیئے۔ پولیس کو ٹیلیفون کرنے وہ باورچی خانے کی طرف لپکا۔ یہیں ایک دیوار پر ٹیلیفون نصب تھا۔ قریب ہی ڈائریکٹری پڑی تھی۔ اس نے ڈائریکٹری اٹھائی اور کانپتے ہاتھوں سے ہنگامی کال کا نمبر ڈھونڈنے لگا۔ دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ وہ عقب میں دروازہ چرچرانے کی مدھم سی آواز نہ سن سکا...... کوجو اندر داخل ہو رہا تھا گرے کو مارنے کے بعد وہ گھر کے ٹھنڈے تہہ خانے میں چلا گیا تھا۔ نمبر ڈھونڈنے کے بعد جونہی ''جو'' کی انگلی ڈائل گھمانے کے لئے سیدھی ہوئی اسے اپنے پیچھے خوفناک غراہٹ سنائی دی، خون جیسے رگوں میں جم گیا۔

اس نے ایک جھٹکے سے پیچھے دیکھا۔ کوجو چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا تیزی سے دم ہلا رہا تھا۔ ریسیور ''جو'' کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرا، پھر وہ ایک میکانکی عمل کے تحت کھڑا ہو گیا۔ کوجو...... ایزی کوجو'' وہ گھگھیائی ہوئی آواز میں بولا۔ اس وقت کوجو نے وحشیانہ انداز میں اس پر چھلانگ لگائی۔ ''جو'' نے ایک چیخ کے ساتھ اپنی جگہ چھوڑی۔ کوجو کا بھاری بھرکم جسم دھپ کی زبردست آواز سے دیوار کے ساتھ ٹکرایا۔ پلستر اکھڑ گیا اور نیچے کی اینٹیں دکھائی دینے لگیں۔ کوجو کے بھونکنے کی آواز پورے مکان میں گونج رہی تھی۔ جو کیمبر ٹانگوں کی پوری قوت سے باہر بھاگا لیکن ابھی بمشکل اس نے دروازہ ہی پار کیا تھا کہ کوجو نے اسے آلیا۔ دونوں اوپر نیچے گرے۔ ''جو'' کی نگاہوں میں گرے کی ادھڑی ہوئی گردن گھوم گئی۔ یاخدا رحم کر زندگی میں پہلی بار اس کے ہونٹوں سے دعائیہ کلمات نکلے اس نے اپنی گردن دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لی۔ کوجو پیچھے ہٹا پھر غراتا ہوا اس کی ناف پر حملہ آور ہوا۔ اگلے ہی لمحے جو کیمبر کی آنتیں کوجو کے جبڑے میں لٹک رہی تھیں۔

☆......☆......☆

ڈونا شاپنگ کے لئے نکلی تو اس نے ٹیڈ کو بھی ساتھ لے لیا اور ظاہر ہے وہ گھر میں اکیلا تو رہ نہیں سکتا تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے گیراج میں آئے اور اس وقت ننھا ٹیڈ ٹھٹک کر رک گیا۔ اسے اپنی ماں کی غیر حاضر دماغی پر حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے کہا۔

''ممی آپ بھول گئیں ہماری گاڑی تو خراب ہے۔''

''اوہ میرے خدا!'' ڈونا کے منہ سے نکلا۔ وہ گاڑی کی خرابی بالکل فراموش کر چکی تھی۔ کل رات پھر وک کی ہدایت کے مطابق اس نے جو کیمبر کی ورکشاپ ٹیلیفون کیا تھا۔ دوسری طرف تادیر گھنٹی بجتی رہی تھی لیکن کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا تھا۔ اس کے بعد دوسرے کاموں میں الجھ کر وہ گاڑی کو بالکل فراموش کر چکی تھی۔ بہرحال کچھ بھی تھا۔ اب شاپنگ کو تو جانا ہی تھا۔ کھانے پینے کی چیزیں ختم ہو رہی تھیں۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ

کی تو وہ ہو گئی۔ وہ اسے آہستہ آہستہ چلاتی ہوئی قصبے کے بازار کی طرف روانہ ہو گئی۔ غیر متوقع طور پر گاڑی نے بالکل تنگ نہیں کیا۔ ڈونا نے سوچا ہو سکتا ہے نقص ٹھیک ہو گیا ہو یہ بھی ممکن تھا کہ وک ہی کو دھوکا ہوا ہو۔ بہرحال وہ بخیر و خوبی شاپنگ کر کے گھر واپس آ گئی۔ واپسی پر راستے میں صرف ایک دفعہ انجن سے کھڑکھڑاہٹ کی آواز آئی لیکن جلد ہی دور ہو گئی۔ ڈونا شش و پنج میں مبتلا تھی کہ گاڑی مکینک کو دکھائے یا نہیں۔ جو کیمبر کی ورکشاپ کافی دور تھی اور قرب و جوار میں کوئی اور اچھا مکینک تھا نہیں۔

جونہی دونوں ماں بیٹا شاپنگ کا سامان اٹھائے گھر میں داخل ہوئے فون کی گھنٹی سنائی دی۔ ٹیڈ اپنے ہاتھ کے لفافے صوفے پر پھینکتا ہوا ٹیلیفون کی طرف لپکا۔ دوسری طرف کی آواز سن کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ڈونا امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''ممی...... ڈیڈی۔''

ڈونا کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ اس کے خوبصورت رخساروں سے سرخی جھلکنے لگی تھی۔ رخصت کے وقت ''وک'' کا انداز خاصا بجھا بجھا تھا۔ وہ ابھی یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ ''وک'' نے اسے معاف کیا ہے یا نہیں۔ مستقبل کیا ہوگا؟ اس کے بارے میں ابھی اسے کچھ پتہ نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے ریسیور پکڑا۔ حسب توقع وک کا لہجہ محتاط تھا۔ اس نے اپنی خیریت سے آگاہ کرنے کے بعد گھر کا حال احوال پوچھا۔ ڈونا نے بتایا کہ کل رات وہ جو کیمبر کو ٹیلیفون کرتی رہی لیکن رابطہ قائم نہیں ہوا۔ اس نے پوچھا کہ کیا وہ خود گاڑی لے کر ''جو'' کی ورکشاپ چلی جائے۔ وک کا جواب نفی میں تھا۔ اس نے کہا کہ راستہ بہت سنسان ہے۔ اگر کہیں راستے میں گاڑی خراب ہو گئی تو مصیبت پڑ جائے گی۔ اس نے مشورہ دیا کہ قصبے کے کار ڈیلر سے کرائے پر گاڑی حاصل کر لو۔ ڈونا نے بھی اس بارے میں سوچا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ کرائے کی گاڑی مہنگی پڑے گی اور وہ وک کی جیب پر خواہ مخواہ بوجھ ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ کسی

نہ کسی طرح کام چلائے گی۔ وک نے ٹیڈ کے بارے میں پوچھا۔ ڈونا نے بتایا کہ وہ اسے بہت یاد کرتا ہے۔ اس نے بلا کو بھگانے والی تحریر دیوار سے اتار لی ہے اور ہر وقت اسے جیب میں رکھتا ہے۔ ٹیڈ قریب ہی بیٹھا رنگین تصویروں والا رسالہ دیکھ رہا تھا۔ اسے پتہ چلا کہ اس کے بارے میں بات ہو رہی ہے تو وہ سر اٹھا کر دیکھنے لگا۔ وک نے کہا کہ ذرا دیر کے لئے ٹیڈ کو ٹیلیفون پر بلاؤ۔ ڈونا جانتی تھی کہ اب وہ ٹیڈ کو خدا حافظ کہہ کر ٹیلیفون بند کر دے گا۔ وہ ابھی اس سے اور باتیں کرنا چاہتی تھی۔ نجانے کیوں اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔

''وک ...... میں تم سے محبت کرتی ہوں۔'' اور جلدی سے ریسیور ٹیڈ کو تھما دیا۔

ٹیڈ باپ سے باتیں کرنے لگا۔ ڈونا آنکھیں جھپک جھپک کر آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ وک نے مجھے کار کرائے پر لینے کا مشورہ دیا ہے۔ اس کے ذہن میں ہے کہ میں کار ٹھیک کرانے ورکشاپ نہیں جا سکتی اس لئے وہ اضافی رقم خرچ کرنے پر تیار ہے لیکن میں اس پر یہ اضافی بوجھ نہیں ڈالوں گی۔ میں کار کرایہ پر نہیں لوں گی۔

اگلے روز سہ پہر ساڑھے تین بجے ڈونا کار لے کر ورکشاپ جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ ابھی کوئی ایک گھنٹہ پہلے اس نے ایک بار پھر ''جو کیمبر'' کو فون کیا تھا لیکن جواب ندارد۔ اس نے ورکشاپ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ٹیڈ کو وہ اتنی گرمی میں ساتھ رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ ممکن تھا کہ راستے میں گاڑی خراب ہو جائے اور اسے لفٹ لینی پڑے۔ ایسے میں ٹیڈ سخت پریشان ہوگا۔ ایک دو گھنٹے کی تو بات تھی۔ اس نے ٹیڈ کو گھر چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور ڈھیر سارے کھلونے اس کے کمرے میں رکھ دیئے۔ اس نے بچوں کے فلاحی ادارے میں ٹیلیفون کر کے ایک دو گھنٹے کے لئے ایک آیا بھی منگوالی تھی۔ لیکن جب وہ پورچ کا رخ کر رہی تھی اس نے ٹیڈ کی ہچکیاں سنیں۔ وہ جلدی سے مڑی۔ ٹیڈ رو رہا تھا۔ وہ بھاگ کر آیا اور ماں کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

"ممی" میں یہاں اکیلا نہیں رہوں گا۔

پچھلے ایک گھنٹے میں وہ کئی بار یہ فقرہ ادا کرچکا تھا۔ ڈونا نے اسے روتے دیکھا تو تڑپ گئی۔ واقعی وہ غلطی کررہی تھی۔ ممکن تھا کہ کسی وجہ سے اسے دیر ہوجاتی۔ اندھیرے میں ٹیڈ یقیناً ڈر جاتا۔ پہلے ہی اسے اپنی خوابگاہ سے خوف آتا تھا۔ اس نے اسے ساتھ ہی لے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ بولی۔

"دیکھو ٹیڈ! میں تمہیں پہلے بتادوں اگر راستے میں گاڑی خراب ہوگئی اور ہمیں پیدل چلنا پڑا تو تم مجھے تنگ نہیں کروگے۔"

ٹیڈ جو تنہا گھر میں رہنے سے سخت خوف زدہ تھا۔ آنسو پونچھتا ہوا بولا۔ "ممی میں وعدہ کرتا ہوں کہ جہاں تک کہو گی تمہارے ساتھ پیدل چلوں گا۔"

ڈونا نے آیا کو رخصت کیا۔ جلدی جلدی کھانے کا کچھ سامان ساتھ لے لیا۔ ٹیڈ کی تھرماس دودھ سے بھرلی کچھ سلائس اور بسکٹ لنچ بکس میں رکھ لئے اور جانے کے لئے تیار ہوگئی۔ گھر سے نکلتے وقت اس کے ذہن میں آیا کہ ایک بار اور جو کیمبر کو ٹیلیفون کرے لیکن پھر ارادہ ملتوی کردیا۔ یہ ایک لاحاصل کوشش تھی وک نے بتایا تھا کہ "جو" کی ورکشاپ میں ٹیلیفون نہیں ہے۔ اس کی بیوی یا بچہ اسے ورکشاپ میں پیغام پہنچاتے ہیں۔ لگتا تھا کہ وہ دونوں کہیں گئے ہوئے ہیں اور جو ورکشاپ میں معروف ہے باہر نکلنے سے پہلے ڈونا نے گھر پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ نجانے کیوں وہ ایکا ایکی اداس ہوگئی تھی پھر اس کی نگاہ فریج کے قریب گھر کے نوٹس بورڈ پر پڑی۔ اس نے نوٹس بورڈ پر لکھ دیا۔

"ٹیڈ اور میں گاڑی ٹھیک کرانے جو کیمبر کی ورکشاپ جارہے ہیں جلد واپسی ہوگی"

تب ڈونا نے آئینے پر آخری نگاہ ڈالتے ہوئے بالوں میں برش کیا اور ٹیڈ کا بازو تھام کر باہر نکل آئی پچھلے پہر کی تیز دھوپ نے ان کا استقبال کیا۔ دونوں تیزی سے قدم اٹھاتے گاڑی میں آبیٹھے۔ ڈونا کو خدشہ تھا لیکن گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔ اس وقت تین بج کر پینتالیس منٹ ہوئے تھے۔

تقریباً دس منٹ بعد وہ بڑی سڑک پر پہنچ چکے تھے۔ سیاحوں اور چھٹیاں گزارنے والے مقامی باشندوں کی اکادکا گاڑیاں جنوبی سمت میں جارہی تھیں۔ گرمی کافی زیادہ تھی اور ان کی کار میں ایئر کنڈیشنڈ نہیں تھا۔ لہٰذا انہوں نے دونوں اگلی کھڑکیاں کھول رکھی تھیں۔ ٹیڈ اپنی بچوں والی نشست پر بیٹھا بڑی محویت سے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا بڑی سڑک پر کوئی دس کلومیٹر چلنے کے بعد وہ ایک بغلی سڑک پر مڑ گئے۔ یہ ایک ویران سڑک تھی۔ اطراف میں اونچی نیچی گھاٹیاں تھیں۔ جو چند ایک مکانات نظر آئے وہ کافی دور دور تھے۔ اس سڑک پر نظر آنے والی واحد گاڑی ایک چھوٹا سا ٹریکٹر تھا جسے ایک سترہ اٹھارہ سالہ نوجوان چلارہا تھا۔ اس وقت وہ جو کیمبر کی ورکشاپ کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ جب اچانک انجن کا مرض عود کر آیا۔ کھڑکھڑاہٹ کی آواز آئی اور گاڑی کو دھچکے لگنے لگے۔ ڈونا بار بار ایکسیلیٹر دبارہی تھی دھچکوں میں اضافہ ہوتا جارہا تھا ٹیڈ پریشانی کے عالم میں ماں کو دیکھ رہا تھا۔ ننھے سے لنچ بکس پر اس کے ہاتھوں کے گرفت لاشعوری طور پر سخت ہوگئی تھی۔

بالآخر انجن ایک بار پھر رواں ہوگیا۔ گاڑی نے آہستہ آہستہ رفتار پکڑی اور کوئی چالیس کلومیٹر کی رفتار سے آگے بڑھنے لگی۔ کوئی ڈیڑھ کلومیٹر آگے انہیں ٹاؤن روڈ نمبر 3 کا بورڈ نظر آیا۔ ڈونا نے گاڑی اس سڑک پر موڑ لی۔ سامنے تھوڑی سی چڑھائی دکھائی دے رہی تھی۔ گاڑی چڑھائی چڑھنے لگی۔ انجن کا زور لگا تو وہ پھر مسنگ کرنے لگا۔ لیکن جیسے تیسے چڑھائی ختم ہوگئی۔ تھوڑی سی ہموار سڑک طے کرنے کے بعد گاڑی ڈھلوان پر اترنے لگی لیکن انجن کی آواز بتدریج خراب ہوتی چلی گئی۔ بالآخر ڈیش بورڈ پر سرخ بتی دکھائی دینے لگی اور ڈونا سمجھ گئی کہ انجن بند ہونے والا ہے لیکن اب اسے زیادہ فکر نہیں تھی۔ تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر جو کیمبر کے گیراج اور گھر کی سرخ چھت دکھائی دے رہی تھی۔ اسے امید تھی کہ گاڑی وہاں تک پہنچ جائیگی۔

جس وقت دھیمی رفتار سے رینگتی ہوئی گاڑی جو کیمبر کی ورکشاپ کے سامنے رکی اس کا انجن خاموش ہوچکا تھا۔ ڈونا نے کھڑکی میں سے ورکشاپ کا جائزہ لیا۔ اور کھلے دروازے میں۔ سے ایک نیلی ویگن کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔ ڈونا کے سینے سے اطمینان کی سانس خارج ہوئی۔ ویگن کی موجودگی کا مطلب تھا۔ جو کیمبر گھر ہی میں ہے۔ پھر اس کی نگاہ لیٹر بکس پر پڑی۔ لیٹر بکس کے اوپر ایک پارسل لٹک رہا تھا۔ شاید اس میں جو کیمبر نے کسی گاڑی کا کوئی پرزہ منگوایا تھا لیکن اگر جو کیمبر گھر ہی میں تھا تو اس پارسل کی موجودگی کیا معنی رکھتی تھی۔ ڈاکیہ یہ پارسل خود بھی "جو" کو دے سکتا تھا تو کیا جو یہاں نہیں ہے۔ پھر ڈونا نے دیکھا کہ ورکشاپ اور گھر میں کہیں کوئی لائٹ وغیرہ بھی نہیں جل رہی۔ اسے ایک دم وک پر غصہ آنے لگا۔ اگر وہ گاڑی ٹھیک کروا جاتا تو اسے یہ مصیبت تو نہ اٹھانا پڑتی۔ اس نے گاڑی سے باہر آکر چند لمحوں کے لئے سن گن لینے کی کوشش کی۔ دور کھیتوں میں کہیں کوئی کو اچلا رہا تھا۔ کسی کار ٹریکٹر یا مشین کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ یہ حقیقی معنوں میں ایک مضافاتی علاقہ تھا۔ ڈونا ورکشاپ کی طرف بڑھی تو ٹیڈ بھی باہر نکلنے کے لئے اپنی "سیٹ بیلٹ" کھولنے لگا۔ ڈونا نے اسے روک دیا۔ وہ بولی۔ "تم اندر ہی رہو۔ میں دیکھ لوں کوئی یہاں ہے۔ بھی یا نہیں۔"

وہ چند قدم ورکشاپ کے دروازے کی طرف گئی اور پھر اس نے ایک عجیب سی غراہٹ سنی۔ زمین نے جیسے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ وہ پوری توجہ سے یہ آواز سننے لگی۔ خوف کی بات یہ تھی کہ اسے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا آواز کدھر سے آرہی ہے۔ اس نے چاروں طرف گردن گھمائی اور پھر یک ٹک ورکشاپ کے ادھ کھلے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ دروازے کے اندر تاریکی میں کچھ حرکت ہوئی اور دفعتاً کو جو اس کے سامنے آگیا ......اس نے دہشت زدہ نگاہوں سے دیکھا۔ یہ کوجو ہی تھا، لیکن عجب ہیبت کذائی میں آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔ منہ سے جھاگ اور رخساروں سے رال بہہ رہی تھی۔ اس کی کھال کیچڑ اور خون...... میں لتھڑی ہوئی تھی۔ سب سے بھیانک چیز اس کی غراہٹ تھی۔ وہ مسلسل غرا رہا تھا۔ یہ منظر اتنا دہشتناک تھا کہ ڈونا سکتے کے عالم میں کھڑی رہ گئی۔ اس نے پڑھا اور سنا تھا کہ انسان بہت زیادہ خوف کے وقت مفلوج ہوجاتا ہے لیکن آج وہ خود اس کیفیت سے دوچار تھی۔ وہ بھاگنا چاہتی تھی لیکن بھاگ نہیں سکتی تھی۔ اسے لگا کہ دماغ اور ٹانگوں کے درمیان رابطہ ٹوٹ چکا ہے۔

پھر اسے ٹیڈ کی دلخراش چیخ سنائی دی اور وہ ہوش میں آگئی۔ تیزی سے پلٹ کر وہ کار کی طرف لپکی۔ اس نے اپنے عقب میں کتے کی بدلی ہوئی غراہٹ سنی اور سمجھ گئی کہ وہ اس کے پیچھے لپک رہا ہے۔ وہ گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف پہنچی۔ کار کا دروازہ اس کے سامنے تھا لیکن اسے اپنے ہاتھ اور دروازے کے ہینڈل کے درمیان برسوں کا فاصلہ محسوس ہورہا تھا۔ اس نے سوچا شاید وہ کبھی دروازہ نہ کھول سکے۔ پھر اسے عقب سے ایک زوردار دھکا لگا اور وہ اڑتی ہوئی کار کے پچھلے دروازے سے جا ٹکرائی۔ 200 پونڈ وزنی کوجو بھاگتا ہوا اس سے ٹکرایا تھا۔ زندہ رہنے کی خواہش نے ڈونا کے ہاتھوں میں جیسے بجلی بھردی۔ اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ اپنا جسم اندر گرایا، ٹانگیں سیکڑیں اور ایک جھٹکے سے دروازہ بند کردیا۔ شاید سیکنڈ کے دسویں حصے کا فرق پڑا تھا۔ دروازہ بند ہوتے ہی پاگل کتا ایک خوفناک آواز سے دروازے کے ساتھ ٹکرایا۔ کار کو زبردست جھٹکا لگا۔ ڈونا اور ٹیڈ کی چیخیں نکل گئیں۔ پھر ڈونا نے کار کی بند کھڑکی میں کوجو کا چہرہ دیکھا۔ خدا کی پناہ اپنی آنکھوں سے چند انچ کے فاصلے پر وہ ایک عفریت کو دیکھ رہی تھیں کوجو کی خون رنگ آنکھیں براہ راست ڈونا کی آنکھوں میں تھیں اور ایک لمحے کے لئے ڈونا کو محسوس ہوا جیسے یہ کتا اسے پہچانتا ہے۔ اس نے سوچا اگر وہ باہر نکلتے وقت حسب عادت کھڑکی بند نہ کردیتی تو اب تک اس کے خون سے گاڑی کی نشستیں رنگین ہوچکی ہوتیں۔ پھر ڈونا کو ٹیڈ کا خیال آیا۔

اس نے جلدی سے مڑ کر دیکھا، ٹیڈ نیم بے ہوشی

کے عالم میں نشست پر پڑا ہے۔ وہ جھک کر اس کے گلا تھپکنے لگی۔ ٹیڈ...... ٹیڈ...... ہوش کرو۔ ٹیڈ نے اپنی خوابیدہ آنکھیں کھولیں اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"ممی، یہ بلا میری الماری سے نکل کر یہاں کیسے پہنچ گئی...... کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں کیا میں اپنے بستر پر ہوں؟

ہوش کرو ٹیڈ...... ہوش کرو۔" ڈونا چلائی۔ اور پھر اس نے ایک خوفناک منظر دیکھا۔ پاگل کتا گاڑی کے سامنے سے ہوتا ہوا ٹیڈ والی کھڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا اور ڈونا نے دیکھا...... یہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ ایک تیز میکانکی عمل کے تحت وہ کھڑکی کے ہینڈل پر جھپٹی اور بازو کی پوری قوت سے شیشہ چڑھانے لگی۔ وہ جانتی تھی چار سالہ ٹیڈ کا جسم اس کے نیچے پس رہا ہے۔ وہ اس کی گھٹی ہوئی چیخیں سن رہی تھی لیکن اس وقت اس کے ذہن میں ایک ہی بات تھی...... بند کھڑکی۔ ابھی تین چوتھائی کھڑکی بند ہوئی تھی کہ کتا ایک بار پھر پرہول آواز سے آٹکرایا۔ اس کی تھوتھنی اندر گھس آئی۔ گرم گرم جھاگ اور خون کے قطرے ڈونا کے ہاتھ پر گرے۔ وہ وحشیانہ انداز میں بھونک رہا تھا۔ ڈونا نے پورا زور لگایا اور کھڑکی بند کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

کتا پیچھے ہٹ کر چاروں پنجوں پر کھڑا ہوگیا۔ ڈونا ٹیڈ کے اوپر سے اٹھی وہ اب رو رو کر کہہ رہا تھا۔

"ممی...... گھر چلو...... مجھے یہاں سے لے چلو ممی۔"

ڈونا نے گاڑی اسٹارٹ کرنا چاہی لیکن انجن گڑگڑا کر خاموش ہوگیا...... وہ اسے سینے سے لگا کر پیار کرنے لگی۔ تب اس نے سامنے دیکھا اور ایک بار پھر اپنی چیخ روکنے میں ناکام رہی۔ کوجو اچھل کر کار کے بونٹ پر چڑھ آیا تھا۔ پھر وہ تیزی سے آگے بڑھا اور دھماکے سے ونڈ اسکرین سے ٹکرایا۔ وہ اپنا جبڑا کھولے بار بار ان پر حملہ کر رہا تھا لیکن اس کے نوکیلے دانتوں اور کار کے مسافروں کے درمیان شیشے کی دیوار حائل تھی۔ وہ اس دیوار کو توڑ دینا چاہتا تھا۔ ٹیڈ کی چیخیں دل خراش تھیں۔ وہ ماں کی چھاتی میں منہ چھپائے زور زور سے چلا رہا تھا۔

"ممی گھر چلو...... گھر چلو ممی۔"

"ڈونا کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔" روتے نہیں ٹیڈ...... روتے نہیں، وہ اندر نہیں آسکتا۔ ہم بالکل محفوظ ہیں۔"

ونڈ اسکرین پر کوجو کے منہ سے نکلنے والی جھاگ پھیلی ہوئی تھی۔ جھاگ کی دوسری جانب اس کی آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ یہ آنکھیں ڈونا پر مرکوز تھیں اور کہہ رہی تھیں۔

"میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ یہ ٹین کا کیبن تمہیں کب تک بچائے گا۔ میں تمہارے ٹکڑے کردوں گا۔ اور جب تم چیخ رہی ہوگی میں تمہارا گوشت کھا رہا ہوں گا۔

ڈونا سمجھ گئی کہ کتا پاگل ہوچکا ہے۔ اس نے سوچا ہوسکتا ہے وہ اپنے مالک کو بھی ہلاک کرچکا ہو۔ اس نے ہارن پر ہاتھ رکھا اور کوجو اچھل کر بونٹ سے اتر گیا۔ ڈونا نے مسلسل ہارن بجانا شروع کردیا۔ لگتا تھا ہارن کی آواز کتے کے کانوں کو مجروح کررہی ہے وہ غراتا ہوا ایک دیوار کی اوٹ میں چلا گیا۔ مسلسل ہارن کے باوجود ورکشاپ میں سے کوئی برآمد نہیں ہوا۔ پھر ڈونا کو اس تنہا مکان کا خیال آیا جو اس نے ٹیلے پر چڑھتے وقت دیکھا تھا۔ مکان سے باہر گھاس پر ایک میز اور دو کرسیاں پڑی تھیں۔ یقینی بات تھی کہ وہاں کوئی رہتا تھا۔ ڈونا نے مخصوص انداز میں ہارن بجانا شروع کردیا۔

تین دفعہ طویل...... تین دفعہ مختصر۔ یہ آواز خطرے کی علامت تھی۔ ڈونا نے دو سال اسکاؤٹس کی تربیت حاصل کی تھی۔ اور وہیں اسے یہ طریقہ بتایا گیا تھا۔ اس نے سوچا اگر گھر والے اس کا پیغام نہ بھی سمجھے تب بھی وہ یہ دیکھنے تو آئیں گے کہ جو کیمبر کے گھر کے سامنے کون مسلسل ہارن بجا رہا ہے۔

"شام کے تقریباً سات بج چکے تھے لیکن دن کی روشنی ابھی باقی تھی۔ ممی! اب تو انجن ٹھنڈا ہوگیا ہوگا۔ پلیز گاڑی اسٹارٹ کرو نا۔"

"تھوڑی دیر اور میرے بیٹے بس تھوڑی دیر اور" ڈونا نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ درحقیقت وہ چابی گھماتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی اگر اب بھی انجن سٹارٹ نہ ہوا تو کیا ہوگا۔ اسے کتوں کے باؤلے پن کے متعلق زیادہ علم نہیں تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ زیادہ شور پاگل کتے کو مشتعل کردیتا ہے۔ اگر اس کے چابی گھمانے سے کتا پھر گاڑی پر حملہ آور ہوگیا تو کیا ہوگا۔

ایک بار پھر اس کا دھیان گھر کے آہنی دروازے کی طرف گیا۔ وہ پچھلے تین گھنٹے میں کئی بار اس دروازے اور کار کے درمیانی فاصلے کو نگاہوں سے ناپ چکی تھی۔ اگر وہ تیز بھاگ کر صرف...... آٹھ قدم اٹھاتی تو دروازے تک پہنچ سکتی تھی۔ یقینی بات تھی کہ گھر میں ٹیلیفون تھا۔ شیرف کو ایک کال ساری مصیبت کا خاتمہ کرسکتی تھی۔ یہ بھی عین ممکن تھا کہ جو کیمبر کے گھر میں رائفل ہو۔

کتا اس وقت گیراج کے ادھ کھلے دروازے میں بیٹھا تھا۔ ڈونا کو یقین تھا کہ وہ کتے کے پہنچتے پہنچتے آہنی دروازے تک پہنچ جائے گا...... لیکن اگر دروازہ لاک ہوا تو...... تو کیا چار سالہ ٹیڈ وہ سلوک دیکھ سکے گا جو کتا اس کی ماں کے ساتھ کرے گا۔ کیا وہ کتے کو ماں کی بوٹیاں نوچتے دیکھ سکے گا؟ ڈونا کو جھرجھری آگئی۔ نہیں یہ آٹھ قدم کا فاصلہ...... بہت طویل ہوسکتا تھا۔ اس کار میں وہ اور اس کا بچہ زیادہ محفوظ تھے۔ اس کا ہاتھ چابی کی طرف بڑھ گیا۔ خدا کو یاد کر کے اس نے چابی گھمائی...... ایک بار...... دو بار...... اور انجن اسٹارٹ ہوگیا۔ ٹیڈ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ خدایا تیرا شکر ہے۔

ڈونا تقریباً چلا اٹھی۔ اس نے ایک دو بار ریس دی۔ کوجو تیزی سے باہر نکلا اور چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوکر کار کو دیکھنے لگا۔ ڈونا نے اس پر ایک نفرت آمیز نگاہ ڈالی او گاڑی کو ریورس کرنے کے لئے گیئر لگایا۔ گاڑی ریورس ہوئی لیکن دو یا تین فٹ رینگ کر رک گئی۔ انجن یکلخت خاموش ہوگیا۔ ڈونا نے خوفزدہ نگاہوں سے دیکھا، ڈیش بورڈ پر سرخ روشنی پھر ابھر آئی تھی۔

"ممی...... ممی...... ممی ٹیڈ زور زور سے رونے لگا۔"

"خاموش ڈونا جھنجھلا کر بولی۔ وہ جلدی جلدی چابی گھما رہی تھی۔ انجن ہر بار کراہ کر خاموش ہوجاتا تھا۔ اسے لگا کہ بیٹری بتدریج ڈاؤن ہورہی ہے۔ لاچار ہوکر اس نے اسٹیئرنگ پر سر لگا دیا اور آنسو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ اس کے مسلسل ہارن پر بھی کوئی یہاں تک نہیں پہنچا تھا۔ شاید ٹیلے کے قریب واقع گھر والے بھی موجود نہیں تھے۔ وہ اسٹیئرنگ پر جھکی رہی۔ ٹیڈ کا ننھا سا ہاتھ اس کی پشت پر آگیا۔ "ممی! مجھ پر غصہ آگیا تھا تمہیں۔"

اس نے بے چین ہوکر اس کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔

"نہیں میرے بچے...... نہیں۔ بس ذرا حوصلہ کرو۔ انجن ضرور اسٹارٹ ہوگا۔ بہت جلد ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔ ٹیڈ نے اس کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ کوجو ایک بار پھر گیراج میں چلا گیا تھا۔ ڈونا بند آہنی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آٹھ قدم...... صرف آٹھ قدم...... لیکن سوال پھر وہی تھا مقفل...... غیر مقفل۔

وہ ایک تاریک رات تھی، تاریک اور پرہول، گیراج کے ادھ کھلے دروازے میں کوجو کا ہیولا نظر آرہا تھا لیکن اب ڈونا کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ واقعی کوجو کھڑا ہے یا اس کی نظر دھوکا کھا رہی ہے۔ ٹیڈ اب اس کی گود میں سر رکھے اونگھ رہا تھا۔ ڈونا نے تھرماس میں کچھ دودھ نکال کر بمشکل اسے پلایا تھا کوشش کے باوجود اسے سلائس نہیں کھلا سکی۔ ذرا ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ دوبارہ اس کی آنکھ ایک شور سن کر کھلی گھر کے اندر ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی کوجو پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ گھن گرج کے ساتھ بھونکتا ہوا آہنی دروازے پر پل پڑا تھا۔ اس کی وحشیانہ ٹکروں سے دروازے کے تختے پچک رہے تھے۔ ٹیڈ نے بھی جاگ کر رونا شروع کردیا تھا۔ خدا خدا کر کے گھنٹی کی آواز تھمی اور کوجو کی وحشت کم ہوئی۔

اس وقت سینکڑوں میل دور برٹ نے مایوسی سے

سر ہلا کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ چیرئی قریب ہی کھڑی تھی۔ یہ اس کی بہن کا گھر تھا خوبصورت کشادہ اور سجا سجایا۔

برٹ نے کہا۔ "لگتا ہے ڈیڈی، انکل گرے کے ہاں تاش کی بازی لگا رہے ہیں۔"

"شاید" چیرئی نے کہا۔ ویسے اس کا خیال تھا کہ دونوں دوست فراغت کے ان لمحات سے فائدہ اٹھانے کے لئے لمبی سیر پر نکل گئے ہوں گے۔ ممکن تھا وہ اس وقت کاسٹل راگ کے کسی قحبہ خانے میں بیٹھے شراب اور شباب سے دل بہلا رہے ہوں۔

"برٹ بولا۔ ممی! اب کوجو کا کیسے پتہ چلے گا؟"

چیرئی نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "برٹ! اگر کوجو کی حالت خراب ہوتی تو تمہارے ڈیڈی گھر سے کہیں نہ جاتے۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو...... چلو دس بجنے والے ہیں اب جا کر سو جاؤ۔

برٹ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ اس کا ذہن کہیں کوجو اور ڈیڈی کے قرب و جوار میں گھوم رہا تھا اور یہ حقیقت تھی کہ ازدواجی چپقلش کے باوجود چیرئی بھی دن میں کئی بار، جو کو یاد کر چکی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ پتہ نہیں اب کبھی اس سے ملاقات ہوگی یا نہیں۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اس سے طلاق لے لے گی۔ برٹ اس کے ارادے سے بے خبر تھا، لیکن اسے امید تھی کہ وہ چند دن میں اسے اس تبدیلی کے لئے تیار کر لیگی۔

رات خاموش تھی۔ ایک سنسان عمارت کے باہر ایک کار کھڑی تھی۔ اس کار میں ایک عورت اور ایک بچہ سو رہے تھے۔ یہ عورت ڈونا تھی اور یہ بچہ ٹیڈ۔ ڈونا ایک خواب دیکھ رہی تھی۔ دور کھیتوں کے درمیان سے اس کا شوہر بھاگا آ رہا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا کار کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اس نے اپنا براؤن تھری پیس پہن رکھا تھا اور بڑا اسمارٹ نظر آ رہا تھا۔ لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ ورکشاپ کے اندر ایک بہت بڑا پاگل کتا چھپا ہوا ہے۔ ڈونا نے چیخ کر اسے خطرے سے آگاہ کرنا چاہا۔ لیکن اس کی آواز گلے میں پھنس گئی اور پھر ورکشاپ کے آدھ کھلے دروازے سے کوجو برآمد ہوا۔ اس نے اپنی خوفناک نگاہوں سے وک کو دیکھا اور اس کی طرف بڑھا ...... تب وک نے بڑی پھرتی سے اپنی پتلون کی جیب سے ریوالور نکالا اور کتے پر فائر کر دیا۔ کتا چلا کر زمین بوس ہو گیا۔ وک اطمینان سے چلتا کتے کے قریب پہنچا۔ اس نے بالوں سے پکڑ کر اس کی لاش اٹھائی لیکن یہ تو صرف کھال تھی...... کوجو کی کھال۔ وک نے اسے ہنس کر بتایا کہ کوجو اس کھال میں موجود نہیں۔ پھر یہ کھال بھی وک کے ہاتھوں سے اوجھل ہو گئی۔ اس نے انگلی سے لیٹر بکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ یہ لیٹر بکس ہے کیا اس میں ڈاک آ چکی ہے۔ ڈاک کا دھیان رکھنا ...... ڈاک بہت اہم چیز ہے۔"

ڈونا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے گھڑی دیکھی رات کا ٹھیک ایک بجا تھا۔ ٹیڈ اپنی نشست پر گہری نیند سو رہا تھا۔ دائیں ہاتھ کا انگوٹھا اس کے منہ میں تھا۔ کوجو کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا اور پھر اس کی نگاہ لیٹر بکس پر پڑی۔ ساتھ ہی اسے یاد آ گیا کہ چند لمحے پہلے وہ کیا خواب دیکھ رہی تھی۔ ایکا ایکی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ڈاک بہت اہم چیز ہے۔ یہ الفاظ ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ شواہد سے ظاہر تھا کہ ڈاک یہاں باقاعدہ سے آتی ہے۔ اس کا مطلب تھا کل بھی ڈاک آئے گی۔ کل کسی وقت سہ پہر سے پہلے ڈاکیہ یہاں ضرور پہنچے گا۔ ڈونا کے ہونٹ خوشی سے لرزنے لگے۔ اس کا جی چاہا کہ اسی وقت ٹیڈ کو جگا کر یہ خوشخبری سنائے۔ لیکن پھر اس نے خود پر ضبط کیا۔ وہ نشست سے ٹیک لگا کر مختلف امکانات کے بارے میں سوچنے لگی۔ ظاہر تھا کہ اگر ڈاکیہ ٹاؤن روڈ نمبر 3 کے اس آخری اسٹاپ تک آتا ہے تو وہ کل کسی وقت ضرور آئے گا۔ اگر جو کیمبر کی ڈاک نہ بھی ہوتی تو بھی اسے یہ تو دیکھنا ہوگا کہ کل والی ڈاک نکالی گئی ہے یا نہیں پھر اس کا دھیان اپنے شوہر کی طرف چلا گیا۔ اسے معلوم تھا وہ آج صبح اسے ٹیلیفون کرے گا۔ رابطہ قائم نہ ہونے پر وہ پھر رنگ کرے گا اور یہ سلسلہ وقفے وقفے سے جاری رہے گا۔ وہ ضرور سوچے گا

کہ دونوں ماں بیٹا کہاں گئے۔ ہو سکتا ہے وہ فکرمند ہو کر کسی پڑوسی کو ٹیلیفون کرے اور اسے کہے کہ ڈونا اور ٹیڈ کا پتہ کرو۔ پھر وہ جو کیمبر اور اس کے اہل خانہ کے متعلق سوچنے لگی۔ وہ سب کے سب کہاں چلے گئے؟؟

دفعتاً ایک وحشت ناک خیال اس کے ذہن میں آیا کہیں...... کہیں وہ تینوں کتے کا شکار تو نہیں ہو گئے تھے۔ اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ سوچنے کی بات تھی اگر وہ تینوں اپنی مرضی سے کہیں گئے تھے تو کتے کو کیوں چھوڑ گئے تھے۔ اور اگر اسے چھوڑ ہی گئے تھے تو اس کی خوراک کا کیا انتظام تھا۔ عموماً جب لوگ کہیں جاتے ہیں تو آس پڑوس میں کسی سے اپنے پالتو جانور کی نگہداشت کا کہہ جاتے ہیں لیکن کوجو کے پاس تو کوئی چڑیا نہیں بھٹکتی تھی۔

وہ خیالوں کا تانا بانا بنتے ہوئے ٹیڈ کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔ اچانک اسے اپنے کان کے بالکل قریب آہٹ سنائی دی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے گردن گھما کر دیکھا...... کوجو کا بھیانک چہرہ صرف چھ انچ کے فاصلے پر تھا۔ کھڑکی کے شیشے نے ان دونوں کو جدا کر رکھا تھا۔ اس کی تھوتھنی پر خشک جھاگ کے پاپڑیاں نظر آ رہی تھی۔ کھڑکی کے شیشے میں شاید معمولی سی درز تھی۔ بو کا ایک بھبکا ڈونا کے نتھوں میں گھستا چلا گیا۔ ڈونا کو محسوس ہوا جیسے وہ اس بو کو پہچانتی ہے۔ ہاں...... وہ اس بو کو پہچانتی تھی۔ یہ بو اس نے ٹیڈ کی الماری میں سونگھی تھی۔ وہ ان آنکھوں کو بھی پہچانتی تھی۔ یہ آنکھیں اس نے الماری کے آدھ کھلے دروازے میں دیکھی تھی۔ اس کی سانس جیسے رکنے لگی۔ سارے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سینے سے ایک دلدوز چیخ بلند ہوئی اور حلق میں آ کر اٹک گئی۔ وہ بری طرح دہشت زدہ تھی۔ سب سے دہشت ناک بات یہ تھی کہ کوجو کی آنکھیں اس سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ وہ صاف محسوس کر رہی تھی کہ یہ آنکھیں اسے کوئی پیغام دے رہی ہیں کوجو کا پیغام وہ کہہ رہا تھا۔

"اے عورت! میں تجھے چھوڑوں گا اور نہ تیرے بچے کو تجھے ڈاکیئے کا انتظار ہے تو شوق سے کر، لیکن ...... میں اسے بھی مار دوں گا۔ بالکل اسی طرح جیسے میں تم دونوں کو ماروں گا...... یاد رکھو میرا نام کوجو ہے اور میرے لگائے ہوئے زخم کا مطلب ہے موت۔"

چیخ ڈونا کے حلقے سے آزاد ہونے کو بے تاب تھی لیکن ڈونا چیخنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کے لئے چیخنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا بیٹا ایک فرشتے کی معصومیت چہرے پر سجائے گہری نیند سو رہا تھا۔

عین اس وقت بوسٹن کے ایک ہوٹل میں وک گہری نیند سو رہا تھا۔ اچانک وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ ساتھ والے بستر پر اس کا دوست روجر محو خواب تھا۔ وک نے اٹھ کر پانی پیا اور پھر بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ رات کے اس آخری پہر اس کا دھیان خود بخود گھر کی طرف چلا گیا۔ وہ سوچنے لگا ڈونا اس کے بعد کیا کرے گی۔ وہ اور ٹیڈ گھر میں تنہا تھے۔ ٹیڈ بھی دن کے وقت نرسری چلا جاتا تھا۔ کیا سیٹو کیمپ نامی وہ شخص پھر اس کے گھر کا رخ کرے گا۔ اس نے تصور کی آنکھوں سے اپنی خوابگاہ میں سیٹو اور ڈونا کے ہیولے دیکھے اور اس کا سینہ جل اٹھا۔ وہ سوچنے لگا کیا ڈونا اور اس کی ازدواجی زندگی برقرار رہ سکے گی۔

دفعتاً اسے خیال آیا کہ وہ جاگنے سے پہلے کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا تھا۔ کیا خواب تھا وہ؟ سمندر کے درمیان خشکی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ اس پر شاید ڈونا اور ٹیڈ کھڑے تھے ٹیڈ زور زور سے چلا رہا تھا۔ وہ اسے مدد کے لئے بلا رہا تھا۔ ایک ایک کر کے خواب کی بہت سی تفصیلات اس کے ذہن میں تازہ ہو گئی۔ نجانے کیوں اس کا دل چاہا کہ ڈونا کو ٹیلیفون کرے۔ وہ اٹھ کر ٹیلیفون کی طرف گیا بھی لیکن پھر واپس آ گیا۔ اس نے سوچا اس وقت دونوں ماں بیٹا گہری نیند سو رہے ہوں گے۔ یوں بھی ان کے ازدواجی تعلقات جس بحرانی کیفیت سے دوچار تھے۔ اس میں آدھی رات کو اپنی بے قراری کا اظہار کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس نے سوچا صبح ناشتے کے بعد سب سے پہلا کام یہی کرے گا۔ لیکن صبح نہ صرف وہ

ٹیلیفون کرنا بھول گیا بلکہ وہ خواب بھی بھول گیا جو رات کسی پہر اس نے دیکھا تھا۔

دوسری طرف ڈونا اور ٹیڈ گاڑی میں بند کسی غیبی امداد کے منتظر تھے۔ گرمی شدید تھی۔ اتنی شدید کہ جسم کے ہر مسام سے پسینے کے دھارے پھوٹ رہے تھے۔ ٹیڈ کا چہرہ کملایا ہوا تھا۔ وہ نشست سے ٹیک لگائے یک ٹک ونڈا سکرین کے پار دیکھ رہا تھا۔ ڈونا کی نظر اس کی گود میں رکھے ایک تہہ شدہ زرد کاغذ پر پڑی۔ یہ کیا ٹیڈ؟ اس نے پوچھا۔

یہ بلا کو بھگانے والی تحریر ہے ممی۔ اس نے جواب دیا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ کیا بلا ہم کو کھا جائے گی؟

ڈونا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ نہیں ٹیڈ میں تمہیں بتا چکی ہوں۔ یہ بلا نہیں ہے۔ صرف ایک کتا ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں...... یہ دیکھو دس بج چکے ہیں۔ دو ڈھائی بجے سے پہلے پہلے ڈاکیہ یہاں ضرور آئے گا اور پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ بارہ بجے کے قریب ہم ایک بار پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے دیکھیں گے۔ ممکن ہے کہ گاڑی ہی اسٹارٹ ہو جائے۔ گھر پہنچ کر سب سے پہلے میں اپنے بیٹے کو نہلاؤں گی۔ پھر کھانا کھائیں گے اور پھر ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر ڈیڈی کے ٹیلیفون کا انتظار کریں گے...... ٹھیک ہے نا۔"

ٹیڈ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اس نے مضبوطی سے پیلے کاغذ کو تھام رکھا تھا۔ ڈونا نے دونوں طرف کی کھڑکیاں چار چار انچ نیچے گرا دی تھیں لیکن گرمی پھر بھی نا قابل برداشت ہو رہی تھی۔ ڈونا کو ایک پمفلٹ کی تحریر یاد آئی جس میں جانوروں کے تحفظ کی ایک انجمن نے لوگوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ زیادہ گرمی میں اپنے کتوں کو گاڑیوں میں بند کر کے نہ جائیں۔ دھوپ میں پارک کی ہوئی بند گاڑی کا درجہ حرارت 40 فارن ہائٹ تک پہنچ جاتا ہے اور اتنی گرمی جانوروں کے لئے خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ ڈونا نے سوچا یہاں معاملہ الٹ ہو گیا ہے۔ ایک کتے نے انسانوں کو گاڑی میں بند کر دیا ہے اور اب ان کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ یہ بے بسی نہیں تھی تو اور کیا تھا۔ آج صبح ڈونا باتھ روم جانا چاہتی تھی، لیکن نہیں جا سکتی تھی۔ ٹیڈ نے اپنی چھوٹی سی خالی تھرماس میں پیشاب کیا تھا۔ پھر یہ تھرماس ڈونا نے کھڑکی میں سے دور پھینک دی تھی۔ دونوں نے دو دو بسکٹ کھائے تھے۔ دودھ کا ذائقہ بدل چکا تھا، لیکن مجبوراً انہوں نے وہی دودھ پیا تھا۔ اس کے بعد ڈونا نے ٹیڈ کو بتائے بغیر کار اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہاتھ بہ آہستگی نیچے لے جا کر اس نے چابی گھمائی تھی...... لیکن ایک ہلکی سی کلک کے سوا کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ بیٹری موٹر کو گھمانے میں ناکام رہی تھی...... اور اب آگ برساتا ہوا سورج آہستہ آہستہ اپنے سفر کے نقطہ عروج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بے رحم دھوپ اس گاڑی کو بتدریج آگ کی بھٹی میں تبدیل کر رہی تھی۔ ڈونا کو اس وقت صرف ایک ہی آس تھی۔ ڈاکیئے کی وہ تصور کی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ ڈاکیہ اپنی سفید اور سرخ موٹر کار میں ڈاک کا انبار لئے اپنے سفر کا آغاز کر چکا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ ٹاؤن روڈ نمبر 3 کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ٹاؤن روڈ نمبر 3 جس کے آخری اسٹاپ پر ایک نیم جان عورت اور بچہ اس کے انتظار کی گھڑیاں گن رہے ہیں۔

ڈونا نے دستی گھڑی دیکھی۔ گیارہ بجنے والے تھے ٹیڈ نے ایک بار پھر گاڑی اسٹارٹ کرنے کی ضد شروع کر دی۔ ڈونا نے اسے سمجھایا کہ بیٹری بہت ڈاؤن ہو چکی ہے، اسے بارہ ایک بجے سے پہلے بالکل نہیں چھیڑنا چاہیے...... لیکن ٹیڈ کی ضد بڑھتی چلی گئی۔

بالآخر ڈونا نے چابی گھمائی دو تین بار گھرر گھرر کی آواز آئی، لیکن انجن اسٹارٹ نہیں ہوا۔ پھر یہ آواز آنا بھی بند ہو گئی۔ ڈونا نے ہارن پر ہاتھ رکھا۔ اس میں سے بھی ایک نا قابل شناخت مدھم سی آواز برآمد ہوئی۔ پہاڑی کے دامن میں واقع مکان تک اس آواز کا پہنچنا تقریباً ناممکن تھا۔ ڈونا نے سوئچ آف کیا اور غصے سے بولی۔

لو اب خوش ہو۔ ہو گئی اسٹارٹ گاڑی تمہیں کہا بھی تھا کچھ صبر کرو۔

ننھے ٹیڈ نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔

اس کے ہونٹ اب بالکل خشک ہو چلے تھے۔ وہ اتنے دکھ سے رو رہا تھا کہ ڈونا کو ترس آ گیا۔ وہ خود کو ملامت کرنے لگی کہ اس نے ٹیڈ کو کیوں جھڑکا۔ وہ اسے بازوؤں میں لے کر چپ کرانے لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ ٹیڈ کا جسم کچھ اکڑا اکڑا سا ہے۔ ایک وہم سا اس کے ذہن میں پیدا ہوا، لیکن پھر فوراً ہی اس نے یہ وہم جھٹک دیا۔ ٹیڈ کے آنسو تھم گئے تھے اس نے ناک سے سوں سوں کرتے ہوئے کہا۔

"ممی! اب میں تمہیں بالکل تنگ نہیں کروں گا۔ تمہیں گاڑی اسٹارٹ کرنے کا بھی نہیں کہوں گا...... لیکن جب گاڑی اسٹارٹ ہو جائے گی اور...... ہم گھر چلے جائیں گے تو تم مجھے ٹھنڈا اینگو اسکوائش پینے کی اجازت دو گی؟"

"ضرور ٹیڈ۔ جو تم کہو گے وہی پلاؤں گی۔" ڈونا نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

یہی وہ وقت تھا جب اس کی نگاہ چند گز دور گھاس پر رکھی ہوئی کسی چیز پر پڑی۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بغور جائزے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ بیس بال کا ایک ٹوٹا ہوا بلا ہے۔ جب وہ اس بلے کی موجودگی پر غور کر رہی تھی گودام کے دروازے میں ایک سایہ لہرایا اور کوجو جو پچھلے دو گھنٹے سے اوجھل تھا، کار کو گھورتا اور غراتا ہوا باہر نکل آیا۔ اسے دیکھتے ہی ٹیڈ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور نشست پر کچھ نیچے کو کھسک گیا۔

عین اس وقت ڈاکیہ ٹاؤن روڈ نمبر 3 پر ڈاک تقسیم کرتا ہوا آ رہا تھا۔ آخر وہ گرے کے مکان کے سامنے پہنچا۔ اس نے گاڑی کھڑی کی اور تھیلے میں سے ایک لفافہ نکالتا ہوا باہر آ گیا۔ لفافہ لیٹر بکس میں ڈال کر اس نے ایک نظر گیراج کی طرف دیکھا۔ گرے کے ساتھ ساتھ جو کیمبر کی گاڑی بھی کھڑی تھی۔ لیٹر بکس میں سے پرسوں کی ڈاک ابھی تک نہیں نکالی گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا گرے گھر میں موجود نہیں۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ وہ اپنے لنگوٹیے یار جو کیمبر کے ساتھ کہیں تفریح کے لیے نکل گیا ہے۔ اس شبہ کو یوں بھی تقویت ملی تھی کہ جو کیمبر نے اپنی ورکشاپ سے ٹیلیفون کر کے پوسٹ ماسٹر سے کہا تھا کہ وہ چند روز کے لئے باہر جا رہا ہے لہٰذا اس کی ڈاک ڈاکخانے میں روک لی جائے۔ اس کی ہدایت کی بدولت ڈاکیہ اس سخت گرمی میں قریباً ایک فرلانگ کے سفر سے بچ گیا تھا۔ اب وہ ٹاؤن نمبر 3 کے آخری اسٹاپ تک جائے بغیر واپس جا رہا تھا۔ شدید گرمی میں بوکھلایا ہوا ڈاکیہ، گیراج میں خون کے دھبے نہیں دیکھ سکا۔ نہ ہی اسے بغلی دروازے کا ٹوٹا ہوا شیشہ دکھائی دیا۔ ایک لمحے کے لئے اس نے یہ ضرور سوچا کہ دونوں گاڑیاں یہاں تو گرے اور جو گئے کس چیز پر ہیں لیکن پھر اسے جو کیمبر کا کھٹارا ٹرک یاد آیا۔ اس نے گمان کیا کہ انہوں نے وہی ٹرک استعمال کیا ہے حالانکہ یہ بات فکر طلب تھی کہ دو آرام دہ گاڑیوں کی صورت میں انہوں نے ٹرک کیوں استعمال کیا۔

☆......☆......☆

"اسٹیو کیمپ" نے ڈونا کے شوہر کو دھماکہ خیز خط پوسٹ کر دیا تھا اور اب بے صبری سے نتیجے کا انتظار کر رہا تھا لیکن چوتھے دن بھی اسے کوئی من پسند اطلاع نہیں ملی۔ اس نے وک کے دفتر ٹیلیفون کئے اور اسے پتہ چلا کہ وک تو قصبے سے باہر گیا ہوا ہے۔ بتانے والے نے یہ بھی بتایا کہ پانچ چھ روزے سے پہلے اس کی واپسی متوقع نہیں۔ اس کا مطلب تھا خط ابھی وک کو نہیں ملا۔ چلو۔۔۔ نہیں ملا تو واپسی پر مل جائے گا۔ اسٹیو نے سوچا پھر وہ اٹھ کر سفر کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے دکان کو تالا لگا دیا تھا اور کچھ عرصے کے لئے فلوریڈا جا رہا تھا۔ اب وہ کسی اور جگہ کی رنگینیوں کو آنکھوں میں سمونا چاہتا تھا۔ سہ پہر دو بجے کے قریب اس نے ضروری سامان اپنی ویگن میں رکھا اور روانہ ہو گیا، لیکن ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک نیا خیال اس کے ذہن میں آیا اور دل ایک دم شدت سے دھڑکنے لگا۔ ڈونا کا شوہر وک گھر میں نہیں تھا۔ نہ ہی آئندہ چند روز میں اس کے آنے کی توقع تھی۔ ڈونا اپنے بچے کے ساتھ گھر میں اکیلی تھی۔ کیوں نہ اس سے اس روز کی بے عزتی کا بدلہ لیا جائے...... ہاں ٹھیک

ہے۔ اس قصبے سے مجھے جانا تو ہے ہی تو کیوں نہ جاتے جاتے یہ حساب بھی چکا دیا جائے۔ اس کے جسم میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ ایک طویل سانس لے کر اس نے ویگن کا رخ ڈونا کے گھر کی جانب موڑ دیا۔

ٹھیک سوا تین بجے اس نے ویگن گھر کے عقب میں کھڑی کی اور پیدل چلتا ہوا۔ مین گیٹ کی طرف بڑھا۔ چلچلاتی ہوئی سہ پہر میں گلیاں سنسان دکھائی دے رہی تھیں۔ پرند چرند تک کونے کھدروں میں دبکے ہوئے تھے۔ یہ ماحول اس کے ارادوں کے لیے بہت سازگار تھا۔ ڈونا کا خوبصورت بھرا ابھرا سراپا اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتا وہ گیٹ کے سامنے پہنچا...... لیکن پھر اس کی تمام امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ گیراج میں ڈونا کی گاڑی موجود نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ کہیں گئی ہوئی ہے۔ بے پناہ مایوسی کے ساتھ اس نے دروازے کو دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔ اندرونی دروازہ بھی کھلا تھا۔ اس نے کمرے میں کھڑے ہو کر آواز دی۔ کوئی ہے...... جواب میں دوپہر کے گھمبیر سناٹے کے سوا کچھ سنائی نہیں دیا۔ نہایت طیش کے عالم میں اس نے سامنے رکھے ٹی وی کو پاؤں سے دھکا دیا۔ وہ اسٹینڈ سے الٹ کر فرش پر گرا اور اسکرین چکنا چور ہو گئی۔ دفعتاً سیٹو کا دل ایک نئے انداز سے دھڑکنے لگا۔۔۔ ڈونا نہیں تو اس کا سجا سجایا گھر ہی سہی۔ اس کی سانس پھر تیز ہو گئی۔ اس نے اطمینان سے گھر کے دروازوں کو اندر سے مقفل کیا اور نہایت وحشیانہ انداز میں چیزوں کو توڑنے پھوڑنے لگا۔ پہلے وہ باورچی خانے میں گیا اور تمام کراکری توڑ ڈالی۔ پھر اس نے ایک کرسی اٹھائی اور گھر کے تمام شیشے چکنا چور کر دیئے۔ ہر قیمتی شے کو اس نے بے کار ٹکڑوں میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پردے پھاڑ ڈالے بجلی کا قیمتی سامان اور ڈیکوریشن کی چیزوں پر ڈے ماریں، وک، ڈونا اور ٹیڈ کی ایک بڑی تصویر اتار کر فرش پر پھینکی اور اسے اپنے پاؤں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ پھر اس نے جلتے ہوئے سگریٹ سے نہایت قیمتی بیڈ شیٹس کو جگہ جگہ سے داغ دیا۔ تب اس کی نگاہ سنگھار میز کے آئینے پڑی۔ ایک پیپر ویٹ مار کر اس نے آئینہ توڑ ڈالا۔۔۔

قریب ہی دیوار پر لگے ہوئے نوٹس پر ایک روز پہلے ڈونا نے کوئی پیغام لکھا تھا۔ میں اور ٹیڈ گاڑی ٹھیک کروانے جو کیمبر کی ورکشاپ جا رہے ہیں، جلد واپسی ہو گی، اس نے یہ پیغام مٹایا اور اس پر موٹے موٹے حروف میں لکھ دیا۔

"پیاری ڈونا! امید ہے تمہیں میرا یہ کام پسند آئے گا۔"

پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ویگن کھلی سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔ یقینی بات تھی کہ ڈونا اس نقصان پر سخت تلملائے گی۔ عین ممکن تھا کہ وہ پولیس کا تعاون حاصل کرے۔ وہ اب جلد از جلد دور نکل جانا چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

یہی وہ وقت تھا جب ڈونا نے ڈاکیئے کی آس دل سے نکال دی۔ تین بج کر پینتالیس منٹ ہو چکے تھے۔ لیکن گرمی کی شدت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کار کا اندرونی درجہ حرارت کم از کم 105 ڈگری تھا ننھا ٹیڈ نیم جان دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں تھیں اور وہ ماں کی گود میں سر رکھے یک ٹک کار کی چھت کو گھور رہا تھا جو اطمینان سے گیراج کی چھاؤں میں بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی وہ منہ اوپر اٹھا کر عجیب ہولناک انداز میں بھونکتا اور پھر اپنی سرخ آنکھوں سے ڈونا کو گھورنے لگتا...... ڈونا ایک پڑھی لکھی حقیقت پسند عورت تھی۔ افسانوی باتوں نے اسے کبھی متاثر نہیں کیا۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ کو جو صرف ایک کتا ہے۔ جو کسی وجہ سے باؤلا ہو گیا ہے۔ ٹیڈ کی الماری اور اس کتے میں قطعاً کوئی تعلق نہیں۔۔۔ لیکن جب بھی وہ کتے کی آنکھوں میں دیکھتی تھی اسے لگتا تھا جیسے یہ کتا ہی نہیں کچھ اور بھی ہے۔ اس کے خیالات درہم برہم ہو جاتے تھے۔

پچھلے دو ڈھائی گھنٹے وہ مسلسل آہنی دروازے پر غور کرتی رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ ٹیڈ سے کہے کہ وہ دروازے کی طرف جا رہی ہے۔۔۔ اور چاہے اس کے

ساتھ کچھ بھی ہو جائے وہ کار سے باہر نہ نکلے۔ اسے امید تھی کہ اگر وہ اچھی طرح سمجھانے میں کامیاب ہو گئی تو ٹیڈ کار سے نہیں نکلے گا۔ کار سے نکل کر وہ دروازے کی طرف بھاگے گی۔ اس کا لٹو گھمائے گی۔ اگر دروازہ کھلا تو وہ کار کی طرف واپس نہیں آئے گی بلکہ پہلو کی طرف سے کسی اور دروازے پر قسمت آزمائی کرے گی۔۔۔ لیکن جب وہ اس منصوبے پر غور کر رہی تھی۔ کوجو جو ڈیڑھ دو گھنٹے سے گیراج کے اندر تھا ٹہلتا ہوا باہر آ گیا تھا۔ اور ڈونا کو اپنا ارادہ پھر ملتوی کرنا پڑ گیا تھا۔ ٹیڈ نے کسمسا کر ڈونا کے چہرے کی طرف دیکھا اور ایکا ایکی بڑے دکھ سے رونے لگا ممی۔۔۔ مجھے سخت پیاس لگی تھی۔ ہم گھر کب جائیں گے۔۔۔؟ ڈونا نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور دلاسہ دینے لگی، لیکن اب وہ کسی طرح چپ ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ڈونا دل میں کہہ رہی تھی۔ نہ رو میرے بچے نہ رو۔ پتہ نہیں ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ تیرے جسم میں جو تھوڑی بہت نمی ہے اسے آنکھوں کے راستے ضائع نہ کرو۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے تھرماس کا ڈھکن کھولا۔ بمشکل چند گھونٹ دودھ باقی بچا تھا۔ وہ جانتی تھی شام سے پہلے پہلے یہ دودھ ختم ہو جائے گا۔۔۔

اس کے بعد کیا اس کا بیٹا مر جائے گا؟ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ دفعتاً گھر کے اندر ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی کوجو کان کھڑے کر کے اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ پہلے چند قدم اس نے آواز کی طرف بڑھائے۔ پھر وہ پلٹا اور خوفناک تیزی سے کار پر حملہ آور ہوا ایک دھماکے سے اس نے ڈونا کی جانب والے دروازے کو ٹکر ماری۔ دروازہ کھڑکھڑا اٹھا۔ ٹیڈ چیخا۔ کتا الٹے قدموں واپس ہٹا۔ اس کی تھوتھنی شدید ٹکر سے زخمی ہو چکی تھی۔ ڈونا نے سمجھا وہ واپس جا رہا ہے، لیکن نہیں۔ اس نے دوبارہ کار کی طرف جست بھری اور خوفناک آواز سے کھڑکی کے شیشے سے ٹکرایا۔ اس کی تھوتھنی کا خون شیشے پر پھیل گیا۔ ڈونا نے دہشت زدہ نگاہوں سے دیکھا، شیشے پر ایک رو پہلی لکیر نظر آنے لگی تھی۔ تو کیا شیشہ ٹوٹ؟ ڈونا نے شدید خوف کے عالم میں سوچا تیسری ٹکر کتے نے پھر دروازے پر ماری۔ آواز اتنی شدید تھی کہ ڈونا نے سوچا اب یہ موذی دوبارہ نہیں اٹھ سکے گا، لیکن اس نے حیرت سے دیکھا۔ کتا پھر پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اس کا چہرہ خون سے رنگین تھا۔ ایک بار پھر وہ دروازے سے ٹکرایا۔ دروازہ اب اندر گھسنا شروع ہو گیا تھا۔ کتے پر نہایت شدید دورہ پڑ چکا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ ہٹ کر دروازے سے سر ٹکرا رہا تھا۔ ڈونا نے دیکھا ٹیڈ نے چہرہ بازوؤں میں چھپا رکھا تھا۔ ایک طرح یہ اس کے حق میں بہتر ہی تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ کار کا دروازہ ٹیڑھا ہو کر ڈونا کے کولہے سے آ لگتا۔ فون کی گھنٹی ختم گئی۔ اس کے ساتھ ہی کوجو رک گیا۔ وہ تھوڑی دیر کھڑا دم ہلاتا رہا پھر دروازے کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا خون آلود آسمان کی طرف اٹھا اور ایسی آواز میں چلایا جس نے ڈونا کے جسم میں سرد لہر دوڑا دی اور وہ ایک بار پھر سوچنے لگی کہ کیا واقعی یہ صرف ایک کتا ہے۔ تھوڑی دیر دروازے کے پاس بیٹھ کر کوجو کار کے بالکل سامنے شاید اگلے پہیوں کے نیچے جا بیٹھا۔ ڈونا نے ٹیڈ کو دودھ کے آخری گھونٹ پلائے اور اس کا سر زانوں پر رکھ کر سلانے کی کوشش کرنے لگی۔ امی میرا منہ کڑوا ہو رہا ہے۔ کڑوے کو ٹیڈ کروڑا کہتا تھا۔ اس طرح کا دوسرا لفظ ناشتہ تھا وہ ناشتے کو ناشتہ کہتا تھا اور اس پر اس کے ہم جماعت ہنستے بھی تھے لیکن اب اس نے ناشتہ کہنا سیکھ لیا تھا۔ ڈونا جانتی تھی اس کا منہ پیاس کی وجہ سے کڑوا ہے لیکن وہ کیا کر سکتی تھی۔ وہ اس کا سر تھپکنے لگی۔ پھر اس کی نگاہ کھڑکی کی طرف پڑی اور وہ یہ سوچ کر لرز اٹھی کہ اگر کوجو اس شیشے پر چند ٹکریں اور مارتا تو کیا ہوتا۔ بالآخر ٹیڈ سو گیا اور ڈونا کو بھی اونگھ آ گئی، اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو سورج کا آتشی گولہ جو کیمبر کے گھر کے عقب میں روپوش ہو رہا تھا۔ کار دہکتی ہوئی بھٹی میں حرارت کچھ کم ہو گئی تھی۔ کوجو کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید وہ ابھی تک کار کے سامنے تھا۔ اس نے دیکھنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کے علاوہ کچھ نہ جان سکی کہ کوجو گیراج کے سامنے موجود نہیں وہ سوچنے لگی اگر کوجو کار کے سامنے بھی موجود نہیں۔ تو یہ آہنی

دروازے تک پہنچے کا بہترین موقع ہے۔ ٹیڈ بے خبر سو رہا ہے اس کی اپنی توانائی بھی ابھی اتنی کم نہیں ہوئی کہ ہاتھ پاؤں ہلانے مشکل ہو جائیں۔۔۔۔۔ اگر یہ کوشش کرنی ہے تو پھر کیوں نہ ابھی کرلی جائے۔ ایکاایکی اس کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ وہ محسوس کررہی تھی کہ جوں جوں وقت گزر رہا ہے اسے دروازے تک رسائی مشکل نظر آرہی ہے اور یہ ایک نفسیاتی عمل تھا۔ کسی مشکل قدم کے بارے میں جتنا سوچا جائے وہ اتنا ہی مشکل ہوتا جاتا ہے۔ اپنے ڈیڈی کی نصیحت اس کے کانوں میں گونجی۔۔۔۔ لیکن اگر کوجو خاموشی سے کار کے سامنے بیٹھا ہے اور اس کے نکلنے کا منتظر ہے تو پھر؟؟؟ وہ کتنی دیر تذبذب میں رہی، پھر اس نے کوشش کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ گرمی کی وجہ سے ٹیڈ اپنی قمیض اتار چکا تھا اب یہ قمیض ڈش بورڈ پر پڑی تھی ڈونا نے یہ قمیض اپنے بائیں ہاتھ پر لپٹی۔

سوئے ہوئے ٹیڈ پر ایک نگاہ ڈالی اور دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے آہستہ سے ہینڈل گھمایا اور باہر کی طرف دباؤ ڈالا لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ اسکا مطلب تھا کہ کوجو کی وحشیانہ ٹکروں نے دروازے کو جام کردیا تھا۔۔۔۔ لیکن اگر ایسا ہوا بھی تھا تو وہ عقبی دروازہ استعمال کرسکتی تھی۔ اس نے ایک بار پھر کوشش کی۔۔۔۔ اور تب ایک جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ خوش قسمتی تھی کہ وہ اپنی ہی جھونک میں باہر نہیں گری۔ دروازہ پورا کھل گیا تھا۔ اس نے بمشکل خود کو سنبھالا۔۔۔۔ دفعتاً اس پر ایک خوفناک انکشاف ہوا۔ موت اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دکھائی دینے لگی۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس دنیا میں یہ اس کے آخری لمحے ہیں۔۔۔۔ دروازہ کھل چکا تھا لیکن اب وہ بند نہیں ہوسکتا تھا۔ کوجو کسی بھی لمحے اس کھلے دروازے سے داخل ہو کر اسے اور ٹیڈ کو چیر پھاڑ سکتا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ہینڈل پکڑا اور جسم کی پوری قوت سے دروازے کو بند کرنا چاہا لیکن۔۔۔۔ وہ بند نہیں ہوا۔ اس نے دیوانگی میں دروازے کو جھنجھوڑ ڈالا۔

"ایک کوشش اور کرو ڈونا۔۔۔۔۔ ایک کوشش اور اس کے اندر سے آواز آئی۔ ایک بار پھر اس نے ہینڈل کو پوری قوت سے اپنی طرف کھینچا۔ کرچ کی آواز آئی اور ایک دھماکے سے دروازہ بند ہوگیا۔ ٹیڈ اس آواز سے کسمسایا اور نیند میں بڑبڑانے لگا۔ ڈونا کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ جسم پر لرزہ طاری تھا۔ اعصاب جیسے شل ہو گئے تھے۔ اسے لگا جیسے وہ اب کبھی باہر نکلنے کی کوشش نہیں کرسکے گی۔۔۔۔ لیکن اسے کوشش کرنا تھی اور اور ابھی کرنا تھی۔ اور اس سے بہتر موقع پھر نہیں مل سکتا تھا۔ شاید یہ اس کا آخری چانس تھا۔ وہ جانتی تھی دروازہ کھلنے اور بند ہونے سے دو دفعہ آواز پیدا ہوئی تھی اگر کتا گاڑی کے سامنے ہوتا تو ضرور حرکت کرتا۔ یقیناً۔۔۔۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ ڈونا نے ایک طویل سانس لے کر اعصاب کو قابو کرنے کی کوشش کی اور ہاتھ دوبارہ ہینڈل پر رکھ دیا۔ اس دفعہ اس نے بڑی احتیاط سے دروازہ کھولا۔ پھر اپنے پاؤں باہر نکالے اور آہستہ آہستہ کھڑی ہوگئی۔ دھوپ غائب ہوگئی تھی، لیکن اندھیرا ابھی نہیں پھیلا تھا۔ دور کہیں کوئی پرندہ بول رہا تھا۔ ڈونا نے اپنی اکڑی ہوئی ٹانگوں کو سیدھا کیا۔ پھر جھک کر زمین سے چھوٹے چھوٹے کنکر اٹھائے اور بونٹ کی دوسری جانب پھینکنے لگی۔ یہی وہ جگہ تھی جو اسے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پہلے دو کنکر زمین پر گرے اور ان کی آواز آئی لیکن تیسرا کنکر زمین پر نہیں گرا۔ ایک لمحے کے لیے ڈونا کے ذہن میں آیا کہ وہ آہنی دروازے تک پہنچنے کا ارادہ ترک کردے، لیکن پھر ہمت کر کے چند قدم آگے بڑھی۔ اس وقت عقب میں آہٹ ہوئی۔ ڈونا نے جلدی سے گردن گھمائی۔۔۔۔ کوجو اس سے چار فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں اور حلق سے ایک دھیمی لیکن مسلسل غراہٹ بلند ہورہی تھی۔ ڈونا کے جسم کا ہر ایک رواں کھڑا ہوگیا۔ تو آخر وہ پاگل کتے کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔

اس کا شک صحیح نکلا تھا۔ وہ گاڑی کے سامنے خاموشی سے بیٹھا اس کے باہر نکلنے کا انتظار کرتا رہا تھا اور اب شکار اور شکاری آمنے سامنے تھے۔ پھر کتے نے اپنی

جگہ سے حرکت کی اور ڈونا کے ہونٹوں سے کربناک چیخ بلند ہوئی۔ حتی الامکان تیزی سے اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ کتا خالی سڑک پر گرا لیکن پھر لوٹ کر فوراً سیدھا ہوگیا۔ اس دوران گاڑی کے دروازے کی طرف لپکی، بٹن دبا کر اس نے ہینڈل کھینچا، لیکن دروازہ۔۔۔۔ دروازہ نہیں کھلا اور تب دوسری بار کتے نے اس پر چھلانگ لگادی۔ 200 پونڈ وزنی جسم ناقابل گمان رفتار سے اس کے ساتھ ٹکرایا۔ وہ منہ کے بل کار سے ٹکرائی پھر تیزی سے سیدھی ہوئی اور کتے کے منہ پر ٹانگ ماری۔ اس دوران اس کا ہاتھ مسلسل ہینڈل سے الجھ رہا تھا۔ کتا پھر حملہ کرنے کے لئے الٹے پاؤں پیچھے ہٹا۔ ڈونا نے زور لگا کر دروازہ کھولنا شروع کردیا۔ ڈونا نے زور لگا کر دروازہ کھولنا چاہا۔ وہ جانتی تھی یہ آخری موقع ہے اس کے لئے بھی اور شاید ٹیڈ کے لئے بھی۔ پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ ڈونا نے حتی الامکان تیزی سے پشت کے بل نشست پر گرایا، لیکن وہ برق دروازہ بند نہ کرسکی۔ کوجو خوفناک آواز میں بھونکتا ہوا اندر گھس آیا۔ اب اس کا نصف دھڑ کار کے اندر تھا۔ ڈونا کے دونوں ہاتھ اس کی گردن پر تھے۔ خون آلود بالوں کے گچھے اس کی برہنہ کلائیوں کو چھو رہے تھے۔ اس کی انتہائی بدبودار سانس سیدھی ڈونا کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ وہ اپنے عقب میں ٹیڈ کی دلخراش چیخیں سن رہی تھی۔ ان چیخوں میں اس کی اپنی چیخیں بھی شامل تھیں۔ اور کوجو کی قاتل غراہٹیں بھی۔ پھر کوجو کی گردن اس کے ہاتھوں سے پھسلی اور اس کے نوکیلے دانت ڈونا کے برہنہ پیٹ میں پیوست ہو گئے۔ ایک چیخ کے ساتھ اس نے دروازے کا ہینڈل کھینچا۔ دروازہ زور سے گھوم کر جو کی پسلیوں سے ٹکرایا۔۔۔۔ ایک بار دو بار تین بار وہ آدھ کھلے دروازے سے اسے مسلسل ضربیں لگا رہی تھی کوجو تھوڑا سا پیچھے ہٹا۔ ڈونا سمجھی وہ باہر نکل رہا ہے۔۔۔۔ لیکن نہیں۔ اس دفعہ اس نے ڈونا کی ران سے گوشت کا ایک لوتھڑا جدا کردیا۔ ڈونا درد سے بے تاب ہو کر چلائی۔ خون اس کی پنڈلیوں کی طرف بہہ رہا تھا۔ تب کوجو ایک دفعہ پھر اندر گھسا۔ ڈونا نے دوبارہ اس کی گردن تھام لی۔ اس کے ہاتھ کمزور پڑ رہے تھے لیکن جب تک وہ زندہ تھی۔ یہ قاتل جانور اس کے بچے تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس نے زور لگا کر اسے باہر کی طرف دھکیلا، لیکن کتے کا نصف دھڑ اب بھی گاڑی میں تھا۔ پھر اس سے پہلے ڈونا کی ہمت بالکل جواب دے جاتی۔ کتا پچھلے پاؤں پر اچھلنے کے لئے حسب سابق تھوڑا سا پیچھے ہٹا۔ یہ ایک نہایت قیمتی لمحہ تھا۔ ڈونا نے لپک کر دروازے کا ہینڈل تھاما اور پوری قوت سے اپنی طرف کھینچ لیا۔ دروازہ کوجو کے سر سے ٹکراتا ہوا پرشور آواز سے بند ہوگیا۔ ڈونا نے مڑ کر دیکھا، ٹیڈ، پیلا کاغذ مٹھی میں دبائے ایک کونے میں سمٹا چیخیں مار مار کر رو رہا تھا۔ ڈونا نے اسے تھپتھپایا۔

"حوصلہ کرو ٹیڈ سب ٹھیک ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہے"۔ لیکن وہ جانتی تھی سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ زخمی ہوچکی تھی۔ اور اسے ایک کتے نے کاٹا تھا۔۔۔۔ اور وہ کتا پاگل تھا۔

جس وقت ٹاؤن روڈ نمبر 3 کے آخری اسٹاپ پر یہ خونی ڈرامہ کھیلا جارہا تھا، کتے کا مالک یعنی دس سالہ برٹ اپنی ماں چیرئی سے اصرار کررہا تھا کہ وہ ڈیڈی کو ٹیلیفون کرکے کتے کی حالت دریافت کرے۔ چیرئی اسے سمجھا رہی تھی۔ کہ کچھ دیر پہلے اس نے ٹیلیفون کیا تھا۔ لیکن وہ گھر سے مسلسل غیر حاضر ہے۔ جب برٹ کا اصرار زیادہ بڑھا تو چیرئی نے اس کی تسلی کے لئے اپنی ایک سہیلی کو ٹیلیفون کیا۔ یہ سہیلی ان کے گھر سے دو ڈھائی فرلانگ کے فاصلے پر رہتی تھی۔ اس کا شوہر بھی کیمبر کا دوست تھا۔ چیرئی نے سہیلی کو بتایا کہ وہ کنکٹی کٹ سے بول رہی ہے۔ وہ اور اس کا بیٹا اپنے پالتو کتے کے بارے میں پریشان ہیں اگر اسے زحمت نہ ہو تو وہ کسی طرح ان کے گھر کا ایک چکر لگا آئے۔ سہیلی نے وعدہ کیا کہ جونہی اس کا شوہر آیا وہ اسے دریافت حال کے لئے ورکشاپ روانہ کردے گی اور جوابی کال کے ذریعے اسے مطلع کرے گی۔ (چیرئی کی سہیلی نے یہ وعدہ کبھی پورا نہیں کیا) تقریباً اس وقت ڈونا کا خاوند وک بھی بوسٹن کے ایک

خوبصورت ہوٹل کے کمرے میں بیٹھا بیوی کو ٹیلیفون کرنے کا سوچ رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ دو دفعہ کوشش کر چکا تھا، لیکن کسی نے ٹیلیفون نہیں اٹھایا تھا۔ وہ جانتا تھا اس وقت ٹیڈ ماں کے ساتھ بیٹھا رات کا کھانا کھا رہا ہوگا یا سونے کی تیاری میں مصروف ہوگا۔۔۔ لیکن اور بھی بہت کچھ ہوسکتا تھا یہ بھی تو ممکن تھا کہ۔۔۔ اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔ گمنام خط لکھنے والے کا تاریک ہیولا اس کی نگاہوں کے سامنے ناچنے لگا۔ یہ ہیولا کسی ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں ڈونا کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ ٹیڈ کسی خواب آور دوائی کے زیر اثر صوفے پر گہری نیند سو رہا تھا۔ اس نے سر کو زور سے جھٹک کر یہ تکلیف دہ تصور ذہن سے نکالنا چاہا۔ لیکن اگر یہ تصور غلط تھا اور ڈونا، ٹیڈ کے ساتھ گھر ہی میں موجود تھی تو پھر کوئی ٹیلیفون کیوں نہیں اٹھا رہا تھا۔ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ انہیں کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔ یہ خیال آتے ہی ایک بار پھر وہ گھر کے نمبر ملانے لگا۔

نمبر ملانے اور مایوسی سے سر ہلا کر ریسیور واپس رکھنے کا یہ سلسلہ وقفے وقفے سے رات گیارہ بجے تک جاری رہا۔ اب وک خوفزدہ حد تک پریشان تھا۔ ذہن بار بار ایک دائرے میں گھوم رہا تھا پہلے وہ سوچتا کہ ڈونا اپنے محبوب اسٹیوکیمپ کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ پھر یہ خیال آتا کہ اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے اور ٹیڈ کے ساتھ کسی ہسپتال میں پڑی ہے۔ تیسرا خیال ذہن میں یہ آتا کہ گھر میں ڈاکہ پڑا ہے اور دونوں ماں بیٹا شدید زخمی یا ہلاک ہوگئے ہیں۔ وک کا دوست روجر اس کی پریشانیوں سے بے خبر ساتھ والے بستر پر گہری نیند سو رہا تھا۔ اس وقت رات کے بارہ بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے جب وک نے بے چین ہو کر کمرے کی روشنی جلا دی۔ روجر ہڑبڑا کر جاگ گیا۔

"کیا بات ہے وک۔۔۔ تم سوئے نہیں"۔

اس نے خوابیدہ لہجے میں پوچھا۔

وک نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "روجر! رات کے بارہ بج چکے ہیں۔۔۔ ڈونا اور ٹیڈ ابھی تک گھر نہیں پہنچے"۔

روجر بھی گھڑی دیکھتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دونوں دوست کچھ دیر اس مسئلے پر غور کرتے رہے پھر روجر نے وک کو مشورہ دیا "وہ شیرف کو ٹیلیفون کرے اور اسے کہے کہ اس کے اہل خانہ کی خیریت دریافت کی جائے" وک نے ڈائریکٹری اٹھائی اور اس میں کاسٹل کا ؤنٹی شیرف ڈپارٹمنٹ کا نمبر تلاش کرنے لگا۔

☆......☆......☆

ٹیڈ پر غنودگی طاری تھی۔ وہ گہری نیند میں بار بار چلا اٹھتا تھا۔ ڈونا دونوں ہاتھ گود میں رکھے ساکت بیٹھی تھی۔ اس کا جسم تپ رہا تھا۔ کنپٹیاں درد سے پھٹی جا رہی تھیں۔ اسے لگتا تھا جیسے ذہن کے تار دھیرے دھیرے کھنچے جا رہے تھے۔ ٹیڈ کی ادھ کھلی مٹھی سے پیلا کاغذ نیچے گر گیا تھا جیسے اس دعا پر سے اس کے معصوم ذہن کا اعتماد اٹھ گیا تھا۔ یہ دعا کہ جو کوان کی گاڑی سے باہر رکھنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ ڈونا نے ایک دکھیاری ماں کی نگاہ سے بیٹے کے سن ہوتے چہرے کو دیکھا اور بڑبڑانے لگی۔

میرے چاند! میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ تجھے گھر ضرور پہنچاؤں گی۔ وہ ٹیڈ کی گردن سیدھی کرنے کے لئے آگے جھکی تو پیٹ کے زخم سے ٹیس اٹھنے لگیں، لیکن درد کا اصل منبع اس کی ران تھی گھٹنے سے ذرا اوپر آنے والا یہ زخم نہایت گہرا تھا۔ کار میں ابتدائی طبی امداد کا چھوٹا سا بکس تھا، لیکن اسے پٹی کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ یوں بھی اس کا خیال تھا کہ خون بہنے سے زخم کا زہریلا مادہ خارج ہو جائے گا اور یہ بہتا ہوا خون دھیرے دھیرے نشست کو داغدار کر رہا تھا۔ اس نے اسپرین کی دو گولیاں کھائی تھیں، لیکن اس سے بھی کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ پاگل کتے کا شکار خود بھی پاگل ہو جاتا ہے، لیکن اس بارے میں اسے زیادہ معلوم نہیں تھا کہ مرض کا حملہ ہونے کے بعد علاج کیا جائے تو وہ کارگر ہوتا ہے یا نہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ مرض کا حملہ کتنی دیر میں ہوتا ہے۔ شاید چند گھنٹوں میں، چند دنوں میں یا چند ہفتوں میں بہرحال اس بات کا اسے سو فیصد یقین تھا کہ جس کتے نے اسے کاٹا ہے وہ پاگل ہے اور مرض کی

انتہا کو چھو رہا ہے۔۔۔ یکبارگی ڈونا کو کار تنگ ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ ایک تابوت میں بدل گئی۔ اس تابوت میں وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کا بیٹا بھی تھا۔ ڈونا کا دم گھٹنے لگا۔ اس کے ذہن میں آواز آئی۔ ڈونا تمہیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔۔۔ ورنہ عبرتناک موت تیرا اور تیرے بیٹے کا مقدر بنے گی۔ ہسٹریائی انداز میں وہ چلائی اور اس کا ہاتھ دروازے کی طرف بڑھا، لیکن پھر اس نے اس کیفیت پر قابو پا لیا۔ وہ ڈیش بورڈ سے سر لگا کر رونے لگی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ یہ اس کے گناہوں کی سزا ہے جو اس کے ساتھ اس کے بیٹے کو بھی بھگتنا پڑ رہی ہے۔ شاید اس پاگل کتے کے روپ میں اس کی جنسی لغزشیں مجسم ہوگئی تھیں۔۔۔ اگر یہ صرف ایک کتا تھا تو اب تک مر کیوں نہیں گیا تھا؟ وہ سوچتی رہی اور روتی رہی اور دھیرے دھیرے پکارتی رہی۔

"مدد۔۔۔ پلیز۔۔۔ مدد۔۔۔ پلیز۔۔۔ مدد۔۔۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ وک نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف شیرف، ہانز مین تھا۔ وہ کاسٹل ورک سے بول رہا تھا اس نے بتایا۔ مسٹر وک تھوڑی دیر پہلے ایک پولیس پارٹی آپ کے گھر بھیجی گئی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کے لیے اچھی اطلاع نہیں ہے"

وک کا چہرہ زرد ہوگیا۔ پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے لرزاں لہجے میں پوچھا۔ کیا وہ دونوں مر گئے؟

شیرف کی آواز آنے تک وک جیسے زمین اور آسمان کے درمیان میں معلق رہا۔ پھر اس کی آواز آئی۔ مسٹر وک!

وہ دونوں گھر میں موجود نہیں۔ لہٰذا اس وقت ان کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن ایک یا ایک سے زیادہ افراد نے تمہارے گھر میں زبردست توڑ پھوڑ مچائی ہے۔۔۔ کیا تم کسی شک کا اظہار کر سکتے ہو۔

وک کی آنکھیں غصے کی زیادتی سے بھیگ گئیں۔ اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ایسا ہوا تو یہ صرف اور صرف ایک شخص کا کام ہے اور اس کا نام ہے اسٹیوکیمپ۔ میرا بچہ اور بیوی اسی شخص کے پاس ہیں۔ شیرف نے اس شک کی وجہ پوچھی وک کچھ جھجکتا رہا پھر اس نے شیرف کو سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ آخر میں اس نے کہا کہ ڈونا نے اس لفنگے سے تعلقات ختم کر لئے تھے۔ یہی قطع تعلقی پہلے گمنام خط اور پھر اس کے اغوا کا سبب بنی ہے۔ شیرف نے کہا۔

"لیکن تمہارے گھر کے نوٹس بورڈ پر ایک تحریر بھی ملی ہے لکھا ہے۔ "پیاری ڈونا! امید ہے تمہیں میرا کام پسند آئے گا۔" اس فقرے سے انداز ہوتا ہے کہ اسٹیوکیمپ یا جس شخص نے بھی توڑ پھوڑ کی ہے۔ وہ جب گھر میں داخل ہوا تو ڈونا موجود نہیں تھی۔" امید کی ہلکی سی کرن وک کے چہرے پر دکھائی دی۔ لیکن پھر شیرف کی آواز نے اسے فوراً معدوم کر دیا۔ وہ بولا۔

"۔۔۔ ہوسکتا ہے اس شخص کی موجودگی کے دوران ہی ڈونا گھر واپس آ گئی ہو۔۔۔ بہرحال ہم حتی الامکان تیزی سے تفتیش کر رہے ہیں۔ تم کاسٹل راک کب پہنچ رہے ہو۔"

وک بولا۔ ابھی اسی وقت میں روانہ ہو رہا ہوں میں ائیرپورٹ سے کار لے کر صبح پانچ بجے تک گھر پہنچ جاؤں گا شیرف نے نرم لہجے میں کہا مسٹر وک! ذرا تسلی سے یہ نہ ہو کہ تمہارے بیوی بچے تو زندہ سلامت مل جائیں اور تم تیز رفتاری میں جان گنوا بیٹھو۔ ریسیور نیچے رکھ کر وک نے قدرے پشیمان نگاہوں سے اپنے دوست روجر کی طرف دیکھا۔ اسے ڈونا کے تعلقات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ لیکن شیرف سے اس کی گفتگو کے دوران وہ سب کچھ جان چکا تھا۔ روجر نے آگے بڑھ کر بڑی نرمی سے وک کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور ایک اچھے دوست کی طرح اسے تسلی دینے کی کوشش کرنے لگا۔

☆......☆......☆

جس وقت وک جلدی جلدی کاسٹل راک روانہ ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ قریباً اسی وقت کنکٹی کٹ میں چیرٹی اپنے بستر میں لیٹی گہری سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ رات کا بیشتر حصہ اس نے جاگ کر گزارا تھا۔ بہن کے ہاں چند روز کے قیام کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ گھر اپنا ہی ہوتا ہے اور عورت کی زندگی شوہر کے بغیر نامکمل

ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے کہ جو کیمبر سخت مزاج تھا۔ بعض اوقات اسے پیٹتا بھی تھا۔ اس گھر میں عسرت و تنگ دستی بھی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ اس کا گھر تھا۔ جہاں کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور غم اس کے اپنے تھے۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ آج صبح کاسٹل راک واپس روانہ ہو جائے گی اور اس کے بعد کبھی طلاق کا خیال اپنے ذہن میں نہیں لائے گی۔۔۔ آج اپنا شوہر اسے بے پناہ یاد آرہا تھا۔۔۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے مرے کئی روز ہو چکے ہیں اور اب اس سے طلاق لینے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔۔۔ صبح کے چھ بجے تھے۔ ٹیڈ ناشتے کے لئے روتا بیدار ہوا تھا۔ اس کی آواز سن کر ڈونا بھی جاگ گئی تھی۔ کوجو گیراج کے دروازے اور کار کے درمیان بیٹھا تھا۔ ٹیڈ کے رونے کی آواز سے اس نے اپنے کان کھڑے کر لئے۔ ڈونا کو لگا جیسے وہ پھر کار پر حملہ کرنے لگا ہے۔ اس نے ٹیڈ کو بمشکل چپ کرایا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ وہی گھسی پٹی تسلیاں کوجو کے مرنے کی باتیں ڈیڈی کی باتیں کھانے اور گھر کی باتیں یہ باتیں سن سن کر ٹیڈ کی آنکھوں میں امید کی روشنی جلتی بجھتی رہی۔۔۔ اور پھر وہ حادثہ ہوا جو ڈونا کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ ڈونا کے ایک لطیفے پر ٹیڈ کمزوری سے ہنسا اور اچانک اس نے اپنا گلا پکڑ لیا۔ اس کی سانس پھنسی رہی۔ ڈونا نے دیکھا اس کی آنکھیں الٹ رہی ہیں۔ ٹیڈ وہ چلائی اس سے پہلے بھی ٹیڈ کو دو دفعہ غشی کا دورہ پڑ چکا تھا۔ پہلی دفعہ وہ صرف دو سال کا تھا اور دوسری دفعہ اس نے ابھی نرسری جانا شروع کیا تھا۔ ڈاکٹر اسے مرگی قرار دیتے تھے۔ ڈونا کا رنگ برف کی طرح سفید ہو گیا اور وہ ٹیڈ کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑنے لگا۔ ٹیڈ کے ہاتھ پاؤں مڑ چکے تھے اور آنکھوں کے سفید ڈھیلے نظر آرہے تھے وہ نشست پر لڑھک گیا تھا۔ ڈونا سمجھ گئی کہ ٹیڈ مر رہا ہے۔ وہ اپنے اکلوتے بچے سے ہاتھ دھو رہی ہے۔ وہ جانتی تھی اس دورے میں زبان حلق کی طرف گر کر سانس کی نالی بند کر دیتی ہے اور ایسا ہوا تھا ٹیڈ کی سانس رک چکی تھی۔ ڈونا نے زور لگا کر ٹیڈ کا جبڑا کھولا اور اس کی زبان کو ہاتھ سے پکڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ چلا رہی تھی ٹیڈ۔۔۔ خدا کے لئے آنکھیں کھولو۔۔۔ ٹیڈ کار میں ہونے والی ہلچل نے کوجو کو ایک بار پھر مشتعل کر دیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح کھڑکی سے ٹکرایا۔ شیشے کی رو پہلی لکیر یکلخت سینکڑوں چھوٹی چھوٹی لکیروں میں تقسیم ہو گئی۔ شیشہ ٹوٹ رہا تھا۔

دوسری ٹکر، لکیروں کا جال پورے شیشے پر پھیل گیا تیسری ٹکر شیشہ اندر کی طرف ابھر آیا۔ چوتھی ٹکر۔۔۔ اس خونی ڈرامے کا ڈراپ سین تھی، لیکن یہ ٹکر کوجو نے کار کے دروازے پر ماری۔ پوری کار جھنجھلا گئی۔ پھر کوجو حسب تھوتنی سے خون کے قطرے ٹپکاتا اپنی جگہ جا بیٹھا۔ اس دوران ڈونا، ٹیڈ کی زبان پکڑنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ لیکن وہ ہر بار اس کی انگلیوں سے نکل جاتی۔ ٹیڈ کے دانتوں نے ڈونا کی انگلیاں زخمی کر دی تھیں۔ خون رس رس کر اس کی ٹھوڑی پر بہہ رہا تھا، لیکن ڈونا کو درد کا مطلق احساس نہیں تھا۔ پھر اس نے اپنے ناخن چھو کر ٹیڈ کی زبان پکڑی اور کھینچ کر اس کے ہونٹوں تک لے آئی۔ تب اس نے اس کا سر پیچھے کو جھکا دیا۔۔۔ سانس کی آمد و رفت بحال ہو گئی۔ ٹیڈ میری آواز سن رہے ہو۔ وہ بولی ٹیڈ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ چہرے پر موت کی زردی کھنڈی تھی۔ وہ وقتی طور پر موت سے بچ گیا تھا لیکن۔۔۔۔ موت اس سے دور بھی نہیں تھی اور یہ سب اس ظالم کتے کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ سب اس کا قصور تھا۔ ڈونا کے اندر سے غصے کی ایک بلند لہر اٹھی وہ اس کی طرف دیکھ کر پھنکاری بے رحم درندے میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی...... میں قسم کھاتی ہوں تجھے زندہ نہیں چھوڑں گی۔ اس کی نظریں ایک بار پھر گھاس میں پڑی ہوئی اس شے پر مرکوز ہو گئیں، جو اس کے خیال میں بیس بال کا بلا تھا۔

دن ہر لمحے روشن ہوتا جا رہا تھا۔ گاڑی کے اندر حرارت بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔

دوسری طرف وک اپنے گھر پہنچ چکا تھا۔ گھر کی حالت زار دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ ٹیڈ کے کھلونے جا بجا بکھرے ہوئے تھے۔ ہر چیز تہہ و بالا ہو چکی تھی۔ شیرف اپنے عملے کے ہمراہ موجود تھا۔ فنگر پرنٹس لئے جا رہے تھے تصویریں اتاری جا رہی تھیں۔ سٹیو کیمپ کی ویگن کا نمبر دور و نزدیک کے تمام پولیس اسٹیشنوں تک پہنچ چکا تھا۔ نزدیکی قصبوں اور شہروں میں بھی پولیس کو ہوشیار کر دیا گیا تھا۔ شیرف بانر مین اور سراغرساں میسن کی پوچھ گچھ کے جواب میں وک نے تواتر کے ساتھ یہ کہا تھا کہ اس گمشدگی کا ذمے دار "اسٹیو" ہے لیکن سراغرساں میسن نے یہ نقطہ اٹھایا تھا کہ اگر اسٹیو ڈونا اور بچے کو اغوا کیا ہے تو ڈونا کی گاڑی کہاں ہے۔۔۔ تب وک کو بھی خراب گاڑی کا خیال آیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ گاڑی خراب تھی اور اس کی بیوی اسے ٹھیک کرانے کا سوچ رہی تھی، اس جواب پر میسن نے مکینک کا پتہ پوچھا۔ وک نے بتایا کہ وہ کیمبر نامی شخص سے گاڑی ٹھیک کروانے کا ارادہ رکھتی تھی، لیکن چونکہ وہ کہیں گیا ہوا تھا اس لئے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ گاڑی کہاں لے کر گئی ہوگی۔ میسن نے کئی ورکشاپوں میں ٹیلیفون کیا۔ وک کے خیال میں یہ سارا سلسلہ فضول تھا۔ اغواء کا ذمے دار صرف اور صرف سٹیو تھا۔ وہ میسن کی تفتیش پر سخت جھلایا ہوا تھا۔ میسن نے اسے کہا کہ وہ بہت تھکا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اپنے کمرے میں جا کر آرام کرے وک اپنے کمرے میں پہنچ کر چند منٹ آرام کے لئے لیٹ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹہ آرام کرے گا اس دوران اسٹیو کا کچھ نہ کچھ پتہ چل جائے گا۔۔۔ لیکن جب وہ اٹھا تو موسم کے سب سے گرم دن کی دوپہر ہو چکی تھی۔

سراغ رساں میسن کے گھر کے لان میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس کا ذہن بار بار گمشدہ گاڑی میں اٹک جاتا تھا۔ آخر مغویہ کی گاڑی کہاں تھی۔ اس نے جو کیمبر کی ورکشاپ پر بھی کئی دفعہ رنگ کیا تھا لیکن کوئی جواب نہیں آتا تھا۔ اتنے میں برآمدے سے ٹیلیفون کی گھنٹی سنائی دی۔ میسن نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سکاربورف، کی اسٹیٹ پولیس ہیڈ کوارٹر کی طرف سے اطلاع تھی کہ اسٹیو کیمپ کو ویگن سمیت گرفتار کر لیا گیا ہے۔ عورت اور بچہ اس کے ساتھ نہیں۔ اس نے کچھ بھی بتانے سے انکار کیا ہے۔ یہ اطلاع سنتے ہی میسن نے شیرف بانر مین سے کہا کہ انہیں جو کیمبر کی ورکشاپ میں گاڑی کا پتہ کرنا چاہیے۔ چند لمحے بعد شیرف بانر مین پولیس کار میں جو کی ورکشاپ کا رخ کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

ڈونا نشست سے ٹیک لگائے اونگھ رہی تھی۔ ٹیڈ بے حس و حرکت لیٹا تھا۔ اس کے ہونٹ اب سیاہ پڑ چکے تھے۔ آنکھیں حلقوں کے اندر گہری اتر گئی تھی...... آہستہ آہستہ اس کی قوت مدافعت ختم ہو رہی تھی۔ چار سالہ ٹیڈ ٹرینون مر رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کے ہونٹوں سے ایک مدھم آواز نکلتی "ممی" گھر چلو! لیکن یہ آواز اتنی بلند ہرگز نہیں تھی کہ ڈونا کے کانوں تک پہنچتی۔ کوجو اگلے پنجوں پر سر جھکائے گیراج کے سائے میں بیٹھا تھا۔ اس کے جسم میں اور دماغ میں اٹھنے والی ٹیسیں اب ناقابل برداشت ہو چکی تھیں...... دفعتاً اسے کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ اسے لگا جیسے شہد کی بہت بڑی مکھی بھنبھناتی ہوئی اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وہ گیراج کی تاریکی میں چلا گیا۔ دم سادھے اس نے دیکھا وہ ایک لمبی گاڑی تھی۔ اطراف سے نیلی اور اوپر سے سفید۔ چھت پر ایک گول بتی تھی۔ شیرف بانر مین نے کار روکی۔ اسے چند سال پرانے ماڈل کی "پنٹو" گاڑی میں موجود تھے۔ وہ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ یہاں سے اگلی نشستوں پر دیکھنا ممکن نہیں تھا وہ پولیس کار سے برآمد ہوا اور محتاط قدموں سے گاڑی کی طرف بڑھا۔ بائیں جانب کا شیشہ چکنا چور تھا۔ بانر مین کو خطرے کا احساس ہوا۔ اس کے ہاتھ اپنے اعشاریہ 38 پولیس ریوالور تک پہنچا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے سے اسے بالوں کی جھلک نظر آئی۔ پہلے تو اس نے سمجھا کہ عورت کو گولی مار دی گئی ہے، لیکن شیشے میں گولی کا سوراخ نظر نہیں آرہا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب پاگل کوجو گیراج کی تاریکی میں سے نکلا اور وحشیانہ انداز میں بھونکتا ہوا شیرف پر لپکا۔ شیرف نے گھوم

کر دیکھا، دیوہیکل کتا اس پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ یہ ایک خوفناک کتا تھا۔ اور اسکی شکل نہایت خوفناک ہو رہی تھی۔ کتے کے دھکے سے شیرف الٹ کر سڑک پر گرا۔ ریوالور اس کے ہاتھوں سے نکل کر پولیس کار کی چھت پر سے پھسلتا ہوا دوسری جانب جا گرا۔ ایک لمحے کے اندر اندر ہانر مین سمجھ گیا۔ عورت اور بچہ کار میں تھے۔ یہ خونخوار کتا انہیں گھیرے ہوئے تھا۔۔۔۔ اور اب وہ خود اس کتے کے چنگل میں پھنس چکا تھا۔ اسے اپنے پیٹ کے نچلے حصے میں شدید جلن کا احساس ہوا۔ سرخ خون اس کی نیلی قمیض کو بھگوتا ہوا سڑک پر گر رہا تھا۔ کتا اس پر دوبارہ چھلانگ لگانے کے لئے پیچھے ہٹا۔ پھر وہ ہوا میں اچھلا۔ شیرف نے اسے جھکائی دینا چاہی، لیکن کتا اس کی نیت بھانپ گیا۔ اس نے اسی رخ پر چھلانگ لگائی اور شیرف کو نیچے لیے ہوئے پختہ سڑک پر گرا۔ اس کے نوکیلے دانت شیرف کے داہنے ہاتھ کی انگلیاں چبا رہے تھے۔ شیرف نے ٹانگوں کے زور سے کتے کو پیچھے اچھالا۔ اس وقت اس نے دیکھا کہ "کار" کا دروازہ کھلا اور ایک عورت برآمد ہوئی۔ یقیناً یہ ڈونا تھی۔ وہ اس کے گھر میں اس کی ٹوٹی ہوئی تصویر کو دیکھ چکا تھا۔ تصویر میں وہ خاصی پرکشش دکھائی دیتی تھی، لیکن اس وقت وہ نہایت پتلی حالت میں تھی، چہرے پر موت کی زردی، جسم لہولہو۔ کتے نے شیرف کو چھوڑ کر عورت کی طرف دوڑ لگائی۔

عورت نے تیزی سے کار میں گھس کر دروازہ بند کرلیا۔ شیرف اپنی کار کی طرف لپکا۔ اس کی بس ایک ہی خواہش تھی کہ کسی طرح ریڈیو پر اس حادثے کی اطلاع دے سکے، لیکن زندگی بھر ایسا اذیت ناک تجربہ اسے نہیں ہوا تھا۔ اس نے جھک کر دیکھا اس کی قمیض میں ایک سرخ سوراخ تھا اور اس کے اندر سے ایک موٹا خاکستری رسہ نکل کر نیچے لٹک رہا تھا۔ یہ اس کی بڑی آنت تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے کار کا دروازہ کھولا اور اندر گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔ کتا اب اس کی پنڈلیوں کو بھنبھوڑ رہا تھا۔

ڈونا، شیرف کی چیخیں سن کر باہر نکلی تھی۔ پھر اس نے کتے کو اپنی طرف لپکتے دیکھا اور واپس کار میں گھس گئی۔ کتا حسب سابق دیوانگی کے عالم میں دروازے سے سر ٹکرانے لگا، ٹیڈ کی چیخیں جگر پاش تھیں۔ چند لمحے بعد کتا واپس شیرف کی طرف لپکا۔ ڈونا نے سوچا یہی وقت ہے آہنی دروازے پر قسمت آزمانے کا۔ کتا بدقسمت کے جسم سے زندگی کی آخری رمق چھیننے میں مصروف تھا۔ اس نے ٹیڈ کو آنکھیں بند کرنے کی ہدایت کی اور کار کا دروازہ کھولنے کے لیے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ اور تب اسے اندازہ ہوا کہ کتے کی وحشیانہ ٹکریں بالآخر دروازے کو جام کر چکی ہیں۔ اس نے نہایت تیزی سے ٹیڈ کے ساتھ اپنی جگہ بدلی...... لیکن جب اس نے کوجو کی طرف دیکھا تو وہ اپنے کام سے فارغ ہو چکا تھا۔ شیرف کا بے جان جسم خون میں لت پت پڑا تھا۔ اس کا ایک بازو، جسم سے جدا ہو چکا تھا اور کوجو اسے کھلونے کی طرح ہوا میں اچھال رہا تھا۔ یہ ایک لرزہ خیز منظر تھا۔ ڈونا نے آنکھیں بند کر کے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ پھر اسے ٹیڈ کی کراہیں سنائی دیں۔ اس کی حالت ایک بار پھر خراب ہو رہی تھی...... "مجھے کیا کرنا چاہیے۔" وہ بلند آواز سے چلا اٹھی۔ باہر نکل کر کتے کے ہاتھوں مارے جانے سے اس کے معصوم بچے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا پھر؟...... پھر اسے انتظار کرنا چاہیے۔ شیرف اس کی تلاش میں یہاں آیا تھا جب وہ واپس نہیں پہنچے گا تو، یقیناً عملے کو فکر لاحق ہوگی۔ پیلا کاغذ کار کے فرش پر پڑا تھا۔ اس نے یہ کاغذ اٹھا کر تھمایا۔ اس نے نیم بے ہوشی کے عالم میں مضبوطی سے اسے تھام لیا۔

وک ابھی ابھی نیند سے بیدار ہوا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوگیا کہ گھڑی بارہ بجا رہی ہے۔ وہ ایک نہایت گرم دوپہر تھی۔ اس کی قمیض پسینے سے بھیگ کر جسم سے چپک گئی تھی۔ اتنے میں میسن اندر داخل ہوا اس نے بتایا کہ شیرف ٹاؤن روڈ نمبر 3 پر جو کیمبر کی ورکشاپ گیا تھا، لیکن کوشش کے باوجود اس سے رابطہ قائم نہیں ہو سکا۔ لگتا ہے وہ اپنی گاڑی کے قریب موجود نہیں ہو سکتا ہے کسی اور معاملے میں الجھ گیا ہو سٹیو کیمپ سے پوچھ گچھ جاری تھی۔

وک سست قدموں سے چلتا ہوا اوپر ٹیڈ کے

کمرے میں چلا آیا۔ اس کی اشیاء اسی طرح کمرے میں بکھری ہوئی تھیں۔ دیوار پر بلا کو بھگانے والے الفاظ دکھائی نہیں دے رہے تھے الماری کا دروازہ آدھ کھلا تھا۔ اور۔۔۔ اور وک نے غور کیا تو اسے محسوس ہوا کہ اندر سے کسی جانور کی بو آ رہی ہے۔ یہی بات کئی مرتبہ ڈونا نے بھی کہی تھی۔ وہ الماری کے قریب پہنچا یکبارگی اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ الماری سے اسے خوف آ رہا تھا۔ شاید اندر کوئی چیز موجود تھی۔ یہ دو آنکھیں تھیں، انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی۔ پھر اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یہ آنکھیں اس نے کہاں دیکھی تھیں۔۔۔۔ کب دیکھی تھیں۔ تب ایک جھٹکے سے الماری کا دروازہ بند کر دیا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آ رہے تھے۔۔۔۔ یہ آنکھیں ایک کتے کی تھیں کتا خراب کار، جو کی ورکشاپ۔۔ ایک دم بہت سی کڑیاں مربوط ہوئیں اور وک کے جسم کا ہر رونگٹا کھڑا ہو گیا۔ زندگی میں پہلی بار اس آواز پر یقین کیا۔ یہ ٹیڈ کی آواز تھی۔ دور کہیں سے وہ پکار رہا تھا۔ ڈے ڈی۔۔۔ ڈے ڈی۔۔ اس کی آواز میں بلا کی بیچارگی تھی۔ وک ایک جھٹکے سے اٹھا اور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے آیا کچھ دیر وہ دروازے پر کھڑا حواس مجتمع کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا اسے جو کیمبر کی ورکشاپ جانا چاہیے۔۔ یا نہیں۔ کہیں وہ یونہی جذباتی فیصلہ تو نہیں کر رہا۔ اگر جو کی ورکشاپ پر ڈونا کا کوئی سراغ نہیں ملتا تو شیرف ضرور واپسی اطلاع دیتا۔ اسی ادھیڑ بن میں وہ اپنی کرائے کی کار میں آ بیٹھا اور بڑی سڑک کی طرف چل دیا۔ آخر وہ اس دوراہے پر پہنچ گیا جہاں سے ایک نسبتاً تنگ سڑک ٹاؤن روڈ نمبر 3 کی طرف جاتی تھی۔ دوسری سڑک اس پولیس اسٹیشن کی طرف جاتی تھی جہاں اسٹیو کیمپ سے پوچھ گچھ کی جا رہی تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا اسے کس طرف جانا چاہیے۔ پھر وہ ٹاؤن روڈ نمبر 3 کی طرف مڑ گیا۔ شاید اسے پھر الماری سے اٹھنے والی بو یاد آ گئی تھی جونہی وہ اس سڑک پر مڑا بالکل اچانک ہی اسے جو کیمبر کے کتے کا نام بھی یاد آ گیا۔ اس کا نام کوجو تھا۔

۔۔۔۔ اور یہ فیصلے کا وقت تھا۔ سورج نہار پر تھا۔ دھوپ کی شدت سے کار آگ سے نکلے لوہے کی طرح تپ رہی تھی۔ آج ڈونا اپنی جانب والی کھڑکی بھی نہیں کھول سکتی تھی۔ اس کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا۔ ٹیڈ والی کھڑکی سے گرمی کے سوا کچھ داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ٹیڈ بے حس و حرکت پڑا تھا۔ ایک مرجھائی ہوئی شاخ کی طرح وہ مر رہا تھا۔ ڈونا جانتی تھی وہ مر رہا ہے اور یہ بھی جانتی تھی اس بند سڑک پر کوئی افسانوی ہیرو اسے اور اس کے بیٹے کو بچانے نہیں آئے گا، کہانیوں کا کوئی شہزادہ گھوڑے پر بیٹھ کر یہاں نہیں پہنچے گا۔ جو کچھ کرنا ہے اسی کو کرنا ہے۔ جو کچھ بیتنا ہے اس پر اور اس کے بیٹے پر بیتنا ہے۔۔۔ ہاں یہ فیصلے کا وقت تھا۔

اس کی ران کا زخم جل رہا تھا۔ وہ کناروں سے سرخ ہو چکا تھا کبھی کبھی ڈونا کی آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا جاتی تھی۔۔۔۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ ابھی اس پر باؤلے پن کا اثر نہیں ہوا مگر کب تک۔ وہ کسی بھی وقت پاگل ہو سکتی تھی۔ اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھوں ہلاک کر سکتی تھی۔ ہاں کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ کچھ ہونے سے پہلے اسے کچھ کرنا تھا۔ اس نے ایک نظر پھر گھاس میں پڑے ہوئے بلے کو دیکھا اور تمام تر قوت جمع کر کے آخری بار کار سے باہر نکل آئی تھی۔

عین اسی وقت تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرتا ہوا ٹیلے کی دوسری جانب پہنچا۔ اس نے گرے کے مکان سے باہر لان میں ایک میز اور دو کرسیاں پڑی دیکھیں۔

یہیں اسے جو کیمبر کی ویگن بھی کھڑی دکھائی دی۔

ویگن دیکھ کر اس نے گاڑی روکی اور اندر لپکا۔ جب وہ گیراج میں پہنچا اسے شیشے کا ٹوٹا ہوا دروازہ اور پھر فرش پر خون کے دھبے دکھائی دیئے۔ وہ بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا یہاں اس نے جو کیمبر اور گرے کی بدبودار لاشیں دیکھیں۔ ان کے زخموں سے صاف نظر ظاہر ہوتا تھا کہ کسی جانور نے انہیں بھنبھوڑا ہے۔ اس کے ذہن میں دیوہیکل کتے کا تصور آیا اور اس کے منہ سے بے ساختہ کوجو کا نام نکل گیا جیسے کسی تصویر کے دو ٹکڑے آپس میں ملنے سے ایک نیا

منظر آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ ایسے ہی وک یہ جان گیا کہ ڈونا اور ٹیڈ کی گمشدگی کوجو کی ہلاکت آفرینی سے وابستہ ہے۔ وہ پلٹا اور دروازے سے نکلتا ہوا کار کی طرف بھاگا۔

۔۔۔۔دوسری طرف ڈونا گھاس میں سے بیس بال کا بلا اٹھا چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کوجو غرانے کے بعد تیزی سے اس کی طرف لپک رہا ہے۔ لیکن وہ ابھی اس کی طرف نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ بلے کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کر رہی تھی اور پھر اس کا ازلی دشمن اس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ وہ پہلو کی طرف سے حملہ آور ہوا تھا۔ ڈونا نے نہایت تیزی سے بلا گھما کر کوجو کے سر پر مارا۔ وہ چند فٹ پیچھے ہٹا اس کے حلق سے نہایت دھیمی لیکن پر ہول غراہٹ برآمد ہو رہی تھی۔ ڈونا نے بلے پر گرفت اور مضبوط کی اس کے سینے کا زیرو بم نہایت نمایاں تھا۔ گردن سے نیچے قمیض پر خون کے دھبے تھے۔ یہ اس کے لاڈلے بیٹے کا خون تھا۔ اس کے زخمی ہونٹ پونچھ کر ڈونا نے اپنے ہاتھ یہاں صاف کئے تھے۔ اس کے چہرے کی رگیں تنی ہوئی تھیں کوجو اور ڈونا بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ جولائی کی چلچلاتی دوپہر میں ایک دوسرے کو تولنے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ سوائے تین آوازوں کے اور یہ تین آوازیں تھیں کوجو کی دھیمی غراہٹ ڈونا کی ہانپتی سانسیں اور کسی درخت پر بیٹھی چڑیا کی چہچہاہٹ۔

کوجو اپنی بائیں جانب ہٹا۔ ڈونا نے دائیں طرف حرکت کی۔ وہ ایک دائرے کی شکل میں حرکت کرنے لگے۔ وہ دانت کچکچا کر بولی۔ آموذی! آگے آ۔۔۔آگے آ۔ کوجو نے اس کی آواز سن کر جست بھری۔ ڈونا نے نہایت تیزی سے بلا گھما کر اس کے سر کو نشانہ بنانا چاہا۔ نشانہ چوکا، لیکن وار خالی نہیں گیا۔ بلے کا نچلا حصہ پورے زور سے کوجو کی پسلیوں پر پڑا۔ دھپ کی آواز آئی۔ کوجو کے حلق سے چیخ سے مشابہہ آواز نکلی۔ اس نے زمین پر گر کر دو تین پٹخنیاں کھائیں، لیکن فوراً سیدھا ہو گیا اور تب ڈونا۔۔۔نہایت وحشت کے عالم میں چیختی ہوئی اس پر پل پڑی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا بلا مشینی انداز میں کوجو پر برسنے لگا۔ چمکتی ہوئی دھوپ میں بلا اٹھ رہا تھا۔ گر رہا تھا، پھر اٹھ رہا تھا ڈونا ہانپ رہی تھی چیخ رہی تھی، رو رہی تھی اور ناقابل یقین تیزی سے کوجو کو نشانہ بنا رہی تھی۔۔۔۔ہاں یہی اس کے بچے کا دشمن تھا۔ اسی نے اس معصوم کو موت کی دہلیز پر پہنچایا تھا۔ وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گی۔ وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گی۔ طوفانی ضربوں نے کتے کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ وہ ہر بار پلٹنی کھا کر اٹھنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن اس وقت ایک اور ضرب اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ پرانے بلے کی لکڑی دستے کے قریب سے تڑخ چکی تھی۔ لیکن ڈونا کو کچھ ہوش نہیں تھا۔ زمین آسمان اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے۔ کائنات رنگوں کے بے ڈھنگے رقص کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔ بیس بال کا بلا خون آلود ہو چکا تھا۔ یہ کوجو کا خون تھا۔ وہ اب بھی ڈونا کی ضربوں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اب اس کی حرکت میں تیزی نہیں رہی تھی۔ پھر ایک جھٹکے سے بلا ٹوٹ گیا۔ دستہ ڈونا کے ہاتھ میں رہ گیا اور اس کا بھاری حصہ زوردار آواز سے جا ٹکرایا۔ کوجو قریب تھا لیکن اس کے چہرے پر ڈونا کو اب بھی آسیبی مسکراہٹ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اب بھی قسم کھا رہی تھیں کہ ڈونا کو چھوڑے گا اور نہ اس کے بچے کو۔ ڈونا کے ہاتھ میں اب ٹوٹے ہوئے بلے کا قریباً ڈیڑھ فٹ لمبا نوکیلا ٹکڑا تھا۔ وہ پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلائی۔ آموذی آ کھڑا کیوں ہے۔ مار مجھے اس کی چیخ سن کر 200 پونڈ وزنی کتے نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور ایک سرخ گیند کی طرح اس پر جھپٹا۔ ڈونا نے لکڑی کے نوکیلے ٹکڑے کو ایک بڑے خنجر کی طرح استعمال کیا۔ ڈیڑھ فٹ لمبا ٹکڑا ایک فٹ تک کوجو کے پیٹ میں گھس گیا۔

لیکن وہ پیچھے نہیں ہٹا۔۔۔۔اس کے پنجے ڈونا کے برہنہ شانوں پر تھے اور تھوتھنی اس کی گردن سے ایک انچ کے فاصلے پر۔۔۔۔اور یہ فاصلہ مزید کم ہو رہا تھا۔ کوجو ایک ایسے طاقتور انجن کی طرح تھا جس کا ایندھن ختم ہو رہا تھا لیکن وہ اب بھی پوری گھن گرج سے اسٹارٹ تھا اور پھر

ڈونا نے لکڑی کا ٹکڑا اس کے پیٹ سے کھینچا۔ ایک آخری چیخ اس کے ہونٹوں سے نکلی خوفزدہ جھلائی ہوئی اور پر غضب چیخ۔ لکڑی کا ایک ٹکڑا پیچھے ہٹا اور دوسری بار اس کے پیٹ میں پیوست ہو گیا یکبارگی کوجو کی گرفت ڈونا کے کندھوں پر ڈھیلی پڑ گئی وہ ایک جھٹکے کے ساتھ پیچھے کی طرف گرا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اینٹھے اور وہ سیاہ سڑک پر زور سے لرز کر ساکت ہو گیا۔ اس کی تھوتھنی سے خون کی دھاریں بہہ نکلی تھیں۔ بھاری بھرکم طویل دم ساکت پڑی تھی۔ اس کی بے نور آنکھیں جولائی کے گرم آسمان کو گھور رہی تھیں۔۔۔۔وہ مر چکا تھا۔ ڈونا تیزی سے بیس بال کے بلے کی طرف لپکی۔ اس نے بلا اٹھایا اور دیوانگی کے عالم میں مردہ کتے کو مارنے لگی۔ اس کی ہر ضرب پہلے سے شدید تھی۔ وہ پھٹی ہوئی آواز میں چیخ رہی تھی اور یہ چیخیں۔۔۔۔کوجو کی آخری چیخوں سے ملتی جلتی تھیں۔

پھر وہ چونک کر کار کی طرف بھاگی۔ اس کا بیٹا ابھی زندہ تھا۔ اس نے دروازہ کھولنا چاہا مگر وہ ناکام ہوئی۔ دروازہ پھر جام ہو چکا تھا۔ تمام دروازے مقفل تھے۔ اس نے بہت زور آزمائی کی، لیکن دروازہ کھولنے میں کامیاب نہ ہوئی۔ پھر اس کی نگاہ بلے پر پڑی۔ اس نے بلا اٹھایا اور کار کی عقبی اسکرین پر دے مارا لیکن اسکرین نہیں ٹوٹی۔ اس نے پولیس کار کے پاس ایک سیاہ چیز پڑی دیکھی یہ مردہ شیرف کا پستول تھا۔ اس نے لپک کر پستول پکڑ لیا تب وہ بھاگتی ہوئی آئی اور پورے زور سے پستول والا ہاتھ عقبی اسکرین پر مارا۔ وہ ایک بے چین ماں کی ضرب تھی۔ شیشہ برداشت نہ کر سکا اور وہ چکنا چور ہو گیا۔ ڈونا کی کلائی سے خون کا فوارہ ابل پڑا، لیکن اسے کچھ پرواہ نہیں تھی۔ اس نے لپک کر ٹیڈ کو تھاما اور باہر کھینچ لیا یہی وہ وقت تھا جب وک کی کار تیز رفتاری سے اس کی طرف بڑھی۔ بریک چرچرائے گاڑی رکی اور وک بھاگتا ہوا اس کے پاس پہنچا ڈونا۔۔۔۔ڈونا اس نے ٹیڈ کو اس کے ہاتھوں سے جھپٹ لیا "ٹیڈ۔۔۔۔ٹیڈ" وہ اسے زور زور سے ہلا رہا تھا۔ ٹیڈ کا چہرہ خوفناک حد تک زرد تھا۔ اس میں ٹیڈ کے سینے سے کان لگائے ڈونا نے دیکھا وک کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔۔۔۔پھر وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں، ڈونا! اسے مرے کتنی دیر ہو گئی؟"

وک کی آواز ڈونا کے کانوں میں جیسے سیسہ پگھلا گئی۔ "کیا کہہ...... کہہ رہے ہو تم؟" وہ سینے کی پوری قوت سے چلائی لیکن اس کی آواز اتنی مدھم تھی کہ بمشکل وک تک پہنچ سکی، پھر وہ جھپٹی اور ٹیڈ کو اس کے ہاتھوں سے چھین لیا۔ ٹیڈ! میرے بچے "آنکھیں کھولو"۔ وہ بیٹھی ہوئی آواز میں چلا رہی تھی۔ پھر وہ اسے دیوار کے سائے میں گھاس پر لٹا کر مصنوعی سانس دینے لگی، اپنے ہونٹوں کو اس کے ہونٹوں سے ملا کر اپنی سانس اس کے پھیپھڑوں میں داخل کرنے لگی۔

تب پولیس اہل کاروں کے سائرن گونجے، ایک ایمبولینس سے دو ڈاکٹر نکلے انہوں نے ٹیڈ کو ڈونا سے لینا چاہا لیکن ڈونا نے انہیں پیچھے دھکا دے دیا۔ ڈاکٹروں نے دوبارہ کوشش کی دفعتاً ڈونا کے سفید دانت دکھائی دینے لگے وہ عجیب انداز میں غرائی اور ڈاکٹروں پر جھپٹی۔ ڈاکٹر گھبرا کر پیچھے ہٹے۔ ہر شخص کے چہرے پر دہشت کے آثار نظر آنے لگے۔۔۔۔ڈونا باؤلی ہو چکی تھی۔ وہ خوفناک انداز میں غرائی۔ پولیس والوں پر جھپٹی۔ دو سپاہیوں نے اسے عقب سے دبوچنا چاہا۔ اس نے تیزی سے مڑ کر ایک سپاہی کو کاٹ کھایا۔ دوسرا سپاہی الٹے قدموں پیچھے ہٹا، ڈونا چلاتی ہوئی اس کی طرف لپکی ایک سارجنٹ نے پھرتی سے ریوالور نکالا۔ اس وقت وک نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور بھاگ کر سارجنٹ پر چھلانگ لگا دی۔ دونوں اوپر تلے گرے۔ وک نے سارجنٹ کا ریوارلور والا ہاتھ تھام لیا۔ "خدا کے لئے سارجنٹ" وہ پرنم آنکھوں سے بولا۔ "میرا بچہ تو چلا گیا لیکن بیوی ابھی زندہ ہے تم اپنا ہاتھ روکو۔ میں اسے روکنے کی کوشش کرتا ہوں"۔

سارجنٹ نے اثبات میں سر ہلایا۔ وک نے دیکھا ڈونا پھر ٹیڈ کے بے جان جسم کے پاس بیٹھی تھی۔ جیسے کوئی مرغی چوزے کو پروں میں چھپاتی ہے، ایسے ہی

اس نے ٹیڈ پر اپنے جسم کا سایہ کر رکھا تھا۔ وک قریب پہنچا تو ایک بار پھر اس کے سفید دانت چمکنے لگے۔ وہ کچھ بول بھی رہی تھی۔ لیکن الفاظ کے بجائے حلق سے صرف دھیمی سی غراہٹ بلند ہو رہی تھی۔ وک سمجھ گیا کہ اسے سمجھانا فضول ہے۔ وہ کبھی نہیں مانے گی۔ کہ اس کا بیٹا مر چکا ہے، وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکی تھی۔ دفعتاً وک نے چھلانگ لگائی اور اسے دبوچ لیا۔ ڈاکٹر اور پولیس والے بھاگے۔ کسی نے ہاتھ پکڑے کسی نے پاؤں۔ ڈاکٹروں نے انجکشن لگانے کی کوشش کی لیکن وہ بری طرح مچل رہی تھی۔ سرنج ٹوٹ گئی۔ تیسری کوشش میں ڈاکٹر انجکشن لگانے میں کامیاب ہو سکا۔

شیرف ہارمن اور کوجو کی لاشیں ابھی زمین پر پڑی تھیں۔ دونوں لاشوں پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ ٹیڈ کی لاش بھی زمین پر تھی۔ ایک اردلی برہنہ لاشوں پر چادریں ڈالنے کے لئے آگے بڑھا۔ جس وقت اس نے ٹیڈ پر چادر ڈالی، ڈونا کو ایمبولنس میں چڑھانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ ٹیڈ کے چہرے پر چادر دیکھ کر ایک بار پھر زور سے مچلی اور آزاد ہوگئی۔ وہ تیر کی طرح بیس بال کے بلے کی طرف لپکی، بلا تھام کر وہ کتے کی طرف آئی اور ایک بار پھر اس کے مردہ جسم پر ضربیں لگانے لگی۔ مکھیاں اڑ اڑ کر چاروں طرف پھیلنے لگیں۔ کتے کا جسم ضربوں سے اچھلنے لگا۔ وک نے اسے روکنے کے لئے آگے بڑھنا چاہا لیکن ڈاکٹر نے ہاتھ کے اشارے سے منع کردیا۔ چند لمحے بعد وہ لہراتی ہوئی زمین بوس ہوگئی۔۔۔ انجکشن کا اثر ہو چکا تھا۔

وک ست قدموں سے اٹھا اور "روجر" کو ٹیلیفون کرنے کے لئے آہنی دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے لٹو گھمایا اور دروازہ کھل گیا۔ یہی دروازہ تھا جس کے بارے میں ڈونا تین دن سوچتی رہی تھی۔ جب وہ "روجر" کو نمبر ملا رہا تھا اس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ سٹیوکیمپ پر اندھا دھند شک نہ کرتا اور اپنے رقیبانہ احساسات سے ہٹ کر سوچتا تو شاید اس کا دھیان خراب کار کی طرف چلا جاتا اور وہ یہاں پہنچ کر اپنے بچے اور بیوی کو بچالیتا۔۔۔ شاید۔

وہ اگست کی ایک اداس شام تھی وک نے پورچ میں کار روکی اور آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اس نے خود ہی دروازہ کھولا اور سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گیا۔۔۔۔ ڈونا ایک آرام کرسی پر بیٹھی خلا میں گھور رہی تھی، وک کے قدموں کی چاپ سن کر اس نے مڑ کر دیکھا اور پھیکے انداز میں مسکرادی۔ اسپتال میں کوئی ڈیڑھ مہینہ گزارنے کے بعد وہ دو روز پہلے ہی واپس آئی تھی۔ اب وہ پوری طرح صحت مند تھی لیکن دل کے زخموں کو بھرتے تو کچھ دن لگتا ہے۔ اس نے غمگین لہجے میں کہا۔ "وک! کیا اس گھر میں ہم اکٹھے رہ سکیں گے؟"

وک جانتا تھا ڈونا کے سوال کے دو حصے ہیں۔ ایک حصے میں اس نے پوچھا تھا۔ "کیا ہم ٹیڈ کے بغیر اس گھر میں رہ سکیں گے؟" دوسرا سوال یہ تھا۔ "کیا ہم اکٹھے رہ سکیں گے؟" یہ دوسرا سوال ان کے گھریلو جھگڑے اور اسٹیوکیمپ کے معاملے کی طرف اشارہ کرتا تھا۔

اسٹیوکیمپ سے پوچھ گچھ کے دوران پولیس نے اس کی ویگن کی مکمل تلاشی لی تھی۔ غیر متوقع طور پر ویگن کے خفیہ خانوں سے منشیات برآمد ہوئی تھی۔ منشیات رکھنے اور کسی کی املاک کو نقصان پہنچانے کے جرم میں اسے چار سال قید کی سزا ہوئی تھی۔۔۔۔ بہت دن ہوئے وک نے اس کے متعلق سوچا تک نہیں تھا۔ ڈونا جواب طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں دنیا کا سب سے قیمتی پانی چمک رہا تھا۔ وک نے جھک کر اس کی آنکھوں کو چوم لیا۔ یہی اس کے دوسرے سوال کا مفصل جواب تھا۔ اس نے کہا "ڈونا ہم سے بہت غلطیاں ہوئی ہیں اور ہمیں ان کی سزا بھی ملی ہے۔ اب ہم ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔" پھر اس نے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے بالکونی میں لٹکتے ہوئے جھولے کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ "دیکھو ڈونا! ٹیڈ کا جھولا خالی ہے، ہمیں اس جھولے کو اتارنا نہیں۔"